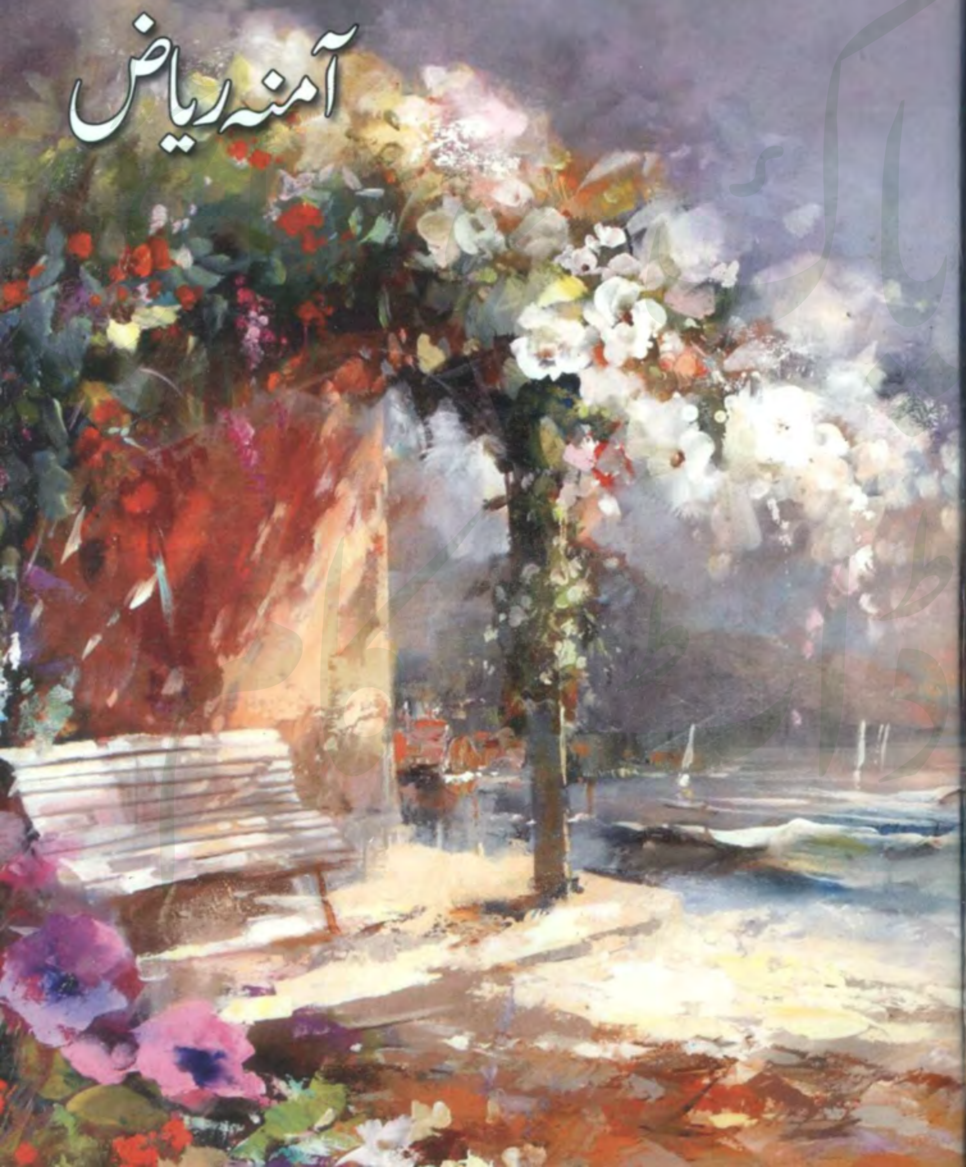
محبت اِماں ٹھہری

آمنہ ریاض



پیش لفظ

''محبت بے اماں ٹھہری'' میری ابتدائی دور کی لکھی ہوئی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف جرائد میں شائع ہو کر قارئین کی پسندیدگی کی سند پا چکی ہیں۔ دس سال کے طویل عرصہ میں، میں نے گو کہ بہت ہی کم لکھا اس کے باوجود یہ خدا کا مجھ پر کرم ہے کہ یہی کہانیاں میرا نام قارئین کے ذہن میں زندہ رکھنے کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

ان کہانیوں میں محبت بھی ہے نفرت بھی۔ خلوص بھی ہے بد دیانتی بھی۔ دوستی اور دشمنی بھی ہم قدم ہیں تو چاہت اور رقابت کو بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غرض اس مجموعے میں آپ کو زندگی کا ہر رنگ ملے گا۔ ان رنگوں کو بڑے سلیقے سے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کتنی کامیاب رہی اس کا فیصلہ کرنا صرف میرے قارئین کا حق ہے۔

میں صائمہ اکرم کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کروانے کا خیال دیا۔ صائمہ بلاشبہ ایک بہت اچھی مصنفہ ہیں لیکن اس سے بھی اچھی دوست ہیں۔

میں القریش پبلی کیشنز اور محمد علی قریشی صاحب کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کو ترتیب دینے کا اہتمام کیا۔

آمنہ ریاض

محبت بے اماں ٹھہری

روشنی کے حکمران نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اپنی کرنیں بڑی فراخدلی سے زمین کو سونپی تھیں۔ ساری کرنوں نے دائرہ بنا کر اپنی سمت متعین کی اور منتشر ہو گئیں۔ایک کرن نے دور سے اس بڑے سے گھر کی کھڑکی کو دیکھا تھا جس کی چوکھٹ کے گرد جھمکا بیل اپنی تمامتر خوب صورتی و رعنائی کے ساتھ آویزاں تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہاں تک آئی اور ونڈو گلاس سے اپنی ننھی سی ناک ٹکا کر اندر جھانکا۔ محبت کی مہک اسے دیکھ کر مسکائی اور بڑی شوخی سے آنکھ مار کر اندر آنے کی دعوت دی۔ جواباً کرن بھی مسکرا دی اور چھلانگ مار کر شیشے کے پار اتر گئی۔ پلنگ پر خوابیدہ دو نفوس میں سے ایک کے چہرے پر بڑی نرمی سے بوسہ دیا۔وہ کسمسائی اور کروٹ بدل لی۔ہار باعث تلملاہٹ ہوتی ہے سو کرن بھی تلملا اٹھی اور دور سے اپنی ہم جولیوں کو کھینچ لائی جو اس کے سارے وجود پر چھا گئیں۔

''اف! یہ صبح اتنی جلدی کیوں ہو جاتی ہے؟''

اب تلملاہٹ کا شکار وہ ہوئی تھی اور کسلمندی سے اٹھ بیٹھی تھی۔ پپوٹوں پر نیند براجمان تھی۔اس نے بال سمیٹتے ہوئے دائیں طرف سوئے اسعد کو دیکھا پھر گلاس ونڈو کو۔دوسرے ہی لمحے وہ پردے برابر کر کے دوبارہ بیڈ پر دراز ہو چکی تھی۔کرنیں دھکا دے کر باہر نکالے جانے پر منہ بسورنے لگیں پھر کوئی روزن نہ پا کر کسی اور سمت کی طرف گامزن ہو گئیں۔دوسری بار نیند میں خلل تب پڑا تھا جب مخصوص انگلیوں کے لمس نے اس کے بالوں میں ہلچل مچائی تھی۔

''پلیز سعدی! مجھے سونے دو......'' اس نے کروٹ بدلنا چاہی لیکن اسعد نے روک دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے پھر سے سونے کی۔ میں پہلے ہی آفس سے لیٹ ہو چکا ہوں اور زبیری صاحب کا دو بار فون بھی آ چکا ہے۔جلدی سے میرے لیے کافی بنا دو اور ہاں یہ ٹائی کی ناٹ بھی لگاؤ۔''

اسے ٹائی کی ناٹ لگانی نہیں آتی تھی اسی لیے پہلے یہ کام اسعد کے والد کیا کرتے تھے اور اب دیکھ۔

اسعد کی بات کا الٹا اثر ہوا تھا دیجہ کو سر تک کمبل تانتے دیکھ کر اس نے ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے گھورا پھر ایک جھٹکے سے کمبل کھینچ دیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ زبیری صاحب پھر سے فون کریں لہٰذا فوراً سے پیشتر اٹھ بیٹھو...... دیا! میں تم ہی سے کہہ رہا ہوں۔'' وہ اسے یونہی مخاطب کیا کرتا تھا۔

''اف! یہ زبیری صاحب۔'' وہ جھنجھلاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''میں ان زبیری صاحب سے بہت تنگ ہوں سعدی! آخر باس تم ہو یا وہ۔ ذرا سی دیر ہوئی نہیں اور ان کی انگلیوں میں کھجلی شروع ہوئی نہیں۔ آخر تم انہیں جاب سے فارغ کیوں نہیں کر دیتے۔ ان فیکٹ باس کو تو آفس دیر سے آنے کی اجازت ہونی ہی چاہیے۔'' اس نے موقف بیان کیا تھا، اسعد مسکراتے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے جا رکا۔

''دیکھیے مسز دیجہ اسعد! اول تو آفس دیر سے جانا میرے اصولوں میں شامل نہیں ہے سوچو ذرا جب آفس میں باس ہی دیر سے پہنچے گا تو ورکرز اس چیز کا کیا اثر لیں گے۔ دوسری بات یہ کہ زبیری صاحب پاپا کے زمانے کے ورکر ہیں۔ بہت ہی محنتی اور قابل اعتماد۔ میں ان کی عزت بھی بہت کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بیٹا کہتے ہیں لہٰذا انہیں فارغ کرنا ناممکن ہے۔ اب سیدھی طرح یہاں آ کر ناٹ لگاؤ۔''

وہ کچھ رعب سے بولا تو دیجہ منہ بسورتی اس کے قریب آن رکی۔ ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے وہ مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی جو اسعد پر واضح نہیں ہو پا رہی تھی سو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''سعدی! اب تم ٹائی کی ناٹ لگانا سیکھ لو۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے کچھ تعجب سے پوچھتے ہوئے اس کی کمر کے گرد بازو پھیلا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

''ہر روز تم یوں مجھ سے ٹائی کی ناٹ لگوانے آتے ہو جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کے پاس جا کر کہتا ہے ماما مجھے اسکول کے لیے تیار کر دو۔''

''ہاہاہا'' اس کی سنجیدگی اسعد کے قہقہے میں کھو گئی تھی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' گھورنے کا اسعد پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ ہنستا ہی چلا گیا تو وہ بھی مسکرا دی بالوں کی گرہ کھل کر کندھوں پر بکھر گئی تھی۔ اسعد کی نظریں زلفوں میں الجھ گئیں۔

''یوں کیا دیکھ رہے ہو؟'' پلکوں کی جھالر عارض پر تھرکنے لگی تھی۔

''دیکھ رہا ہوں میری بیوی غصے میں زیادہ حسین لگتی ہے یا ہنستے ہوئے......'' اس کے ہونٹ دیجہ کی پیشانی کو چھونے لگے تھے۔

''سعدی! زبیری صاحب کا فون پھر سے آ جائے گا۔'' فقرہ معنی خیز تھا۔ اسعد کنی کترا گیا۔

''سو واٹ؟ بقول تمہارے زبیری صاحب کو تو عادت ہے بار بار فون کرنے کی۔''

متبسم وشریر لہجے نے دیجہ کو جھینپنے پر مجبور کر دیا تھا جسے چھپانے کے لیے اس نے دونوں ہتھیلیاں اسعد کے سینے پر رکھ کر پیچھے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اسٹول کا سہارا لینے لگا۔

''آفس دیر سے جانا تمہارے اصولوں میں شامل نہیں ہے۔ میں ناشتا تیار کرنے جا رہی ہوں تم جلدی سے آ جاؤ۔'' مختصر لفظوں میں وہ اپنی بات سمجھا گئی تھی اور کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے اسعد کا چھت پھاڑتا قہقہہ سنا تھا۔ اس کے اپنے چہرے پر بھی اسعد کی محبت تبسم کی طرح بکھر گئی۔

کچن میں آ کر اس نے الیکٹریکل کیتل کا پلگ لگایا اور خود اسعد کا فیورٹ آملیٹ تیار کرنے لگی کیونکہ اس کے بعد اسعد نے محض ڈنر ہی کرنا تھا۔ لنچ ٹائم میں بھی وہ محض چائے، کافی پر گزارا کرتا تھا اور پھر ڈنر گھر پر ہی کیا کرتا تھا۔ جس طرح اسعد اس کی پسند وناپسند کا خیال رکھتا تھا اسی طرح دیجہ خود بھی اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بس اس کی شخصیت میں شدت پسندی کا عنصر غالب تھا اور اسی شدت پسندی کے زیر اثر وہ اسعد کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک بار اسعد کے جوتے پالش کرنے پر اس نے ملازمہ کو تھپڑ دے مارا تھا۔ صبح آفس جاتے ہوئے وہ بریف کیس خود تھماتی تھی اور کوٹ بھی خود ہی پہناتی تھی۔ اب بھی وہ اسے پورچ تک چھوڑنے آئی تھی۔

''سنو سعدی! تمہیں یاد ہے نا آج ہمیں مسز فاروق کے یہاں جانا ہے۔''

وہ پوچھ رہی تھی اسعد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک بار پھر اس کے گال پر اپنی محبت ثبت کر کے کار اسٹارٹ کر دی تھی۔ دیجہ گیٹ پر اس وقت تک کھڑی رہی جب تک روڈ پر کار کا نقطہ معدوم نہیں ہو گیا۔

+

مسز فاروق کے گھر کا لان بے حد خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سبز گھاس پر تھرکتی روشنیاں اور اس گھاس کو بیدردی سے روندتے قدم آپس میں برسر پیکار تھے۔ سفید وردیوں میں ملبوس ویٹرز ہاتھوں میں سنہری طشتریاں اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ رات کی مناسبت سے گہرے رنگوں کے ملبوسات سے سجے وجود، میک اپ کی تہیں چہروں پر چڑھائے ایک دوسرے میں مگن تھے۔ مسکراہٹیں تھیں، ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹیں تھیں، قہقہے تھے، کھلکھلاہٹیں تھیں۔ دنیا جہان کے مختلف پرفیومز کی خوشبوؤں کے حصار کو توڑتی، باربی کیوز کی اشتہا انگیز مہک سارے لان میں قبضہ جما رہی تھی۔

بیک گراؤنڈ میں بجتی مدھم ودھر موسیقی نے سارے ماحول کو رومینٹک بنا دیا تھا اور سب سے بڑھ کر چہار سو پھیلی چاندنی فضا کی خنکی کو کھینچ کر ہر وجود پر کپکپی طاری کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی جس میں اسے کسی قدر کامیابی بھی ہوئی تھی۔

اوراس سارے ماحول کاایک جزووہ بھی تھی جس کے سراپے کو نیوی بلیو کلر کی ساڑھی نے مزید دلکش بنا دیا تھا۔اس نے اپنی شہد رنگ زلفوں سے ہم رنگ آنکھیں ایک ہی سمت میں ٹکا رکھی تھیں جہاں اسعد احمد گیلانی اپنے بیش قیمت سوٹ کی پرواہ کیے بغیر گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھا تھااور رنگ برنگے ملبوسات میں ملبوس بچوں کاایک بڑاسا گروپ اس کے گرد دائرے کی صورت براجمان تھا۔محبت،شفقت اوراسی قسم کے دوسرے جذبات ایک ساتھ اس کے چہرے کا حصہ بنے ہوئے تھے......اور وہاں کچھ اور بھی تھا شاید کچھ نہ ہونے کا دکھ......اگرچہ اس کے چہرے پر رقم نہ تھا مگر جو آپ سے محبت کرتے ہیں وہ آپ کے اندر بستے ہیں۔وہ اندر کے حال سے ہر لمحہ واقف ہوتے ہیں۔آپ کچھ نہ بھی کہیں وہ پہچان جاتے ہیں۔سو وہ بھی پہچان گئی تھی۔

یہ شاید اس کی نظروں کی تپش ہی تھی جس نے اسعد کو سر اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔وہ بڑے جاندار انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے پاس آنے کی دعوت دے رہا تھا۔اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور نفی میں گردن ہلا دی تھی۔اسعد نے کندھے اچکائے اور پھر سے بچوں میں مگن ہوگیا۔وہ ریڈ اسٹونز سے بنی روش سے گزرتی اس حصے میں آ گئی جہاں سفید سنگ مرمر کا فوارہ قمقموں سے منعکس کر کے ست رنگے موتی برسا رہا تھا۔وہ کنارے پر ٹک کر موتیوں کو ہتھیلی پر جمع کرنے لگی،اسے لگا شاید کچھ ایسے ہی موتی اس کی آنکھوں میں بھی ٹکے ہیں ذرا جو موقع ملا تو باڑھ توڑ کر باہر نکل آئیں گے تبھی اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی تھی،جانی پہچانی سی آواز،مانوس سی آواز۔اس نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو واپس دھکیلا اور اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر دیکھتی پیچھے والی شخصیت اس کے سامنے آ گئی۔وہ صبا تھی اس کی بیسٹ فرینڈ جو آتے ہی اس سے لپٹ گئی تھی۔

''کیسی ہو دیجہ!قسم سے اتنا دل چاہ رہا تھا میرا تم سے ملنے کو۔اگر آج یہاں ملاقات نہ ہوتی تو میں کل تمہارے گھر آنے والی تھی۔ویسے تم مسز فاروق کے یہاں کیسے؟میں تو کل ہی بیروت سے آئی ہوں۔یو نو فاروق بھائی،ابراہیم کے بہت اچھے دوست ہیں اور......''

وہ یونہی نان اسٹاپ بولا کرتی تھی مگر اس وقت دیجہ نے ٹوک دیا۔

''خدا کے واسطے صبا!آہستہ آہستہ بات کرو......ممکن ہے میں تمہاری بات بہتر طریقے سے سمجھ سکوں۔''صبا شرمندہ ہوئے بغیر ہنس دی۔

''چلو وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔''وہ اس کا ہاتھ تھام کر کونے والی میز پر لے آئی پھر شکوہ وشکایات کی فہرستیں نکالی گئیں۔معافی تلافی ہوئی،گزرے قصے دوہرائے گئے۔اسکول سے لے کر یونیورسٹی لیول تک کے دوستوں کو یاد کیا گیا اور یوں وہ ماضی کے شبستان سے گزر کر حال کے گلستان میں داخل ہو گئے۔

''محض چار سال ہی تو ہوئے ہیں ہمیں یونیورسٹی چھوڑے اور لگتا ہے صدیاں بیت گئیں۔''صبا کی

نظریں سیاہ آسمان میں جانے کیا کھوج رہی تھیں۔

''ہاں لیکن کبھی کبھی بالکل کل کی بات ہی لگتی ہے۔''صبا تائید میں سر ہلاتے ہوئے ہنسنے لگی کوئی قصہ ذہن کی راہ گزر سے گزرا تھا۔

''اور وہ تمہارا مجنوں کہاں ہے؟''صبا نے پوچھا تو دیجہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اسعد کی بات کر رہی ہوں۔''

دیجہ نے مسکراتے ہوئے اسعد کی طرف اشارہ کر دیا صبا اس طرف دیکھنے لگی اور بولی۔

''ایک میرے میاں ہیں جنہیں ہر محفل میں لڑکیوں کے بیچ راجہ اندر بنے رہنے کا شوق ہے اور ایک یہ اسعد ہے......خیر ان بچوں میں سے تمہارا کونسا ہے؟''دیجہ خاموش رہی جس موضوع سے بچتی آئی تھی نادانستہ طور پر چھڑ گیا تھا۔

''ان میں سے کوئی بچہ میرا نہیں ہے صبا۔''اس کے لہجے کا اضطراب صبا سے مخفی ہی رہا۔

''اچھا پھر وہ کہاں ہے کیا گھر پر چھوڑ آئی ہو؟''

وہ ایک بار پھر خاموش رہی۔کیا کہے؟کس سمت میں قدم دھرے۔سچ کہہ دے یا موضوع بدل دے؟سچ کڑوا ہے اور موضوع بدلنا بے حد مشکل۔

''اے!یہ تم کہاں کھو جاتی ہو۔''صبا نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔وہ چونکی۔

''میں پوچھ رہی تھی......''

'یہ آخر کیوں جاننا چاہتی ہے؟'اس نے سوچا۔

''کوئی اور بات نہیں کر سکتیں صبا۔''وہ اکتاہٹ سے بولی تھی۔صبا نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ٹھیک ہے اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو......''

''نہیں نہیں صبا!میں تمہیں بتاتی ہوں۔کوئی بچہ نہیں ہے میرا۔خدا نے مجھے اتنی صلاحیت ہی نہیں دی کہ میں اولاد پیدا کر سکوں سمجھ رہی ہو نا تم،صبا بانجھ ہوں میں......''

وہ یک لخت ہی بھڑک اٹھی تھی۔یہ چند لفظ بولنے میں اس کی ساری قوت صرف ہوئی تھی شاید۔تبھی تھک کر سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔وہ رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں پا رہی تھی۔پتا نہیں کیوں اسے لگا تھا جیسے صبا اس راز سے واقف ہے اور جان بوجھ کر اسے کرید رہی ہے۔یقیناً دل ہی دل میں اس پر ہنس بھی رہی ہو گی۔فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔سرد ہوا کے جھونکے بھی خراماں خراماں دھرتی کا رخ کر رہے تھے اور وہ ہر احساس سے بے نیاز صرف ایک احساس کے زیر اثر تھی۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری دیجہ!میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ان فیکٹ میں تو جانتی ہی نہیں تھی......''اس کا انداز وضاحتی تھی اور وہ کرسی پر جھکی اس کے کندھے تھپک رہی تھی۔

"اُف او کے بس میں ہی irritate ہو جاتی ہوں۔" وہ بمشکل مسکرائی تھی۔

"نہیں بھئی دراصل میری باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کو غصہ دلا دیں۔ تمہیں یاد ہے نا! ابراہیم ہماری شادی سے پہلے کتنے کول مائنڈڈ ہوا کرتے تھے مگر اب......"

صبا نے اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اور ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کمال خوبصورتی سے موضوع بدل دیا تھا اور بظاہر تو وہ بھی بہل گئی تھی مگر جب احساس محرومی جاگ اٹھے تو اسے دبانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ پرانے زخم چھڑ جائیں تو انہیں بھرنے میں وقت تو لگتا ہی ہے نا۔

تارکول کی سیاہ سڑک ڈوبتے چاند کی زرد روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ دو رویہ قد آور اشجار جنات کی طرح تنے ہوئے تھے اور اپنی شاخیں پھیلائے حملہ کرنے کو بیتاب۔ اسعد نے ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر اس پر ڈالی تھی جو اپنے بالوں کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کھڑکی سے باہر نجانے کیا کھوج رہی تھی۔ اسعد نے ذرا سا جھک کر اس کے شانے سے اپنا شانہ ٹکرایا تھا وہ متوجہ ہوئی اور اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دی۔

"جب ایک بے انتہا ہینڈسم بندہ پہلو میں بیٹھا ہو تو کوئی بھی عقلمند لڑکی تمہاری طرح، اسے چھوڑ کر گاڑی سے باہر نہیں دیکھتی۔ خاص طور پر تب جب پہلو میں بیٹھا بندہ اس کا مجازی خدا بھی ہو۔"

وہ حد درجہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا لیکن آنکھوں میں شرارت ہلکورے لے رہی تھی۔ دیجہ نے اس کے ہونٹوں پر پھیلی پیاری سی مسکان کو دیکھا جو دیجہ کے لیے اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

"اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ پہلو میں بیٹھے ہینڈسم بندے کو نظر ہی لگا دی جائے۔" اپنی طرف اسے یک ٹک دیکھتا پا کر وہ شرارت سے گویا ہوا تو دیجہ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔

"کاش میں تم کو نظر لگا سکتی تو کسی اور کی نظر لگنے کا خطرہ ہی نہ ہوتا۔"

"اور وہ کسی اور کون ہے؟" وہ کسی قدر حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"مسز عباس کی نند...... سارے فنکشن میں وہ تمہیں ہی دیکھتی رہی گھور گھور کے......" اسعد کا قہقہہ بڑا زوردار تھا کیونکہ دیجہ کا زور "گھور گھور" پہ تھا۔

"یقین کرو یہ خبر مجھے تم سے ملی ہے کہ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ورنہ میں نے تو آج مسز عباس کو نہیں دیکھا ان کی نند کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔" اسعد نے دیجہ کو جمائی روکتے دیکھا تو بازو وہ پھیلا دیا۔

"یہاں آ جاؤ۔" دیجہ نے ذرا سا کھسک کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اسعد کا مضبوط ہاتھ اس کے شانے پر تھا۔

"حیرت ہے کہ تم نے مسز عباس اور ان کی نند کو نہیں دیکھا حالانکہ وہ بالکل تمہارے سامنے والی ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔"

"تم مجھ پر شک کر رہی ہو دیا؟" اسعد نے اپنے لہجے میں دل گرفتگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی

تھی۔

"بالکل نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں میرا حق کوئی غصب نہیں کر سکتا۔" اس نے شانے پر دھرا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ اس کے اس قدر پختہ یقین پر اسعد بھرپور انداز میں مسکرا دیا۔

"حقیقتاً مجھے تو آج فرصت ہی نہیں ملی کہ کسی کی نند کو دیکھوں دراصل بچوں کی مخلوق ہوتی ہی اتنی خوب صورت ہے کہ کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتی۔" نادانستہ وہ دیجہ کے دل پر ہاتھ مار بیٹھا تھا۔ ایک آہ تھی مگر بے آواز ہونٹوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

"سعدی!" اس نے ہولے سے پکارا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"دو باتیں پوچھ لو۔" وہ مگن سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

"تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں سعدی؟" وہ پوچھ رہی تھی اور لہجہ اندرونی حالت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اسعد کو ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دیجہ نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا تب اسعد نے اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے شانے پر مضبوط تر کر دی۔

"ہاں دیجہ! مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ یہی کہہ پایا۔ وہاں بچوں کے بیچ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کا یہ عمل دیجہ کو کس قدر تکلیف پہنچائے گا۔ اس کا سویا ہوا احساس کمتری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"پلیز دیا! رونا نہیں۔ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔" اب اسعد کا ہاتھ اس کے بالوں میں تھا۔

"میں رو تو نہیں رہی سعدی!"

ہاں کچھ آنسو نظر نہیں آتے وہ محض دل پر گرتے ہیں، برستے ہیں اور برستے ہی چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ اور زیادہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔

"میں تو صرف خدا سے شکوہ کر رہی تھی۔" وہ پھر بولی۔

"سب عورتوں کے قدموں تلے جنت رکھ دی ایک سوائے میرے۔ ایک کو نا مجھے بھی دے دیتا تو کیا کمی ہوتی اس کے خزانے میں۔"

"سب کچھ بھول جاؤ دیا! صرف یہ یاد رکھو کہ ایک تم ہو اور ایک میں...... اور ہمیں کسی تیسرے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بہت نرمی سے کہہ رہا تھا جبکہ وہ سوچ رہی تھی۔

"نہیں سعدی! ضرورت تو ہے۔ ایک ننھے وجود کی جو ہماری محبت کا جیتا جاگتا منہ بولتا ثبوت ہو۔"

✦

ایک بار پھر ویسی ہی صبح دھرتی پر اتری تھی۔ ویسی ہی سورج کی مست انگڑائیاں، ویسی ہی کرنوں کی اٹکھیلیاں۔ پہلے تو وہ سستی سے کمبل میں ہی بیٹھی رہی پھر سیاہ گرم شال اپنے گرد لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلاس ونڈو سے چھن چھن کر آتی سورج کی بیٹیاں اپنی کامیابی پر خوش ہو رہی تھیں۔ اس نے پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ کھڑکی کے سامنے بچھی صاف ستھری سڑک پر صبح، اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ ایستادہ تھی۔ اس نے پردے برابر کیے۔ اندر رہ جانے والی کرنیں خاموشی میں تحلیل ہو گئیں۔ اسعد جم خانہ سے آنے والا تھا۔ وہ ہاتھوں سے بال سنوارتی ٹیرس پر آ گئی۔ وہ گرل پر جھکی لان میں جھانک رہی تھی جہاں بوڑھا مالی بابا بڑی شفقت سے بیل بوٹے سیراب کر رہا تھا۔ اس کے پکارنے پر سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگا پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے پیار دیا جسے قبول کرتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

"بابا! اماں وزیراں آ گئی؟" وہ کام والی ماسی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ بابا نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ زینہ طے کر کے لاؤنج میں آ گئی، جہاں دائرے کی صورت میں پڑے بیش قیمت صوفوں کے قریب وہ بیٹھی تھی۔ اماں وزیراں کی بیٹی۔ مہر النساء۔

"اماں وزیراں نہیں آئی؟" اس نے مہر النساء سے پوچھا تھا۔

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے اس نے آج ہمیں بھیجا ہے۔" جواب مہر النساء کے ساتھ کھڑی عورت کی طرف سے آیا تھا۔

"تم؟" وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم وزیراں کی کون ہو؟"

مہر النساء نے جواب دیا۔ "یہ ہماری سب سے بڑی بہن ہے۔"

دیجہ کو ہنسی آ گئی کیونکہ اس نے سب سے بڑی پر زور دیا تھا۔

"ہاں اس کی شکل وزیراں سے بہت ملتی ہے۔" اس نے کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنے دوپٹے سے فرنیچر کی گرد صاف کرنی شروع کر دی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کی مخاطب وہ تھی اور نظریں مہر النساء پر تھیں جو ہمیشہ کی طرح سائیڈ ٹیبل کے قریب دو زانو بیٹھ گئی تھی اور گرد صاف کرتے ہوئے بہت اشتیاق سے ٹیبل پر سجے کرسٹل پیسز کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا۔

"زہرہ۔" مختصر سوالات عام طور سے مختصر جوابات کے ہی حامل ہوتے ہیں۔

مہر النساء نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بہت احتیاط سے ہر چیز کو چھو رہی تھی۔ سولہ سترہ سال کی یہ لڑکی ہمیشہ اسے اٹریکٹ کرتی تھی جس کے ہونٹ زندہ دلی سے مسکراتے تھے اور معصومیت آنکھوں میں تخت نشین تھی۔ دیجہ نے یونہی پکار لیا۔ وہ جو منہمک تھی گھبرا گئی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

"تمہیں یہ پسند ہیں؟" دیجہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا مگر اس کے باوجود مہر النساء خاموش رہی۔ چہرہ ابھی بھی گھبراہٹ کے زیر اثر تھا لیکن آنکھوں میں معصومیت اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے مہر النساء ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہیں وہ تم رکھ لو۔" اثبات تحیر میں بدل گیا۔

"سچ؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ دیجہ نے سر ہلایا تو وہ خوشی خوشی سلیکشن کرنے لگی۔ تبھی زہرہ کی سرزنش بھری آواز نے اسے ٹوک دیا۔ دیجہ کو اس کی مداخلت ناگوار گزری تھی۔

"میں تمہیں تو نہیں دے رہی زہرہ۔" اس نے کچھ نرمی سے کہا تھا۔ اس کے باوجود طنزیہ مسکراہٹ نے زہرہ کے چہرے کا احاطہ کرنے میں لمحہ ہی لیا تھا۔

"مجھے دو یا اسے بات تو ایک ہی ہے نا بی بی! اسے نہ ہی دو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی غریب کو بغیر محنت کے مل جائے تو وہ گندم کی ڈھیری کی طرح پھیل جاتا ہے اور ندیدی نظروں سے ہر چیز کو تکتا ہے پھر تم امیر لوگ ہی ہڈ حرامی کا طعنہ دیتے ہو۔"

"تم اتنا تلخ کیوں بول رہی ہو۔" دیجہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات اتنی سخت تو نہ تھی۔ اس کے باوجود زہرہ کے لفظ لفظ میں تلخی کا سیال تھا اور اب تبسم میں بھی۔

"یہ تلخ تو نہیں ہے۔ یہ سچ ہے جی اور تم امیر لوگ سچائی کو تلخی کا نام دیتے ہو۔ زندگی ہم غریبوں میں سچائی بھر دیتی ہے یعنی تلخی۔"

دیجہ اسے دیکھے گئی تھی جس کے دھنسے ہوئے پپوٹے اور گردن کے قریب جا بجا جھریوں کا جال، پکی عمر کا پہاڑہ پڑھ رہا تھا اور آنکھوں میں جہاندیدگی کسی پیشہ وارانہ عورت کی طرح ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔

"تم شادی شدہ ہو؟" سینٹرل ٹیبل سے اخبار اٹھاتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا اور مہر النساء کو مسکرا کر شہہ دی تھی۔

"ہاں اماں نے میری شادی کی تھی۔"

"تھی......؟ کیا مطلب؟"

"دو روز پہلے طلاق ہو گئی۔" زہرہ نے یوں بتایا تھا گویا اسے نہیں کسی اور کو طلاق ہوئی ہو۔ دیجہ کو جھٹکا سا لگا۔

"پھر تو تم عدت سے ہوئیں زہرہ؟"

"نہ...... مجھے کوئی غم نہیں ہے۔" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے عدت کا تعلق غم ہی سے ہو۔ اطمینان قابل دید تھا۔ دیجہ نے ایک گہرا سانس بھرا اور نظریں اخبار پر ہیڈ لائن پر ٹکا دیں۔ اسے زہرہ کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا تھا۔

"بچے کتنے ہیں تمہارے؟"

"نا بھلا بچہ ہوتا تو وہ حرامی طلاق دیتا ہی کیوں۔ بچے کے لیے ہی تو اس نے دوسری شادی کی ہے۔"
دیجہ کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"بب...... بچہ نہیں ہوا زہرہ؟" جانے وہ کیا سننا چاہ رہی تھی۔

"رب ہی جانے۔" زہرہ نے ایک طویل سرد آہ بھری۔

"میں گئی تھی ڈاکٹرنی کے پاس۔ وہ کہنے لگی جب رب کی مرضی ہوگی بچہ ہو جائے گا۔ پورے آٹھ سال تک میں ڈاکٹرنی کے پاس جاتی رہی۔ دم درود بھی کرائے۔ اس کمینے کی مار بھی کھائی۔ ساس کے طعنے الگ اور سسر کی گالیاں الگ۔ نندوں کے پیر دھو دھو کر پیئے اور تو اور دیور اور دیورانی کی بھی خدمتیں کیں۔ پر ہک ہاہ...... عورت کی قسمت ہی ایسی ہے بچہ نہ ہو تو مرد دوسری لاتا ہی ہے چاہے چھپا کر لائے یا کھلم کھلا......"

"سب مرد ایک سے تو نہیں ہوتے نا۔" اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ اس کا فقرہ تائید طلب ہے یا تردید طلب۔ بس دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

"نہ جی سب مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ مرضی کرنے پہ آئیں تو نہ عورت روک سکتی ہے اور نہ اولاد...... میں نے اب تک دو مرد دیکھے ہیں جی۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ مہر النساء شاید لان کی طرف چلی گئی تھی۔

"میرے ابے کو پتر کی زنجیر چاہیے تھی جو اس کے بڑھاپے میں اس کا سہارا بن سکے اور جب میری ماں پتر نہ پیدا کر سکی تو بڑھاپے میں میری ماں کی گود میں سات بیٹیاں ڈال کر دوسری شادی کر لی اور جب دوسری کے بھی پتر نہ ہوا تو ایک سال کے اندر اندر تیسری بیوی لے آیا۔ دونوں کو ڈالا میری ماں کے سر پر اور خود بڑی کی لت لگا بیٹھا۔ میری ماں نے تو گزارہ کر لیا تھا جی! پر ان دونوں سے نہ ہوا۔ ایک نے طلاق لے لی اور ایک بھاگ گئی۔ دوسرا مرد اکبر تھا، میرا میاں۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر اس کا مغز سڑ گیا تھا۔ خود کو ہیرو سمجھتا تھا۔ اسے بھی پتر چاہیے تھا اور میں تو بیٹی بھی نہ دے سکی۔"

دیجہ نے زہرہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور نظریں گود میں رکھے اپنے لرزتے ہاتھوں پر مرکوز کر دی تھیں۔ زہرہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی دیجہ مفہوم نہ سمجھ سکی۔

"تو کیا اسعد بھی......؟"

ذہن کے دالان میں بس ایک ہی سوال کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

"نہیں، نہیں اسعد ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے پرزور تردید کی تھی۔

"ہیں جی۔" زہرہ نے حیرانگی سے کہا تھا۔ دیجہ شاید بے اختیاری میں کچھ زیادہ ہی اونچا بول گئی تھی۔

"ہاں...... کک...... کچھ نہیں تم اپنا کام کرو۔" وہ سست روی سے چلتی واپس ٹیرس پر آ گئی۔ دھوپ کی

تمازت میں شدت آ چکی تھی جو بلاشبہ بدن کو بھلی لگ رہی تھی۔ اس کا دماغ سوال کر رہا تھا جبکہ دل انکاری تھا تب اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

"نہیں سعدی ایسا کچھ نہیں کرے گا...... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔"

نفی میں زور زور سے سر ہلاتے ہوئے نظر کا پنچھی گرل سے نظر آتی سڑک کے اوپر پھڑپھڑانے لگا۔ ہاں وہ اسعد تھا اور ایک بچہ...... دو، تین سال کا...... کچھ فاصلے پر کھڑی کار کا فرنٹ ڈور وا تھا اور اسعد مسکراتے ہوئے بچے کے سامنے دوزانو بیٹھا اس کے گھٹنے جھاڑ رہا تھا۔

دیجہ نے کھوجنا چاہا کیا تھا اس کے چہرے پر۔

حسرت...... یاس، ناامیدی، نارسائی، تڑپ، محبت یا کچھ بھی نہیں؟ وہ چیخنا چاہتی تھی اور چیخ نہیں پا رہی تھی۔ سانس تھمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زہرہ کی آواز اسے لرزا رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے گرل کو تھام لیا سرزمین ذات زلزلے سے دوچار تھی اور اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تمسخر اڑاتے قہقہے پھیل رہے تھے۔ اس نے پیشانی پر نمودار ہو جانے والی چند بوندوں کو پونچھا۔ ایک نگاہ اسعد پر ڈالی جو ابھی بھی بچے سے ہمکلام تھا۔ وہ مڑی اور مضبوط قدموں سے چلتی لاؤنج میں آ گئی۔ سامنے ہی مہر النساء بڑے سے پنجرے میں موجود آسٹریلین پیرٹس کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دائیں جانب زہرہ صوفوں کی گرد جھاڑتی جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔

"زہرہ" اس کے پکارنے پر وہ متوجہ ہوئی ساتھ ہی مہر النساء بھی۔

"میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں زہرہ...... مجھے پتا سمجھا دو۔"

وہ بہت مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے قسمت کی دھنی رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ قسمت اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ جو پتھر اپنی راہ میں رکھنے والی ہے اس سے ٹھوکر نہیں کھائے گی بلکہ اس سے پہلے ہی اسے ہٹا دے گی۔

وہ اندرون لاہور کی ایک تنگ و تاریک گلی تھی جس کے آغاز سے اختتام کا نقطہ دیکھنا بے حد مشکل تھا۔ بلیک شیراڈ نے آگے جانے سے انکار کیا تو وہ اسے ایک طرف پارک کر کے گلی میں گھس گئی۔ کھلے ہوئے گٹروں کا گندا بدبودار پانی گلی میں جا بجا پھیلا ہوا تھا جس کی بدولت اسے چلنے اور سانس لینے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ بہر حال اسے یہ رستہ طے کرنا ہی تھا کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں جو مشکلات اس کے سامنے آتیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہو سکتی تھیں۔

اس نے رک کر ایک آدمی سے اماں وزیراں کے گھر کا پتہ معلوم کرنا چاہا۔ وہ شخص یہاں موجود بیشتر لوگوں سے قدرے بہتر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں تھامے اسے بغور دیکھتا رہا پھر پرسوچ انداز میں سر اٹھا کر پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور "آئیں جی میں آپ کو لے چلتا ہوں۔" کہہ کر اس

کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دیجہ کی مجبوری اسے اس کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ بندہ بولنے کا شائق تھا یا محض اس کے سامنے بولے ہی جا رہا تھا دیجہ سمجھ نہ سکی۔ وہ تو بس کھیلتے کودتے، گند میں لتھڑے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دیکھتے ہوئے اسے سخت کراہیت ہو رہی تھی اور اس نے ناک چڑھا رکھی تھی۔ یہ شاید فرار کی ایک راہ بھی تھی کیونکہ چارپائیوں پر اور چبوتروں پر بیٹھی عورتیں اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں دیجہ کو تنگ کر رہی تھیں۔ بالآخر وہ ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ دیجہ کو تقلید کرنا پڑی۔

''آئیں جی اندر ہی آ جائیں اپنا ہی گھر ہے۔'' وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا۔ دیجہ ''اپنا ہی گھر'' پر ناک سکیڑ کر رہ گئی۔ وہ شخص کسی کو با آواز بلند آوازیں دے رہا تھا پھر ایک لڑکی آئی تو وہ شخص بولا۔

''جا منی اماں کو بلا لا۔ یہ بی بی ملنے آئی ہے اس سے۔'' وہ لڑکی چلی گئی تو وہ شخص ایک چھلنگا سی چارپائی پر میلی سی چادر بچھا کر اسے بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ دیجہ الجھن زدہ سی بیٹھ گئی تو وہ اپنا بائیوڈیٹا سمجھانے لگا۔ وہ اماں وزیراں کا داماد تھا اور دیجہ کو اس سے زیادہ جاننے کی تمنا نہ تھی۔ اس نے شکر کیا جب اماں وزیراں آ گئی کیونکہ اس کی آمد نے ''دامادنامے'' میں خلل ڈال دیا تھا۔ وزیراں اس کے سامنے بچھی جا رہی تھی۔

''میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی تھی وزیراں۔'' دیجہ نے تمہید باندھی تھی۔

+

وہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آئی تھی۔ دائیں جانب ڈرائنگ روم کے ساتھ چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر اسٹڈی کی لائیٹ ابھی بھی روشن تھی۔ وہ تخیل کی آنکھ سے اسعد کو دیکھنے لگی جو کسی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اندر جائے یا نہیں۔

اسی پل تشنگی دل کے کسی کونے میں کرلانے لگی اور نارسائی نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے نوحہ خوانی شروع کی تو اس نے دل کڑا کر کے اور حسرت کا ہاتھ جھٹک کر اسٹڈی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ صحرا خریدنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس کے لیے اسے ایک برسات تو کیا اپنے سارے ساون بھادوں وقتی طور پر رہن رکھنے تھے اور یہی بات جب اس نے اماں وزیراں سے کہی تھی تو وہ ایک لمحے کے لیے اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی اور جب بولی تو غصہ اور سختی اس کے انداز سے عیاں تھی۔

''ہم غریب ضرور ہیں بی بی! مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹیاں فروخت کرتے پھریں۔''

وہ دبی دبی آواز میں بول رہی تھی اور دیجہ کو پہلی بار اس بے ضرر سی عورت سے خوف محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے اندر بولنے کی سکت نہیں پا رہی تھی لیکن اسے یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا لہٰذا بولی۔

''میری بات کا غلط مطلب مت نکالو وزیراں! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو اور سمجھو۔ ضرورت

مند تم بھی ہو اور میں بھی۔ خدا نے مجھے ماں بننے نہیں دیا مگر ممتا کا جذبہ تو ہر عورت میں ہوتا ہے نا۔ سو مجھے سمجھنے کی کوشش کرو وزیراں! مجھے بچہ چاہیے اور تمہیں چھ بیٹیوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ زہرہ کی طلاق کے بعد تو تمہارا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہے۔'' وہ اضطراری انداز میں ہاتھ مسل رہی تھی۔ ''تم اپنی ایک بیٹی مجھے دے دو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں جیسے ہی وہ میری گود میں بچہ ڈالے گی میں اسے واپس تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔''

''اس میں بھلا ہمارا کی فیدا (فائدہ) بیٹی تو پھر ہمارے ہی در پر ہوگی۔''

''اس کی شادی کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گی۔ تم دیکھنا میں...... میں اس کی شادی بہت اچھی جگہ کروا دوں گی۔'' اس کا انداز نا چاہتے ہوئے بھی ملتجی ہو چلا تھا وزیراں کچھ لمحے خاموش رہی۔ دیجہ کو اس کے جھریوں زدہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں نظر آئی تھیں پھر دفعتاً وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں بی بی! زہرہ کا ابا نہیں مانے گا۔''

''زہرہ کے ابے نے اب تک تمہیں کیا دیا ہے۔ سوائے سات بیٹیوں کے جو بیٹے کی چاہ میں دوسری اور پھر تیسری شادی کر سکتا ہے اسے بیٹیوں کی کیا پرواہ۔ جو خود کما نہیں سکتا وہ انکار کیسے اور کیونکر کرے گا۔'' وہ ایک لمحے کو وزیراں کے تاثرات جاننے کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔

''اس کے علاوہ؟''

''اس کے علاوہ میں تمہیں دو لاکھ روپے دوں گی تم ایک تو کیا دو لڑکیوں کی شادی بھی آرام سے کر سکو گی۔''

وزیراں کی حیرت سے کھلی آنکھیں خوشی سے کچھ اور کھل گئیں۔ دولت کی چمک عزت، غیرت معاشرہ، ہر احساس پر حاوی ہو چکی تھی۔

''لیکن کونسی بیٹی؟'' اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر اس نے اپنی تمام بیٹیاں گویا ایک قطار میں دیجہ کے سامنے پیش کر دی تھیں۔

''مہرو...... مہر النساء۔'' دیجہ نے بڑے آرام سے پانچویں بیٹی کا نام لے دیا تھا وہ قائل کرنے کا طریقہ جانتی تھی اور یوں بھی قسمت کی گیند فی الحال اسی کے کورٹ میں تھی۔

+

کھٹکے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اندر آنے والی دیجہ ہے۔ اس کی پیاری سی بیوی جس سے وہ محبت نہیں عشق کرتا ہے۔ بڑے جاندار انداز میں مسکراتے ہوئے کہنی چیئر کی بیک پر ٹکا کر ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا تھا۔ دیجہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس تک آئی تھی اور اس کا ہاتھ

تھام کر سامنے آ گئی تھی۔ کمر کو تھوڑا سا خم دے کر ٹیبل کے ساتھ ٹکتے ہوئے بولی۔

''اتنا کام مت کیا کرو سعدی...... تھک جاؤ گے۔'' اس نے اسعد کے گلاسز اتار کر میز پر رکھ دیے تھے۔ محبتوں سے گُھلا لہجہ جس میں فکر کا عنصر غالب تھا اسعد کے اندر تک طمانیت اتار گیا۔

''ٹھیک ہے اب نہیں کروں گا اور تھکوں گا بھی نہیں۔'' چیئر کی بیک سے پشت ٹکاتے ہوئے وہ بڑی فرصت سے اسے تکنے لگا تھا۔

''اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟'' یہ غالباً دل کا چور تھا تبھی اسے اسعد کی محبت لٹاتی نگاہیں خود کو کھوجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو تم مجھ سے کہنا چاہتی ہو۔'' وہ واقعی کھوج رہا تھا اور دیجہ کو یقین تھا کہ اسعد اس کی بے چینی بھانپ لے گا۔ وہ ایسا ہی تھا باہر رہتے ہوئے بھی اندر سے واقف۔ دیجہ نے بس پلکیں جھکا لیں۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے سعدی۔'' وہ لفظ چننے کے مراحل طے کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں لفظ فقروں میں ڈھل ہی نہیں رہے تھے۔ اسعد کچھ ثانیے اسے تکتا رہا پھر کرسی کے ہینڈلز پر دونوں ہتھیلیوں سے دباؤ ڈال کر اٹھنا چاہا۔

''ٹھیک ہے پھر سو جاتے ہیں۔''

''نہیں سعدی۔'' بے اختیار دیجہ نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے تھے وہ بیٹھ گیا۔

''ایک بات ہے...... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں سعدی۔''

استفہام نگاہوں کا پہرہ دار تھا گویا کہہ رہا ہو ''اب کہہ بھی چکو۔'' دیجہ اس کے قدموں میں کسی داسی کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر سعدی کے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔

''سعدی تم میری ایک بات مانو گے؟''

''اس سے قبل تمہاری وہ کونسی بات ہے جو میں نے نہ مانی ہو یا ٹال دی ہو؟'' اسعد کا ہاتھ اس کے بالوں میں تھا۔

''نہیں تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری بات ضرور مانو گے۔'' اس نے ایک دم سر پر رکھا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بات ضرور مانوں گا۔''

''تم...... سعدی تم شادی کر لو۔''

اسعد کے ہاتھ کی گرفت یک لخت کمزور پڑ گئی تھی۔ دوسرے پل وہ دیجہ کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے لگتا ہے دیجہ! تم نیند میں ہو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔'' اس نے حکم دیا تھا سخت لہجے میں۔ دیجہ کو وحشت سی ہوئی، اپنے دل کی دھڑکنوں سے۔ اسعد ریک کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ گئی۔

''نہیں سعدی! میں نیند میں قطعاً نہیں ہوں بلکہ میں پورے ہوش و حواس میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں۔''

''مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے دیجہ!'' وہ دھاڑا تھا۔ دیجہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور ریک سے جا لگی۔

''تم کیا سمجھتی ہو میں تمہاری اجازت کا منتظر ہوں کہ ادھر تم اشارہ کرو اور میں شادی کرنے چل دوں...... نہیں دیجہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی کرنی ہوتی تو میں تب ہی کر لیتا جب ڈاکٹر نے تمہارے بانجھ پن کی خبر دی تھی۔'' اسعد ایک بار پھر رخ موڑ گیا تو وہ پھر سامنے آ گئی۔

''پلیز سعدی...... پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ می...... میں خود تمہاری شادی کرواؤں گی۔''

اسعد نے اسے بازو سے پکڑ کر دھکا دینے والے انداز میں ہٹایا تھا۔ وہ لڑکھڑا گئی تب تک اسعد دھڑ سے دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ دیجہ کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے پیچھے جائے یا نہیں۔ اسعد کا رویہ اس کی توقع کے عین مطابق تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ اسے معلوم تھا اسعد مان جائے گا۔ اسے ماننا ہی پڑے گا۔ شاید گھنٹہ بھر وہ اسٹڈی میں بیٹھی رہی پھر بیڈ روم میں آ گئی جہاں اسعد کروٹ لیے سو رہا تھا یا محض پوز کر رہا تھا۔ وہ بیڈ کے کونے پر ٹک کر سونے کی سعی کرنے لگی۔

جانے کب اس کی آنکھ لگی تھی اور پھر کھل بھی گئی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں ساڑھے سات پر ٹکی تھیں۔ انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے اس نے دیجہ کو دیکھا جو دوسری طرف رخ کیے سو رہی تھی۔

''میرا سکون برباد کر کے کس سکون سے سو رہی ہے بیوقوف۔'' غصے کے بادل چھٹنے لگے اور تاسف کی ہوا اٹھلانے لگی۔ کہنی کا سہارا لے کر وہ اس کی طرف جھکا اور بڑی نرمی سے چہرے پر بکھرے مشک بار بال سمیٹنے لگا۔ وہ ابھی بھی بے خبر تھی۔ اسعد کے ہونٹ اس کی کنپٹی کو چھو آئے۔ اسعد نے دیجہ کا ہاتھ تھام لیا جو تکیے پر چہرے کے قریب پڑا تھا وہ انگوٹھے سے ہتھیلی پر سجے بتاشے کو محسوس کر رہا تھا جو کچھ روز قبل مہندی سے اس نے اپنے ہاتھ پر سجایا تھا۔ ہونٹوں نے ہتھیلی تک کا سفر نہایت اطمینان سے طے کیا تھا۔

دیجہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیرت سے خود پر جھکے اسعد کو تک رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور اذیت ناک رت جگے کا خمار روحوں میں حلول ہو گیا۔

''تم میری ذات کی تکمیل ہو دیا! میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے میرا امتحان مت لو۔'' روح کی سچائیاں لہجے میں سمٹ آئی تھیں۔ ہونٹوں نے ایک بار پھر ہتھیلی کو چھوا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دیجہ

نے کروٹ لی اور ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکا دیں۔

"کیسی عجیب محبت ہے نا تمہاری۔ ایک چھوٹے سے امتحان سے گھبرا گئی۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اسعد نے اسے تاسف سے دیکھا۔

"امتحان چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ بس امتحان ہوتا ہے۔" وہ باہر نکل گیا تھا۔

اب وہ دونوں اپنے اپنے انداز میں ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسعد نے سوچا احتجاجاً ناشتا نہیں کرے گا۔ دوسری طرف دیجہ بیگم نے ناشتے کے نام پر کافی بھی تیار نہ کی تھی۔ اسعد کو افسوس نے گھیر لیا۔ یہی لڑکی اس کے کھانے پینے کا کس قدر دھیان رکھتی تھی اور آج...... محض آج وہ اسے آفس سے واپسی پر پورچ میں بھی لینے نہ آئی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اگرچہ کھانا چنا ہوا تھا مگر وہ خود موجود نہ تھی۔ اس نے غصے سے ٹیبل کو دیکھا، بازو پر پڑا کوٹ اور بریف کیس صوفے پر اچھالا اور راستے میں آئے کارنر ٹیبل کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔ کھٹکے کی آواز اور پھر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز نے دیجہ کو بیڈ روم سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کارنر ٹیبل پر رکھا کرسٹل کا نفیس سا گلدان اور شیشہ دیوار سے ٹکرانے کی بنا پر چکنا چور ہو چکے تھے۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی کر رہی تھیں۔

"پتا نہیں اس نے کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں؟"

اس رات وہ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ہی واپس آیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائیٹس نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اسعد بڑی اجنبیت سے اس کے قریب سے گزر کر اندر جا چکا تھا۔ وہ وہیں کھڑی خود سے الجھتی رہی۔ پھر اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ واش روم کی لائیٹ آن تھی اور پانی گرنے کی واضح آواز اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ اسعد سے بات کرنا چاہتی تھی تبھی بیڈ پر لیٹ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری جانب وہ شاید قصداً دیر لگا رہا تھا۔ ذہنی تکان دیجہ کے سارے وجود کا گھیراؤ کیے ہوئے تھی۔ نیند کی وادی میں اترنے میں اسے پل ہی لگے حالانکہ آنکھ کی یہ بیوفائی اسے سخت ناگوار گزری تھی۔

اسعد نے چپ سادھ رکھی تھی جو ہفتوں پر محیط ہو چکی تھی۔ وہ نہ دیجہ کو مخاطب کرتا تھا اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب دیتا تھا۔ دیجہ کو اس سے اتنے سخت ردعمل کی توقع قطعاً نہ تھی اسعد کا رویہ اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔ اس کی ناراضی کی مدت کبھی بھی اتنی طویل نہ ہوئی تھی۔ وہ رات کو بہت دیر سے آنے لگا تھا دیجہ کے لیے دن تو کٹھن تھے ہی سردی کی طویل راتیں کچھ اور طویل ہو گئیں۔ حد تو تب ہوئی جب گھڑی کی سوئیاں دو اور تین کا فگر بھی کراس کرنے لگیں۔

+

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے تکے گئی تھی اور جب ضبط کا یارا نہ رہا تو اس کے کشادہ سینے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میرے ساتھ یوں مت کرو اسعد! میں مر جاؤں گی مگر تمہاری بے اعتنائی کے ساتھ زندہ رہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ پلیز میرے ساتھ یوں مت کرو۔"

وہ ٹوٹی پھوٹی سی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور اسعد کی نگاہیں اس کے ریشمی بالوں پر تھیں۔ کیسی دیوانگی تھی جو اسے اس حال تک لے آئی تھی۔ اسعد نے اس کے گرد اپنا حصار کھینچ کر گویا اسے تحفظ کا احساس دیا تھا۔ دیجہ کے آنسو ہمیشہ اسے تکلیف دیتے تھے اب بھی ایسا ہی ہوا۔ دیجہ اس بات سے بخوبی واقف تھی۔ اس لمحے وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔ اسعد کا ملال بڑھنے لگا۔ اسے تنگ کر کے وہ خود بھی کہاں پر سکون رہ سکا تھا۔ کتنی ہی راتیں سڑکیں ناپتے، بستر کے کانٹے چنتے گزری تھیں۔ اس نے دیجہ کے گرد اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر لی پھر بہت دھیمی اور نرم آواز میں بولا۔

"اور جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو کیا وہ درست ہے دیا؟" اس کی آواز و انداز میں چاہت کی شدتیں تھیں۔ دیجہ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"میں کچھ غلط تو نہیں کر رہی سعدی۔ کیا اپنی ممتا کو تسکین پہنچانے کا انتظام کرنا غلط ہے؟"

"دیا! یتیم خانے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے بچوں سے جو ممتا کے پیاسے ہیں ہم کوئی بچہ ایڈاپٹ بھی تو کر سکتے ہیں۔" وہ اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیجہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

"مجھے ایڈاپٹڈ چائلڈ نہیں چاہیے۔ بچہ ایڈاپٹ ہی کرنا ہوتا تو میں تبھی کر لیتی جب ڈاکٹر نے مجھے بانجھ قرار دیا تھا۔" کسی گزری بات کا حوالہ زبان کی نوک پر پھسلا تھا۔

"لیکن میں کسی معجزے کی منتظر تھی اسعد! لوگ کہتے ہیں معجزے اسی دنیا میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ میں بھی انتظار کرتی رہی کہ شاید خدا کو مجھ پر ترس آ جائے اور وہ میری گود بھر دے لیکن معجزہ نہیں ہوا۔ مجھ پر آ کر تمام معجزے ختم ہو گئے۔ میں نے سنا تھا دعائیں تقدیریں بدل دیا کرتی ہیں لیکن میری تو دعائیں بھی تہی داماں ہی رہیں۔" وہ روئے جا رہی تھی برسات کا ورود یک لخت ہوا تھا۔

"میں کیا کروں سعدی! میں اپنے من کو نہیں مار سکتی۔ گود لیا ہوا بچہ ممتا کی پیاس تو بجھا سکتا ہے لیکن دل کی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ یوں بھی کسی کے گناہ کو میں اپنی اولاد نہیں کہہ سکتی۔" ہاتھ کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے وہ دوٹوک لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے تم سے اس قدر اوپری سوچ کی توقع نہیں تھی دیا!" دکھ نے اس کی آواز کو دھیما کر دیا تھا۔

"یہ اوپری سوچ نہیں ہے۔ یہ میری محبت ہے جو مجھے سکون نہیں لینے دیتی۔ میں...... میں تمہارے

بچوں سے کھیلنا چاہتی ہوں سعدی! جس کی رگوں میں تمہارا خون ہو کسی اور کا نہیں۔ میں چاہتی ہوں جب وہ میری بانہوں میں ہو تو اس سے تمہاری مہک آئے۔ اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کی ناک اور گال سب...... سب کچھ تمہارا پرتو ہو۔ میں جب اسے دیکھوں تو مجھے تم نظر آؤ کوئی اور نہیں۔" دیجہ کی آنکھوں میں اب آنسو نہ تھے بلکہ عجیب سی چمک تھی۔ اسعد خاموش رہا۔ اب کہنے کے لیے اس کے لفظوں کی صندوقچی خالی ہو گئی تھی۔ کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔ وہ یونہی اسے تکتے گیا پھر جیسے تھک کر صوفہ کم بیڈ پر گر گیا۔

"تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟" دیجہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر قدموں میں بیٹھ کر اول تا آخر ساری بات گوش گزار کر دی۔ اسعد ابھی بھی خاموش تھا لیکن لبوں پر طنزیہ مسکان تھی۔

"گویا ایک نہیں دو دو زندگیوں کا سودا کیا ہے تم نے۔" انداز خود کلامی کا سا تھا پھر اسے مخاطب کر کے بولا۔

"ویسے تم نے سوچا ہے! اگر مہر النساء بھی ماں نہ بن سکی تو کیا تم تیسری شادی کرنے کے لیے کہو گی مجھے؟" پین انگلیوں کے بیچ گھماتے ہوئے وہ یقیناً طنز کر رہا تھا۔

دیجہ کی نگاہوں میں سراسیمگی سمٹ آئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس نے اس نہج پر بالکل نہیں سوچا تھا۔

"مجھے ڈراؤ مت سعدی! اور ہم اندھیرے پہلو ہی کیوں دیکھیں، روشن پہلو بھی تو ہیں۔" اس کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا تیز ہوا کے خوف سے کانپتے پتے جیسا۔ اسعد کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے دیجہ! میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" خوف، بے یقینی میں بدل گیا پھر خوشی میں۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نا سعدی؟"

"سو فیصد لیکن اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار محض تم ہو گی دیجہ...... تم اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہی ہو بعد میں تکلیف ہو تو مجھ سے شکایت مت کرنا۔"

وہ سنجیدہ تھا اور آنے والے دنوں کی تباہ کاریوں کا حوالہ دے کر اسے ڈرانا چاہتا تھا۔ دیجہ خوش تھی جس کے آگے اسعد کی تنبیہ دب کر رہ گئی تھی۔

✦

وہ مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا نہ جانے کیوں؟

اور رات کے اس پہر جب کہ سارا عالم کمبلوں میں دبکا ہوا تھا وہ گرل پر کہنیاں ٹکائے دیو قامت درختوں کے پیچھے سر ابھارتے زرد چاند کو تک رہا تھا۔ یہ کوئی مناسب وقت تو نہ تھا چاند کو تکنے کا اور وہ کچھ ایسا رومینٹک مائنڈڈ بھی نہ تھا کہ چاند کو تکنے سے کوئی دلی آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ بس دیجہ کو چاند پسند تھا اور وہ

دیجہ کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ سو اس کے ساتھ کھنچتا ہوا آتا اور دودھیا روشنی میں بیٹھ جاتا۔ ایسے میں دیجہ اس چاند کو تکا کرتی جس کا ایک عالم دیوانہ تھا اور وہ اس کا ہاتھ تھامے اس چاند کو تکتا جس کا وہ دیوانہ تھا۔ ہوا کے رتھ پر سوار ہو کر مخصوص خوشبو اس تک پہنچی تھی۔ نرم قدموں کی ہلکی سی دھمک جو اس کے لیے کسی مدھر دھن سے کم نہ تھی۔ زرد چاندنی میں ایک اور چاندنی۔

اس کی چوڑی پشت پر نظریں ٹکائے وہ کوئی مناسب لفظ ڈھونڈ رہی تھی جو اس کے کیے کا مداوا کر دیں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ مداوا اور ازالہ تو بے معنی ہو چکے تھے۔ اس کے نزدیک جو کچھ ہوا اسے کم و بیش یونہی ہونا تھا آج نہ ہوتا تو کل ہو جاتا لیکن تب اس سب میں اس کی رضا شامل نہ ہوتی اور اس کے مجازی خدا کا کوئی بھی قدم اس کے لیے باعث آزار ہو سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے...... لیکن مجھے لفظ کیوں نہیں مل رہے؟ یہ شرمندگی کیسی ہے؟ میں وہ کیوں نہیں کہہ پا رہی جو کہنا چاہتی ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے کی طرف بڑھایا پھر انگلیاں بھینچ کر واپس کھینچ لیا۔ فی الوقت وہ اپنا کوئی بھی احساس اس کے دامن سے باندھنا نہیں چاہتی تھی۔ جن کی چاہ آپ کے دل کے قریب رہتی ہے۔ جن کی طلب کے پھول دل کے گلستان میں کھلا کرتے ہیں۔ جو آپ کے سنگ سانس کی طرح رہتے ہیں جب انہی لوگوں سے کلام کرنے کے لیے آپ کو لفظ کھوجنے پڑیں۔ ڈکشنریاں کھنگالنے کی ضرورت پڑنے لگے تو یہ دوریوں کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے جس کے اختتام پر فصیلیں تن جاتی ہیں شاید...... شاید دیوار چین سے بھی زیادہ مضبوط اور بلند و بالا۔ اسے اپنے اور اسعد کے درمیان کوئی قلزم موجزن نظر آیا تھا جس کی وسعتوں کو ناپنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر پکار لیا۔ پتا نہیں اس نے سنا تھا یا نہیں۔ رخ ہنوز انڈے کی زردی جیسے چاند کی طرف تھا۔

دیجہ کی دوسری پکار پر وہ دھیرے سے مڑا اور نظریں اس پر جما دیں۔ سرد و سپاٹ نظریں جن میں وارفتگی تھی نہ ہی شگفتگی، نہ شرارت اور نہ بے تابی...... آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی تھی۔

"اسعد! وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔" اس کی بے تاثر نگاہوں نے اس پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔ نجانے یہ اطلاع تھی، سرزنش یا پیغام۔ اسعد کے دل میں برچھی سی اتر گئی۔ وہ اسے جھنجھوڑنا چاہتا تھا اور جھنجھوڑ نہیں پا رہا تھا۔ اسے لفظوں کی مار مارنا چاہ رہا تھا مگر مار نہیں پا رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا اٹھو بیوقوف لڑکی وہ جو اس وقت میرا انتظار کر رہی ہے اور جس کے انتظار کی خبر تم مجھے دینے آئی ہو۔ وہ تمہارا شوہر تقسیم کرنے آئی ہے جب میں اس کے قریب رہوں گا۔ اس کا ہاتھ تھاموں گا تو کیا تم پرسکون رہ سکو گی۔ جب تمہارے بجائے میرے دم سے اس کا بیڈ روم آباد رہے گا تو کیا تم سو سکو گی۔

"چلو اسعد! ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ مہر بیچاری تھک جائے گی۔"

''اور میری تھکاوٹ......اسے کون سمیٹے گا۔'' لفظ پھر سے بے معنی ہو گئے دیجہ نے اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے اور اسعد کو آج پہلی بار اپنا یوں اس کے ساتھ کھنچے جانا برا لگ رہا تھا۔

''اف بیچاری سو گئی۔'' اسعد نے دیکھا محترمہ بیچاری عجیب و غریب انداز میں محو استراحت تھی۔

''تم اسے جگا لو گے یا میں......؟'' وہ پوچھ رہی تھی پھر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی جگانے لگی۔ وہ کسمسائی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے حیرت مترشح تھی۔

''مہر النساء......اسعد۔'' دیجہ نے غالباً اسے مطلع کیا تھا۔ مہر النساء نے اسے دیکھا تھا اور گڑبڑا کر پیچھے کھسک جانے والے دوپٹے کو کھینچ کر چہرہ چھپا لیا تھا۔ وہ مہر النساء کو دیکھ رہا تھا۔ دیجہ اسے دیکھ رہی تھی پھر وہ سائیڈ ٹیبل پر جھکی پھر مڑ کر اس کی طرف آ گئی۔ قلزم کی پرجوش لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔

''یہ مہر النساء......کی رونمائی اسے دے دینا۔'' سبز رنگ کا مخملیں کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دیجہ نے سرگوشی کی تھی۔ آواز اتنی ہی تھی کہ وہ سن سکے۔

''معاہدے اس قسم کی چیزوں کے محتاج نہیں ہوتے دیجہ!'' بہت نارمل انداز میں کہی گئی بات میں شعلوں کی سی لپک تھی جن کی تپش اپنی روح کے قریب اس نے محسوس کی تھی۔

''وہ خوش ہو جائے گی اسعد۔'' اسعد ہنس دیا۔ عجیب طنزیہ ہنسی تھی۔

''دلی وابستگی نہ ہونے کے باوجود میں اسے خوشی دوں گا لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔''

''کیس تھامتے ہوئے وہ دروازے کے آگے سے ہٹ گیا تھا گویا اسے جانے کا حکم دیا تھا۔ دیجہ نے ہونٹ کا کونا چباتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ سب کچھ اس کی منشاء کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اسعد کو کہیں دور لے جائے جہاں مہر النساء کا وجود نہ ہو۔ اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی اس نے اور تیزی سے مڑی تھی۔ بند دروازہ منہ چڑا رہا تھا۔ دھڑکنوں کا ارتعاش بڑھ گیا تھا اور لہروں کا شور کانوں سے قریب تر آ گیا تھا۔ دل نے خواہش کی کہ دروازہ زور زور سے پیٹ ڈالے اور جب دروازہ کھلے تو اسعد کا ہاتھ تھام کر دوڑ لگا دے لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اسعد نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ آب قلزم اب اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹی پھر مڑی اور بھاگتی ہوئی زینہ طے کر گئی۔

خاموشی بیڈ روم کے کسی کونے سے نکل کر سارے میں بکھر گئی۔ اس سمیت، کمرہ بھی ادھورا، نامکمل سا لگ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی کھڑکی کے قریب رکھی ایزی چیئر تک آ گئی جس کی بیک پر اسعد کی ٹائی پڑی تھی۔ اس نے ٹائی اٹھا کر گال سے لگائی پھر اسے بازوؤں میں بھینچ کر کرسی پر ڈھے گئی۔ ایک درد تھا جو دل کی دیواروں سے سر ٹکرا کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے بازو پر رکھی ٹائی ہونٹوں سے لگائی۔ سارے کمرے میں اور کمرے کی ایک ایک شے میں اس کی مہک تھی مگر وہ نہ تھا۔ درد آنسوؤں کی صورت بڑی فرصت سے اس

کی کنپٹی پر لکیریں چھوڑنے لگا اور ہر نئی لکیر کے ساتھ ماضی کا ایک ایک ورق پلٹتا جانے لگا۔

جب اسعد اس سے پہلی بار ملا تھا وہ ایم بی اے کے فائنل میں تھا اور دیجہ نے بی اے فائن آرٹس میں ایڈمیشن لیا تھا۔ بہت ہی اتفاقیہ ملاقات تھی ان کی جو صدیوں پر محیط ہو گئی تھی اور جب وہ دلہن بن کر اس گھر میں اتری تھی کسی ملکہ کی طرح کسی فاتح حسینہ کی طرح جس نے اسعد جیسے اسٹون کو فتح کیا تھا اور اس روز اسعد کس قدر خوش تھا۔

''مجھے لگتا ہے آج میری تکمیل ہو گئی ہے۔'' اس کا حنائی ہاتھ تھام کر اسعد نے کہا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

''میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں دیجہ!'' آنے والے دنوں میں یہ فقرہ اس نے کئی بار سنا تھا اپنی تمام تر شدتوں اور سچائیوں کے ساتھ۔

اور جب اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''میں اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہوں دیجہ! بہن بھائیوں کی شرارتوں، محبتوں سے ناواقف، میرے گھر میں ہمیشہ خاموشی کا راج رہا ہے اور میں نے جب بھی اس بادشاہت کو ختم کرنا چاہا تو وہ مجھ پر ہنس دی کیونکہ میری آواز میں اتنا زور نہ تھا۔ میں چاہتا ہوں ہمارے گھر میں شور ہو۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں، ننھی منی ہنسی۔'' وہ آنکھیں موند کر اس منظر میں کھو گیا تھا جو اس کے ذہن کی تخلیق تھا۔

''دیجہ ہمارے کم سے کم بارہ بچے تو ضرور ہوں گے، ہے نا؟'' دیجہ اس کی شرارت سمجھ نہ سکی تھی سو گھبرا گئی۔

''بارہ بچے......اف نہیں سعدی! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں انہیں سنبھالوں گی کیسے؟''

''یار آدھے تم سنبھال لینا باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''میں تو پھر بھی سنبھال نہیں پاؤں گی......دو تین کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''تین تو بہت ہی کم ہیں۔ چھ تو ضرور ہونے چاہئیں۔'' وہ بحث کے موڈ میں تھا۔ دیجہ اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔

''نہیں تین بچے ہی کافی ہیں۔''

''چھ۔''

''تین۔'' دیجہ روتے روتے ہنس دی وہ لمحہ یاد کر کے۔

اور جب ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا۔

''آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔''

پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ کر سر پر دے مارنے کا مطلب اسے حقیقتاً تب سمجھ آیا تھا۔

چار سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اسعد کی محبت ہنوز قائم تھی۔ اس نے بانجھ پن کو بنیاد بنا کر کبھی دیجہ کی تذلیل نہ کی تھی۔ کسی دوسری عورت کی طرف نہ دیکھا تھا۔ کہا تھا تو فقط اتنا۔

"دیجہ! میرے لیے صرف تم اہم ہو اور کوئی نہیں۔"

وہ اپنا کہا پورا کر رہا تھا لیکن کسی بچے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں احساس محرومی کے جو نقوش ابھرتے تھے وہ دیجہ کے احساس کمتری کو دوچند کر دیتے تھے۔ ان تلخ احساسات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اسے ایک یہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا۔ اس طرح اسعد کی خواہش پوری ہو جاتی۔ دیجہ کی ممتا کو مرکز مل جاتا اور ان کے رشتے کو بھی ٹھیس نہ پہنچتی۔ لیکن اس پل وہ خود کو کانٹوں کی زد میں پا رہی تھی۔ وہ اٹھی اور وارڈروب کھول کر ایک ایک لباس کو دیکھنے لگی۔ لیکن دل کا سکون لباس سے تو ممکن نہیں ورنہ تخیل کی آنکھ کیا کم تھی وہ ہاتھ سے گال رگڑتی کھڑکی میں آن رکی۔ بھاری پردہ ہٹایا پھر گلاس ڈور بھی۔ تیز ہوا میں رقص کرتی نمی اس کے چہرے سے ٹکرائی اور بالوں سے الجھنے لگی۔ چڑیوں کی چہکار میں صبح کا مژدہ تھا۔ صبح اپنی زلفیں سمیٹتی بیدار ہو رہی تھی۔ اندھیرے کے پردے کو پھاڑتی روشنی میں اس نے سامنے بچھی سڑک کو دیکھا جہاں دو ہیولے ہاتھ میں ہاتھ دیئے فکر دوراں سے آزاد نظر آ رہے تھے۔ ایک ہیولہ اس کا اور ایک اسعد کا۔ نجانے کیوں اسے لگا اسعد اس سے چھن چکا ہے۔

"اسعد صرف میرا ہے کسی اور کا نہیں...... ہاں وہ کسی اور کا نہیں ہے۔" وہ روتے ہوئے بڑے زور سے چیخی۔ ہیولے گھبرا کر روشن صبح میں محو ہو گئے۔

✦

پورچ کی سیڑھیوں میں مہر النساء کو بیٹھا دیکھ کر وہ حیران ہوئی پھر اس کے قریب چلی آئی۔

"مہرو...... یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" اور مہرو بیگم ہمیشہ کی طرح گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی ہونق سی شکل دیکھ کر دیجہ کو ہنسی آ گئی۔ یہ لڑکی اپنی معصومیت کے باعث ہمیشہ سے اس کی توجہ کا مرکز رہی تھی اور یہ توجہ اسی کی کرم نوازی تھی کہ وہ اس کے گھر میں موجود تھی۔

"گھبراؤ نہیں مہرو! چلو اندر چلتے ہیں یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔" وہ اسے لیے کچن میں آ گئی۔ الیکٹرک کیٹل آن کر کے وہ ڈائننگ ٹیبل کی چیئر گھسیٹ کر مہر النساء کے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔

"اب بتاؤ اس وقت باہر کیا کر رہی تھیں؟" مہرو نے جواب نہیں دیا۔ جھکا سر میز کی سطح سے ٹکنے کے درپے تھا۔

"دیکھو مہرو مجھ سے بالکل بھی مت گھبراؤ۔ اگر تم اسی طرح ڈرتی، گھبراتی رہیں تو بہت مسئلہ ہو جائے گا اور میں ابھی سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ ابھی کچھ عرصہ یہیں رہنا ہے۔"

دیجہ نے کم لفظوں میں اسے ساری بات سمجھا دی لیکن وہ ازلی بیوقوف "جی" کہہ کر اس کی شکل دیکھنے لگی تو وہ بھی جواباً جی کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

"تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اسے حیران سا چھوڑ کر بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ خالی تھا۔ وہ حیران ہوتی واپس کچن میں آ گئی۔

"مجھے کیا پتا...... میں باہر آئی تو وہ گاڑی میں بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں تو انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا بلی کی طرح...... پھر میں ڈر کر اندر آ گئی۔" گردن جھکا کر گویا جرم کا اعتراف کیا گیا۔ اس کے لہجے کی شرمندگی کو دیجہ نے نظر انداز کر دیا تھا یا محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ بس مضطرب سی ہو گئی تھی۔ مہرو کہہ رہی تھی۔

"بی بی! آپ ان سے کہہ دیں وہ مجھے یوں نہ گھورا کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"آ...... اچھا کیا رات کو بھی ڈر لگا تھا؟" مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

"رات کو...... رات کو کب؟"

"رات کو جب میں نے تمہیں جگایا تھا۔" شیلف سے ٹیک لگائے کافی کا مگ منہ سے لگائے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔ اسے مہرو کے اس قدر بھول پن پر غصہ آ رہا تھا۔

"نہیں تب تو ڈر نہیں لگا تھا۔" مہرو کے جواب میں دیجہ نے ایک گہری سانس با آواز بلند ہوا کے سپرد کی تھی۔

"سنو مہرو! رات اسعد نے تم سے کچھ کہا تھا؟" مہرو نے لاپرواہی سے سر ہلا دیا پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

"انہوں نے کہا تھا تم سو جاؤ۔" دیجہ کو بہت زور سے کھانسی آئی تھی۔ کافی کہیں گلے میں ہی اٹک گئی تھی مہرو جلدی سے اس کے لیے پانی لے آئی۔

"کیا اسعد نے تم سے سونے کے لیے کہا تھا؟" وہ بے یقینی سے تصدیق چاہ رہی تھی۔ مہرو نے زور زور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور اسعد...... کیا وہ بھی سو گیا تھا؟"

"پتا نہیں مجھے سونے کا کہہ کر وہ باہر نکل گئے تھے...... بی بی! اماں کب آئے گی۔" مہرو نے پوچھا تھا کسی گہری سوچ میں ہلکورے لیتے ہوئے دیجہ کو اس کے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہ تھی۔

✦

بیگ کی زپ بند کر کے اس نے اپنے سامان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ٹکٹ اٹھا

کر پرس میں اڑس لیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں ہلکا سا برش پھیرا اور ہونٹوں پر نیچرل کلر کی لپ اسٹک کا کوٹ کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔

اسعد ابھی کچھ دیر قبل آفس سے لوٹا تھا اور اب ڈرائنگ روم میں چھری کانٹے سے جنگ کر رہا تھا۔ وہ کچھ لمحے دروازے میں ایستادہ رہی پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی۔ ان کی شادی کے بعد شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اسعد تنہا ڈنر کر رہا تھا۔ مہرو اپنے کمرے میں تھی۔

''اسعد۔'' کرسی کی پشت پر ہتھیلیاں جما کر اس نے بہت ہولے سے اسے پکارا اور سر اٹھانے پر بولی۔

''میں کراچی جا رہی ہوں کچھ دنوں کے لیے۔ ایکچوئلی ماما کا فون آیا تھا وہ مجھے بہت مس کر رہی ہیں...... یونو...... پاپا کی ڈیتھ کے بعد تو وہ بالکل...... ہی تنہا رہ گئی ہیں۔'' وہ اسعد کی نظروں سے خود کو چھلتا ہوا محسوس کر رہی تھی جن میں جھوٹ پکڑ لینے کی واضح تحریر رقم تھی۔

''واپس کب آؤ گی۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''جب ماما آنے دیں گی۔''

''او کے ٹیک کیئر آف یور سیلف اور آنٹی کو میرا اسلام کہنا۔'' وہ پھر سے پلیٹ پر جھک گیا۔

''اسعد تم مجھے ایئرپورٹ تک چھوڑ آؤ۔'' وہ منتظر ہی رہی۔ اس کے خیال میں یہی فقرہ کچھ رد و بدل کے ساتھ اسعد کو کہنا چاہیے تھا لیکن اسعد کی دلچسپی دیجہ کی نسبت پلیٹ کی طرف زیادہ تھی۔

''آئی ایم سوری دیجہ! آج میں بہت تھک چکا ہوں تم پلیز ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔''

دیجہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ وہ ناراض تھا اور کس قدر بے اعتنائی برت رہا تھا۔ دیجہ نے اپنا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اپنا خیال رکھنا سعدی۔'' اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر وہ باہر نکل گئی تھی اور کراچی پہنچنے سے پہلے اس نے اپنی سارے آنسو بہا دیئے تھے۔ جہاں ماما اپنی بانہیں وا کیے اسے پناہ دینے کے لیے تیار تھیں۔

✦

ساحل کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی وہ سمندر کی آتی جاتی شوریدہ سر لہروں کو دیکھ رہی تھی جو پتھروں کے قریب ڈھیر سارا جھاگ چھوڑ کر واپس پلٹ جاتی تھیں۔ اسعد کا ہاتھ تھامے اسی ساحل پر انہی لہروں میں اس نے بارہا اپنے پیر بھگوئے تھے۔ ریگ ساحل پر نقوش وفا رقم کئے تھے۔ گھروندے بنائے تھے۔ سیپیاں چنی تھیں۔ وفا کے ان گنت وعدے، یقین کے، شبنم کی مانند ہوا کے سپرد کیے تھے۔ وہ گیلی ریت پر قدم دھرنے لگی شاید کوئی وعدہ، کوئی لہر، کوئی گھروندہ گزرے دنوں کی نشانی بن کر سامنے آ

جائے۔ لیکن وہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔

اس نے جھک کر پانی کو مٹھی میں قید کرنا چاہا اور ناکام ہو کر گھر لوٹ آئی۔ کاریڈور میں ماما نے اسے فون ریسیو کرنے کے لیے کہا تھا۔ دعائیں شاید یونہی مستجاب ہوا کرتی ہیں دوسری طرف سے آتی اسعد کی آواز نے اندر کی لگی آگ پر چھینٹے ڈال دیے تھے۔

''کیسی ہو دیا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔''

''اور...... میرے بارے میں نہیں پوچھو گی کہ کیسا ہوں۔ کس حال میں ہوں۔''

دیجہ کچھ نہیں بولی تھی۔ جب خاموشی دل کا حال کہہ دے تو لفظوں کی حاجت نہیں رہتی۔ اسعد کے لہجے کا سوز اسے اپنے اندر بھی محسوس ہوا تھا۔

''پلیز دیا! واپس آ جاؤ میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔''

''میں بھی تمہیں بہت مس کر رہی ہوں سعدی! مگر واپس نہیں آ سکتی...... مما واپس آنے نہیں دے رہیں۔'' ایک بار پھر اس نے جھوٹ کا دامن تھام کر اسعد کو خاموش کروا دیا تھا۔ حالانکہ اسعد کی بیتابی اسے مسرت سے نواز رہی تھی پھر جب فون بند کر کے وہ اندر آئی تو ماما چائے تیار کر چکی تھیں۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگیں۔

''کیا کہہ رہا تھا اسعد؟''

''واپس بلا رہا ہے۔'' وہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔

''ہاں دیجہ! میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی اب تم واپس چلی جاؤ۔ میری بات کو غلط مت سمجھنا جانو اور یوں بھی تین ہفتے ہو چکے ہیں تم کو کراچی میں، اسعد تنہا ہے اسے تمہاری ضرورت ہو گی ویسے بھی بیٹا مرد کو کبھی اتنا عرصہ تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے وہ بہک جاتا ہے۔'' ماما اسے سمجھا رہی تھیں مگر وہ جھنجھلا گئی۔

''پلیز ماما! اسعد ایسا بالکل بھی نہیں ہے اور ویسے بھی مہرو ہے تو اس کے پاس۔''

بے دھیانی میں وہ مہرو کا نام لے گئی تھی حالانکہ سارے جہان کی طرح وہ ماما سے بھی یہ بات چھپانا چاہتی تھی۔

''مہرو...... مہرو کون؟''

''اماں وزیراں کی بیٹی۔''

''اماں وزیراں کی بیٹی۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں پھر ایک دم حیران ہوئیں۔

''لیکن وہ اسعد کے پاس کیا کر رہی ہے؟''

''ایک بیوی اپنے شوہر کے پاس کیا کرتی ہے ماما؟'' وہ الٹا ان سے پوچھ رہی تھی۔ دانستہ اطمینان کا

دامن تھامے اس نے سب سچ بتا دینے کی ٹھانی تھی۔

''بب...... بیوی...... تو کیا اسعد نے دوسری شادی کر لی ہے؟''

''نہیں ماما! بلکہ میں نے اس کی شادی کروادی ہے۔''

''کیا......'' وہ گنگ سی رہ گئی تھیں، اس کی بات سن کر۔ انہیں اپنی بیٹی کی عقل پر شک ہو رہا تھا۔

''اوہ میرے خدایا! یہ تم کیا کر آئی ہو بے وقوف لڑکی!'' انہوں نے چند ثانیے توقف کیا۔

''اور...... اور پھر نوکرانی کی بیٹی...... تم نے غلطی کر دی ہے دیجہ بہت بڑی غلطی...... یہ بی کلاس لوگ تو یوں بھی بہت چالاک ہوتے ہیں۔'' وہ کچھ اور اسے ملامت کرنا چاہتی تھیں لیکن دیجہ نے مہلت ہی نہ دی۔

''فار گاڈ سیک ماما! خاموش ہو جایئے۔ میں...... میں پہلے ہی بہت ڈپریسڈ ہوں۔'' اکتاہٹ سے کہتے ہوئے وہ اپنے بیڈروم کی طرف آ گئی۔

+

بہت تاریک صحرا ہو گیا ہے
ہوا کا شور گہرا ہو گیا ہے
کسی کے لمس کا یہ معجزہ ہے
بدن سارا سنہرہ ہو گیا ہے

وہ جس خاموشی سے گئی تھی اسی خاموشی کا دامن تھامے واپس بھی آ گئی تھی اور مہرالنساء کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ششدر سی رہ گئی تھی۔ سیاہ رنگ کے سادہ سے سوٹ میں چنا ہوا سرخ دوپٹہ بے نیازی سے کندھوں پر ڈالے وہ ''وہ'' والی مہرو تو قطعاً نہیں لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بندے اور گلے میں نازک سا چین، کلائیوں میں خوبصورت جڑاؤ کنگن، پہنے وہ بڑی خوشدلی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ بدلے ہوئے لب و لہجے کے ساتھ آنکھوں کی معصومیت میں چمک آ گئی تھی۔ چہرے پر خوش حالی تھرکتی پھر رہی تھی۔ کسی کے لمس کا جادو واقعی چل چکا تھا۔ دیجہ نے خود کو ہواؤں کی زد میں محسوس کیا۔ دل میں بال سا آ گیا۔ ملال بڑھ گیا تھا۔

''کیا میں کچھ کھونے والی ہوں؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

لیکن اسعد جس بیقراری سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کا سارا ملال آپوں آپ ہی ڈھل گیا۔

''دیجہ آج ہم باہر ڈنر کریں گے۔'' وہ یقیناً حکم دے رہا تھا۔ دیجہ نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ وارڈ روب کھول کر کچھ لمحے وہ کچھ کھوجتا رہا پھر سیاہ رنگ کی ساڑھی اس کی طرف بڑھا دی یہ اس کا فیورٹ کلر تھا۔

''تم یہ پہن لو۔'' دیجہ نے اس کے ہاتھ سے ساڑھی لے لی۔ شاور اس نے کچھ دیر قبل لیا تھا لہٰذا چینج کر کے اس نے لائیٹ سا میک اپ کیا اور اسٹیپس میں کٹے ہوئے بالوں کو یونہی کھلا چھوڑ دیا۔ اچانک قد آدم آئینے میں مہرو کا عکس ابھر آیا تھا جس کی سیاہ چوٹی کمر سے نیچے تک جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں برش پکڑے اپنے بالوں کو بھول کر اس کے بالوں کو تکنے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' اسعد کی آواز نے اسے چونکایا تھا۔ وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔

''ہوں...... ہاں...... کچھ بھی تو نہیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم نے مجھے کتنا یاد کیا؟'' وہ اس کے ہاتھ سے برش لے کر اس کے بالوں میں چلانے لگا۔ آنکھوں میں محبت کی جوت جلائے پوچھ رہا تھا۔

''بہت...... بے حد زیادہ۔'' وہ پوری سچائی سے کہہ رہی تھی۔ اسعد مسکرا دیا پھر کچھ یاد آنے پر ڈریسنگ ٹیبل کے نچلے دراز سے ایک گفٹ پیک نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''دس از فار یو۔'' وہ ایک ٹانگ کے سہارے ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ گیا، یوں کہ کمر میں خم آ گیا۔ اس لمحے وہ بھی سیاہ شلوار سوٹ میں تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''خود ہی دیکھ لو۔'' دیجہ نے باکس کھولا آنکھوں کو خیرہ کرتا ڈائمنڈ نیکلس تھا۔

''یہ بہت خوب صورت ہے سعدی!'' وہ اسے دیکھے گئی۔

''بالکل میری زندگی کی طرح۔'' بہت ہولے سے شہادت کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے اسعد نے کہا تھا اور اس کے ہاتھ سے نیکلس لے کر اس کے پیچھے آن رکا۔

''اب چلیں۔'' نیکلس کا لاک بند کر کے اس نے پوچھا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اسعد کے بازو میں ہاتھ ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ انہیں لاؤنج سے گزر کر پورچ تک جانا تھا اور لاؤنج میں مہرالنساء بڑی دلچسپی سے کوئی مووی دیکھ رہی تھی۔ دیجہ چلتے چلتے رک گئی۔

''سعدی! میرے ایئر رنگز کمرے میں ہی رہ گئے ہیں تم چلو میں پہن کر آتی ہوں۔''

''او کے جلدی آنا۔'' دیجہ نے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر اس کی طرف آ گئی آج دیجہ کے پکارنے پر مہرالنساء ہمیشہ کی طرح اچھلی نہیں تھی۔

''اٹھ کر کپڑے بدل لو مہرو۔'' بنا کسی تمہید کے اس نے کہا تھا۔

''لیکن......'' مہرو نے کچھ کہنا چاہا دیجہ نے ٹوک دیا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔'' اس نے ہر لفظ پر زور دیا تھا۔

''میں اور اسعد ڈنر کے لیے باہر جا رہے ہیں تم چینج کر کے سو جانا۔'' وہ اسے اپنی حیثیت کا تعین

کرواتی، احساس تفاخر سے گردن تانے باہر آ گئی جہاں اسعد اس کا منتظر تھا۔

+

"اس مہنگائی نے تو کمر ہی توڑ دی ہے۔ ادھ کلو چاول لینے جاؤ تو بس روپے ایویں مک جاتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے نا بی بی، ست (سات) جی ہوں گھر میں تو آدھ سیر چاولوں میں بھلا کیا بنتا ہے۔" اماں وزیراں بڑے دکھ بھرے انداز میں اپنی داستان حمزہ بیان کر رہی تھی۔ دیجہ اس کا مطلب بخوبی سمجھتی تھی تبھی اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے پرس کھولتے دیکھ کر وزیراں کا راگ کچھ اور تیز ہو گیا۔

"لو وزیراں! یہ کچھ روپے رکھ لو۔" دیجہ نے اس کی طرف نوٹ بڑھائے تھے جنہیں تھامتے ہوئے وزیراں نے دعاؤں کے ڈونگرے برسانے شروع کر دیے تھے۔ پھر دیجہ بولی۔

"سنو وزیراں! میں چاہتی ہوں کہ تم مہرو کو کسی اچھی ڈاکٹر کو دکھاؤ آں...... تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔"

"ہاں ہاں بی بی! تم فکر ہی نہ کرو۔ اب کے مہرو کو میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں نا تو ضرور کسی اچھی ڈاکٹرنی کو دکھاؤں گی۔" وزیراں نے جلدی سے کہا تھا۔

"یہ کچھ اور پیسے رکھ لو۔ داتا دربار جاؤ تو میری طرف سے چادر چڑھا دینا۔" تبھی مہرو اپنا بیگ لیے چلی آئی۔

+

لہو لہو ہے آرزو
کبھی گماں، کبھی یقین
قدم کہیں، نظر کہیں
جب ہوش میں بھی رہیں
بے خودی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے

وہ انگلیوں پر حساب لگانے بیٹھی تو پتا چلا دس ماہ گزر گئے۔ وہ تحیر زدہ سی رہ گئی۔ آخر یہ دن گئے کہاں؟ حالانکہ اسے تو پل پل صدیوں پر محیط لگتا تھا۔ اسعد، مہرو کے ساتھ ہوتا تو وہ جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکر لگاتی رہتی اور جب اس کے ساتھ ہوتا۔ بے چینی و اضطراب تب بھی دامن گیر رہتے۔ آنکھیں

ہر وقت بوجھل رہنے لگی تھیں۔ سیاہ دائرے بڑھتے جا رہے تھے۔

وہ کچھ عرصہ پہلے والی دیجہ اسعد گیلانی تو قطعاً نہ رہی تھی جو بے انتہا نفاست پسند تھی۔ جسے لباس پر پڑی شکنیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ جسے بال بکھارے رکھنا پسند نہ تھا۔ جو پرفیومز اور جیولری کی شیدائی تھی۔ ہر لمحہ فارغ رہنے کے باوجود وہ ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہ دے پائی تھی۔ ذہن ان دونوں کی طرف سے ہٹتا تو کہیں اور جاتا۔ نیند بھی روٹھ گئی اور جب خود سے جنگ کرتے کرتے تھک جاتی تو نیند کی کئی کئی گولیاں پھانک لیتی اور جس خبر کی وہ منتظر تھی۔ جس کے لیے ہجر کا دامن تھامے ہوئے تھی وہ خبر مل ہی نہیں رہی تھی تب وہ اماں وزیراں کے سر ہو گئی۔

"آخر تم کیا کرتی پھر رہی ہو وزیراں! آخر کیوں نہیں لے کر جاتیں مہرو کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس...... کیوں دیر ہو رہی ہے اتنی......" مارے غیض کے اسے اپنی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔ وہ یوں وزیراں پر برس رہی تھی گویا وزیراں "دیر" ہونے کی ذمہ دار ہو۔

"میں اسے لے گئی تھی بی بی...... مگر" وزیراں منمنائی۔

"یہ کارڈ رکھو اپنے پاس۔" اس نے وزیٹنگ کارڈ وزیراں کی گود میں پھینک دیا۔

"اس پتے پر چلی جانا یہ میری سہیلی کا پرائیویٹ کلینک ہے۔ تم مہرو کو یہاں لے جاؤ۔ میں نے اسے فون کر دیا ہے۔" وہ بے ربط سا بول رہی تھی۔

"اور ہاں ڈاکٹر زبیرہ کو صرف یہ بتانا کہ مہرو تمہاری بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔" اس کا زور تمہاری پر تھا اور وزیراں سمجھدار تو تھی ہی۔

عجیب سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ مندی مندی آنکھوں سے وہ چھت کو گھورتی رہی جو کبھی قریب آ رہی تھی تو کبھی دور جا رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو چکر سر پر آ لگا وہ تکلیف سے مٹھیاں بھینچ گئی۔ چار بلو لینے کے باوجود نیند آنکھوں کے کونوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ غنودگی کی ہلکی سی دھند چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑی مشقت سے اٹھی۔ گول گول گھومتے سر کو سنبھالتی وہ نیچے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ دفعتاً ایک آواز ہوا کے دوش پر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

"مہر...... مہر" وہ پکار رہا تھا۔

"مہر؟ یہ کون ہے؟ اوہ...... تو...... تو وہ اب مہر ہو گئی ہے۔"

نفرت کا شدید ترین احساس رگوں میں اترنے لگا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتی کچن تک آئی تھی۔

"یہ کیا ہے مہر؟"

"روٹی۔" مہرو کی من من اسے سنائی دی تھی۔ جواباً ہر طرف خاموشی چھا گئی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز میں تبسم کی رمق تھی۔

"مجھے تو آسٹریا کا نقشہ لگ رہا ہے۔" شریر سا انداز تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے دیجہ نے ان کے دھندلے وجود کو جنا چاہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انگلیوں میں جیسے لوہے کی سلاخیں آن ٹھہری تھیں۔ دیوار کو تھامنا چاہا تو ہاتھ پھسلتا چلا گیا۔ ٹانگوں نے بوجھ سہارنے سے انکار کیا تو وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ وہ خود کو خلا میں ہچکولے کھاتی محسوس کر رہی تھی۔ اسعد کو پکارنا چاہا تو آواز کہیں اندر ہی اٹک گئی۔ اٹھتی گرتی پلکوں تلے سیاہ دائرے بننے لگے۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کب اس نے ٹھنڈے فرش پر سر رکھا اور دنیا و مافیہا سے بیگانی ہو گئی۔

اسعد بہت تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کرنا چاہا تو ایسا لگا ہاتھ استری کو چھو گیا۔ برف جیسے فرش پر بے سدھ پڑی وہ بے طرح گرم ہو رہی تھی۔ اسعد نے مضطرب و بے چین سا ہو کر اسے بانہوں کا سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"چلو دیجہ اندر چلتے ہیں۔" پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے اس نے اپنی آواز کی گرفت مضبوط کر دی تھی اور وہ شاید آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود ہوش میں نہ تھی تبھی اسے بے انتہا اجنبیت سے دیکھتی رہی تھی۔

"دیا! آر یو آل رائیٹ۔"

ہاں تب۔ فقط تب ہی اس کے لبوں پر مسکان جاگی تھی۔ عجیب سی مسکان نشے کے سمندر میں ہلکورے لیتا تبسم۔ اسعد کی نگاہوں میں "اپنی زندگی" کے لیے ترحم سمٹ آیا لیکن تب تک محترمہ زندگی عجب بے خودی کے عالم میں اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر ایک بار پھر کھو چکی تھیں۔ اس نے پوری گردن موڑ کر پیچھے کھڑی مہرالنساء کو دیکھا جو اس کے ساتھ ڈنر کرنے کی خواہش مند تھی۔ نظریں ملنے پر وہ اعتماد سے اسے دیکھتی رہی تھی کسی بھی ناگواری کے بغیر۔

"آپ انہیں بیڈ روم میں لے جائیں یہ یقیناً سونا چاہتی ہیں۔"

اسعد نے بہت متشکرانہ نگاہوں سے اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا جو عمر کی بہت سی سیڑھیاں عبور نہ کرنے کے باوجود شعور کے لاتعداد زینے پھلانگ چکی تھی۔

"شکریہ...... بہت شکریہ مہرالنساء۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ مہرالنساء مسکرا کر برتن سمیٹنے لگی اور وہ دیجہ کو لیے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے دیجہ کو بہت احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا وہ اسے دیکھتا رہا جو کچھ ہی عرصے میں صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ گندمی رنگت میں بے انتہا زردیاں گھل گئی تھیں۔ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اسے ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مڑتے ہوئے اس نے ایک قدم بھی نہ بڑھایا تھا کہ ہاتھ نازک سی گرفت میں آ گیا۔ دیجہ کئی رت جگوں کا خمار آنکھوں میں لیے اسے تک رہی تھی۔

"آج یہیں رک جاؤ اسعد...... پلیز...... یہیں میرے پاس رک جاؤ۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ایسی التجا جو غیروں سے کی جاتی ہے۔ ایسا دھڑکتا ہوا انداز جس میں گزارش کے رد کیے جانے کا خطرہ ہو۔ اسعد اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

"میں تمہارے ہی پاس ہوں دیا۔ بس لائیٹ آف کرنے جا رہا تھا۔"

"نہیں آج لائیٹ آن ہی رہنے دو۔ آج ہم بہت ساری باتیں کریں گے...... بہت ڈھیر ساری۔"

"ہاں بالکل ٹھیک۔" اسعد بہت بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔ دیجہ نے اس کا ہاتھ تھام کر سینے سے لگا لیا تھا اور سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا تھا۔ گویا بھاگ جانے کے راستے مسدود کیے تھے اور اس کے گھٹنے پر سر رکھے وہ ایک سے دوسرا فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائی تھی۔ اسعد کی انگلیوں کی نرماہٹ اسے نیند کے سمندر میں دھکا دے گئی تھی۔

+

یہ جو ریگ دشت فراق ہے یہ رکے اگر
یہ رکے اگر تو نشاں ملے یہ نشاں ملے
کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے
یہ گڑی ہوئی ہے کہاں کہاں
میرے آسماں سے کدھر گئی
تیرے التفات کی کہکشاں
میرے بے خبر، میرے بے نشاں
یہ رکے اگر تو پتہ چلے
میں تھا کس نگر، تو رہا کہاں
کہ زمان و مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
وہ میرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پر برس گئیں

اپنے نصیب کی بارشوں کو اپنی چھت تک محدود کرنے کے لیے اس نے جو سعی کی تھی وہ بلاشبہ رائیگاں جا رہی تھی اور حسد و جلن کی بیلیں، دل کے گلستان میں اپنی جڑیں مضبوط تر کرتی جا رہی تھیں۔

مہرو سے بات کرنا تو در کنار کبھی کبھی اس کی صورت دیکھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ اول تو وہ اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی پھر جب ملکیت کا احساس غالب ہونے لگتا تو شان سے باہر آ جاتی۔ مہرو کو مخاطب کرنے کی کوشش کرتی تو ہوں ہاں کر کے خاموش ہو جاتی یا کسی کام میں الجھ کر دانستہ مصروف ہو جاتی یا ظاہر کرتی۔

بہت غیر محسوس انداز میں مہرو کے سامنے اسعد پر اپنا حق جتاتے ہوئے اسے مزہ آنے لگا تھا۔ مہرو کے چہرے پر پھیلتے تاثرات اس کے اندر تک تسکین کی کرنیں اتار دیتے۔ اسے ویسا ہی سکون ملتا جیسا برسوں سے پیاسی زمین کو رم جھم برستی بارش پہنچاتی ہے۔ سخت گرمی میں بھی شہر دل کے چوراہے میں برف باری ہونے لگتی۔ مہرو اس کی رقیب بنتی جا رہی تھی اور اس رقیب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جس مقصد کے لیے اسے لایا گیا تھا وہ پورا ہو جائے اور جس کے آثار اسے فی الحال دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے تبھی ایک بار پھر اس نے اماں وزیراں کو بلا بھیجا کیونکہ مہرو کے متعلق چیک اپ کی ذمہ داری اسی پر تھی۔ وہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی کیونکہ اس راز سے چند لوگ ہی واقف تھے۔ اور پتا نہیں کیوں؟ اماں وزیراں آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی تبھی اچانک مہرو کی بہن چلی آئی۔ زہرہ سے چھوٹی، ہو بہو مہر النساء کی فوٹو کاپی۔ وہ مہرو سے ملنے آئی تھی جو واش روم میں تھی۔ دیجہ بلا ارادہ ہی اس سے باتیں کرنے لگی۔

"نام کیا ہے؟"

"شبانہ۔"

"کونسے شہر سے آئی ہو۔"

"گوجرانوالہ۔"

"میاں کیا کرتا ہے تمہارا؟"

"پتا نہیں۔"

"ایں...... کیا مطلب؟"

"چار ماہ پہلے جب میں لاہور آئی تھی تو ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اب خدا جانے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا تم چار مہینوں سے اپنے گھر نہیں گئیں۔" اس کی دلچسپی یونہی بڑھ گئی تھی۔ شبانہ کچھ لمحے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور بولی۔

"طلاق دے دی اس نے مجھے، چار مہینے پہلے۔"

"اوہ...... کیوں دی اس نے تمہیں طلاق؟" دیجہ نے شبانہ کی جھکی پلکوں تلے ہلکورے لیتا دکھ دیکھا تھا مگر محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ تو خود سے الجھی ہوئی تھی "آخر کیا چکر تھا پہلے زہرہ اور اب شبانہ؟"

سوال سن کر شبانہ اداسی سے ہنسی تھی۔

"ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ تو دینا ہی تھا بس میں اسے اولاد نہ دے سکی تو اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

"کیا تم بھی زہرہ کی طرح...... میرا مطلب ہے۔" وہ سمجھ نہیں سکی کہ کس طرح سے اپنی بات اسے سمجھائے۔ پھر اس نے شبانہ کو دیکھا جو اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ دیجہ الجھ گئی۔ انسے رہ رہ کر مہرو کا خیال آ رہا تھا۔

"میں نے اماں سے کہا تھا میری شادی کسی بچوں والے سے کر دے مگر وہ نہیں مانی، خالہ کے بیٹے سے کر دی میری شادی۔ اب جی آپ خود بتاؤ مرد بچے کے لیے ہی تو شادی کرتا ہے نا اور مجھے پتا تھا کہ میرے بچے نہیں ہوں گے میری کوکھ بھی خالی رہے گی۔"

"یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟" دیجہ نے تیزی سے پوچھا تھا۔

"پتا تھا جی سب پتا تھا۔ میری ماں کو میرے دادے کی بددعا لگی تھی جی۔ میری ماں نے اس کے ہاتھ سے روٹی چھینی تھی پھر وہ مر گیا۔ پر جاتے جاتے جھولی پھیلا کر میری ماں کو بددعا دے گیا تبھی اللہ نے اماں کو بیٹا نہیں دیا اور اب ماں کا کرنا ہم بہنیں بھگت رہی ہیں۔"

"یہ سب ڈھکوسلے ہیں شبانہ! دعائیں اور بددعائیں کسی کی قسمت بنا یا بگاڑ نہیں سکتیں۔"

"نہ جی یوں نہ کہیں دعائیں اور بددعائیں تو وہ کام کرتی ہیں جو بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میں نہیں مانتی اس فلسفے کو۔ بہرحال تم بیٹھو مہرو آتی ہی ہوگی۔" وہ اٹھی اور لان میں آ گئی۔ اس نہج پر سوچتے ہوئے یک لخت اس کے ذہن میں گھنٹی سی بجی۔ بجی اور بجتی چلی گئی۔ وہ بددعاؤں کی کارستانی سے منحرف تھی مگر نجانے کیوں دل میں ایک شک سا سر ابھارنے لگا۔

+

مہرو کا مکمل چیک اپ کروانے کے تین دن بعد وہ ڈاکٹر کے روبرو تھی۔ ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ سے انداز میں رپورٹس کا جائزہ لیا پھر سامنے ٹیبل پر رکھ کر پشت بیک سے ٹکا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی رولنگ چیئر کے ساتھ ساتھ دیجہ کی دھڑکنیں رول کر رہی تھیں۔ خطرے کا احساس کہیں اندر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بے تابی نے اسے ہاتھ مسلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ایکسکیوزمی ڈاکٹر آپ...... آپ مجھے بتا کیوں نہیں رہیں؟ آخر کیا پرابلم ہے مہر النساء کے ساتھ کیوں اتنی دیر ہو رہی ہے؟"

"خیر دیر تو ایک اور ہی پہلو ہے اس چیز کا...... خدا کی مصلحت ہم انسان نہیں جان سکتے۔ کچھ کاموں

میں وہ دیر کرتا ہی ہے۔یوں بھی اکثر کپلز کے یہاں تو شادی کے دس دس سال بعد بھی اولاد نہیں ہوتی۔کوئی بھی مسئلہ نہ ہونے کے باوجود۔مہرالنساء کی شادی کو تو محض دس ماہ ہوئے ہیں۔'' دیجہ بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''بہرحال مہرالنساء کے کیس میں اس کی اپنی مرضی کا بھی عمل دخل ہے۔''

''پلیز ڈاکٹر! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی......پلیز آپ مجھے وضاحت سے بتائیے۔'' اس نے بے چینی سے کہا تھا۔ڈاکٹر نے ذرا سا آگے جھک کر کہنیاں میز پر ٹکائیں اور ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

''یوں ہے مسز گیلانی! کہ مہرالنساء کی رپورٹس کے مطابق وہ وقفے کے لیے باقاعدہ میڈیسن لیتی رہی ہے۔''

''واٹ؟'' دیجہ ہونق سی شکل لیے ڈاکٹر کو تکے گئی جو ایک کے بعد ایک بم بلاسٹ کر رہی تھی۔

''جی ہاں! آپ کہہ رہی ہیں کہ مہرالنساء جلد اولاد کی خواہش مند ہے لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ذرا خود سوچیے اگر وہ جلد ہی بے بی پیدا کرنا چاہتی ہے تو اتنا ریگولرلی میڈیسنز کیوں استعمال کر رہی ہے۔ان فیکٹ تقریباً تین مہینے پیشتر اس کا ابارشن بھی ہو چکا ہے۔اب آپ خود زیادہ عقلمند ہیں سمجھ سکتی ہیں کہ اتنا بڑا کام عورت کی مرضی کے بغیر تو نہیں ہو سکتا نا۔''

دیجہ نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

''اوہ میرے خدایا! آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ کونسی گتھی ہے جو سلجھنے میں ہی نہیں آ رہی؟''

''مہرو اس قدر چالاک نکلے گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔میں نے اس کی معصومیت سے متاثر ہو کر اس کا انتخاب کیا تھا اور......وہ...... معصومیت کے پردے میں کس قدر خباثت لیے ہوئے ہے؟ کیا......کیا اسعد کو مجھ سے چھیننے کی کوئی سازش......کوئی طریقہ؟''

اگر دو راستوں پر آپ بیک وقت گامزن ہوں تو لاشعوری طور پر ایک سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔سامنے سے آتا ٹرک اسے تب نظر آ رہا تھا جب وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

✦

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔آنکھوں میں ایک سیلاب تھا جو پلکوں کی باڑھ کود کر گود میں رکھے ہاتھوں کو نم کر رہا تھا۔اس نے پلکوں کی بوجھل جھالر سی اٹھائی اور فوراً ہی جھکا لی۔عین سامنے والے صوفے کی پشت پر دونوں ہتھیلیوں سے بوجھ ڈالے دیجہ کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ایک ٹانگ کو اضطراری انداز میں حرکت دیتے ہوئے وہ جواب طلب نظروں سے اسے تک رہی تھی۔انداز میں پھاڑ کھانے والا عنصر غالب تھا۔مہرالنساء

سوکھے پپڑی جیسے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور بولی۔
نے بڑی مشقت سے گلے میں اٹکا گولا نگلا،
''میں نے اماں کو روکا تھا مگر وہ نہیں مانی۔اس نے کہا تھا تیرے بعد مجھے دو بیٹیاں اور بیاہنی ہیں اور
ب تک ان کی شادی نہیں ہو جاتی تو نے بچہ پیدا نہیں کرنا۔'' اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی تھی
سکیاں کسی صورت تھمنے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔دوسری طرف دیجہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ واقعی اس لڑکی کو
اڑ کھائے۔

''ہاں تم تو دودھ پیتی بچی ہو نا۔ماں نے کہہ دیا اور تم نے مان لیا۔کل کو وہ کنویں میں چھلانگ لگانے کو
ہے گی تو وہ بھی کر لینا۔'' وہ دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اس پر برس رہی تھی۔

''بیوقوف لڑکی! تمہیں اندازہ ہے کس قدر بڑا نقصان کر چکی ہو تم۔مجھے نہیں تو کم سے کم اسعد کو ہی بتا
یا ہوتا۔صحیح کہا تھا زہرہ نے۔تم غریبوں کو بغیر محنت کے مل جائے اور وہ بھی حیثیت سے بڑھ کر تو تم پھیل
جاتے ہو۔تمہارے علاج کے نام پر کتنا کچھ بٹور چکی ہے تمہاری ماں اور تم اس میں برابر کی شریک رہی ہو۔
ہرالنساء بیگم......میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں اور تمہاری ماں کو اسی وقت شوٹ کر دوں؟''

''دیجہ۔'' اسعد کی نسبتاً کرخت آواز نے اسے مزید کچھ بولنے سے روک دیا تھا۔اس نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

''پلیز دیجہ! جسٹ لیو دس ٹاپک۔مہرو تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' اور مہرو تو جیسے اشارے کے انتظار
یں تھی۔دیجہ نے مٹھیاں بھینچ کر اسے جاتے دیکھا۔اس کا تنفس بہت تیز ہو رہا تھا اور دھڑکن تیز تر۔

''کیوں بھیجا ہے تم نے اسے اندر؟'' دیجہ کا لہجہ و انداز ویسا ہی تھا۔درشت، غصیلا، پرطیش اسعد اس کے برعکس نرمی سے بولا۔

''تم پہلے ہی اسے کافی ڈانٹ چکی ہو دیجہ! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا نا۔اب چیخنے چلانے سے کیا ہوگا؟
یوں بھی وہ اتنی قصوروار نہیں ہے۔تم کیوں اس بے چاری کا خون خشک کر رہی ہو؟''

''بے چاری......تو اب وہ تمہیں بیچاری لگنے لگی ہے۔'' اس کی پوری بات سے اپنے مطلب کا لفظ چننے میں اسے لمحہ ہی لگا تھا۔اسعد نے کچھ بے یقینی سے اسے دیکھا۔وہ بالکل جاہل عورتوں کی طرح طعنے دے رہی تھی۔وہ بھی بھڑک اٹھا۔

''ٹو ہیل ود یو۔'' اس نے ٹیبل پر پڑی گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھایا اور بغیر اس کی طرف دیکھے تیزی سے باہر نکل گیا۔

دیجہ نے اسے باہر جاتے دیکھا اور کمرے میں پڑی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنی شروع کر دیں۔ذرا سی دیر میں کمرے کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔غبار پھیلتا جا رہا تھا۔

کتنے ہی لمحے خاموشی سے سرک گئے تھے جب اس نے دروازے پر دستک سنی۔بیڈ پر اوندھے منہ

لیٹے، اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ دستک تیز ہوئی پھر کچھ اور تیز۔ اس نے سسک کر تکیہ سر پر رکھ
وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ دروازہ ایک تواتر سے بجنے لگا۔ ساتھ ساتھ اسعد کی آواز ابھری۔

"دیجہ دروازہ کھولو۔" پہلے اس کی آواز سپاٹ تھی کسی بھی تاثر سے عاری پھر سختی سمٹ آئی۔

"دیجہ دروازہ کھولو۔" کمرے میں وحشت بڑھنے لگی۔ دل کا غبار دماغ تک رسائی حاصل کر گیا
وارڈ روب کے نچلے حصے سے ایک بڑا سا بیگ نکال لائی اور اس میں اپنا ضروری سامان ٹھونسنے لگی۔ دروازہ
ایک بار پھر پوری قوت سے پیٹا گیا تھا۔

"دیجہ اب تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں دروازہ توڑ دوں گا۔" اسعد کی چنگھاڑ اس تک پہنچی تھی۔ ا
نے بڑھ کر لاک کھول دیا اور واپس پلٹ آئی۔

اسعد بہت غصے میں اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بہت کول مائنڈڈ بندہ تھا مگر اس لمحے غصے میں کھول رہا
کمرے کی تتر بتر حالت دیکھ کر غصہ کسی قدر تحیر میں بدل گیا۔

"یہ سب کیا ہوا ہے اور یہ تم کیا کر رہی ہو؟" دیجہ نے کوئی بھی جواب دینے سے گریز کیا۔

"آخر تم جواب کیوں نہیں دے رہیں۔۔۔۔۔ کیا کر رہی ہو تم۔" دیجہ کی طویل چپ اسے چڑا رہی تھی
وہ اپنی چڑچڑاہٹ کو غصے میں چھپا رہا تھا۔

"پیکنگ کر رہی ہوں۔" دیجہ نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے اطلاع بہم پہنچائی تھی۔

"نظر آ رہا ہے مجھے لیکن کیوں کر رہی ہو؟"

"میں کراچی جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟" اسعد نے اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ وہ جو جھک کر بیگ میں کپڑے ٹھونس رہی
یوں کھینچے جانے پر اس کے سینے سے آ لگی۔

"کیوں کس لیے، کس طرح؟ یہ سب جاننے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں ہے مسٹر اسعد گیلانی! آ
بہت اطمینان سے رہو اپنی 'بیچاری' کے ساتھ۔" اس نے جھٹکے سے اپنا بازو اسعد کی گرفت سے آزاد کر
تھا۔

"آئی کانٹ بلیو دیجہ۔۔۔۔۔ آئی کانٹ بلیو دس۔۔۔۔۔ تم ابھی تک اسی ایک لفظ کے پیچھے پڑی ہوئی
آخر کیوں تم جاہلوں کی طرح بی ہیو کر رہی ہو؟" کیا کچھ نہیں تھا اسعد کے لہجے میں، آنکھوں میں رنج
تاسف۔

"کیوں نہ بی ہیو کروں میں جاہلوں کی طرح۔۔۔۔۔ میرے گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔
دوسری عورت میرے گھر پر قابض ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ میرا شوہر مجھ سے چھینا جا رہا ہے اور میں خاموش تما
بنی رہوں۔"

"کون چھین رہا ہے تمہارا شوہر؟"

"مہر النساء چھین رہی ہے۔" وہ حلق کے بل چیخی تھی۔ اسعد نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہوش میں آؤ دیجہ! وہ بے ضرر سی لڑکی کیا چھینے گی مجھے تم سے۔۔۔۔۔"

"وہ بے ضرر نہیں ہے اسعد۔۔۔۔۔ ہرگز بھی بے ضرر نہیں ہے۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔ اسعد نے اسے بانہوں میں بھر لیا وہ شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوئی تھی۔ اسعد اس کا سر تھپک رہا تھا لیکن خاموش کروانے کی مبہم سی کوشش بھی نہ کی تھی اس نے۔ شاید اسی طرح غبار دھل جاتا۔ وہ بات جو وہ کئی دن سے محسوس کر رہا تھا آج پہلی بار اس کے منہ سے سنی تھی۔ خود کو تو وہ رد کر سکتا تھا مگر اب جبکہ وہ کہہ چکی تھی تو سوچنے کی گنجائش نہ تھی۔ اضطراب لازم تھا۔

اسعد نے بہت نرمی سے اسے خود سے الگ کر کے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی طرف بڑھا دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی تھی۔ اسعد نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر واپس ٹیبل پر رکھا اور خود پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"دیجہ! میں صرف آج وضاحت کر رہا ہوں دوبارہ نہیں کروں گا۔ مہر النساء سے شادی کرنے کے لیے مجھے تم نے فورس کیا تھا۔ بقول تمہارے یہ ایک معاہدہ ہے۔" ہاتھ بڑھا کر دیجہ کے گالوں سے آنسوؤں کے موتی چنے تھے۔

"معاہدوں کے بھی چند اصول ہوا کرتے ہیں دیجہ ڈیئر! اور وہ چند اصول ہمیں ہر صورت پورے کرنے پڑتے ہیں چاہے کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو۔ میں بھی وہی اصول پورے کر رہا ہوں۔
پلیز دیجہ! مجھ پر شک کر کے مجھے میری ہی نظروں میں مت گراؤ۔" اس کا لہجہ دھیما تھا مگر سلگتا ہوا تھا۔
اس کی نگاہوں کی تپش دیجہ نے اپنے اندر بھی محسوس کی تھی۔ آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے۔

"میں تم پر تو شک نہیں کر رہی ہوں۔" اسعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"میں چاہوں گا کہ آنے والے دنوں میں اس قسم کی مغلظات تمہارے ذہن میں نہ پلنے پائیں۔ مہرو واقعی معصوم ہے دیجہ! اپنی ماں کے ہاتھوں میں کھلونا۔ اس کی ماں نے اس طرح سے برین واشنگ کی ہے اس کی کہ وہ کچھ بھی نہ کر پائی۔ لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کچھ آیا سمجھ میں یا نہیں؟" آخر میں وہ کچھ ہلکے پھلکے سے انداز میں دریافت کر رہا تھا۔ دیجہ نے گال رگڑتے ہوئے سر ہلا دیا لیکن ایک پھانس تو اب بھی تھی۔

"اور تم مہرو سے کوئی باز پرس بھی نہیں کرو گی۔" دیجہ نے پھر سے سر ہلا دیا۔
آخر ساری ہمدردیاں مہرو کے لیے ہی کیوں ہیں ایک ہی سوال کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''اور ہاں۔'' اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بھی کھڑا کر دیا۔

''اسعد، دیجہ سے محبت کرتا تھا، کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ چاہے بیچ میں کتنی ہی مہرو کیوں نہ آ جائیں سمجھیں کچھ۔'' اسعد نے اس کی ناک دھیرے سے کھینچتے ہوئے شوخی سے پوچھا تھا۔ دیجہ نے جھینپ کر اس کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں اور اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے اپنے گرد اس کا مضبوط حصار محسوس کیا تھا۔ پھانس کسی قدر نکل چکی تھی۔ وحشت سر پر پیر رکھے بھاگ گئی تھی۔ بہت عرصے بعد ان کے کمرے میں رقص کرتی محبت بھری تنہائی اتری تھی اور یہ شاید اسی تنہائی کے سحر انگیز فسوں کا اعجاز تھا کہ وہ ایک روتے بلکتے وجود کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے جس نے چھوٹی عمر میں شعور کا دامن تھاما تھا۔ جسے اس کی معصومیت مار گئی تھی، جو اپنی جنم دینے والی کے ہاتھوں چابی کی گڑیا بنی رہی تھی اور جس نے اپنی بہنوں کو دلہن بنا دیکھنے کے شوق میں اپنے وجود کا حصہ ختم کر ڈالا تھا۔

+

وقت کی سبک رفتار جاری و ساری تھی اور اس سبک رفتاری میں ڈگمگاہٹ کا سبب محض چند الفاظ بنے تھے جس میں مہرو کے ماں بننے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ ششدر سی ڈاکٹر کا منہ تکے گئی جیسے یہ کوئی انہونی ہو...... بہت ہی ناقابل یقین بات۔

وہ خوش تھی۔ بے انتہا خوش بلکہ اپنے احساسات کے اظہار کے لیے اسے خوشی کا مکمل اور بھرپور لفظ چھوٹا لگ رہا تھا۔ ساکت تالاب میں پتھر پھینک دینے سے سطح آب جس طرح ارتعاش کے زیر اثر جھوم اٹھتی ہے۔ لہریں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک رقص کرتی ہوئی اپنی حیات کا مژدہ دیتی ہیں کچھ ایسا ہی حال اس کے دل کی امید کا تھا جو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گزرے وقتوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے دیسی گھی کے چراغ روشن کر کے جشن منائے یا کسی بلند مقام پر چڑھ کر چیخ چیخ کر اعلان کرے اور اس خوشی کے زیر اثر وہ یکسر فراموش کر چکی تھی کہ تخلیق کے ادوار اسے نہیں مہرو کو پورے کرنے ہیں اور اس رات اسعد کے بازو پر سر رکھے اس نے کتنی ہی باتیں اس ادھوری جان کے بارے میں کر ڈالیں جس کی نامکمل رگوں میں روح بھی نہیں پھونکی گئی تھی۔

''میں اس کا نام بہت خوب صورت سا رکھوں گی۔ جہانگیر، شاہجہان یا ایسا ہی کوئی اور سنا ہے نام تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر لڑکی ہوگی تو اس کا نام نور رکھوں گی۔ ہے نا اسعد اچھا نام ہے نا نور! اف کتنا پیارا ہوگا نا وہ ...... بالکل تمہاری طرح اس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ، پیشانی، بال سب، سب کچھ تم سا ہو گا۔ اسعد تم چپ کیوں ہو...... جواب کیوں نہیں دیتے...... ہے نا وہ تمہارے جیسے ہوگا نا۔'' ذرا سی گردن موڑ کر وہ تائید چاہ رہی تھی۔ اسعد مثبت انداز میں مسکرایا پھر اس کے چہرے پر بکھری لٹیں سمیٹتے ہوئے بولا۔

''دیجہ......''

''ہوں۔'' وہ مگن سی اس کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔

''دیجہ! مہرو میرا انتظار کر رہی ہوگی۔'' دیجہ کے ہاتھ یک لخت ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے کچھ توقف سے اپنا سر اس کے بازو سے ہٹا لیا۔ اس کا چہرہ اس وقت بے حد سپاٹ تھا کچھ دیر قبل والی خوشی بھی کہیں نہ تھی وہ جب اس کے تاثرات جاننے میں ناکام رہا تو دھیرے سے اس کی پیشانی چھو کر باہر نکل گیا۔

انتظار کے لمحات واقعی بڑے جاں گسل ہوتے ہیں لیکن ان لمحات میں بھی بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ وہ اسی مٹھاس کے زیر اثر ہر طرح سے ''مہرو'' کا خیال رکھ رہی تھی۔ اپنی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود اس سے باتیں کرتی تھی کونسی خوراک کتنی مقدار میں لینی چاہیے اور کونسی چیز آنے والے وجود کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی، وہ ہر بات کا دھیان رکھتی تھی اور پھر رات کے پچھلے پہر وہ اپنا آپ مہرو کی جگہ رکھ کر خوش فہمی کے بستر پر سو جاتی تھی۔

اس دن وہ مارکیٹ سے لوٹی تھی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے۔ چھوٹے چھوٹے فراکس، جرابیں، پیمپرز، ننھی منی چوڑیاں، ڈھیروں ڈھیر کھلونے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ پانی پینے کے ارادے سے وہ کچن میں آئی تھی اور اسعد کو دیکھ کر رک گئی تھی پھر کچھ سوچتی ہوئی بے آواز قدموں سے اس کے پیچھے آن رکی۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اسعد جانے کس دھیان میں تھا یوں مخاطب کیے جانے پر ٹھٹک گیا اور اس کے ٹھٹکنے پر دیجہ کے قہقہے آؤٹ آف کنٹرول ہوئے جا رہے تھے۔ اسعد نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا پھر خود بھی ہنس دیا۔ لائیٹ پرپل کلرز کی ہاف سلیوز شرٹ پر ملٹی شیڈ دوپٹہ لیے وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ بالوں کو کلپ نے جکڑ رکھا تھا۔

''کچھ نہیں مہرو کے لیے جوس نکال رہا تھا تم لوگی۔'' ٹن کی ٹوپ کھینچ کر گلاس میں جوس انڈیلتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی باہر نکل گیا تھا۔ اس کا رخ مہر النساء کے بیڈروم کی جانب تھا۔

دیجہ وہیں کھڑی رہی، خاموش، متفکر، عجیب بات تھی یہی کام اسے کرنا تھا مگر اسعد کو کرتا دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی تھی۔

اس وقت بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھی وہ چینل پر چینل بدل رہی تھی لیکن ذہن پوری طرح سے ان دونوں میں اٹکا ہوا تھا۔

''دیجہ! میں اور مہرو واک کے لیے جا رہے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ مہرو عورت کا مکمل سراپا لیے اسعد کے پہلو میں ہنستی مسکراتی کھڑی تھی۔ دیجہ کے ہاتھوں میں خفیف سا لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ دونوں ایک مکمل تصویر کی مانند لگ رہے تھے۔

"تو کیا اس پہلو میں اب میری جگہ نہیں رہی۔" اس نے سوچا اور آنکھوں کے سامنے وہ پل پھیل گیا جب اس نے مہرو سے کہا تھا۔

"مہرو میں اور اسعد ڈنر کے لیے جا رہے ہیں تم چینج کر کے سو جاؤ۔"

"کہاں کھو گئیں یار...... چلو نا...... تم بھی فریش ہو جاؤ گی۔" صوفے کی بیک پر رکھا ہاتھ کھینچتے ہوئے اسعد نے کہا تھا۔ وہ رخ موڑ گئی۔

"نہیں سعدی! میرا موڈ نہیں ہے۔ تم لوگ جاؤ" اس کا دل چاہا کہ کاش اسعد اصرار کرے مگر او کے جیسی تمہاری مرضی کہہ کر چلا گیا تھا۔ ننھے فرشتے کے آنے میں کچھ دن ہی باقی رہ گئے تھے اور وہ اسعد کے ساتھ شاپنگ پر جانا چاہتی تھی مگر اسعد کے پاس ٹائم نہ تھا اور اب مہرو کے لیے مصروفیات میں سے کیسے لمحے کشید کیے جا رہے تھے۔ دیجہ کے دل میں ایک بار پھر حسد و شک کی انی سی اترتی چلی گئی۔

+

گماں یہ بے ثباتی کا
یقیں بن بن کے ہر لمحے
بڑی شدت سے میرے ذہن کا دامن ہلاتا ہے
یہی باور کراتا ہے
کہ حرف و لفظ کا جتنا اثاثہ تھا
فنا کی سرحدوں پر ہے
سخن سچائی کا سارا اتفاخر ٹوٹنے کو ہے
محبت روٹھنے کو ہے

اسعد مہرو کو اس کی ماں سے ملوانے لے گیا تھا اور وہ ایک بار پھر اپنی تنہائی پر ماتم کناں تھی۔ ایک چبھن تھی جو خون کے ساتھ ساتھ سارے بدن میں گردش کرتی پھر رہی تھی۔ اضطراب تھا جو روح کو گھائل کیے دے رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج وہ پہلی بار اپنے کیے پر پشیمان ہوتے ہوئے اسعد کی وفائیں خود کو باور کرا رہی تھی۔ حسد ہر چیز پر بھاری ہوتا ہے۔ مرد جب حسد کرتا ہے تو عورت کو مقید کر لیتا ہے اور جب عورت حسد کرتی ہے تو مرد کو مقید کرنے کی آرزو میں خود کو رول دیتی ہے۔ جنون کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ہر وہ کام کر گزرتی ہے جو گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ مہرو سے کوئی بھی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بہت سے رشتے انہیں جکڑے ہوئے تھے۔ پہلا رشتہ وہ تھا جسے زمانہ "سوکن" کے نام سے جانتا ہے اور یہی رشتہ باقی سب کی بنیاد تھا۔ دوسرا رشتہ یہ تھا کہ وہ اس کی شوہر کی اولاد کو جنم دینے والی تھی۔ یہ رشتہ یوں اہم تھا کہ وہ اس

کے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ تیسرا اور آخری رشتہ حسد کا تھا۔ جلن کا تھا جس نے شک کی کوکھ میں پرورش پائی تھی۔

پہلے جس بچے کے آنے کے وہ دن گن رہی تھی اب اسی سے متنفر ہو چلی تھی۔ یہ یقین کامل ہو چکا تھا کہ اگر مہر النساء ماں بن گئی تو وہ خود اسعد کو کھو دے گی اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

+

ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس نے مہر النساء کو دیکھا جس کی رنگت میں زردی کا مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار میں کسی قدر شدت آ گئی تھی۔ اسکرین پر دوبارہ نظریں ٹکاتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں کھچڑی سی پکتی محسوس کی۔ منزل بس چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس نے سوچا قلعہ مسمار کیا جا سکتا ہے۔

"او کے مہرو! میں اپنی فرینڈ کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ ریموٹ کاؤچ پر پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کہنے پر مہرو کے چہرے پر گھبراہٹ ابھر آئی تھی۔

"وہ...... میں نے...... آپ سے کہا تھا نا۔"

"کیا کہا تھا بھئی۔" وہ جانتی تھی مگر یوں بن گئی گو کچھ خبر ہی نہ ہو۔

"م...... مجھے کچھ...... درد ہو رہا ہے...... شاید آج ہی...... آپ آج مت جائیں شاید...... ہاسپٹل جانا پڑے۔"

"شاید نہیں یقیناً جانا پڑے گا مہرو بی بی۔" اس نے سوچا جبکہ مہرو کہہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر کی دی ہوئی تاریخ سے تو دو روز پہلے ہی اوپر ہو چکے ہیں آپ...... آپ سمجھ رہی ہیں نا۔" مہرو کی آواز میں تکلیف تھی، الجھن تھی۔ شاید وہ اپنی کیفیت سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔

"میرا جانا بہت ضروری ہے مہرو! دیبا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" اس نے اپنی فرینڈ کا نام لیا تھا پھر مہرو کی نگاہوں میں التجا دیکھ کر بولی۔

"میرا جانا بہت ضروری ہے ورنہ دیبا ناراض ہو جائے گی لیکن تم...... اچھا میں فاسٹ ڈرائیو کرتی ہوئی جاؤں گی اور اسے تمہاری بابت بتا کر واپس آ جاؤں گی۔ اب تو خوش ہو۔" بکری ذبح ہو چکی تھی اور وہ چھری کو مزید تیز کر رہی تھی۔ مہرو کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور مہرو کا گال تھپتھپا کر باہر آ گئی۔ پورچ کی طرف جانے سے پہلے وہ انٹرنس کا دروازہ لاک کرنا نہیں بھولی تھی۔ اب وہ سڑکیں ناپنے کے لیے تیار تھی اور اس دوران اسے ایک بار بھی ننھے نووارد کا خیال نہیں آیا تھا۔

+

"وہ مجھے مار ڈالے گی وہ مجھے مار ڈالے گی۔"

آپریشن تھیٹر کی سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے وہ ایک ہی فقرے کی بازگشت سن رہا تھا۔ نظر دروازے کے عین اوپر لگی سرخ بتی پر ٹکی تھیں جس کا جلنا بجھنا بھرپور خطرے کو ظاہر کر رہا تھا۔ اسی قسم کی لال شعاعیں ایک تواتر سے اس کی آنکھوں میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ سینے پر بازو لپیٹے وہ اپنے دل میں ایک [illegible] محسوس کر رہا تھا۔ کاریڈور میں آتے جاتے لوگوں کو وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاں وہ فقط ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا تھا جو اس کی نسل کو آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ موت کو مات دینے کی سعی کر رہی تھی۔ [illegible] آج تک اس نے نظر بھر کر محض اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ مبادا دیجہ سے بے وفائی کا مرتکب ٹھہرے۔ حقیقت تھی کہ اسے دیجہ سے بے انتہا محبت تھی اور اسی محبت کے طفیل وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار تھا۔

وہ گھبراہٹ تھی جو اسے گھر کھینچ لائی تھی۔ گیٹ ان لاکڈ تھا اور انٹرنس ڈور لاکڈ تھا۔ اسے کچھ حیرت ہوئی تھی اور پہلا دھیان مہرو کی طرف ہی گیا تھا۔ اسے معلوم تھا ڈلیوری کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے اس مہینے کی بارہ تاریخ دی تھی اور آج تو چودہ تاریخ ہو چکی تھی۔ وہ لیدر گڈز کا کام شروع کرنے والا تھا لوکیشن کے انتخاب اور خرید کے سلسلے میں جن لوگوں سے بات ہوئی تھی انہیں آج ہی انگلینڈ فلائی کرنا تھا لہٰذا ان سے بھی ملنا ضروری تھا اور اس کے بعد ایک امپورٹنٹ میٹنگ تھی۔ اسی دوران کچھ ایسا ہوا تھا کہ اس کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا تھا پہلے تو وہ ٹالتا رہا پھر گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مسلسل انگیج ٹون آ رہی تھی۔ اب آفس میں بیٹھے رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا تب اس نے میٹنگ کینسل کی اور گھر گیا جہاں اس لمحے ہُو کا سا عالم تھا۔

چوکیدار کچھ دن سے چھٹی پر تھا۔ وہ کچھ لمحے وہیں کھڑا رہا پھر گاڑی کی طرف آ گیا۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر وہ سیفٹی بیلٹ باندھ رہا تھا جب ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا ایک آواز تھی بہت مدھم اس نے غور سے سننے کی کوشش کی پھر جیسے وہ تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں، وہ گاڑی سے نکل آیا اور آواز کے تعاقب میں گلی کی طرف آ گیا۔ یہ گلی گھر ہی کا الگ تھلگ حصہ تھی۔ گھر کے پچھلے حصے کی ایک کھڑکی اس طرف کھلتی تھی۔ گلاس ڈور کے دوسری طرف اسے جو کچھ نظر آیا وہ بے حد غیر یقینی تھا۔ اس نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر مہرو کو تسلی دینی چاہی پھر تیزی سے پورچ کی طرف آ گیا۔ اس کے پاس انٹرنس کی ڈپلیکیٹ چابی تھی مگر کہاں یہ اسے معلوم نہ تھا۔ کوٹ کی جیبیں کھنگالتا وہ گاڑی کی طرف آیا تھا ڈیش بورڈ پر بھی چابی نہ تھی۔ اس نے بریف کیس کھول کر سیٹ پر الٹ دیا اور بالآخر وہ چابی مل گئی۔ وہ جتنی جلدی کر رہا تھا اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ سیڑھیوں میں رکھے گملے سے ٹھوکر کھائی تھی۔ چابی ہاتھ سے نکل کر لان کے گھاس میں کھو گئی تھی اس

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس لمحے جیسے مفقود ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر چابی تلاش کی۔ کانپتے ہاتھوں سے لاک کھل ہی نہیں رہا تھا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ اس سا مضبوط اعصاب کا بندہ بھی ڈگمگایا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی گیس کی نہایت ناگوار بو اس کے نتھنوں سے ٹکرا کر سانسوں میں اتر گئی تھی۔ وہ پروا کیے بغیر مہرو تک پہنچا تھا جو تکلیف کی شدت سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ اسعد نے اسے بازوؤں میں بھر کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا تھا اور بہت ریش ڈرائیو کرتے ہوئے، اگلی پچھلی گاڑیوں اور ٹریفک سگنلز کی پروا کیے بغیر ہاسپٹل پہنچا تھا۔ اس کے اعصاب چٹخنے ہوئے تھے اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا اور کیسے ہوا ہے۔ مہرو آپریشن تھیٹر میں تھی اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"بہت دیر ہو چکی ہے۔ زچہ اور بچہ دونوں کی جان خطرے میں ہے۔"

اور تب سے اب تک وہ یونہی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک ایک ورق الٹتا جا رہا تھا۔ ایک ایک پیچ کھل رہا تھا گزرے دنوں کے کتنے ہی پل فلم کی طرح اس کے سامنے چل رہے تھے۔ کچھ دیر قبل دیجہ نے موبائل پر کانٹیکٹ کیا تھا۔ اسعد اس کی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ انٹرنس ڈور لاک کرتے وقت سوئی گیس کا والو کس نے کھول دیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کا متمنی بھی نہ تھا لیکن اس کے باوجود ہاسپٹل کا نام بتا کر اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں اس لمحے صرف مہرو تھی باقی ایک مہیب چپ تھی ایک خلا تھا۔ طویل خلا ذہن و دل پر جیسے دھند چھائی ہوئی تھی جس کے زیر اثر وہ دعا بھی نہیں کر پا رہا تھا تبھی اس نے اپنے نزدیک ایک آواز سنی تھی لیکن اس کی طرف دیکھا نہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر اسعد کو پکارتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا تھا تب اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دیجہ کی طرف دیکھا تھا۔

"مم..... مہرو؟" اسعد کی نگاہوں کی سرد مہری نے اسے گڑبڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسعد نے گردن موڑ کر نظریں واپس آپریشن تھیٹر کے دروازے پر ٹکا دیں اور بولا۔

"آپریشن تھیٹر میں ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے اس کی جان خطرے میں ہے۔"

اس کا لہجہ آنکھوں جیسا ہی ٹھنڈا اٹھار تھا۔

"یو ڈونٹ وری اسعد! اسے کچھ نہیں ہوگا ہم..... ہمارا بے بی بالکل ٹھیک ہوگا۔"

اب کے اسعد نے جھٹکے سے گردن اس کی طرف موڑی تھی۔ وہ کیسی مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کیا وہ اپنے کیے پر شرمندہ نہیں ہے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اور کہنا چاہتا تھا۔ "صرف بچہ ہی نہیں بچے کو جنم دینے والی کی جان بھی خطرے میں ہے۔" لیکن وہ نہیں کہہ پایا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

"ویری سوری مسٹر اسعد! آپ نے مریضہ کو لانے میں بہت دیر کر دی تھی..... ہم نے پوری کوشش کی

لیکن ہم انہیں نہیں بچا سکے۔" ڈاکٹر تسلی آمیز نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اسعد کی نگاہیں ڈاکٹر کے ہرے گاؤن سے ہوتی ہوئی بند ہوگئیں۔ گردن نڈھال ہو کر پیچھے کی طرف لڑھک گئی تھی۔

+

اس نے بڑی محبت سے براؤن کمبل میں لپٹے اس ننھے وجود کو دیکھا تھا اور جھک کر اس کے پھولے پھولے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے تھے۔ دو دن تک بچی کو I.C.U. میں رکھا گیا تھا کیونکہ سوئی گیس نے بچی کی سانس کی نالی کو کسی قدر متاثر کیا تھا۔ پیدائش کے تین دن بعد ڈاکٹر نے اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور آج مہر النساء کا سوئم تھا۔ ڈیڈ باڈی اماں وزیراں کے گھر پہنچا دی گئی تھی اور وہیں تجہیز و تکفین کا سارا کام ہوا تھا۔ ایک بار پھر وزیراں کا منہ نوٹوں کی گڈیوں نے بند کر دیا تھا۔ اس دوران ایک بار اس کے گھر بھی گئی تھی اور جلد ہی بچی کا بہانہ بنا کر لوٹ آئی تھی۔

وہ خوش تھی بے انتہا خوش۔ سانپ مر گیا تھا اور لاٹھی صحیح سلامت تھی۔ کوئی ذہنی خلش نہ تھی۔ کوئی خلا... تھا وہ یوں مطمئن تھی جیسے یہ سب یونہی ہونا تھا۔ بچی کو کاٹ میں لٹا کر وہ اسٹڈی روم کی طرف آ گئی جہاں اسعد ایزی چیئر پر جھول رہا تھا۔ اپنی خوشی کی بدولت اسے اسعد کی سرد مہری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے بدلے ہوئے رنگ نظر نہیں آ رہے تھی۔ ہاں اس کی خاموشی کو دیجہ نے محسوس کیا تھا۔ "کسی کے مرنے پر افسوس تو ہوتا ہے نا۔" کہہ کر اس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم دھرتی اس کی پشت پر آ رکی پھر اس کی گردن میں بازو ڈال کر ٹھوڑی اس کے بالوں پر رکھ دی تھی۔

"وہ سو گئی؟" اسعد نے پوچھا تھا۔

"ہاں سو گئی۔" اس کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر وہ ننھا وجود آ گیا تھا وہ گھوم کر اسعد کے سامنے آئی اور کرسی کی ہتھی پر بیٹھ گئی تھی۔ بازو ابھی بھی اس کی گردن کے گرد حمائل تھے۔

"تم نے دیکھا ہے اسعد! وہ کتنی پیاری ہے اور اس کی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔ بالکل تمہاری طرح...... میں اس کا نام اجالا رکھوں گی یا پھر سویرا...... مجھے لگتا ہے اس کے آنے سے ہر طرف روشنی پھیل گئی ہے۔ سویرا ہو گیا ہے۔ اجالا پھیل گیا ہے۔"

"نہیں دیجہ! میں اس کا نام سویرا رکھوں گا اور نہ اجالا۔ بلکہ میں اس کا نام مہرو رکھوں گا صرف اور صرف مہر النساء۔" اپنی گردن سے اس کے بازو الگ کرتے ہوئے اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔ ان نظروں کا مفہوم دیجہ کی سمجھ سے بالاتر تھا لیکن وہ گڑبڑا گئی۔

"ہاں...... اچھا نام ہے مہرو...... النساء"

"جاؤ دیجہ اور اس بچی کو غور سے دیکھو۔ اس کی آنکھیں مجھ سے نہیں بلکہ مہر النساء سے ملتی ہیں۔ اس

کی ناک اور ہونٹ بھی مجھ جیسے نہیں ہیں وہ ہو بہو اپنی ماں جیسی ہے۔" اس کا لہجہ بہت بے تاثر سا تھا۔

"ہاں...... شاید...... میں نے غور نہیں کیا۔" دیجہ جھینپ مٹانے کو ہولے سے ہنسی تھی۔

"مجھے اندازہ ہے اسعد! تم بہت دکھی ہو اور اس کی موت پر...... مجھے بھی بے حد افسوس ہے۔ مگر شاید اس کی موت یونہی آنی تھی۔" وہ چپ ہوئی پھر بولی۔

"وہ اچھی تھی بے حد اچھی...... دیکھو نا جاتے جاتے ہمیں ایک بیٹی دے گئی۔"

"ہمیں نہیں...... مجھے ایک بیٹی دے گئی۔" اس نے دیجہ کی بات نہایت سہولت سے قطع کی اور اپنی بات پر زور دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں...... میں سمجھی نہیں...... اسعد۔"

اسعد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ اسٹڈی ٹیبل تک چلا گیا تھا۔

"یو نو دیجہ! ڈلیوری سے چند روز قبل مہرو کی ذہنی حالت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ تم اسے کھانا نہیں دیتیں اور اسے مارتی ہو اور یہ بھی کہ تم اسے جان سے مار ڈالو گی۔" وہ دراز سے کچھ نکال کر اس کے سامنے آن رکا تھا۔

"لیکن میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا یقیناً یہ مجھے تم سے متنفر کرنے کی کوئی کوشش ہے۔ میں نے سوچا تھا دیجہ کہ میری دیجہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی وہ تو بہت نرم دل ہے۔" دیجہ کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے اس نہج پر بار بار سوچا تھا ہر سوال کا جواب تیار تھا۔ اسعد اس بات پر ہنس رہا تھا لیکن آنکھوں کے تاثرات بہت عجیب سے تھے۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائی۔ اسے خاموش دیکھ کر اسعد نے پشت پر بندھے ہاتھ کھولے اور دیجہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک لفافہ تھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"خود دیکھ لو مگر اس سے قبل مجھے ایک سوال کا جواب چاہیے۔" دیجہ لفافے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

"سوئی گیس کا والو کس نے کھولا تھا دیجہ! تم نے...... ہے نا؟" اسعد کا لہجہ بے انتہا سخت تھا۔ وہ "ناں" کہنا چاہتی تھی مگر زبان تالو سے چپٹ گئی۔

"بتاؤ دیجہ! والو تم نے کھولا تھا نا؟" وہ حلق کے بل چنگھاڑا تھا۔ دیجہ پیچھے ہٹ گئی مگر بازو مضبوط آہنی گرفت میں تھا۔ پتا نہیں یہ خوف تھا، گھبراہٹ یا احساس جرم کہ وہ بولتی ہی چلی گئی۔

"میں اسے مارنا نہیں چاہتی تھی...... آئی سویئر میں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر......"

"مگر تم نے اسے مار ڈالا۔" اسعد نے اس کی بات ایک بار پھر قطع کر دی تھی۔

"تم نے اسے مار ڈالا دیجہ اور تمہیں ایک بار بھی اس بات کا خیال نہیں آیا کہ تم کتنا بڑا گناہ کرنے جا

رہی ہو۔ ایک نہیں بلکہ دو، دو جانوں کو تم نے کتنی آسانی سے خطرے میں ڈال دیا۔ تم اس حد تک خودغرض و بے حس ہو سکتی ہو مجھے اندازہ نہیں تھا دیجہ۔'' اسعد نے ملامتی انداز میں اس کا بازو جھٹک دیا تھا۔

''تم مہرو کو مارنا نہیں چاہتی تھیں لیکن تم نے اسے مار ڈالا اور میں......'' اس نے توقف کیا اور بولا۔

''اور میں تمہیں اپنی زندگی سے نکالنا نہیں چاہتا تھا مگر نکال رہا ہوں۔'' اس کا لہجہ بہت عام سا تھا لیکن دیجہ کو اندر تک دہلا گیا۔

''تمہاری آنکھوں اور دل پر حسد کا اتنا گہرا پردہ پڑ چکا ہے دیجہ کہ شاید اس پردے کے پیچھے میں بھی کہیں کھو جاؤں گا۔ اسی لیے میں اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کچھ عرصے بعد جب اس کے چہرے میں مہرالنساء کا عکس واضح ہو تو تم اس کا بھی وہی حشر کرو جو اس کی ماں کا کیا ہے۔ مائیں وحشی نہیں ہوتیں دیجہ، شاید اسی لیے خدا نے تمہیں ماں نہیں بنایا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کو چاہا جس کے لیے صرف اس کا اپنا آپ اہم ہے جو کوئی بچہ اس لیے ایڈاپٹ کرنا نہیں چاہتی کہ وہ کسی کا گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں دیجہ عباس! گناہ و ثواب سے مبرا۔''

اسعد نے اس سے اپنے نام کا مان بھی چھین لیا اور اب وہ خاموش تھا۔ کمرے میں سکوت چھایا ہوا تھا۔

''یہ گھر تمہارا ہے۔ اس گھر کی ایک ایک چیز تمہاری ہے۔ حق مہر کی رقم میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے۔ میں اب تمہارے نام کے ساتھ اپنا نام بھی جڑا رہنے نہیں دینا چاہتا ہوں۔ یوں بھی بے حس و خودغرض لوگوں کو تنہا ہی رہنا پڑتا ہے۔''

''کیا تم مجھے معافی مانگنے کا ایک موقع بھی نہیں دو گے اسعد۔''

''معافی...... کس سے مانگو گی دیجہ! مہرو تو مر چکی۔'' اسعد کے لہجے میں دکھ بہت تھا۔

''اور مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے ہر تعلق توڑ چکا ہوں۔ بلیو می دیجہ! میں تم کو کبھی نہیں بھولوں گا کیونکہ تم وہ واحد عورت ہو جس سے میں نے بے انتہا محبت کی ہے اور اب...... بے انتہا نفرت بھی......''

دیجہ کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں زمین پر دوزانو بیٹھ گئی وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے اشک سمیٹنا چاہتی تھی لیکن وہ بکھرتے چلے گئے۔ گود میں رکھے ہاتھ اس برسات میں بے طرح بھیگ رہے تھے۔ اسعد نے اسے تاسف سے دیکھا اور بولا۔

''میرا مقصد تمہیں ہرانا نہیں دیجہ! لیکن اب میں تمہارے ساتھ کسی صورت نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ تمہارے دل سے مہرو کی نفرت نکل جائے لیکن تم ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ تمہارے لیے صرف تمہارا اپنا آپ مقدم رہا۔ تم نے ہمیشہ اپنی ذات کو اہمیت دی اور اگر آج تم خالی ہاتھ ہو تو بھی محض اپنی

ہی وجہ سے...... میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ تم پرسکون زندگی گزارو اور ضمیر کی چبھن تمہیں سونے دے۔''

اس کی نظریں ابھی بھی اپنے ہاتھوں پر تھیں۔ مضبوط قدموں کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی اور خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو زور سے زمین پر پٹخا اور روتی ہی چلی گئی۔ اس کی سسکیاں فضا میں بکھرتی جا رہی تھیں۔ کمرے کے کونے میں بیٹھی نحیف و نزار محبت نے اس کو تاسف و ہمدردی سے دیکھا اور آنکھیں موند کر ابدی نیند سو گئی۔

ہوتا ہے...... یوں ہی ہوتا ہے اپنے لیے محل تعمیر کروانے والے ہمیشہ اسی میں نہیں رہتے۔ وہ دوسروں کے لیے گڑھے کھودتے ہیں اور بالآخر ان میں گر جاتے ہیں اور ضروری تو نہیں کہ ہر داستان اپنے اختتام میں راجا رانی کو ہنستی مسکراتی زندگی دے جائے۔ آنسو تو ان کے مقدر میں بھی ہوتے ہیں۔ رونا تو راجا رانی کو بھی پڑتا ہے۔

راکھ

وہ کب سے لان اور برآمدے کی درمیانی سیڑھیوں میں بیٹھا تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکی تھیں جبکہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں نے ایک دوسرے کو یوں جکڑ رکھا تھا گویا آج دونوں ہتھیلیوں کا آپس میں پیوست ہو جانے کا ارادہ ہو۔ آنکھیں کسی ان دیکھے نقطے پر ٹکی تھیں اعصاب میں ایک واضح محسوس کیا جانے والا کھنچاؤ اور پیشانی پر ان گنت لکیروں کا الجھا ہوا جال تھا۔

آسمان سیاہی مائل سرمئی بدلیوں کی لپیٹ میں تھا اور ہوا نے تو شاید آج زمین کا رخ نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ عجیب طرح کا لایعنی سا سکوت اور حبس چہار سو چھایا ہوا تھا اور اس کے اندر گویا الاؤ روشن تھا۔ کنپٹی پر ایک پسینے کی دھار مسلسل بہہ رہی تھی اور جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمائے گویا وہ ضبط کی انتہائی حدود سے گزر رہا تھا۔

اسے غصہ اس بات پر نہیں آ رہا تھا کہ کشف اس سے خفا ہے بلکہ اصل غصہ اس بات پر تھا کہ وہ اس سے ایک ایسے شخص کے لیے خفا ہے جو اس کا کچھ بھی نہیں ہے۔

اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے شکنجے سے آزاد کیا اور ہتھیلی اپنے سامنے پھیلا لی۔ انہی آہنی ہاتھوں نے بارہا کشف کے نازک مرمریں ہاتھوں کو اپنی قید میں لیا تھا۔ بارہا اس نے کشف کو اپنے دل سے وجود تک محسوس کیا تھا اور پچھلے پانچ دن سے اس نے کشف کی آواز تک نہ سنی تھی سارے گھر میں فقط ایک آواز گونجتی رہی تھی اور وہ تھی ان کی ننھی سی بیٹی سحر کے ہنسنے یا پھر رونے کی آواز...... خود اس نے کئی بار سحر کے حوالے سے اس جنگ کو ختم کرنے کے مواقع پیدا کیے مگر کشف جان بوجھ کر انجان رہی۔

اس سے قبل وہ خود صبح سویرے اسے آفس جانے کے لیے جگاتی تھی۔ آفس کی تیاری میں اس کی مدد کرتی تھی۔ اس کے لیے ناشتا تیار کرتی تھی۔ پھر لنچ اور ڈنر کا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا۔ مگر پچھلے چار بلکہ پانچ دنوں میں ان دونوں کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار آپوں آپ تن گئی تھی۔ جس نے اگر مضطرب

اسے کیا تھا تو زیر اثر خود کشف بھی تھی۔ اس کا متوحش چہرہ اور متورم آنکھیں مخفی تو نہ رہی تھیں۔ عجیب بات تھی نا کہ مسز کشف آذر کمال، آذر کمال سے یاور بن سہیل کی وجہ سے خفا تھی۔ اس ایک خیال کے ساتھ ہی اس کی انگلیاں بے اختیار بھنچ گئیں۔

یاور بن سہیل۔ کشف کا کیا تھا؟ کچھ نہیں جبکہ آذر کمال اس کا سب کچھ تھا، پھر بھی...... پھر بھی اتنے فاصلے...... اتنی خفگی...... اتنی دوری اور اجنبیت صرف اور صرف یاور بن سہیل کی وجہ سے۔

کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ وہ پاکستان آیا۔ اس نے کشف حسام کو دیکھا اور شادی کر لی۔ یہاں تک کوئی الجھاؤ نہ تھا کہ کشف اس کے مرحوم تایا کی بیٹی تھی۔ کینیڈا کی ایک ملٹی نیشنل فرم میں وہ چیف ایگزیکٹو کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا اور پچھلے دو سالوں میں پہلی بار تین ماہ کی لیو پر پاکستان آیا تھا۔ منگنی کے بعد ظاہر ہے کہ شادی بھی ہونی ہی تھی اور یہاں بھی کسی نے نعرہ اعتراض بلند نہیں کیا تھا سوائے کشف کے۔ منگنی کے بعد پہلی بار اس نے خود آذر سے کانٹیکٹ کیا تھا اور یہ بات اس کے لیے باعث خوشی یوں تھی کہ اس سے قبل یہ کام وہ خود کرتا رہا تھا۔ جہاں وہ خوش ہوا تھا کشف کی اگلی بات سن کر جھلا گیا تھا۔

"دو روز بعد تو یاور بھائی جاپان جا رہے ہیں۔ انہیں ان کی فرم کی جانب سے چھ ماہ کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تم خود سوچو آذر۔ یاور بھائی کی غیر موجودگی میں ہماری شادی کیسے ہوگی۔"

"یاور بھائی نے کیا ہمارا نکاح پڑھوانا ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ہماری شادی نہ ہو سکے گی۔" وہ تیزی و تندی سے بولا تھا۔

پہلی بار اسے یاور بن سہیل کے نام سے چڑ ہوئی تھی۔ جس کا مختصراً تعارف فقط اتنا ہی ہے کہ وہ تایا جان کے کسی مرحوم دوست کا بیٹا تھا۔ قریبی رشتے داروں کے منہ موڑ لینے کی بنا پر بارہ سال کی عمر سے اس گھر میں تھا اور تایا جان کے انتقال کے بعد سے وہ اس گھر کا بڑا بیٹا ہونے کا حق ادا کر رہا تھا۔ پھر ایک اور تعارف یوں تھا کہ وہ اس گھر کا ہونے والا بڑا داماد تھا۔ تایا جان نے اپنی زندگی میں ہی ماہ نور کو یاور سے منسوب کر دیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو آذر نے چاہا۔ یعنی شادی اور شادی کے ٹھیک ایک ماہ بعد وہ کشف کو لے کر کینیڈا آ گیا جسے پا کر اسے زمین و آسمان اپنی مٹھی میں مقید لگنے لگے تھے۔

اس روز موسم بے حد خوشگوار تھا۔ یخ بستہ فضاؤں میں سورج کی نرماہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ ہفتہ وار تعطیل کا بھرپور لطف لے رہا تھا۔ کشف اس کی فرمائش پر کافی بنا لائی۔ پھر ساتھ ہی بڑا سا البم بھی کیبنٹ سے نکال لیا۔

"آج مجھے سب گھر والے بہت یاد آ رہے ہیں۔" کشف کی رونی صورت دیکھ کر وہ ہنس دیا۔ پھر البم دیکھنے لگا۔ جس میں جا بجا یاور بن سہیل کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بچپن سے جوانی تک کا سارا کلیکشن موجود

تھا۔

''یہ گھر والوں میں صرف یاور شمار ہوتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے دریافت کیا تھا بس یونہی کہ اس کی یاور سے انسیت سے بخوبی آگاہ تھا وہ ہنس دی جھینپ کر۔

''بعض باتوں اور بعض جذبوں کی وضاحت کرنا خاصا مشکل کام ہے اور میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں وضاحت دینا ہمیشہ مشکل لگتا ہے۔''

''یہ وضاحت کسوٹی یہاں کہاں سے آ گئی۔'' البم کو صفحہ در صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے سرسری سی نگاہ کشف پر ڈالی تھی۔

''کسوٹی زرخیز ذہنوں کی پیداوار ہے اور کیا۔'' وہ ایک تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''میں خود بھی نہیں جانتی کہ یاور بھائی میرے لیے کیا ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے بہت کچھ ہیں۔ تم نے ابھی پوچھا تھا نا کہ کیا گھر والوں میں صرف یاور بھائی شمار ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب صرف اتنا ہے آذر کہ وہ میرے سب ہی گھر والوں سے بڑھ کر ہیں۔ میں ان سے بے حد محبت کرتی ہوں...... بے تحاشا...... سب سے زیادہ۔''

اور آذر نے بے اختیار تصویر اس کے ہاتھ سے کھینچ لی تھی۔ کشف کا اتنے جذب سے کسی اور کے لیے محبت کا اظہار کرنا اس کے دل کو عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ کتنی محبت بار نگاہوں سے تصویر میں موجود اس بے تحاشا شاندار پرسنیلٹی کے مالک شخص کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی لگاوٹ سے اس کے لیے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ کتنے ہی جگنو تھے جو اس پل اس کی نگاہوں میں آن ٹھہرے تھے اور آذر کمال کا دل بس ایک پل کو چاہا تھا کہ اپنے ہاتھ میں موجود اس تصویر کو انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے مسل ڈالے۔

''کیسی بیوی ہو تم یار! اپنے ہینڈسم میاں کو چھوڑ کر اپنی بڑی بہن کے ہونے والے سرتاج سے محبت کر رہی ہو اور وہ بھی بے تحاشا۔'' اندرونی بے جا اضطراب کو پابہ زنجیر کرنے میں اسے پل ہی لگا تھا اور اپنے دل میں اٹھنے والے اس بے تکے ابال پر دس دفعہ لعنت بھیجتے ہوئے وہ یکسر مختلف ٹون میں کشف سے مخاطب تھا اور اس کے اس انداز کو کشف ان چار ماہ میں بخوبی سمجھنے لگی تھی۔ تبھی بے حد اطمینان سے تصویر واپس البم میں لگا کر الماری کے نچلے حصے میں کسی مقدس صحیفے کی طرح رکھ آئی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے ٹھہر کر اپنے بالوں کو بینڈز کی زد سے آزاد کروانے لگی۔ آذر نے بے اختیار کشن اسے کھینچ مارا تھا۔

''تمہاری باتیں مجھے حسد میں مبتلا کر رہی ہیں۔'' انداز کچھ کچھ تنبیہی، کچھ کچھ شریر سا تھا۔ بازو سہلاتی کشف نے اسے قدرے غصے سے گھورا تھا۔

''تو میں کیا کروں؟''

''پیار۔'' آذر اس کے پیچھے آن رکا'' اور وہ بھی صرف مجھ سے۔'' اس کی کمر کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے آذر نے ٹھوڑی اس کے شانے پر رکھ دی تھی۔ کشف کی نگاہوں میں حد درجہ تحیر امڈ آیا تھا۔ اس نے آئینے میں نظر آتے آذر کے عکس کی نگاہوں میں جھانکا۔

''تم...... پاگل ہو آذر؟'' اگلے ہی پل وہ ہنس دی تھی۔ نجانے کیوں اور آذر کمال کے پاس اس کے اس سوال کا بے حد مربوط جواب موجود تھا۔

''ہاں میں پاگل ہوں اور صرف تمہارے لیے۔'' وہ اس کی مہکتی زلفوں سے الجھ گیا تھا اور کشف کے بے ساختہ قہقہے اس کے اندر تک تراوٹ اتار گئے تھے۔

اولاً کشف اس کی پسند تھی۔ گھنٹوں کے فرق سے محبت بنی پھر بیوی اور اب؟...... اب وہ اس کا عشق تھی اسے اس ننھے منے وجود سے بھی زیادہ عزیز تھی جو چند مہینوں کے وقفے سے اس دنیا میں اس کی محبت اور اس کے قانونی و شرعی رشتے کا حقیقی روپ لے کر دنیا میں وارد ہونے والا تھا۔

وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پایا تھا اور نام دینا چاہتا بھی نہیں تھا کہ اس کے خیال میں یہ ایک احمقانہ سوچ تھی مگر وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ جب بھی کشف یاور سے فون پر بات کر رہی ہوتی تھی یا کبھی اس کے ساتھ چیٹنگ پر گھنٹوں صرف کرتی تھی تو نجانے کیوں وہ مضطرب سا ہو جاتا تھا۔ دل بالکل سمندر بن جاتا جس کی وسعتیں کسی بڑے سے گرداب کی زد میں ہوتیں کشف کی باتوں میں یاور بن سہیل کا حوالہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے درخت کے لیے جڑ ناگزیر۔

اس روز کشف کے ویکلی چیک اپ کے بعد آذر نے اس کی عجیب سی کیفیت کو وہیں ہاسپٹل میں ہی بھانپ لیا اور واپسی پر جب استفسار کیا تھا تو وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر بے اختیار رو دی تھی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آذر۔'' واقعی سراسیمگی اس کے ہر ہر انداز سے مترشح تھی اور آج سے نہیں بلکہ کئی دن سے۔ آذر نے بے اختیار بازو پھیلا کر اسے خود سے نزدیک کر لیا تھا کشف کو شاید اس سہارے کی ضرورت تھی اس کے شانے سے سر ٹکا کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ آذر نے اس کے وجود کا ارتعاش اپنے دل تک محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا پھر ڈاکٹر نے بھی تو یہی کہا تھا کہ پریگنینسی کے دوران ہر عورت، معمول سے ہٹ کر حساس ہو جاتی ہے۔

آذر نے اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پہلے احتیاط سے موڑ کاٹا پھر کار کی رفتار قدرے دھیمی کر کے بہت نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا تھا۔

''تمہیں ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت بالکل بھی نہیں ہے، انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے بھی تو کہا ہے کہ کوئی Complication نہیں ہے اور پھر میں بھی تو تمہارے لیے دعا کراؤں گا شفا۔'' ایک بار پھر اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے تسلی دی۔ کبھی کبھار وہ موڈ میں ہوتا تو اسے

یونہی پکارا کرتا تھا۔ باقی کا راستہ آذر نے محض اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بہت سی بے معنی
کرتے ہوئے گزارا تھا۔

"میری ایک بات مانو گے آذر۔" کار ان کے اپارٹمنٹ کے سامنے رکی تھی۔ جب کشف
نکلتے ہوئے بڑی آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ فرنٹ سائیڈ کا دروازہ لاک کرتے ہوئے
اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

"دس باتیں مان لوں گا...... تم کہو تو۔" اس کا ہاتھ تھام کر وہ اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی
بڑھا تھا۔

"آذر! میں پاکستان جانا چاہتی ہوں...... اپنوں کے درمیان انسان زیادہ سکون محسوس کرتا ہے
میں بھی شاید...... پلیز تم سمجھو نا آذر...... وہاں سب لوگ ہوں گے امی، ماہ نور، چچی، فاریہ بھابی وغیرہ
زیادہ مطمئن رہوں گی پھر اگر ڈلیوری کے دوران مجھے کچھ ہو بھی گیا تو......"

"تمہیں اللہ سمجھے شفا...... کبھی تو غلطی سے ہی کوئی ایسی بات کر لیا کرو جو میرا دل خوش کر دے،
جی۔ تم نے بھی قسم کھائی ہوئی ہے کہ ہر بری اور بے تکی بات میرے سامنے ہی کرنی ہے۔" وہ اسے
لاک کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ کشف اس کے پیچھے تھی۔

"اب اپنی باتوں میں الجھا کر تم مجھے اصل بات بھلا دو گے۔" وہ شاکی ہوئی۔

"تم اگر بھول بھی جاؤ تو میں یاد رکھوں گا نا کیونکہ چند روز پہلے میں بھی کچھ ایسی ہی بات سوچ رہا
بچہ جب اپنی آنکھیں کھولے گا تو اس کے سبھی اپنے اس کے قریب ہوں گے پھر میں چاہ رہا تھا کہ بابا ہی
کے کان میں اذان دیں۔" اپنی اس برملا خواہش کا اظہار کرنے میں اس نے پل بھر کا توقف نہیں کیا تھا
کی بنیادی وجہ شاید لاشعوری طور پر یہی تھی کہ کشف نے "سب لوگوں" میں یاور بن سہیل کا نام نہیں لیا تھا
ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً وہ چاہنے کے باوجود کشف کو پاکستان نہ لا پاتا۔

کشف نے تو صرف چند مہینوں کے لیے آنے کی بات کی تھی مگر وہ یہیں مستقل سیٹل ہو جانے کا ارادہ
لے کر آیا تھا۔ تبھی آتے ہی نوکری کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی۔ کینیڈین فرم کے تین سالہ تجربہ
شاندار اکیڈمک ریکارڈ کی بنا پر اسے جلد ہی ایک پرائیویٹ فرم میں جاب مل گئی تھی۔ جبکہ بابا اپنی گارمنٹ
فیکٹری کا چارج اس کے حوالے کرنا چاہتے تھے جو کہ وہ اپنے بڑے بیٹے شجاعت کے ساتھ پارٹنرشپ
بنیاد پر چلا رہے تھے۔ آذر کے ذہن میں کہیں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ پارٹنرشپ دو بھائیوں میں تفرقہ
ڈالنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے تبھی اس نے نوکری کو ترجیح دی۔ پھر اس نوکری کے حوالے سے ملنے
مراعات بھی قابل قدر تھیں۔

بچے کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ان کی پہلی ویڈنگ اینورسری تھی جسے کسی بڑے پیمانے

منانے کا خیال آذر نے خود ہی ذہن سے نکال دیا تھا اور وہ اسے آواری میں ڈنر کروانے لے گیا تھا۔ اس
روز وہ بہت خوش تھا مگر محض ایک بات نے سارا موڈ غارت کر دیا تھا۔ آذر کو تو کشف یوں بھی خوب صورت
ہی لگتی تھی پھر آج تو وہ بہت ٹک سک سے تیار ہوئی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر تک اس گزرے سال کو یاد کرتے
رہے اور پھر یونہی باتوں باتوں میں آذر نے اس کی تعریف کی تھی۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو اسپیشلی یہ بلیو کلر تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔" کشف سر جھکا کر مسکرا دی تھی
ویسے بھی آج وقتاً فوقتاً شرمیلی سی مسکان اس کے لبوں کا احاطہ کر رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے آذر! یاور بھائی کا فیوریٹ کلر ہے بلیو۔" کشف نے خوشی خوشی اسے بتایا تھا اور اس کا
حلق اندر تک کڑواہٹ سے تر ہو گیا تھا یعنی اس کی زندگی کے اتنے اہم موقع پر اس کی بیوی یاور بن سہیل کی
پسند کا رنگ پہنے گی۔ اس کی طبیعت مکدر ہو گئی مگر چونکہ آج کا خوب صورت دن وہ کسی بدمزگی کی نذر نہیں کرنا
چاہتا تھا تبھی ایک بار پھر سر جھٹک دیا تھا اور واپسی میں وہ اسے وہ گھر دکھانے لے گیا تھا جو اس نے حال ہی
میں خریدا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس گھر میں شفٹ ہو جائیں کیوں کہ آذر کا آفس
یہاں سے قریب تھا۔

اس کے بعد کا عرصہ جیسے چٹکیوں کی زد پر گزرا تھا۔ آذر اس دوران اپنے آفس کے کاموں میں
مصروف رہا اور کشف نے گھر کی آرائش و زیبائش میں وقت گزارا۔

کشف کو پا کر وہ خوش تھا اور سحر کو پا کر بےحد مطمئن۔ تبھی اس کی ملاقات ایک بار پھر یاور بن سہیل سے
ہوئی۔ وہ تائی جان اور ماہ نور کو لے کر ہاسپٹل آئے تھے۔ آذر کی یاور سے یہ محض دوسری ملاقات تھی اور آذر
کو جو ان دنوں اپنا آپ ایک مشکیزے کے مترادف لگنے لگا تھا جس میں یاور بن سہیل کے لیے ناپسندیدگی
قطرہ قطرہ اکٹھی ہو رہی تھی اب سخت شرمندگی ہوئی۔ اتنے شائستہ اطوار والے شخص سے بلاوجہ کا حسد پال لینا
نری حماقت ہی تھی۔ پھر اسے یاور اور ماہ نور کی شادی سے متعلق کچھ سن گن بھی ملی تھی۔ مگر چونکہ اس وقت سبھی
لوگ موجود تھے اس لیے اسے خود سے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ لگا۔

مگر یہ سب محض ایک دن یا چوبیس سے چھبیس گھنٹے کے لیے تھا۔ یاور کے لیے پیدا ہونے والی
کدورت جو اس دن کی ملاقات کے بعد ختم ہونے کو تھی یکدم خون بن کر رگوں میں دوڑنے لگی۔ وہ مشکیزہ
جس میں ناپسندیدگی رفتہ رفتہ متحد ہو رہی تھی ایک آن میں منہ تک بھر گیا۔

وہ آفس سے قصداً جلدی آ گیا تھا کیونکہ آج کشف کو ڈسچارج کر دیا جانا تھا۔ حالانکہ امی نے کہا بھی
تھا کہ وہ کشف اور سحر کو گھر لے آئیں گی مگر آذر نے اپنا موقف نہیں بدلا تھا۔ وہ کشف اور سحر کو اپنے نئے گھر
میں ہی لے جانا چاہتا تھا۔ ہاسپٹل کے پارکنگ لاٹ میں کار پارک کرنے کے بعد وہ بڑے مطمئن انداز
میں لفٹ کی جانب گیا تھا۔ سیکنڈ فلور کے کمرہ نمبر سات کے بند دروازے کے آگے بس چند منٹ ٹھہر کر اس

نے کچھ سوچا تھا پھر دلکشی سے مسکرا کر ہولے سے دروازہ دھکیلا تھا اور بائیں ہاتھ میں پکڑا گلاب
پیچھے چھپا لیا تھا۔ دروازے نے بہت خفیف سی آواز پیدا کی تھی وہ اندر داخل ہو گیا ملگجے سے اندھیر
اس نے وہ دیکھا جسے دیکھ لینے کے بعد خون رگوں میں آگ بن کر پچھاڑیں مارنے لگا تھا۔ مٹھیا
اختیار بھنچ گئی تھیں۔

یاور بن سہیل...... کشف آذر کمال پر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ کشف کی پیشانی کو چھو ر
اور کشف...... وہ مسکرا رہی تھی۔ جبکہ آذر کے دل و دماغ میں اتھل پتھل شدید ہونے کے باوجود
دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا تھا۔ تبھی یاور سیدھا ہوا اور کشف کی نگاہ آذر پر پڑی۔

"آذر......" اس نے نعرہ لگایا اور آذر جان نہیں سکا ان دونوں کے تاثرات...... وہ مسکرا رہے
"اچھا ہوا تم آ گئے میں ابھی یاور بھائی سے کہہ رہی تھی کہ آذر بھی......"

"چلو...... ڈاکٹر نے تمہیں ڈسچارج کر دیا ہے۔" بہت سرد مہری سے کہتے ہوئے اس نے آگے
سحر کو گود میں اٹھا لیا تھا اور بنا ان دونوں کی جانب دھیان دیے باہر نکل گیا تھا۔

اسی ایک خیال نے ایک بار پھر اس کے ذہن سے لے کر ریڑھ کی ہڈی تک پھریری سی دوڑا
اور وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ انداز نشست رتی بھر بھی نہ بدلا تھا۔ ویسے ہی کہنیوں کو گھٹنوں کا سہارا
ہتھیلیاں آپس میں پیوست کرنے کی لاشعوری سی کوشش کرتے ہوئے اس نے پچھلے تیرہ ماہ حرف بہ
سوچ ڈالے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا آسمان پر چھائی سرمئی بدلیاں ارتعاش کے زیر اثر تھیں ہوا
خمار ساز ندہ ہو چکا تھا اور کچھ دیر قبل والا سکوت اور حبس کہیں نہ تھا۔

اور جب طویل اور بے معنی سکوت ٹوٹتے ہیں تو طوفان آتا ہے جس میں بارش برستی ہے جو اندر
بھڑکتے الاؤ کو بجھا دیتی ہے اور آگ بجھ جائے تو دھواں اٹھتا ہے۔ ایسا دھواں جو سانسوں کو آلودہ کر
باعث بنتا ہے۔

آذر کمال نے بالآخر سنگی سیڑھیوں کو بخش دیا تھا۔ پیٹ میں دھمال ڈالتے چوہوں کو تسلیاں د
ہوئے اور دماغ میں کلبلاتے کیڑے کو ڈپٹ کر سلاتے ہوئے اس نے اندر کا رخ کیا تھا۔ لاؤنج سے
کر لونگ روم تک مہیب سناٹا اپنے پنجے گاڑھے بیٹھا تھا۔ وہ کچن میں آیا جہاں کچن ٹیبل پر پچھلے پانچ روز
طرح کھانا چنا ہوا تھا ٹرانسپیرنٹ جگ میں ٹھنڈا ٹھار پانی موجود تھا باؤل میں دو طرح کا سالن موجود تھا جس
میں سے دھواں اٹھ اٹھ کر مہین سے بادل بناتا تھا اور محو ہو جاتا تھا سب کچھ تھا اور پچھلے پانچ روز سے یہی تما
ہو رہا تھا۔

وہ صبح اٹھتا تو ناشتا یونہی موجود ہوتا اور آفس سے واپسی پر بھی ٹیبل بجی سجائی ملتی تھی۔ لیکن اگر اسے تنہا
بیٹھ کر ہی پیٹ بھرنا ہوتا تو گھر کی بجائے کوئی بھی ریسٹورنٹ نہایت مناسب جگہ ہو سکتی تھی۔ اس نے گردن

موڑ کر دیکھا۔ کچن کے دروازے کے عین مقابل اس بیڈ روم کا دروازہ تھا جہاں پچھلے پانچ روز سے کشف
نے مع سحر کے بسیرا کیا ہوا تھا آج بھی وہ دروازہ بند تھا۔ آذر نئے سرے سے جل بھن کر خاکستر ہوا۔ پیٹ
میں محو دھمال چوہے سو گئے تو ذہن کا کیڑا از سر نو بیدار ہوا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے بیڈ روم میں گھس گیا بڑی
مشکل سے خود پر ضبط کیا تھا ورنہ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ کچن سے لے کر بیڈ روم تک ہر چیز کا حشر بگاڑ دے۔
ازدواجی زندگی کی یہ چھٹی بدصورت رات تھی جو ایک بدصورت دن کے اختتام پر اس کی منتظر تھی۔ کتنا
دل چاہ رہا تھا کشف سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو۔ سحر کو پیار کرنے کو دل مچل رہا تھا۔ اس نے شرٹ اتار
کر ہوا میں اچھالی اے سی آن کیا اور دھپ سے بیڈ پر گر گیا۔ بند کھڑکی سے باہر چھاجوں چھاج برستا مینہ
اودھم مچا رہا تھا اور اندر وہ کروٹیں بدل بدل کر خوب صورت سے بیڈ کے جوڑ ہلا رہا تھا۔ نیند ذہنی خلفشار کے
ہوتے ہوئے بھی کافی رات گئے اس پر مہربان ہوئی تھی۔ اس نے ناگواری سے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کیا
پھر چند لمحے یونہی بیڈ پر اوندھا لیٹا رہا۔ آج تو آفس جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا پھر دوسرا اسے چائے کی
شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ طوہاً کرہاً اٹھا اچھی طرح خبر تھی کہ جب وہ چائے بنانے کچن میں جائے گا تو ٹیبل
پر ڈنر کے لوازمات کی بجائے ناشتا ہوگا۔ وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا اور بغیر منہ دھوئے ہی کمرے سے باہر آ گیا۔

کچن میں مصروف عمل کشف کو دیکھ کر اس نے خاموشی سے ایک طویل سانس ہوا کے سپرد کر ڈالا پھر
وہیں دروازے کی چوکھٹ سے شانہ ٹکا کر اسے دیکھنے لگا، ابھی جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے کشف کی
مہک کو کمرے کی ہر شے میں محسوس کیا تھا اور اب وہ اس کے عین سامنے تھی۔ اتنے دنوں بعد نظر بھر کر دیکھنے
کا موقع ملا تھا ورنہ کشف نے تو اس سے ایسے تمام تر مواقع چھین لیے تھے یقیناً آج وہ خود بھی دیر سے بیدار
ہوئی تھی تبھی تو کچن میں تھی ورنہ اس کا معمول تو یہ ہو گیا تھا کہ ناشتا لگا کر الارم اس کے سرہانے رکھ دیتی تھی
اور اس کے بیدار ہونے سے قبل ہی واپس بیڈ روم میں روپوش ہو جاتی تھی۔

آذر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا جھگڑا تھا اور وہ بھی اس قدر طویل ترین
......رات تک جو یہ سوچ رہا تھا کہ پیش قدمی نہیں کرے گا اسے دیکھتے ہی ہار گیا۔

"یاور بن سہیل جائے جہنم میں...... میں اس کے لیے اپنی بیوی کو خفا کیوں کروں۔"
حقیقتاً وہ تھک گیا تھا اور اب دل دہائیاں دے رہا تھا۔ کشف جو سامنے تھی آذر نے سر کی پشت پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے فقط چند پل سوچا پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے بے حد قریب پہنچ گیا۔
"گڈ مارننگ۔" شیلف پر دائیں بائیں ہتھیلیاں جما کر اس کے تمام تر راستے مسدود کرتے ہوئے
ان کے بے حد قریب دھیرے سے سرگوشی کی۔ وہ شاید آملیٹ کے لیے آمیزہ تیار کر رہی تھی۔ پل بھر کو
اکی لحظہ بھر کو ہاتھ رکے اور آذر نے ایک بار پھر اسے اس کے کام میں مگن ہوتے دیکھا۔
"اچھا چلو...... اب صبح ہی صبح کوئی اچھی سی بات کرو جو میرا دل خوش کر دے۔" فرمائش کی مگر جواب

ندارد۔ وہ اپنے اس روز کے نامناسب رویے کو یاد کر کے شرمندہ بھی ہو رہا تھا تبھی کشف کو اتنی اجنبیت اور
سرد مہری اپنائے رکھنے پر حق بجانب سمجھتا تھا۔

''شفا! مجھ سے بات کرو یار اتنے دنوں سے میں نے تمہاری آواز نہیں سنی۔ کیا ابھی تک خفا ہو''
آذر نے اپنے ہمیشہ والے انداز میں اس کے شانے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے دریافت کیا اور اب
کشف خاموش نہیں رہی تھی۔ وہ چمچہ پٹخ کر اس کی جانب پلٹی تھی۔

''تمہیں میری خفگی کی پروا ہے آذر!'' بڑے کٹیلے انداز میں پوچھا مگر آذر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''تمہاری ہی تو خفگی کی پروا ہے ورنہ سارا جہان جائے بھاڑ میں۔'' شوخی سے کہتے ہوئے اس
کے گرد ہاتھ باندھ دیے اور حیرت انگیز طور پر کشف نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔

''تمہیں یاد ہے آذر! تم کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔''

''تھے سے کیا مراد ہے؟...... میں تو ابھی بھی یہی کہتا ہوں۔'' وہ اس کی بکھری زلفیں سمیٹنے لگا۔

''کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے نا آذر؟''

''کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو شفا میں اگر کہہ رہا ہوں تو کر بھی تو رہا ہوں۔ ریئلی یار!
صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے میں نے اور وہ صرف تم ہو۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''پھر محبت میں تو شک کی گنجائش نہیں ہوتی آذر!...... کیوں مجھ پر شک کر کے مجھے میری ہی نظروں
سے گرا رہے ہو۔'' آذر نے اپنا کام ترک کر کے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ گہری بھوری آنکھوں میں
قطرہ قطرہ سمندر سمٹ رہا تھا آذر نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر انگوٹھوں کی مدد سے بے حد نرمی
کے ساتھ اس کی آنکھیں صاف کیں۔

''میں تم پر شک نہیں کر رہا کشف...... میں تم پر شک کر ہی نہیں سکتا۔''

''تم یاور بھائی پر تو شک کر رہے ہو آذر!''

آذر کے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر پہلو میں گر گئے۔ سارے خوش کن جذبات برنر کی آنچ پر چڑھ گئے
اور اس کے اعصاب تن گئے۔

''پلیز کشف! میں یاور کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔'' فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ
سے لگاتے ہوئے اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''تمہیں بات کرنی ہوگی آذر! کیونکہ...... کیونکہ میں یاور بھائی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ بے بسی
سے بولی تھی اور آواز میں محسوس کی جانے والی نمی تھی۔ آذر بری طرح سلگ گیا اس نے جبڑے مضبوطی سے
بھینچ کر بوتل فریج میں رکھی۔ کشف کی آنکھیں التجاؤں کا قلعہ بنی ہوئی تھیں۔

''تمہیں یاور کے بغیر رہنا پڑے گا کشف کیونکہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' اس نے ٹھوس لہجے

میں گرا کر کرسی پر ڈھے گئی۔
اپنی بات واضح کی۔ کشف اپنا سر ہاتھوں میں گرا کر کرسی پر ڈھے گئی۔
''آذر! وہ میرے بھائی ہیں۔'' وہ روتے ہوئے بڑی بے بسی سے بولی آذر نے ایک کڑی نگاہ اس
پر ڈالی۔

''نہیں کشف وہ تمہارا بھائی نہیں ہے...... کبھی تم نے سوچا ہے کشف کہ جس شخص کو تم بھائی بھائی کہتے
نہیں تھکتیں وہ تمہیں کیا سمجھتا ہے...... تم اس کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتی ہو...... نہیں سوچا تو اب سوچو اور
اگر نہیں سوچ سکتیں تو مجھ سے سنو...... تم یاور بن سہیل کے لیے صرف ایک عورت ہو...... ایک حسین اور خوب
صورت عورت...... سمجھیں تم...... صرف عورت۔'' نہایت نفرت سے اس شخص کی حقیقت بیان کر کے وہ اس
تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ کشف کے تاثرات دیکھ سکے وہ تو بس اپنے اندر مچلتے اس
جوار بھاٹے کی چند موٹی موٹی چنگاریاں کشف پر اڑا کر آیا تھا۔

+

کشف...... وہیں کچن ٹیبل کی کرسی پر کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھی تھی۔ بے بسی ہر انداز سے
ہویدا تھی کہ ہاتھ میں نہ زادِ راہ تھا اور نہ ہی منزل کا معتبر پتا۔

نجانے آذر کے دماغ میں یہ خناس کہاں سے بھر گیا تھا کہ وہ اس کے باپ جیسے بھائی کے لیے اس قسم
کے خیالات کا اظہار کر گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ کشف سے بے حد محبت کرتا ہے تو کیا محبت یہی ہے؟ کسی بھی
انسان کو محض خود تک محدود کر دینے کا نام۔

وہ آذر سے پوچھنا چاہتی تھی اور اسے بتانا بھی چاہتی تھی کہ ''کچھ لوگوں کی محبت ہمارے خمیر کا حصہ
ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یاور بھائی کی محبت میرے خمیر میں گندھی گئی ہے پھر تم خود بتاؤ آذر! اگر میں ان
سے محبت کرنا چھوڑ دوں تو زندہ کیسے رہوں۔'' مگر کیسے بتاتی کہ آذر تو یاور بھائی کا نام تک سننے کا روادار نہ
تھا۔ اس روز ہاسٹل میں ہی وہ آذر کے رویے کو بھانپ گئی تھی مگر سمجھ نہ پائی تھی کہ اصل وجہ کیا ہے دو روز تک
خود سے کوئی سرا تلاشنے کی کوشش کے بعد بالآخر اس نے آذر سے پوچھ لیا۔ آذر فوراً بھڑک اٹھا تھا۔

''وہ شخص کون ہوتا ہے میری بیوی کی پیشانی چومنے والا؟''

''آذر۔'' وہ دنگ سی رہ گئی۔ ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ آذر اس بات کو اتنے غلط انداز میں لے گا۔ یاور
بھائی نے تو اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسے بیٹے کی مبارک باد دی تھی۔ تو کیا وہ شخص اتنا بھی حق نہیں
رکھتا تھا کہ اس لڑکی کی پیشانی پر پیار کر سکے جس نے اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا اور جسے وہ بیٹی کہا کرتا
تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے دل برداشتہ ہوئی تھی کہ کچھ بول ہی نہ پائی تھی جبکہ آذر بول رہا تھا اسے کوئی دقت
نہ تھی۔

''اپنے ہی گھر میں میں اجنبی ہو گیا ہوں کشف! یہاں تو ہر طرف یاور بن سہیل ہے۔ پردے سے

لے کر بیڈ شیٹس تک تم نے اس کی پسند و ناپسند کو مدنظر رکھا۔ گھر کے انٹیریئر تک میں وہ سب۔ آئینہ بن راز ا فرنیچر تم نے اس لیے پسند کیا کیونکہ وہ یاور بھائی کو پسند تھا۔ ہمارے بیٹے کا نام تم نے وہ رکھا جو اسے پسند تھا۔ تم اس کی پسند کے کھانے پکاتی ہو اور یہاں تک اکتفا نہیں ہے تم یاور ہی کی پسند کے کلرز پہنتی ہو اور تو اور تم نے گلے میں میرا گفٹ کیا ہوا لاکٹ پہننے کی بجائے یاور کا دیا ہوا لاکٹ پہن رکھا ہے۔ کیوں کشف ...... آخر کیوں؟ کیا میرا اس گھر پر کوئی اختیار نہیں؟ کیا میری بیوی کا یہ فرض نہیں بنتا کہ وہ میری پسند و ناپسند کو مقدم جانے؟"

اوہ تو گویا یہ ایک پل کی نہیں صدیوں کی کہانی ہے۔ کشف نے جھکا سر اٹھایا آذر متغیر چہرہ لیے اس کے سامنے تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ یہ سب صرف یاور بھائی کی نہیں خود اس کی پسند بھی تھا۔ بس غلطی یہ ہوئی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً اسے یاور بھائی سے منسوب کرتی رہی تھی۔ ہر بار آذر نے اسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا اور وہ کرتی بھی رہی تو پھر اب یہ کڑوا اعتراض کیوں؟

"اور اب میں اس شخص کو مزید تمہارے اور اپنے درمیان برداشت نہیں کر سکتا۔" آذر نے رخ موڑ کر قطعی ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔

"فیصلہ تمہیں کرنا ہے کشف! کہ ہم دونوں میں سے تمہیں کون زیادہ عزیز ہے...... مگر یاد رکھنا کوئی فیصلہ ہو تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہوگا۔"

وہ اتنی اجنبیت سے کہہ رہا تھا اور یہ اس شخص کا ایک نیا ہی روپ تھا جس سے کشف متعارف ہوئی تھی۔ یہ شخص جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا اسے سمجھنے میں کتنی غلطی کر رہا تھا۔

"اگر میں تم سے کہوں کہ شجاعت بھائی کو چھوڑ دو...... تو کیا تم چھوڑ دو گے۔" وہ ایک دم اس کے سامنے آ گئی۔ اپنے اندر کا دکھ چھپا کر قدرے تیزی سے پوچھا۔ اپنے تئیں اس نے آذر کو لاجواب کر دیا تھا مگر جواباً آذر کے لبوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"شجاعت میرے بھائی ہیں کشف اور یہ رشتہ یوں معتبر ہے کہ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون ایک ماں باپ کا ہے۔" آذر کہہ کر چلا گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ اپنی سوچ اور احتجاج کرتی محبت کے ساتھ۔

رشتے صرف خون نہیں دل بھی تو بناتے ہیں۔ جیسے یاور بھائی کا رشتہ ان لوگوں سے تھا۔ وہ صرف ان کے بھائی ہی نہیں باپ بھی تھے۔ ان کے لہجے و انداز میں ہمیشہ پدرانہ شفقت ہوتی تھی اپنی اور ماہ نور کی شادی میں دیر بھی وہ صرف اس غرض سے کر رہے تھے کہ پہلے کشف کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر بھی آذر کہتا تھا کہ۔

"نہیں...... ناممکن۔" اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا پھر چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ وہیں کچن میں بیٹھی تھی۔ ادھ کٹی پیاز جوں کی توں شیلف پر دھری تھی۔ چائے کا پانی کھول کھول کر سوکھ چکا تھا۔ ڈور بیل

چیخ رہی تھی اور ساتھ ہی سحر بھی۔

اس نے تیزی سے چہرہ خشک کیا۔ برنر آف کیا۔ بھاگ کر دروازہ کھولا باہر کام والی ماسی کھڑی تھی۔ پھر اسی تیز رفتاری سے جا کر سحر کو اٹھایا۔ بچپن سے اب تک یاور بھائی کی مضبوط شخصیت کو دیکھا تھا۔ وہ بری طرح ان سے متاثر تھی شروع شروع میں ان کے انداز و اطوار، پسند و ناپسند وہ جان بوجھ کر اپناتی تھی مگر بعد میں یہی سب اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔

وہ واقعی ان سے بے حد محبت کرتی تھی اور آذر یہ سمجھنے کو تیار نہ تھا کہ دلوں میں ہر شخص کی محبت کا ایک خانہ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی ایک کی محبت ہی اسے لبالب بھر دے۔ اسے بہت پہلے آذر کی کہی باتیں یاد آنے لگیں۔

"میرے سوا کسی کو مت چاہو شفا۔" اسے آذر کے انداز میں معصوم بچوں کی سی ہٹ دھرمی محسوس ہوتی تھی تبھی وہ ہنس دی تھی۔

"اچھی زبردستی ہے...... اب کیا تم جذبات پر بھی پہرے بٹھاؤ گے؟"

"بالکل بٹھاؤں گا بلکہ تمہیں ایسے پہرے لگانے ہی پڑیں گے۔ ورنہ میں قتل کر دوں گا۔"

"کسے؟" کشف نے شرارت سے پوچھا تو وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"تمہیں...... تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔"

اس کے خیالات کے تسلسل کو ٹیلی فون کی بیل نے توڑا۔ اس نے سحر کو پہلے کاٹ میں لٹایا پھر ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی۔ مگر اسکرین پر نظر آتے نمبر نے اسے ریسیور اٹھانے سے روک دیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر کھڑکی میں جا رکی، باہر پچھلی رات کی بارش کے بقایاجات موجود تھے۔ اس نے متواتر بجتی ٹیلی فون بیل سے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ آنکھیں لبالب بھری تھیں بھنچنے سے بہنے لگیں۔ تبھی ملازمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "باجی...... فون۔" وہ متحیر سی باجی جی کی شکل دیکھ رہی تھی۔ "تم جاؤ میں دیکھتی ہوں۔" کشف نے اسے جانے کے لیے کہا اور پھر بڑھ کر فون کا پلگ نکال دیا پھر وہیں چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر رو دی۔

✦

پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا مگر نظریں ابھی تک ٹیلی فون سیٹ پر تھیں ایک عجیب سی الجھن اور حیرانی نے انہیں گھیر لیا تھا۔

"آخر آذر کیوں نہیں چاہتا کہ کشف مجھ سے ملے۔" دل نے خود کلامی سی کی تھی۔ ابھی ابھی وہ کشف سے بات کر کے فارغ ہوئے تھے۔ مگر ہمیشہ کی طرح مطمئن ہونے کی بجائے الجھ گئے تھے۔ پہلے تو بات کرنے کا موقع ہی اتنی دیر سے ملا صبح سے نمبرز ملا ملا کر تھک گئے تھے اور اب جب کشف کی طرف جانے کا

سوچ رہے تھے تو ادھر سے فون ریسیو کرلیا گیا تھا۔ آذر تو اس وقت آفس میں ہوتا تھا ظاہر ہے فون ریسیو
ہی کشف نے تھا۔ حال احوال دریافت کرتے ہوئے اچانک یاور کو کشف کی آواز بوجھل لگی تھی۔

''تم رو رہی ہو کشف!'' انہوں نے استعجاب سے پوچھا۔

''نن...... نہیں تو یاور بھائی...... بس ہلکا سا زکام ہو رہا ہے۔'' انہوں نے فوراً ڈپٹ دیا۔

''جھوٹ مت بولو اور سچ بتاؤ کہ کیوں روئی ہو۔'' وہ بخوبی آگاہ تھے کہ کشف کو جھوٹ بولنے
سلیقہ نہیں آتا پھر کچھ ان میں بھی کہی گئی بات کی حقیقت پرکھ لینے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ دوسری طرف کشف
کی سسکیاں انہیں مزید مضطرب کر گئی تھیں۔

''میں نہیں بتا سکتی یاور بھائی۔ پلیز...... پلیز مجھ سے مت پوچھیں۔'' یاور کی حیرانی دوچند ہوئی کہ
زندگی میں پہلی بار ہوا اور نہ اس سے قبل تو یاور کو کبھی پوچھنے کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی۔ وہ ہمیشہ خود ہی اپنا
ان کے سامنے رکھ دیتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تم نہیں بتانا چاہتی تو مت بتاؤ مگر میں ابھی تمہاری طرف آ رہا ہوں۔''

''نہیں یاور بھائی! پلیز آپ مت آیئے گا۔'' کشف کا تیزی میں کہا گیا جملہ انہیں حد درجہ حیران
کر گیا تھا۔ دوسری طرف یقیناً کشف ایسا بے اختیاری میں کہہ گئی تھی کیونکہ اس کے بعد طویل خاموشی تھی۔

''یاور بھائی! آذر نہیں چاہتے کہ میں آپ سے ملوں اور پلیز اب یہ مت پوچھیے گا کہ کیوں؟ کیونکہ
اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے ہی نہیں۔'' بھیگی ہوئی لڑکھڑاتی آواز میں کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر
دیا اور یہاں ریسیور یاور کے ہاتھ میں جھول گیا۔

''آخر ایسی کون سی بات ہے جس کی بنا پر آذر کشف کو مجھ سے نہیں ملنے دینا چاہتا۔'' انہوں نے خود
سے سوال کیا تبھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہاسپٹل کے روم کے دروازے کی دہلیز کے قریب مسلا ہوا پھول
آ گیا تھا۔ ان کا ذہن عجیب سے خیالات سے بھرنے لگا مگر کچھ بھی سوچنے سے قطعی گریز کرتے ہوئے
انہوں نے کار کی چابی ٹیبل سے اٹھائی۔ موبائل ہاتھ میں لیا۔ کمرے سے باہر نکل کر پہلے سیکرٹری کو چند
ضروری ہدایات دیں پھر آفس سے باہر آ گئے۔

پچھلی رات برسنے والی بارش نے سارے شہر پر خاصے خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔ آسمان سے
زمین تک ہر چیز دھلی دھلائی لگ رہی تھی۔ درختوں کے پتے نکھر کر کچھ اور ہرے سے لگنے لگے تھے۔ اس
وقت چار بجے تھے۔ شام میں معلوم ہوتی دوپہر تھی کتنا وقت بیت گیا تھا بارش کو تھمے مگر نیلے آسمان پر سفید
بادل روئی کے گالوں کی طرح یہاں سے وہاں ہوا کی زد پر اڑتے پھر رہے تھے اور یاور کو یہ موسم بہت بھاتا
تھا۔ انہیں بارش بہت پسند تھی کشف کو بھی بارش پسند تھی اور اگر ان کا ذہن کشف کے عجیب رویے اور آدھی
ادھوری باتوں میں نہ الجھا ہوتا تو ضرور اس موسم کی دلفریبی سے لطف اندوز ہوتے۔ کچھ دیر کے لیے ماہ نور کو

سوچ... آج بھی کشف کو اپنی اور ماہ نور کی شادی کے متعلق بتانے کے لیے ہی فون کیا تھا
چے اور خوش ہوتے۔
وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

''آپ کی شادی پر تو میں ڈبل نیگ وصول کروں گی سالی کی حیثیت سے بھی اور بہن کی حیثیت سے
ی۔'' اور وہ ہنس دیتے تھے کہ انہیں تو اس کی ہر حیثیت دل و جان سے قبول تھی۔ وہ اسے اپنی بہن نہیں بیٹی
نتے تھے کہ جب کشف نے پہلا قدم اٹھایا تھا تو وہ ان کی انگلی تھامے ہوئے تھی۔ اس نے بولنا ان سے
یکھا تھا۔ لکھنا بھی ان ہی کے قلم سے شروع کیا تھا۔ وہ اپنی ہر بات انہیں بتاتی تھی۔ وہ اپنی ہر فیلنگ ان
سے شیئر کرتی تھی۔ اس گھر میں انہیں اتنی محبت ملی تھی کہ اکثر سوچتے شاید سگے ماں باپ اتنی محبت ان کی
ہولی میں نہ ڈال پاتے۔

حسام...... جنہیں وہ ماہ نور اور کشف کی طرح ابو ہی کہا کرتے تھے کی وفات کے بعد احسان مندی کے
احساسات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر شائستہ، ماہ نور، کشف اور کاشف کا خیال رکھا تھا۔ جن
دنوں کشف کی شادی ہوئی وہ جاپان میں تھے! جہاں اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکنے کا افسوس تھا وہیں
اس فرض کے پورا ہو جانے کا اطمینان تھا۔ انہیں ان کی فرم کی طرف سے چھ ماہ کے لیے بھیجا گیا تھا مگر وہاں
ان کے اچھے کام سے متاثر ہو کر کچھ مزید عرصہ روک لیا گیا اور اب ایک سال بعد واپس آئے تھے کاشف کا
ایڈمیشن یو ای ٹی میں ہو چکا تھا۔ شائستہ اور ماہ نور کو اپنے ساتھ ہی لے جانے کا ارادہ تھا اور کاشف کی رہائش
کا بندوبست ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں ہو گیا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد کشف سے ملے اور اسے دیکھتے ہی مسحور سے رہ گئے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ
خوب صورت ہو گئی تھی اور اپنی ننھی سی بیٹی کو گود میں لیے کتنی معتبر سی لگ رہی تھی۔ ماں بن گئی تھی مگر انہیں
دیکھتے ہی کسی ننھی بچی کی طرح پرجوش ہو گئی تھی۔

''یہ ہیں میری بیٹی کے اصل ماموں۔'' ہنستے ہوئے اس نے کاشف کو چڑایا تھا۔

''تو میں کیا نقل ہوں۔'' بجائے چڑنے کے وہ بھی ہنستا رہا تھا اور اس وقت ہاسپٹل کے کمرے میں
موجود سبھی لوگ کتنے خوش اور مسرور تھے تبھی انہوں نے آذر کو دیکھا تھا جو مسلسل کاٹ میں لیٹی اپنی بیٹی سے
کھیل رہا تھا۔ وہ آج بھی انہیں اتنا ہی اچھا لگا تھا جتنا کہ اول روز...... بے حد سلجھا ہوا، مدبر اور شائستہ اطوار
کا حامل تبھی تو وہ کشف کے لیے راضی ہوئے تھے۔ پہلے وہ آذر کی ظاہری خوبیوں سے متاثر ہوئے تھے مگر
اسے اہم کشف کے حوالے نے بنایا تھا...... وہ صرف ان کا بہنوئی ہی نہیں داماد بھی تھا۔ وہ ہمیشہ ان سے
بہت تمیز سے ملتا تھا۔ بہت عزت سے پیش آتا تھا۔

ان کی کار حفیظ سینٹر کے سامنے رکی تھی جس کی مخالف سمت میں آذر کا آفس تھا۔ اگرچہ وہ گھر جانے
کے ارادے سے نکلے تھے مگر کچھ سوچ کر آذر کے آفس کی طرف آ گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ

یہ سب بے اختیاری میں ہوا اور ہوتا ہی چلا گیا۔

بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد سیکرٹری نے انہیں آذر کے آفس میں جانے کے لیے کہا یقیناً وہ میٹنگ سے فارغ ہو گیا تھا۔ انہوں نے آفس میں داخل ہوتے ہی با آواز بلند سلام کیا تھا اور ان کے خیال میں تو آذر کی جانب سے بھی ایسی ہی گرمجوشی کا اظہار ہونا چاہیے تھا مگر آذر نے کوئی خاص رسپانس ظاہر نہیں کیا تھا۔ مصافحے کے لیے بھی یاور نے ہی ہاتھ بڑھایا تو اس نے جیسے طوعاً و کرہاً اپنی چیئر پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملا کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پلیز تشریف رکھیے۔ کہیے...... کیسے آنا ہوا۔" بظاہر ہمیشہ کی طرح آج بھی تمیز سے بول رہا تھا مگر آواز و انداز میں واضح محسوس کی جانے والی سرد مہری تھی۔ یاور نے اسے اپنی غلط فہمی سمجھتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ ادھر ادھر نجانے کس چیز کی تلاش میں ہاتھ مارتے ہوئے وہ ان کی جانب قطعاً متوجہ نہ تھا۔ سفید شرٹ پر بلیک ٹائی لگائے وہ گزشتہ دنوں کے برعکس زیادہ ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کیوں نہ جاتے جاتے تم سے ملتا جاؤں۔" انہوں نے حتی المقدور اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کی تھی۔

"کوئی کام تھا؟" آذر نے اپنے سابقہ انداز میں پوچھتے ہوئے فائل کھول کر سامنے ٹیبل پر رکھی تھی۔ یاور کو یکدم بے حد سبکی کا احساس ہوا۔

"نہیں کام تو نہیں تھا مگر......" انہیں آذر کا یہ نیا سا اور قدرے ترش رویہ حیران کر رہا تھا۔

"میں شاید غلط وقت پر آ گیا...... تم تو مصروف ہو غالباً۔" انہوں نے پھر کہا۔ آذر نے اب کی بار کچھ بھی کہنے کی زحمت نہ کی تھی، یاور کے اندر تضحیک کا احساس سر ابھارنے لگا یہاں معاملہ کشف کا نہ ہوتا تو کبھی وہ اتنی دیر تک نہ بیٹھتے بلکہ یہاں سے چلے جاتے اور کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ مگر یہاں انہیں معاملہ فہمی سے کام لینا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کونسی ایسی بات ہے جو آذر کو اس قدر ناگوار گزری ہے کہ وہ کشف کو ان سے ملنے سے روک رہا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اس وقت بھی ان سے اجنبیت سے پیش آ رہا ہے۔

"میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تمہیں یہاں سے لے کر گھر چلیں گے اور کشف کے ہاتھ کا کھانا مل کر کھائیں گے۔" ماحول کو خوشگوار بنانے کی اختیاری کوشش کرتے وہ ذرا سامنے ہوئے اور تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا اور آذر نے پہلی بار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"اچھا تو یہ سوچ کر آئے تھے تم۔" آذر اپنی جگہ سے اٹھا اور فائل ریک کے پاس جا رکا جبکہ یاور ششدر سے رہ گئے۔

"تم۔" ان کے لبوں نے نامحسوس سی حرکت کی۔ آذر کبھی بھی انہیں اس طرح سے مخاطب نہیں کرتا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ مسٹر یاور! میری بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کا اس قدر شوق کیوں ہے تمہیں؟" یاور ایک پل کو ٹپٹا گئے۔ کتنے عجیب سے انداز میں پوچھا تھا اس نے اور میری بیوی پر کس قدر زور دیا تھا۔

"کشف تمہاری بیوی ہی نہیں بہن بھی ہے میری اور اپنی بہن کے ہاتھوں سے پکا کھانا پسند ہے مجھے۔" یاور نے متانت سے وضاحت کی تھی۔ جواباً آذر کا طنز بھرا ہنکارا ابھرا تھا۔

"کم آن یار! کم سے کم بہن بھائی کے پاکیزہ رشتے کی تذلیل تو مت کرو۔" یاور نے الجھ کر اسے دیکھا اس کی باتیں واقعتاً فہم سے باہر تھیں۔

"میں کب کسی رشتے کی تذلیل کر رہا ہوں آذر!" وہ آذر کے ہر انداز میں ظاہر ہوتی نفرت سے خائف ہونے لگے۔ آذر سینے پر بازو باندھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ان کی طرف آیا۔

"کوئی دور پرے کی رشتے داری تو تم دونوں کے درمیان ہے نہیں۔ پھر نہ تو ماں ایک ہے اور نہ ہی باپ لہٰذا کوئی خونی رشتہ بھی نہیں تو پھر کیا تعلق ہے تمہارا اور کشف...... کم آن ٹیل می آخر کیا نام دینا چاہو گے اس تعلق کو۔" آذر کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ اور جوش تھا۔

"کیا رشتے صرف خون سے مشروط ہوتے ہیں آذر۔" وہ بہت پست لہجے میں بولے تھے کس قدر دکھ ہوا تھا انہیں آذر کمال کے خیالات جان کر۔

"ہر تعلق خون کا محتاج تو نہیں ہوتا آذر! ضروری تو نہیں ہے کہ خون کا ایک ہونا ہی رشتے کو معتبر ثابت کرے۔"

"ہوتا ہے بالکل ضروری ہوتا ہے۔" آذر نے سرعت سے بات کاٹی۔ "ہر رشتہ ہر تعلق اپنے معتبر ہونے کے لیے ثبوت مانگتا ہے ایسا ثبوت جو پاکیزہ ہو۔"

"کوئی بھی تعلق یا رشتہ پاکیزہ یا غلیظ تبھی ہوتا ہے جب آپ اسے دیکھتے یا سمجھتے ہوں کسی بھی چیز کی پاکیزگی اور غلاظت کو واضح آپ کی نگاہ اور آپ کا فہم کرتا ہے۔" یاور رسانیت سے بولے۔

"میرا اور کشف کا بظاہر کوئی خونی رشتہ نہیں ہے مگر بہت سے خونی رشتوں سے بڑھ کر پاکیزہ اور قابل اعتماد ہے۔ دلوں کے رشتے اتنے کھوکھلے نہیں ہوتے کہ......"

"اتنے ہی دلوں کے رشتے جڑے ہوئے تھے تو اس کی شادی ہونے ہی کیوں دی اطمینان سے رکھتے گھر میں اور دلوں کے رشتے مضبوط کرتے۔ بنا لیا ہوتا اسے اپنی بیوی۔"

"آذر......" یاور نے اس کی بات قطع کی۔ ایک آتش فشاں سا ابھرا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا اس نے اپنے مطلب کی صرف ایک ہی بات سنی ہے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ کیسی کمینی باتیں کر جاتے ہیں۔ یہ چھ فٹا، بے حد مہذب، مدبر اور معاشرے میں اونچا مقام رکھنے والا شخص جو ان کے لیے بے حد قابل عزت ہو گیا تھا۔

یکدم بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے مقابل کھڑے قہربار نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔
اتنی گھٹیا بات کو اس قدر آرام سے دانتوں تلے چباتے ہوئے یقیناً اسے پورا احساس تھا ک
برچھیاں یاور کے سینے میں اتار گیا ہے۔

اور یاور کے اندر ایک لاوا ابل رہا تھا جو انہیں اندر باہر سے خاک کر رہا تھا۔ طیش کے شد
احساس نے کنپٹی کے قریب رگوں کو پھڑکنے پر مجبور کر دیا تھا اور پہلو میں اضطراب سے مچلتی انگلیاں
نے مضبوطی سے بھینچ لی تھیں۔ مبادا بے اختیاری میں کچھ کر بیٹھیں۔

"میں نے کہا تھا نا پاکیزگی اور غلاظت کی ضاحت دیکھنے والی نگاہ اور سمجھنے والے فہم پر منحصر ہ
کڑے ضبط سے گویا ہوئے۔

"ہمارے رشتے کو جس بھی نگاہ سے دیکھو گے۔ وہ تمہیں ویسا ہی دکھائی دے گا۔ ایک بار ا
طرح سے سوچ لو آذر! کہیں ایسا نہ ہو ہمارا پاک رشتہ تمہاری کج فہمی اور غلط نگاہوں کی بھینٹ چڑ
میں کشف کا بھائی ہوں۔"

"مجھے سبق رٹوانے سے بہتر یہ ہے کہ تم خود پر دھیان دو۔" آذر کے لہجے میں رعونت کچھ اور
تھی۔

"تم ہو کیا؟ کیا شناخت ہے تمہاری۔ بھائی بھائی کی گردان مکمل کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لو
بھوک پیاس سے بلکتے "کتے" کو گھر میں پناہ دینے سے وہ بھائی نہیں بن جاتا۔"
صبر کی ایک حد ہوتی ہے۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے مگر یاور بن سہیل جیسا صابر اور کڑ
کڑوی بات کو برداشت کر جانے والا بندہ اپنا سب کچھ اس ایک لمحے کے ہاتھوں ہار گیا تھا۔ پہلو
کرتا مضبوط ہتھیلی پر بھینچی ہوئی انگلیوں کا آہنی مکا آذر کا جبڑا ہلا گیا تھا۔

+

اس سے قبل میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا۔ مجھے اور یاور بن سہیل میں سے کسی ایک کو چ
اب میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم یاور بن سہیل سے ساری زندگی نہیں ملو گی...... سنا تم نے...!
سہیل سے نہیں ملو گی تم اور یہ میرا حکم ہے تمہارے شوہر کا حکم ہے۔" اس نے آگ برساتے لہجے میں
جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ کشف کٹے ہوئے شہتیر کی طرح صوفے سے ٹکرا کر زمین پر گری۔ تب
اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا اپنے کمرے کی جانب بڑھا مگر پھر رک کر پلٹا۔
"اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ پاتیں انہیں ساری
سسکنا پڑتا ہے۔ کرلانا پڑتا ہے یاد رکھنا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی اور کمرے میں آ گیا تھا۔
زندگی کی تلخ ترین رات شاید یہی تھی۔ بند کمرے میں گویا ہر چیز کی زبان نکل آئی تھی۔ اس نے

سکون تو اب بھی نہ تھا۔
ہو برباد کرنے کا عزم کیا مگر پھر تھک گیا۔
پہلے وہ رقابت میں جلا تھا اور اب نفرت چنگھاڑ رہی تھی۔
انا کسی قد آور اژدہے کا روپ دھارے آگ اگل رہی تھی۔
رات پھر تاریکی کے طعنے دیتی پچھاڑیں نہ تھمیں۔
پھٹا ہوا ہونٹ، ٹیسوں کی زد میں رہا۔ ٹوٹے ہوئے دانت نے اتنا درغلایا کہ دماغ پھٹنے لگا۔
اس کے دائیں گال پر یاور کے ہاتھ کا نشان بڑا واضح تھا۔ ساری رات یہ نشان سلگتا رہا۔ فجر کی پہلی
ذان کے ساتھ وہ اٹھا۔ واش روم میں جا کر ہونٹ کا زخم روئی سے صاف کیا۔ ڈیٹول کی تیز دھار نے از سر نو
ذیت جگائی تھی۔ وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتا رہا جس نے کئی روپ بدلے۔ کبھی کشف تو کبھی یاور وہ تو
جیسے کہیں مدغم ہو رہا تھا اس نے جھک کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔
"رشتے ناطوں کے لیے کس نگاہ اور فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اب تم بخوبی سمجھو گے یاور بن سہیل!
یہ میرا وعدہ ہے تم سے، کشف کی شکل دیکھنے کو نہ ترس گئے تو میرا نام بدل دینا۔" اس نے فیصلہ کیا اور بقیہ
رات اس فیصلے کے اعادے میں گزار دی۔
یاور بن سہیل نے اسے سارے اسٹاف کے سامنے بے عزت کروا دیا تھا۔ نہ وہ اس پر ہاتھ اٹھاتا اور نہ
آذر اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قدم اٹھاتا۔ یاور کے ایک ہی وار سے وہ لڑکھڑا کر ٹیبل پر گرا تھا۔ سنبھلنے کے
ساتھ اس نے غیض سے مغلوب ہوتے ہوئے پیپر ویٹ اٹھا کر یاور کو دے مارا اور وہ کم بخت بروقت دائیں
طرف کھسک گیا۔ نتیجتاً پیپر ویٹ گلاس وال کو ایک چھناکے سے کرچیوں میں تبدیل کر کے زمین بوس
ہو گیا۔ آن کی آن سارے اسٹاف میں کھلبلی مچ گئی۔ ایم ڈی کا آفس تیسرے فلور پر تھا۔ وہ بھی بنفس نفیس آ
گئے۔ چند لمحے بعد پولیس بلوا لی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایم ڈی اپنے اسٹاف کے بندے پر حرف لا کر اپنی
کاروباری ساکھ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا یاور کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ آذر کا مربوط بیان اگلے
دن تک ملتوی کر دیا گیا۔ پولیس کے جانے کے فوراً بعد ایم ڈی نے اسے بلوایا۔
دماغ پہلے ہی گھوما ہوا تھا ان کے ذرا سے استفسار پر اس نے بھڑک کر وہ انداز گفتگو اختیار کیا کہ وہ
دنگ رہ گئے۔ ذرا جو ہوش میں آئے تو قصہ صاف تھا۔ ظاہر ہے وہ مالک تھے کوئی اس کے نوکر تو نہیں کہ
خاموشی سے سہتے اور ہضم کر جاتے مگر آذر بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا اس سے قبل کہ وہ کوئی حکم صادر کرتے
استعفیٰ ان کے منہ پر مار آیا۔ گھر آیا تو کشف منتظر تھی۔
یہ وہ لڑکی تھی جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور شکل دیکھتے ہی از سر نو حیات پاتا تھا مگر آج معاملہ
مختلف تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی سارا وجود الاؤ بن کر دہکنے لگا۔ نفرت کی مضطرب دھمال سر چڑھ گئی۔ ایک
آن میں اسے اپنا حکم سنایا آگاہ کیا اور تن فن کرتا کمرے میں آ گیا۔

واش روم سے فارغ ہو کر وہ واپس بیڈ پر آ گیا۔ میگزین اٹھا کر دیکھتا رہا۔ ٹیلی ویژن آن رکھا
سکون کہیں نہ تھا۔ دماغ میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ آگ کم دھواں زیادہ تھا۔ نجانے کیا وقت تھا جب
فون کی گھنٹی چنگھاڑی کہ چوتھی بیل پر وہ اٹھا مگر آدھی بیل پر ہی آواز بند ہو گئی۔ شاید کشف نے لاؤنج
فون اٹھا لیا تھا یا شاید فون کٹ چکا تھا۔ اس نے چیک کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آنے
والی دو زنانہ آوازوں میں سے ایک کو وہ بخوبی پہچانتا تھا۔ ذرا غور کرنے پر دوسری آواز بھی پہچان میں
آ گئی۔ وہ ماہ نور تھی۔ وہ رو رہی تھی اور جو کچھ کہہ رہی تھی اسے آذر غور سے سن رہا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔
طویل ترین عرصے بعد کشف کی سپاٹ آواز ابھری تھی۔

"میں آ رہی ہوں...... ابھی آ رہی ہوں۔" سلسلہ منقطع ہو گیا آذر نے ایک خواب کے عالم میں
ریسیور احتیاط سے کریڈل پر رکھا۔ اس کی نگاہیں دیوار پر کسی غیر مرئی نقطے کو کھوج رہی تھیں۔

فرعونیت کے پنجے کچھ اور پختگی سے اس کے وجود میں پیوست ہو رہے تھے۔

✦

"اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ پاتیں۔ انہیں ساری
زندگی سسکنا پڑتا ہے۔ کرلانا پڑتا ہے یاد رکھنا۔"

آذر کی آنکھوں میں پڑے سرخ ڈورے، ہونٹ کے کنارے پر جما ہوا خون، آگ برساتا ہوا کڑک
لہجہ اور شدت ضبط سے لرزتا وجود اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ وہ سہم کر جہاں کی تہاں دبکی رہ گئی۔ یہ
احساس تک نہ تھا کہ ابھی آذر کے نفرت سے جھٹکا دینے پر کتنی بری طرح سے گھٹنا میز کے کنارے سے
ٹکرایا ہے۔ آذر کے رویے نے اس بری طرح خوفزدہ کیا تھا کہ آنکھوں میں موجود نمکین پانی وہیں پلکوں
سے چپک کر رہ گیا تھا۔

"آذر کی نگاہوں سے ہی نہیں الفاظ سے بھی قہر برستا تھا۔ لہجے نے نفرت ٹپکائی تھی۔ پھر وہ چلا گیا اور
کشف وہیں بیٹھی رہ گئی۔ یہ رات وحشتوں نے تعبیر کی تھی۔ آخر ایسی کونسی بات ہو گئی تھی جو طوفان کا روپ
لے رہی تھی اس نے تو یاور بھائی کو آدھی ادھوری بات بتائی تھی اور وہ بھی بے اختیاری میں...... تو کیا یاور
بھائی نے...... نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ خود ہی نفی کرنے لگی۔ یاور بھائی سے بات کر لینے کے بعد اس
نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ آذر کو منا لے گی۔ قائل کر لے گی جو وقتی غلط فہمی کی دھند اس کے ذہن پر چھا گئی ہے
اپنے لفظوں سے اسے چھٹ جانے پر مجبور کر دے گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ اس کے سامنے آذر کے
روپ میں فرعون کھڑا تھا۔

پہلے اس نے چناؤ کا حق کشف کو دیا تھا اور اب حکم دے کر چلا گیا تھا۔ جیسے بادشاہ اپنی رعایا کو حکم
دیتا ہے۔ پتھروں پر لکیر کھینچتا ہے جسے مٹانے کی کوشش صرف زخم دیتی ہے۔

ساری رات وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اردگرد ایسا سناٹا تھا گویا غلطی سے قبرستان میں آ گئی ہو۔ پھر اس
نا ٹے کو اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں نے توڑا کتنے آرام سے آذر نے کہہ دیا تھا کہ تم یاور سے ساری زندگی نہیں
و گی۔ بھلا کیا یہ ممکن ہے جن کا ہونا آپ کے لیے آکسیجن کی طرح ہو۔ دید خون میں روانی لاتی ہو۔ دل
ں تراوٹ وطمانیت بھرتی ہو۔ کیا ان سے قطع تعلق اتنی آسانی سے ممکن ہے۔ شوہر معظم کا حکم مان کر بھی
سسکنا پڑتا اور نہ مان کر بھی وہ دہری مشکل میں تھی۔
ذرا اس کے آنسو تھمے تو سحر نے واویلا کر دیا۔ پچھلی رات سے بھوکی تھی ماں کی گود میں آتے ہی قرار پا
گئی۔ کشف نے اس کے نرم سے گال کو چومتے ہوئے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"آذر کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا میرے لیے نہ سہی تو سحر کے لیے۔" تبھی فون کی بیل بج اٹھی۔
اس نے سحر کو کاٹ میں لٹایا اور لاؤنج میں آ کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ماہ نور تھی۔ بے حد روہانسی
ور جو خبر اس نے دی تھی وہ کشف کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لینے کے لیے کافی تھی۔

"یاور کی کار ٹرک سے ٹکرا گئی بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کی حالت بہت نازک ہے اس
وقت آئی سی یو میں ہیں......" اس کے بعد ماہ نور نے کیا کہا وہ سنتی رہی البتہ سمجھ نہ سکی۔ اس کے کانوں میں
مسلسل ایک آواز گونج رہی تھی۔

"اس سے قبل میں نے تمہیں آپشن دیا تھا کہ مجھ میں سے اور یاور میں سے کسی ایک کو چن لو۔"
رعونت بھرا لہجہ اس کے گرد مکڑی کے جالے جیسے تاروں کا جال بننے لگا۔

"اب میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم یاور بن سہیل سے ساری زندگی نہیں ملو گی۔"

"سنا تم نے یاور بن سہیل سے نہیں ملو گی تم۔" کوئی اس کے بہت قریب چنگھاڑا تھا۔

"تم سن رہی ہو نا کشف۔" ماہ نور کی آنسوؤں میں بھیگی آواز ابھری۔

"یہ تمہارے شوہر کا حکم ہے اور یاد رکھنا کشف! اپنے شوہر کا حکم نہ ماننے والی لڑکیاں کبھی خوش نہیں رہ
پاتیں۔ انہیں ساری زندگی سسکنا پڑتا ہے کرلانا پڑتا ہے۔"

"تم آ رہی ہو نا کشف۔" ماہ نور نے پھر پوچھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ "شوہر انسان ہوتا ہے خدا تو نہیں
کہ اس کا حکم ٹالا نہ جا سکے پھر آذر مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ابھی غصے میں ہے مگر میں اسے منا لوں گی۔ وہ مان
جائے گا۔"

"میں آ رہی ہوں...... ابھی آ رہی ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور کمرے سے معمول میں اوڑھنے
والی چادر لے آئی۔ یاور بھائی نے مشکل ترین حالات میں ان کے سروں پر چھایا کی تھی تو کیا وہ ان کے
مشکل وقت میں ان کا ساتھ نہ دیتی جبکہ وہ اس سے ملنے کی تمنا کر رہے تھے۔ ہاں کوئی ایسی ہی بات ماہ نور
نے کہی تو تھی۔

سحر کو اطمینان سے سوتا دیکھ کر اس نے احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور مڑنے پر یکدم اس کی دھڑکن سی
گئی۔ وہ آذر تھا جس نے اسے گرنے سے بچا لیا تھا۔ کشف کے لبوں سے چیخ سی برآمد ہونے سے پہلے
گھٹ گئی۔ دل الگ دھڑ دھڑانے لگا پھر اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر ڈالا اور ایک ایک بات
بتائی۔

''تم نہیں جا سکتیں۔'' پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ آذر کی آنکھوں کے تاثرات سفید برف کی طرح
ہیں۔ لہجہ سپاٹ اور قطعی متزلزل نہ تھا۔ وہ اس کے ہٹیلے پن پر سسک اٹھی۔

''یاور بھائی کو میری ضرورت ہے آذر! خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔ میں...... میں تم سے وعدہ کرتی
ہوں کہ ایک نظر انہیں دیکھ کر واپس آ جاؤں گی اور پھر کبھی ان سے نہیں ملوں گی۔'' وہ بے اختیار ایک
شخص کے سامنے جھولی پھیلا کر کھڑی ہو گئی جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا۔ بس عنایت کے چند لمحے
تھے۔ جو کہ بہر حال اسے ملے تب وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ آذر بنا کچھ کہے اس کے سامنے سے ہٹ گیا
اب بیرونی دروازے اور اس کے درمیان کچھ بھی حائل نہ تھا۔ پہلے وہ کچھ دیر یونہی کھڑی یہ سوچتی رہی
حقیقت قابل یقین ہے بھی یا نہیں۔ آذر نے اس کے تفکرات کو جھٹلاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت
دے دی۔ پہلے وہ التجا کرتے ہوئے روئی تھی اب خوشی سے رونے لگی۔

''تھینک یو آذر...... تھینک یو سو مچ۔'' اس نے تشکرانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ محبت ایسی
ہوتی ہے۔ ہر دم مصالحت کی راہوں کی متلاشی۔ وہ چادر کے پلو سے چہرہ خشک کرتی دروازے کی طرف
بڑھی۔ مگر تیسرے چوتھے قدم پر ہی اس کے قدم ساکت رہ گئے۔ فضا میں زوردار آواز ابھری تھی اور
ہی لوہے کی گرم سلاخ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے بہت قریب دھنستی چلی گئی تھی۔

اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی مگر لگتا تھا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔ بے اختیار ہاتھ اس کی پشت
ٹھہرا اور جب واپس نگاہوں کے سامنے آیا تو سرخ رنگ کا سیال زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس کی ٹانگیں
لرزنے لگیں تب وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔

اس نے سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔ محبت مصالحت کی راہیں تلاش کرتی ہے مگر ضروری نہیں کہ وہاں
بھی ٹھہرے۔ کبھی کبھی تو یہی محبت بھی مصلحت نہیں کرنے دیتی۔

انا زندہ ہو جائے تو محبتیں یونہی رل جایا کرتی ہیں۔

اس کے کانوں میں سحر کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ غالباً شور نے اسے جگا دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو پکار
رہی تھی اور ماں کی ہمتیں ایک ایک کر کے ہوا میں حلول ہو رہی تھیں۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ہر وہ پل مجسم ہونے لگا جس میں آذر نے اس کو اپنا عشق اور اپنی زندگی
تھا۔ تو کیا زندگی کی ساتھ یوں کیا جاتا ہے؟

عشق کو یوں اذیت دی جاتی ہے۔

کشف کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک بے معنی سا قطرہ چادر کے پلو میں جذب ہوا تھا۔ سحر کے
رونے کی آواز تیز تر ہو چکی تھی کشف بے دم ہو کر بائیں طرف لڑھک گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے
اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیرنا چاہی تو حلق آنسوؤں کے ذائقے سے بھر گیا۔
اس کے کان مسلسل سحر کی آواز سن رہے تھے۔ بالآخر اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند ہو گئیں اور معطل
ہوتے حواس کے ساتھ اس کے کانوں نے ایک اور فائر کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد سکوت چھا گیا تھا۔ سحر
کی آواز اب وہ نہیں سن رہی تھی۔

+

کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے ان کے بھاری جوتوں میں مقید پیر ٹھٹک کر یوں رک گئے تھے
گویا وقفے کا مقام یہ نہ ہو۔ کمرے میں ملگجا سا اجالا تھا اور اس اجالے میں وہیل چیئر پر بیٹھا وہ ساکت وجود
قدرے ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئے جیسے وہ کوئی خواب ہو جس کا پلک جھپکنے پر کھو جانا
شرط ہو۔ وہ کوئی خوب صورت خواب تو نہ تھا کہ کھو جانے کا خوف لاحق ہوتا مگر پھر بھی وہ اسے دیکھ رہے تھے
مسلسل...... لگاتار...... بنا پلک جھپکے۔ تبھی ساکت فضا میں مدھم سی ہلچل ہوئی تھی جیسے کسی نے بربط پر زوردار
ضرب لگائی ہو یا ٹھہرے ہوئے پانی میں پوری قوت سے پتھر پھینک دیا ہو۔

''آپ کی شادی میں تو مجھے ڈبل نیگ وصول کرنا ہے۔ سالی کی حیثیت سے بھی اور بہن کی حیثیت
سے بھی۔''

بہت ہی مترنم آواز ان کے قریب بہت مان سے کھلکھلا رہی تھی۔ انہیں لگا ان کی آنکھیں پانی سے تر
ہونے لگی ہیں۔ مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں اور سامنے وہیل چیئر سے چپک کر بیٹھے رہنے پر
مجبور اس وجود پر مرتکز تھیں۔ آج اس وجود کو دیکھ کر ان کے خون کی گردش تیز نہیں ہوئی تھی۔ غصے کی کوئی لہر
نہیں اٹھی تھی۔ نفرت کا آتش فشاں نہیں چنگھاڑا تھا۔ بلکہ دل یہاں سے وہاں صرف ترحم سے بھر گیا
تھا...... تاسف تھا...... ہمدردی تھی۔

مردہ دماغ والے اس وجود سے نفرت کر کے، انہیں اب کچھ حاصل ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ وقت کی چال
کچھ اتنی تیز اور غیر متوقع تھی کہ وہ مات کرنے کا کوئی سامان کر ہی نہ پائے تھے۔

''تم صرف ڈبل نیگ وصولنا چاہتی تھیں کشف! ایک بار مجھے موقع تو دیتیں میں اپنی زندگی تمہاری
ہتھیلی پر رکھ دیتا۔'' مگر وہ صرف ایسا سوچ سکتے تھے کہ شاید کشف کی زندگی لے کر ہی خدا نے انہیں از سر نو
زندگی دی تھی۔

گرفتار ہونے کے محض دو گھنٹے بعد ہی ان کی ضمانت ہو گئی تھی اور اس دوران انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا

کہ آذر سے معافی مانگ لیں گے۔ کشف کے لیے وہ یہ کرنے کو بھی تیار تھے۔ مگر کسی بھی غلط فہمی کو دو
سے پہلے ہی قسمت نے اپنی چال چل دی تھی۔ تھانے سے واپس آتے ہوئے ان کی کار ٹرک سے
تھی۔ چوٹیں شدید تھیں۔ وہ تین ماہ کوما میں رہے اور جب واپس زندگی کی طرف لوٹے تو زندگی ا
تھی۔

''پاپا۔'' وہ اگرچہ چونکے نہیں تھے مگر ماضی سے واپسی میں لمحہ تو صرف ہوا تھا وہ پلٹے عین عق
سترہ سالہ سحر کھڑی تھی۔

''ہماری فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے پاپا...... مما کہہ رہی ہیں جلدی آ جائیں۔'' وہ کہہ کر واپس پلٹ
یاور نے اسے جاتے دیکھا وہ ہو بہو کشف کی فوٹو کاپی تھی۔ کشف کے انتقال کے بعد وہ اسے اپنے
جاپان لے گئے تھے اور اب جب ایک بار پھر چند روز کے لیے واپس آ رہے تھے تو وہ ان سے ساتھ آ
ضد کرنے لگی تھی۔ وہ ایک بار اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتی تھی۔ قبرستان سے واپس آ کر وہ آ
کمرے میں آ گئی تھی۔ جو اس گھر کے آخری کونے میں تھا۔ تب یاور کے سامنے وہ آذر کے
حرکت وجود کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی اور جاتے ہوئے اس نے ان سے کہا تھا۔

''میں ان سے محبت نہیں کرتی...... کیونکہ یہ میری ماں کے بلکہ باپ کے بھی قاتل ہیں اور میں ا
نفرت بھی نہیں کر سکتی کہ بہر حال ان کا نام میرے نام سے جڑا ہے۔'' بہت سپاٹ لہجہ تھا محبت و نفر
طرح کے جذبات سے عاری۔

''یاور۔'' وہ اس آواز پر پھر پلٹے ان کے شانے پر ہاتھ رکھے کمال حسیب کھڑے تھے...
حسیب کے چھوٹے بھائی۔

''یاور...... باہر سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں بیٹا!'' انہوں نے مطلع کیا۔ ایک ہفتہ پاکستا
گزار کر وہ لوگ آج واپس جا رہے تھی۔ یاور بن سہیل کی نگاہیں پھر سے کمرے کے اندر پہنچ گئیں۔
خالی ٹین جیسے وجود کے چہرے پر موجود نظروں سے ان کی نظریں ٹکرائیں۔ ساکت پتلیاں ز
تو اسے محروم تھیں۔ کشف کو قتل کرنے کے بعد آذر نے دوسری گولی اپنے ہی دماغ میں ماری تھی......
اس بات سے سبھی ناواقف تھے۔ البتہ اس حرکت کو بیروزگاری سے ضرور مشروط کر دیا گیا تھا۔ اللہ ا
زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تھا وہ دماغی طور پر مفلوج ہو چکا تھا اور پچھلے سترہ سالوں سے ایسی زندگی
تھا۔

''او کے سر! زندگی رہی تو پھر ملیں گے! انشاء اللہ'' انہوں نے اپنا مضبوط آہنی ہاتھ مصافحے ک
سے کمال حسیب کی جانب بڑھایا جسے انہوں نے تھاما تو پھر چھوڑا نہیں۔ اس نرم سی گرفت سے آزاد
با آسانی حاصل کر سکتے تھے مگر کبھی کبھی انسان خود کو حالات کی زد پر چھوڑ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

''میرا تم سے بھی وہی رشتہ بنتا ہے جو ماہ نور سے ہے پھر تم مجھے چچا کیوں نہیں کہتے۔'' یاور ان کا سوال
سن کر ہنس دیے نرمی سے پھر بولے۔
''رشتے بنانے سے کہاں بنتے ہیں سر...... ویسے بھی آج کے زمانے میں خونی رشتے ہی معتبر ہوتے
ہیں۔''

بلا ارادہ ان کی نظر واپس آذر پر جا رکی تھی۔ پھر وہ، کمال حسیب سے بغلگیر ہوئے [illegible] دروازے کی
جانب بڑھنے لگے مگر ہاتھ ابھی بھی نرم گرفت کے حصار میں تھا۔ اب کے یاور استعجاب سے پلٹے۔ کمال
حسیب کی نگاہوں میں دکھ کسی ننھے بجرے کی مانند ڈول رہا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ آذر نے ایسا کیوں کیا مگر
...... تم اسے معاف کر دینا بیٹا...... پچھلے سترہ سال سے وہ اذیت کاٹ رہا ہے۔'' ان کے لہجے میں آذر کے
کیے پر بے حد شرمندگی، اس کی موجودہ حالت پر دکھ اور التجا تھی کہ یاور کچھ کہہ ہی نہیں پائے۔ ذرا سی گردن
موڑ کر دیکھا کمرے کے اندر وہی ملگجا اندھیرا تھا اور وہ...... جس کے ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی اور اتنی
سکت بھی نہ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے صاف کرے۔

''انا زندہ ہو جائے تو محبتیں رل جاتی ہیں۔''

اور دماغ مر جائیں تو جسم یونہی رلا کرتے ہیں جیسے کہ آذر کمال کا جسم۔

یاور نے کمال حسیب کا ہاتھ تھپتھپایا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ہماری اس دنیا میں دنیاوی خداؤں کی کمی نہیں ہے مگر وہ جو واحد لاشریک ہے نا۔ اسے اپنی برابری پسند
نہیں۔ وہ اگر قدموں تلے سیڑھی لگا کر آسمان تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے تو اسی سیڑھی کو کھینچ کر زمین بوس
کرنے کی سکت بھی اسی میں ہے اور آذر کمال زمین بوس ہو چکا تھا۔

''مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا آذر! کہ کشف کی جان میری وجہ سے چھین لی گئی۔ مجھے خبر ہوتی کہ
میری محبت ہم سب کو اس دوراہے پر لا پٹخے گی تو میں اس سے محبت کرنا ہی چھوڑ دیتا اور کاش کہ تم نے مجھے
ایک موقع دیا ہوتا...... میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے۔ نفرت تو بہر حال ہے کہ تم نے
میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز مجھ سے چھین لی ہے مگر میں تمہارے لیے دعا کروں گا آذر کہ خدا تمہیں
بخش دے۔''

پورچ میں داخل ہونے سے قبل انہوں نے اپنی آنکھ کے کونے میں مچلتا آنسو نرمی سے پونچھ دیا تھا۔
ٹیکسی کے قریب ماہ نور اور سحر ان کی منتظر تھی۔

ملالِ زیست

انتہائی گرمی میں، یہ گرد آلود آندھی کسی نعمت سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے بائیک کی ر[فتار] اور بڑھادی کہ آنکھوں میں ریت بری طرح چبھنے لگی تھی۔

اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی اسے بہت سے بچے دکھائی دیے، جو تیز ہوا کی پروا کیے بغیر کھیل [رہے] تھے۔ گھر کے عین سامنے بائیک روک کر اس نے پہلے زور زور سے آنکھیں رگڑیں کہ اس کے بغیر [چارہ] نہ تھا، پھر باہر سے ہی ہاتھ ڈال کر گیٹ کھول لیا۔ گیٹ کے عین سامنے ایک لمبی روش تھی جس پر [درختوں] کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔

دونوں جانب کے لان میں بڑا مانوس سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بس ہوا کا شور تھا اور کچھ نہیں۔

اس نے بائیک اندر لا کر گیٹ بند کیا پھر تیز تیز قدموں سے واپس آ کر بائیک سے شاپر اتار کر [لاؤنج کی] جانب چل دیا۔ لاؤنج میں معمول سے بڑھ کر سناٹا تھا، جانے کیوں؟

اس نے شاپر صوفے پر اچھالا اور کھڑکیاں چیک کرنے لگا، مبادا گرد اندر آ جائے۔ اس [...] فارغ ہو کر پانی پینے کا خیال آیا مگر تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ شرٹ کے دو تین بٹن کھولتے ہوئے [اس نے] پنکھا فل اسپیڈ سے چلایا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

گو کہ، آج کا دن بھی معمول کے باقی دنوں جیسا ہی تھا مگر نجانے کیوں کوئی بات سوئی کی نوک [کی طرح] اندر ہی اندر کہیں چبھ رہی تھی۔

اس نے اس بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مگر ٹھنڈا پرسکون ماحول اس کے اعصاب کو دھیرے دھیرے تھپکنے لگا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی وہ نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

آنکھ لگے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی جب کسی نے اس کا کندھا بڑے زور سے ہلا دیا۔ وہ بھی [...] ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ارے ہادی تم سو رہے تھے کیا؟"

عالیہ ممانی اپنی عادت کے عین مطابق اس کی نیند برباد کر کے بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ بے چارہ سدا سے مروت کا مارا۔ فوراً نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں مامی! بس یونہی لیٹا ہوا تھا۔"

"ارے میاں بس یہی تو عمر ہوتی ہے بے فکری کی، اپنی مرضی سے سونا، اپنی مرضی سے جاگنا۔ دل چاہا تو گھر سے باہر نکل گئے دل چاہا تو گھر میں آ گئے۔ ایک تمہارے ماما ہیں ایک پل کا بھی تو سکون نہیں ہے ان کی جان کو، دوپہر میں بھی ذرا سونے کو لیٹتے ہیں تو بس یہی فکر رہتی ہے کہ اسٹور پر ملازموں کو چھوڑ کر آیا ہوں پتا نہیں ٹھیک سے دیکھ بھال کر بھی رہے ہوں گے یا نہیں۔ تم جانتے ہو، ملازم تو ملازم ہی ہوتے ہیں جیسا اپنی چیز کی دیکھ بھال انسان خود کر سکتا ہے وہ ملازم تھوڑا ہی کریں گی۔

اے ہادی بیٹے! تم تو سارا دن فارغ ہی ہوتے ہو تو ذرا کبھی کبھی دوپہر میں اسٹور پر ہی چلے جایا کرو۔ تمہارے ماما کو بھی ذرا تسلی ہو جائے گی۔"

"جی مامی! میں ان شاء اللہ کل ہی چکر لگاؤں گا۔" گو کہ اسے مامی کا سارا بیان کسی قدر قابل اعتراض لگا تھا مگر اپنی عادت کے عین مطابق اس نے سعادت مندی سے حامی بھر لی۔

"کل...... لیکن میں تو کہہ رہی تھی کہ...... اچھا چلو ٹھیک ہے کل ہی چلے جانا۔ ابھی تو ویسے بھی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ ایک بات کہوں ہادی؟ دیکھو برا مت ماننا میری عادت تو تم جانتے ہو بڑے ہی صاف دل کی ہوں، مانو دل میں تو کوئی بات رکھتی نہیں، رکھنا بھی نہیں چاہیے خوامخواہ کا زہر بنتا ہے۔ مگر تم سے کچھ کہتے ہوئے ہمیشہ ہی دل ڈرتا ہے کہ کہیں تمہیں برا نہ لگ جائے۔"

"ارے! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مامی! آپ تو بزرگ ہیں میری۔ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"ہائے میرے بچے! وہ تو بس منہ سے نکل گیا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے تو آج تک تمہیں عادل اور منصور کی طرح ہی سمجھا ہے۔ اس بات کے تو تم خود گواہ ہو کہ تمہیں شروع ہی سے اس گھر میں زیادہ اہمیت ملی ہے...... خیر اب لمبی بات کیا کروں، میں یہ کہہ رہی تھی کہ ذرا گھر سے باہر کم رہا کرو تمہارے کون سا دفتر کھلے پڑے ہیں کہ سارا دن وہاں مصروف رہے اور پھر گھر لوٹے۔ بہت دن سے سوچ رہی تھی تم سے کہنے کا مگر یہ سوچ کر خاموش ہو رہی کہ کچھ غلط مطلب نہ لے لو۔ ورنہ میں تو صرف تمہاری بھلائی کے لیے بول رہی ہوں۔ دیکھو ذرا آوارہ گردی کر کر کے تمہاری صحت بھی کیسی گر گئی ہے اور رنگت بھی کتنی سنولا گئی ہے۔ دیکھنے والے تو یہی کہیں گے نا کہ ہم نے مرحومہ نند کی اولاد کا خیال نہ کیا۔

اچھا وہ ایک کام کہا تھا تم سے کہ ذرا بازار کا چکر لگا لینا۔ کہیں بھول تو نہیں گئے۔ مجھے تو وہ دوپٹہ ضرور چاہیے اور وہ کڑھائی کے دھاگے، ہائے میرے اللہ! رمشہ تو اب میری جان کو آ جائے گی کہ رات کو ہی بازار

چلوں مگر یہ میرے گھٹنوں کا درد۔"

"میں سب لے آیا ہوں ممانی! آپ چیک کرلیں۔ تین دوپٹے جو آپ نے رنگوانے کے لیے دیے تھے، تینوں کی پیکو بھی ہوگئی ہے اور یہ اینگر کی گچھیاں بھی چیک کرلیں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں شاپر ان کی جانب بڑھا دیا۔ مامی کا شوق اس وقت قابل دید تھا۔ ایک ایک چیز انہوں نے بڑی عرق ریزی سے چیک کی۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے مگر یہ ملٹی دھاگے کیسے پھیکے پھیکے سے لائے ہو اور یہ پیلے دوپٹے پر تو دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھو ذرا...... ایک ذرا سا کام ہی تو تھا، تم نے کیا کھول کر چیک نہیں کیے تھے۔"

اس کی گردن شرمندگی سے خاصی جھک گئی۔ دل تو چاہا کہ کہے آپ کے اس ذرا سے کام نے میرے ڈھائی گھنٹے برباد کروادیے، مگر جب بولا تو بالکل مختلف۔

"آپ انہیں ایک طرف کردیں ممانی! میں کل تبدیل کروالاؤں گا۔"

ممانی برے برے منہ بناتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کھانا کھالو اٹھ کر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہم سب نے کھایا ہے۔ گرم ہی ہے تب تک میں کپڑے تبدیل کرلیتی ہوں۔ آج ذرا مجھے سعدیہ کی طرف ہی لے چلو۔ بڑے دن ہوگئے مجھے اپنی بہن سے ملے تمہارے ماما سے جب بھی کہتی ہوں تو ٹال جاتے ہیں۔ عادل اور منصور کی مصروفیات سے تو تم واقف ہی ہو...... رمشہ سے پوچھتی ہوں وہ بھی چلی چلے تو تم دو چکر لگا لینا پہلے مجھے چھوڑ آنا پھر اسے۔ کیسی مٹی مٹی ہوا ہے چاروں طرف۔ تم یوں کرو کھانا کھا کر پہلے ذرا باہر پانی لگا دو تاکہ گرد بیٹھ جائے۔"

"اور کچن میں دوپہر کے کھانے کے برتن رکھے ہیں...... انہیں تو آپ بھول ہی گئیں بڑی چچی!" کی طنز بھری آواز سیڑھیوں کی جانب سے آئی تھی۔ لاؤنج میں موجود دونوں نفوس کی گردنیں بیک وقت اس طرف مڑ گئیں۔

ہادی کے تو مانو ہاتھ پیر ہی پھول گئے۔ صبا کی یہ جو ڈرامائی سی انٹری ہوئی تھی اس کا اختتام کس صورتحال پر ہونا تھا۔

"اور پچھلے دو ہفتوں سے، آپ کی کام والی ماسی بھی نہیں آ رہی۔ واشنگ مشین بھی منہ تک بھرا گی۔ ہادی! چچی کو ان کی بہن کے گھر چھوڑ کر آنے کے بعد تم واشنگ مشین لگا لینا، ویسے بھی سارا دن فارغ ہی تو ہوتے ہو کچھ کام ہی کرلینا۔"

"ارے ارے۔ کیا بولے جا رہی ہو لڑکی! ہمارا کیا دماغ خراب ہے جو اس بے چارے سے یہ کام کروائیں گے۔" ممانی کو اس کا انداز خاصا ناگوار لگا تھا، بھڑک کر بولیں۔

"باقی سارے کام بھی تو اسی سے کرواتی ہیں یہ دو بھی کروالیں گی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

وہ بڑے آرام سے بولی۔

ممانی کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چھٹانک بھر کی لڑکی کچھ زیادہ ہی زبان دراز ہوگئی تھی گو کہ، وہ انہیں جتاتی رہتی تھی مگر آج تو سیڑھیوں پر اس کے عقب میں اس کی صبح سے آئی سہیلی بھی موجود تھی۔ انہیں یہ گستاخی برداشت سے باہر لگی۔

"ایسے کون سے کام کروالیے ہم نے، گھر سے باہر کے کام تو مرد ہی کیا کرتے ہیں۔"

"تو پھر آپ عادل یا منصور سے کیوں نہیں کرواتیں یہ سب کام؟ کیا وہ مرد نہیں ہیں۔"

"میں کہتی ہوں صبا! زبان سنبھال کر بات کرو۔ بڑا اس کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر بول رہی ہو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ تم کیوں گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہو ہادی! کچھ بولتے کیوں نہیں۔ ذرا بتاؤ کیا ہم نے کبھی تم سے غیر کا سا سلوک کیا ہے، جیسے ہمارے لیے عادل اور منصور ویسے ہی تم، کیوں؟" وہ بے چارا کیا بولتا۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں چچی! صرف ہادی کو عادل اور منصور جیسا نہ سمجھیں، کبھی ان دونوں کو ہادی جیسا سمجھتے ہوئے کوئی کام ان سے بھی کروالیا کریں۔ ویسے بھی دونوں اس قدر کام چور ہیں سارا دن لیٹے لیٹے پلنگ توڑتے رہتے ہیں۔"

"ہاں تو اپنے باپ کی کمائی سے خریدا پلنگ توڑتے ہیں تمہیں کس بات پر اعتراض ہے۔"

"میری بلا سے وہ کسی اور کے باپ کی کمائی سے خریدا پلنگ بھی توڑتے رہیں۔ مجھے اعتراض ان کی ہڈ حرامی پر نہیں بلکہ آپ کی زیادتی پر ہے جو آپ ہادی کے ساتھ کرتی ہیں۔"

"ہائے میرے اللہ۔" ممانی نے دہل کر سینے پر ہاتھ مارا۔

"ایسی کون سی زیادتی کردی ہم نے ہادی کے ساتھ؟...... کیا تم اور تمہاری ماں بہن نے اس سے کبھی کوئی کام نہیں کروایا۔"

"کروایا ہے، کیوں نہیں کروایا مگر ہم انسانیت سے عاری نہیں ہوجاتے کہ سارا دن اسے بھگاتے رہیں۔"

"لو اور سنو، کون سا ہادی کو پیدل کہیں جانا پڑتا ہے۔ اتنی اچھی حالت کی تو موٹر سائیکل دی ہے تمہارے چچا نے اسے۔"

"کیوں مذاق کرتی ہیں چچی! سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بائیک بک نہیں رہی تھی اس لیے چچا نے اسے عنایت کردی، حالانکہ حالت کے لحاظ سے تو اسے کچرے میں پھینک دینا چاہیے تھا۔"

"ایسی ہی کچرا حالت لگتی ہے تو اپنے باپ سے کہہ کر نئی خرید دو۔"

"اللہ نے توفیق دی تو ضرور خریدیں گے مگر آپ کی طرح جتاتے نہیں پھریں گے۔" وہ قاتنا کا ہاتھ تھام کر باہر دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

"ہونہہ......خرید دیں گے، آنے دو آج ذرا شفیق بھائی صاحب کو، کہتی ہوں ان سے ذرا لگام [...]
رکھیں لاڈلی کو۔ ایسی زبان دراز لڑکیوں کو تو کوئی بیاہنے بھی نہیں آتا۔"

"میرے غم میں آپ اپنی جان ہلکان نہ کریں چچی! ویسے بھی جب سے آپ نے شمع باجی کی [...]
ہے میں خاصی پرامید ہوگئی ہوں۔ اگر ان کی شادی ہوسکتی ہے تو پھر میری بھی ہو جائے گی۔"

وہ لکڑی کا بڑا سا دروازہ عبور کرتے ہوئے بھی جواب دینا نہ بھولی تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی [...]
ہنسنا شروع ہوئی تو پھر دیر تک ہنستی چلی گئی۔

"توبہ......کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک اور بہت نرم انداز گفتگو کی حامل [...]
اپنی چچی سے اس طرح جھگڑا کرسکتی ہے۔"

اس کی بات پر صبا کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ آگے پیچھے بھی چچی کو بلکہ گھر کے [...]
ٹوکتی رہتی تھی مگر آج تو واقعی حد ہوگئی تھی۔

"تمہیں پتا ہے قانتا! میں ایسی نہیں ہوں۔ مگر چچی، ہادی کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں تو [...]
برداشت نہیں ہوتا۔"

"تم نے کبھی تفصیل سے بتایا نہیں کہ اصل میں یہ ہادی ہے کون؟"

گیٹ کی طرف جاتے ہوئے قانتا نے سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"میری پھپھو کا بیٹا ہے۔ اس کی پیدائش سے دو ماہ قبل پھپھا جی کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو [...]
پھپھو یہیں آگئیں پھر ہادی سات سال کا ہوا تو پھپھو جی کی بھی ڈیتھ ہوگئی۔ ہادی کو دادو نے پالا [...]

"اوہ ویری سیڈ! لیکن صبا اس کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو اس کے خلاف ہادی کو [...]
چاہیے۔ تم کیوں اس کے حق میں بول کر خود کو برا بنا رہی ہو، جیسے تمہاری چچی کے تاثرات تھے انہیں [...]
لگتا ہے آج تمہاری شکایت ضرور ہوگی انکل سے۔"

ابھی صبا کوئی جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ قانتا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے ابھی فون [...]
ڈرائیور کو بلوایا تھا۔

"اتنی جلدی سارا دن ختم ہوگیا۔ ابھی تو بہت ساری باتیں کرنی تھیں ہم نے۔" قانتا نے [...]
لگاتے ہوئے اداسی سے کہا۔ صبا مسکرادی۔

"تم تو ایسے اداس ہورہی ہو جیسے بہت دور جارہی ہو۔ سمن آباد سے گلبرگ تک فاصلہ ہی کتنا [...]
چاہو تو کل پھر آسکتی ہو۔"

"اب میں اتنی بھی بے شرم نہیں ہوں کہ ہر دوسرے روز منہ اٹھا کر تمہارے گھر آتی رہوں۔ بڑی [...]
ہے اب تمہیں بھی میرے گھر آنا چاہیے۔"

وہ بہت خفگی بھرے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی کا ہارن ایک بار پھر سنائی دیا۔ قانتا
جھنجلا گئی۔

"مجھے لگتا ہے یہ ڈرائیور ہمارا ملازم نہیں بلکہ ہم اس کے ملازم ہیں۔ مجال ہے جو کچھ دیر انتظار کرے
فوراً ہارن پر ہارن دینا شروع کردیتا ہے جیسے اس کی ٹرین چھوٹ رہی ہو، اچھا میں چلتی ہوں۔ سنو صبا اب تم
نے ضرور میری طرف آنا ہے جب پلان بن جائے تو مجھے کال کردینا میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔" وہ فٹافٹ
باہر نکل گئی پھر ایک شان بے نیازی سے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس نے شاید ڈرائیور کو کچھ جھاڑ
بھی پلائی تھی۔

مگر صبا کا دھیان صرف اور صرف ایش گرے ہنڈا اکارڈ پر ٹکا تھا۔ توبہ ایسی شاندار گاڑی، لش لش کرتی
ہوئی۔

وہ گیٹ سے منسلک اس چھوٹے دروازے پر تب تک کھڑی رہی جب تک قانتا کی گاڑی گلی کا موڑ
نہیں مڑ گئی تھی۔

دل منہ تک حسرت سے بھر گیا۔ کیا ٹھاٹھ تھے قانتا کے۔ عالی شان بنگلے میں رہتی تھی زبردست
گاڑیوں میں سفر کرتی تھی اور ایک وہ تھی جیب عیاشی کی اجازت دیتی تو رکشہ ٹیکسی میں سفر کرلیا جاتا نہیں تو
لوکل ویگنیں زندہ باد۔

اس کا موڈ ایک دم سے آف ہوگیا۔ بے حد بوجھل قدموں سے اندر کی جانب چل دی۔ گرد بیٹھ چکی
تھی اور ہوا بڑے سریلے انداز میں دھیمے قدموں سے چل رہی تھی۔ آسمان بھی خوب نکھرا ہوا لگ رہا تھا مگر
اس سارے منظر میں اس کی دلچسپی کا ذرا سا بھی عنصر نہیں تھا۔

وہ لاؤنج میں داخل ہو کر سیدھی اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھی۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔
لاؤنج میں کھلنے والے سارے دروازے بند پڑے تھے بس کچن کا دروازہ کھلا تھا اور وہیں سے کچھ اٹھا پٹخ کی
آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس نے ایک پل کو سوچا پھر ادھر چلی آئی۔ توقع کے عین مطابق ہادی وہیں تھا۔ تین کرسیوں والی
چھوٹی سی گول ڈائننگ ٹیبل پر جھکا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دروازے کے فریم سے شانہ ٹکا کر اسے دیکھنے لگی۔
ہادی کے ہر انداز میں بہت عجلت تھی۔ وہ چاولوں کے چمچے بہت بھر بھر کر منہ میں رکھ رہا تھا۔

تبھی صبا کی نگاہ میز پر رکھے سالن کے چھوٹے سے ڈونگے پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر پل بھر کو دنگ رہ گئی
کہ سالن کی سطح پر گھی کی بہت موٹی تہہ جمی ہوئی تھی گویا وہ ٹھنڈا کھانا ہی کھا رہا تھا۔

اس کا دل چاہا ہادی کے سر پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرے۔ اگر اس گھر کا کوئی فرد اس کا خیال نہیں رکھتا
تھا تو اس کا مطلب یہ تو بالکل نہیں تھا کہ وہ خود بھی اپنا خیال نہ رکھے۔

"ہادی! آرام سے کھانا کھاؤ یہ پلیٹ کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔" گو کہ وہ اس کی بے حسی سے بُری طرح نالاں تھی مگر ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

ہادی نے اس کی آواز پر بہت چونک کر سر اٹھایا پھر واپس اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے بولا۔

"آ جاؤ تم بھی کھا لو۔"

"میں دوپہر کا کھانا، دوپہر میں ہی کھانا پسند کرتی ہوں۔" وہ بہت جتا کر بولی تھی پھر قریب آ کر اس کے سامنے سے پلیٹ اٹھانے لگی تو وہ فوراً بولا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"گرم کر دیتی ہوں۔"

"رہنے دو گرم ہی ہے۔" صبا نے پلیٹ پٹخی اور ڈونگا اٹھا کر مائیکرو ویو میں رکھ دیا۔ جب تک سالن گرم ہوا وہ کھیرا کاٹ کر اس کے سامنے رکھ چکی تھی۔

"کہاں رہے سارا دن؟" چائے کا پانی رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"وہیں جہاں روز ہوتا ہوں۔ پہلے کیمپس پھر سوئی گیس اور بجلی کا بل جمع کروایا۔ وہاں سے اکیڈمی اور واپسی پر انار کلی...... عالیہ مامی نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔"

"بہت خوب......" اس نے طنز سے کہا۔

"یہ ساری روٹین چچی کے گوش گزار نہیں کر سکتے تھے، وہ تمہیں فارغ فارغ کہہ کر تمہاری دوڑ لگوا رہی تھیں۔"

"چھوڑو نا صبا! وہ اگر مجھ سے کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہیں تو اپنا سمجھ کر ہی کہتی ہیں نا۔ بھلا کوئی غیروں پر بھی اتنا حق جتاتا ہے۔"

اس نے ایسی بات کوئی پہلی دفعہ نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسا نقطہ نگاہ رکھتا تھا اور اسی لیے صبا کو احمق اور بے حس لگتا تھا۔

"ہادی!...... حد ہوتی ہے کسی بات کی، آخر تمہیں یہ بات کب سمجھ آئے گی کہ اپنا کہہ کر یہاں سب تمہیں بیوقوف بنا رہے ہیں اور تم ایک دم کاٹھ کے الو، لگے ہوئے ہو سب کی خدمتوں میں۔"

ہادی کے منہ میں نوالہ تھا۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے بند مٹھی ہونٹوں پر رکھ کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا وہ مزید چڑ گئی۔ کچھ کہنا چاہا پھر پلٹ کر چائے کپ میں انڈیلی اور پٹخنے کے انداز میں کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"بیوقوف اور احساسات سے عاری انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے [illegible] اس کے ارد گرد رہنے والے سارے لوگ اس کی ذات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اسے پتا ہی

نہیں چلتا۔" وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی تھی۔

ہادی اسے باہر جاتا دیکھتا رہا پھر پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

+

"صبا! تمہیں ابو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" وہ بڑی فرصت سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب ثنا نے اندر داخل ہو کر کہا۔ صبا نے چونک کر اسے دیکھا پھر ریموٹ سے آواز کم کرتے ہوئے استفہامیہ انداز میں بولی۔

"خیریت؟"

گو کہ اسے پوری طرح اندازہ تھا کہ یہ بے وقت کی طلبی کیوں عمل میں لائی جا رہی ہے۔ جس قدر شام سے عالیہ چچی بھری بیٹھی تھیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ ابو گھر میں آتے ہی اس کی کلاس لیں گے۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر ہی بیٹھی تھی پھر یہ تو اس کے لیے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔

"ابو گھر آ کر پورے پینتالیس منٹ تک نیچے رکے رہے ہیں...... میرا خیال ہے اتنا وقت خیریت نہ ہونے کے لیے کافی ہے۔" ثنا اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"آیت الکرسی اور درود شریف پڑھ کر ابو کے کمرے میں داخل ہونا صبا! چچی تو یوں بھی معمولی بات کو بھی دس سے ضرب دے کر بتاتی ہیں آج تو پھر بھی تم نے خاصی بدتمیزی کی ہے۔"

صبا کو اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔

"اور میں چچی کے اس ضرب دس والے فارمولے کو فیل کرنا بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لیے تم بے فکر رہو۔" وہ لاپروائی سے کہتی ابو کے کمرے کی طرف چل دی۔

"ابو! میں آ جاؤں؟" دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس نے اندر جھانکا۔ امی بھی موجود تھیں۔

"ہوں۔" ابو نے جواب میں بس اتنا ہی کافی سمجھا تھا اور صبا کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ ان کا موڈ واقعی خراب ہے۔ چہرے کے تاثرات میں بھی خاصی سختی تھی۔

وہ دل کڑا کر کے اندر چلی آئی۔

"جی ابو! آپ نے مجھے بلوایا تھا؟"

"بیٹھو۔" وہ بیٹھ گئی۔

"تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے...... تمہاری چچی نے مجھ سے تمہاری شکایت کی ہے۔"

"چچی کی باتوں کو تو آپ رہنے دیں ابو! حالانکہ آپ ان کی عادات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ معمولی سی بات کو بھی اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہیں کہ بس حد نہیں۔"

"بیٹا جی! پہاڑ بنانے کے لیے رائی بہر حال درکار ہوتی ہے۔ تم نے ضرور ان سے بدتمیزی کی ہوگی
تبھی وہ بھڑکی ہوئی ہیں۔"

"وہ صرف تب نہیں بھڑکتیں جب تک دوسروں کو الفاظ کی مار مار رہی ہوتی ہیں لیکن جیسے ہی انہیں خود
پر حملہ محسوس ہوتا ہے وہ فوراً بھڑک جاتی ہیں، میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی ابو! صرف ایک سچی بات کی
تھی اور انہیں ہر سچی بات ناپسند ہے۔"

"مجھ سے تو خیر اس بارے میں عالیہ نے کوئی بات نہیں کی مگر مجھے اندازہ ہے کہ بحث کس بات پر ہوئی
ہوگی۔ تمہیں ویسے بھی ہادی کی بے جا حمایت کی عادت ہے۔" امی نے کہا۔

"بے جا حمایت۔" اس نے بے یقینی سے امی کو دیکھا۔

"میں ہادی کی بے جا حمایت نہیں کرتی امی! میں صرف اس گھر کے ہر فرد کو احساس دلانا چاہتی ہوں
کہ ہادی کے ساتھ ملازموں کا سا برتاؤ نہ کیا جائے۔ بلکہ ایسا سلوک تو اب لوگ ملازموں کے ساتھ بھی نہیں
کرتے۔ بے چارا باہر کا ایک کام نمٹا کر آتا ہے تو دوسرے کے لیے بھگا دیا جاتا ہے اور......"

وہ ابھی اور بھی بہت کچھ گنوانا چاہتی تھی جب امی نے ٹوک دیا۔

"اب اتنی غلط بیانی بھی نہ کرو تم۔ آدھے سے زیادہ دن تو وہ خود باہر گزار کر آتا ہے۔" بات صرف
عالیہ تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا یہاں تو ان سمیت سب کو گھسیٹ لیا تھا اس نے۔

"اور اس آدھے دن میں بھی وہ کئی کام اسی گھر کے نمٹا رہا ہوتا ہے۔ کبھی بل جمع کروانا تو کبھی راشن
لانا......آپ خود بتائیں ابو، کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ کسی کو اسے کھانا گرم کر کے دینے کی توفیق بھی نہیں
ہوئی۔"

"اب دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں وہ کہ ہر کام ہاتھ سے کر کے دیا جائے۔" اسے عالیہ چچی اور امی میں کچھ
خاص فرق دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"عباد بھائی کو آپ خود کھانا گرم کر کے دیتی ہیں نا عادل اور منصور کو بھی چچی، نہ صرف گرم کر کے دیتی
ہیں بلکہ بچوں کی طرح پلیٹ میں خود نکال کر دیتی ہیں جبکہ تائی اماں تو تب تک اپنے بیٹوں کے پاس ہی بیٹھی
رہتی ہیں جب تک وہ کھانا کھا نہیں لیتے......ویسے اپنائیت کا احساس دینے کے لیے ضروری نہیں کوئی بڑے
عمل کیے جائیں چھوٹی چھوٹی باتیں ہی انسان کا مان بڑھا دیتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتی کہ آپ لوگ ہادی سے کوئی کام نہ لیں۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ اسے صرف منہ سے
بیٹا نہ کہیں سمجھیں بھی۔ کیا فرق پڑ جائے گا اگر آپ لوگ اپنے سگے بیٹوں کی طرح تھوڑا خیال اس کا بھی کر
لیں۔ کھانے پینے کا دھیان رکھ لیا۔ کپڑے وغیرہ استری کر دیے۔ وہ بے چارا یونیورسٹی سے آتا ہے تو
پچاس کام اس کے لیے تیار رکھے ہوتے ہیں۔"

ہمیں بتائیں گی کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میں پوچھتی ہوں پال پوس کر اتنا بڑا.

"لو سنو ذرا......اب یہ

ہم نے۔
لیا احساس کے بغیر ہی کر دیا ہے
پورا دن دفتر میں دماغ کھپا کر آتے ہیں۔ وہ اگر فارغ
باقی لڑکے ملازمتوں سے لگے ہوئے ہیں۔
آخر اس میں برائی ہی کیا ہے۔"
وتا ہے تو تھوڑا کام کر دیتا ہے میں پوچھتی ہوں
ان کا بھی تو آدھا دن فارغ ہی ہوتا ہے مگر ان سے تو کوئی
"منصور اور احمر بھی ابھی کالج جاتے ہیں۔
عباد بھائی کی جب ملازمت نہیں ہوئی تھی تو ابو نے انہیں فوٹو اسٹوڈیو کھول دیا تھا کیا
کام نہیں کروایا جاتا......

برائی ہے اگر......"

"صبا! ہادی ابھی زیر تعلیم ہے ادھر سے فارغ ہوگا تو ہم ضرور اس کے کاروبار کے متعلق سوچیں گے۔
آخر کو ہمارا اپنا بچہ ہے۔ مگر ابھی اس میں بہت وقت ہے۔ ادھر ادھر کی بے کار سوچوں پر دماغ لگانے سے
بہتر ہے کہ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔"

ابو کا انداز اس قدر سخت اور دو ٹوک تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔

"اور سنو آئندہ مجھے شکایت نہیں ملنی چاہیے۔" وہ بہت آف موڈ کی ساتھ باہر نکل آئی۔

"ایک سے ایک خود غرض انسان موجود ہے اس گھر میں۔"

"تمہیں کیا ہوا ہے صبا......رو رہی ہو کیا؟" ہادی جانے کدھر سے آ نکلا تھا۔

صبا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور تڑخ کر بولی۔

"میں کیوں روؤں، روئیں میرے دشمن۔ ایک اکیلے تم اپنا حق لینے کے قابل ہو جاؤ تو مجھے اتنا دماغ
ہی نہ خراب کرنا پڑے۔" وہ تقریباً الٹ ہی پڑی تھی اس پر۔ ہادی نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا پھر مسکرا
دیا۔

"مگر میں نے تم سے کب کہا ہے کہ میرے حق کے لیے جھگڑتی پھرو؟ اول تو میری کوئی حق تلفی نہیں ہو
رہی، دوم یہ کہ اگر کچھ ایسا ہے بھی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اس کا مطلب میرا ہی دماغ خراب ہے۔ عموماً بے حسوں کو فرق پڑا بھی نہیں کرتا۔" اپنی عادت کے
عین مطابق وہ پھر توڑ لہجے میں کہتی آگے نکل گئی۔ ہادی مسکراتا ہوا وہیں کھڑا رہا۔

"تمہارا دماغ خراب نہیں ہے صبا! اصل میں تم بہت اچھی ہو سارے زمانے کا درد دل میں لیے
گھومنے والی۔"

کسی خیال سے چونک کر اس نے ماموں کے دروازے کی طرف دستک کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

+

"ویسے صبا ایک بات مجھے اب تک سمجھ نہیں آ سکی......تم جھگڑا کرتی ہو تو ہادی کی وجہ سے، تمہیں

ڈانٹ پڑتی ہے تو ہادی کی وجہ سے آخر...... یہ چکر کیا ہے؟'' قانتا کی معنی خیز آواز ایئر پیس پر گونجی تو صبا نے گہری سانس بھرتے ہوئے ریسیور کو یوں دیکھا جیسے اس میں قانتا کی شکل دکھائی دے رہی ہو پھر [illegible] سے بولی۔

''بیڑہ غرق اس وقت کا جب میں نے تمہیں ساری بات بتائی۔ مگر تم یہ بات سمجھنے کی کوشش میں اپنے دماغ کی چولیں مت ہلاؤ۔ صرف یہ بتاؤ کہ فون کس لیے کیا ہے؟'' جواب میں قانتا کا بھرپور قہقہہ گونجا تھا۔

''کیونکہ تمہارے اس سارے ڈائیلاگ میں ساری بات ہی ایسی ہے جو مجھ جیسی ٹھنڈے مزاج کی لڑکی کو بھی غصہ دلا سکتی ہے مگر چونکہ میں بہت خوش ہوں اس لیے تمہاری ہر خطاء معاف۔'' اس کا انداز خاصا شاہانہ تھا۔

''خوش، کس خوشی میں ہو؟''

''کوئی ایسی ویسی خوشی...... بھئی بہت بڑی خوش خبری ہے۔'' پرجوش انداز میں قانتا نے تجسس [illegible] پھیلایا۔

''کیا تم فوت ہونے لگی ہو؟'' صبا نے بڑے مزے سے جملہ چست کیا۔ قانتا پل بھر کو خاموش رہی پھر تڑخ کر بولی۔

''صبا! میں سچ کہہ رہی ہوں اب تم نے مزید کوئی فضول بات کی تو میں فون بند کر دوں گی اور پھر نہ تم سے بات کروں گی نہ ہی خوش خبری سناؤں گی۔''

اب ہنسنے کی باری صبا کی تھی۔

''اچھا بابا! اب سنا بھی چکو خوش خبری۔''

''ثمن کی بات طے ہو گئی ہے۔ اگلے مہینے کی سات کو شادی اور ٹھیک دو روز بعد منگنی ہے۔'' قانتا نے اپنی بڑی بہن کا نام لیا۔

''ارے...... سب کچھ اتنا اچانک؟ خیر...... بہت مبارک ہو۔'' اس نے جی بھر کر خوشی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

''بس یار! تمہیں تو پتا ہے، شہباز ماموں کب سے وہاج بھائی کے لیے کہہ رہے تھے مگر پہلے ہم لوگوں کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ ثمن ابھی پڑھ رہی تھی مگر اب ایک تو اس کی پڑھائی بھی مکمل ہو گئی ہے دوسرا یہ کہ وہاج بھائی ایف آر سی ایس کرنے امریکہ جا رہے ہیں اور ان کا ارادہ جاتے ہی ثمن کو بلوا لینے کا ہے۔ بس اسی لیے سب کچھ جلدی جلدی کرنا پڑ رہا ہے۔''

''ثمن تو خوش ہے نا...... اسے میری طرف سے مبارک دے دینا۔'' اس نے کہا

''ہاں! بہت خوش ہے بالکل انار بنی ہوئی ہے اور میں کیوں مبارک دوں؟ یہ کام تم خود ہی کرنا دو روز

بعد منگنی ہے اور تم نے ضرور آنا ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں وقت بتانے لگی۔

''نائیٹ فنکشن ہے یار! میرا خیال ہے مجھے گھر سے اجازت نہیں ملے گی۔''

گو کہ اسے احساس تھا کہ اسے منع نہیں کیا جائے گا۔ آج تک امی ابو نے اپنی اس لاڈلی بیٹی پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی مگر کہنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔

''کیوں نہیں ملے گی اجازت...... بھئی پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری میری ہوگی، تم اپنی مرضی بتاؤ، آنٹی انکل کو میں خود ہی مناؤں گی۔''

''اچھا میں کل تمہیں فون پر بتا دوں گی۔'' اس نے ٹال مٹول کر کے فون بند کر دیا۔ حالانکہ راضی تو وہ دل و جان سے تھی مگر چاہتی تھی قانتا اصرار کرے اور اسے یقین تھا کہ وہ اصرار کرے گی بھی ضرور۔

گو کہ ان دونوں کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس مختصری مدت میں ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئی تھیں۔

صبا کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پارٹی ویئر، میچنگ جیولری، میک اپ اس کا ارادہ بہت اہتمام سے تیار ہونے کا تھا۔ وہ اس فنکشن میں سب سے زیادہ خوب صورت دکھنا چاہتی تھی۔ ثمن سے بھی زیادہ اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنی کوششوں میں ضرور کامیاب ہوگی۔

اپنے کمرے سے نکل کر وہ امی کے کمرے کی طرف آئی تا کہ انہیں ثمن کی منگنی کا بتا سکے مگر کسی سوچ نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

ثنا کی شادی کے سلسلے میں انہیں جتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا انہوں نے امی کو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس کر دیا تھا۔ کسی کی بھی شادی، منگنی کی خبر ملتی انہیں خلجان ہونے لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے خدا سے نالاں رہتیں کبھی قسمت سے شکایت ہوتی تو کبھی ثنا کی کم صورتی سے۔

وہ امی کے کمرے میں آئی تو صورت حال کچھ عجیب سی تھی۔ امی کے تاثرات سمجھ سے بالاتر جبکہ شائستہ خالہ کی صورت شرمندہ شرمندہ۔ وہ اسی شہر میں مقیم تھیں اور صبح سے آئی ہوئی تھیں۔

''میں مانتی ہوں کہ میری ثنا کی عمر کچھ زیادہ ہو گئی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کسی بھی للو پنجو کے ساتھ اسے رخصت کر دوں۔'' وہ بہت غصے میں لگ رہی تھیں۔

''للو پنجو۔'' خالہ نے تعجب اور کچھ کچھ ناگواری سے سر اٹھایا تھا۔

''آپ کی آنکھوں کے سامنے پلا بچہ ہے۔ کوئی بری عادت بھی نہیں اس میں رگ رگ سے واقف ہیں آپ اس کی۔ میں تو کہتی ہوں اس سے زیادہ عقل مندانہ فیصلہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا آپ کے کہے کے آگے تو وہ آج ایک لفظ نہیں بولتا کل کیا کہے گا۔'' خالہ نے تصویر کا ایک رخ دکھانے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے تو حیرت ہے یہ خیال پہلے آپ کے دماغ میں کیوں نہیں آیا؟''

"اللہ بچائے ایسے خیالوں سے۔" امی تڑخ کر بولیں۔

"تم جو مجھے ایسا مشورہ دے رہی ہو تو اس مشورے سے پہلے ایک بار ہادی کو بھی غور سے دیکھ لینا سانولا رنگ...... بس ایک قد ہی ہے تو اس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ میری نازک سی ثنا سے بھلا کیا جوڑ دونوں کا۔"

"یہ بھی خوب کہی آپ نے، بھلا مردوں کی شکل کب دیکھی جاتی ہے۔"

"شکل وہاں نہیں دیکھی جاتی جہاں جیب بھری ہوئی نظر آ رہی ہو۔ یہاں تو ایسا بھی کوئی ذریعہ الٹا اب تک ہم ہی دے رہے ہیں۔"

"تو اسے کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی شروع کروا دیں بھائی صاحب۔ ماشاء اللہ محنتی لڑکا ہے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ انشاء اللہ چند ہی روز میں کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔"

"ارے رہنے دو بی بی! جنہیں بیٹھ کر ٹھونسنے کا مرض لگ جائے نا تو پھر آسانی سے یہ مرض پیچھا چھوڑتا۔"

"اتنی سنگ دلی سے نہ سوچیں آپا! ابھی اس بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ دوسروں کے در پر پڑا ہے اس لیے زیادہ کھٹک رہا ہے مگر یہاں تو ہادی سے چار چار برس بڑے بھی ماں باپ کی ذمہ داری بنے بیٹھے ہیں۔"

"یہ تو خیر تم نے سچ کہا ہادی کی عمر واقعی کم ہے۔" یکدم امی کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی تھی۔

"میری ثنا سے تو ڈیڑھ سال ضرور ہی چھوٹا ہوگا البتہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری نزہت سے تین سال بڑا ہے۔ اگر تمہیں ایسا ہی ہادی پسند ہے تو نزہت کے لیے سوچ لو...... کہو تو میں آج ہی بات کر لیتی ہوں تمہارے بھائی صاحب سے......"

ان کی آنکھوں کی چمک اب صبا پر واضح ہوئی تھی۔ باقی سب باتوں سے ہٹ کر اس آخری بات پر اس کے لب مسکرا دیے۔ امی کو میٹھا میٹھا طنز کرنے میں کمال حاصل تھا اور کس مزے سے انہوں نے ثنا خالہ کا مشورہ انہی کو لوٹا کر خاموش کروا دیا تھا۔

صبا کا دل چاہا وہ کچھ دیر مزید یہاں رک کر یہ گفتگو سنے مگر اس کا دماغ فی الحال کچھ اور سوچ رہا تھا وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

✦

فون جانے کب سے بج رہا تھا مگر کسی کو ریسیو کرنے کی فرصت نہ تھی۔

امی بہت دیر سے عالیہ ممانی کے پورشن میں تھیں۔ جانے کون سے صلاح مشورے آج کی تاریخ میں ہی ہونا ضروری تھے۔

ثنا جانے کب سے سر منہ لپیٹے پڑی تھی۔ صبا نے دو تین بار اس کی طبیعت کے متعلق پوچھا تھا مگر ثنا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ یوں تو بڑی متحرک طبیعت کی لڑکی تھی سکون سے ذرا کم ہی بیٹھتی تھی۔ ایک کام ختم ہوتا تو دوسرا شروع کر دیتی دوسرے سے نبٹتی تو تیسرا تیار کر لیتی۔

"ثنا...... ثنا پلیز فون ریسیو کرنا۔" چوڑیاں پہنتے ہوئے اس نے پلٹ کر اسے مخاطب کیا۔ ثنا نے اکتا کر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

"تم ہی دیکھو جا کر شاید قانتا ہی ہوگی۔"

"قانتا کا فون تو پہلے آ چکا ہے اب تک تو وہ گھر بھی پہنچنے والی ہوگی۔" وہ اسی کے یہاں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

"پھر ہے ہادی گھر پر وہ خود ہی دیکھ لے گا۔"

"ایک ہادی ہے، آخر وہ بے چارا کون کون سا کام کرے۔"

"صبا! مجھے تنگ مت کرو، ایسی ہی ہادی سے ہمدردی ہو رہی ہے تو خود جا کر فون ریسیو کر لو، میرا دماغ مت کھاؤ۔" اس کے لہجے میں اس قدر بے زاری تھی کہ صبا مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور کان میں بندہ ڈالتے ہوئے باہر آ گئی۔

"ہیلو۔"

"السلام علیکم! کیا ہادی گھر پر ہے۔" بہت عجلت بھرے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

صبا بھرپور طریقے سے چونکی۔ یہ آواز اس کے لیے انتہائی مانوس تھی۔ پہچاننے میں تو خیر غلطی کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"سعد بات کر رہے ہو نا...... کیسے ہو؟ بہت دنوں سے چکر بھی نہیں لگایا خیریت؟" اس کا خوشگوار موڈ کچھ اور خوشگوار ہوا تھا تبھی اس کے اجنبیت بھرے لہجے کو بھی مائنڈ نہیں کیا۔

"ہاں وہ بس کچھ مصروفیت رہی۔ ہے ہادی گھر پر؟" ایک بار پھر اس نے اپنا سابقہ لہجہ برقرار رکھا۔

"یہ بھلا بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟" وہ بہت اپنائیت بھرے انداز میں ڈپٹ کر بولی مگر دوسری جانب اس کی بات کا اثر کچھ الٹا ہی ہوا تھا جس کی توقع کم سے کم صبا کو تو نہیں تھی۔

"صبا! ہر بات کے لیے، ہر وقت مناسب نہیں ہوتا۔ بات کرنے کا کون سا طریقہ درست ہے اور کون سا نہیں اس پر پھر کبھی بات کی جا سکتی ہے فی الحال تم یہ اپنے Codes of conduct سنبھال کر رکھو اور برائے مہربانی ہادی کو بلا دو۔"

صبا کی ساری گرمجوشی منہ کے بل زمین پر گری تھی۔ اتنا انسلٹنگ رویہ لگا تھا سعد کا کہ وہ دنگ رہ گئی دل تو چاہا کہ جواب میں وہ بھی کراری سی بات کہے مگر چونکہ جھٹکا بہت زوردار تھا اس لیے کرارے جواب کی

بجائے دماغ نے جس پہلے مشورے سے نوازا اسی پر عمل کر ڈالا۔

"ہادی! تمہارا فون ہے۔" وہ وہیں سے چلا کر بولی تھی اور کھٹاک سے ریسیور ہولڈ پر لگا یا تھا
ہادی کمرے سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نیند کا ادھوراپن لکھا تھا۔

"کس کا فون ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ لٹھ مار انداز میں کہتی آگے نکل گئی۔

موڈ بری طرح سے آف ہوا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اسی وقت قانتا آ گئی تو اسے خود پر قابو پانے
شعوری سی کوشش کرنی پڑی۔ اگر گھر میں رہتی تو اتنا بھی نہ کرتی کہ وہ اپنے موڈ کو اپنی پسند ناپسند کے
رکھتی تھی کسی دوسرے کی خاطر اس نے اپنے مزاج پر قابو پانے کی بہت کم کوششیں کی تھیں۔ بس ایک ہی
جس کی خاطر وہ اپنا موڈ بدل لیا کرتی تھی۔

"غیر اہم لوگوں کو اہمیت دینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔"
بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے دماغ کو ایک اسی نقطے سے نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

قانتا کے یہاں ملنے والی غیر معمولی پذیرائی نے اس کے موڈ پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ یہی
کہ واپسی پر وہ بہت فریش دکھائی دے رہی تھی۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کسی غیر معمولی
احساس ہو گیا تھا۔ سارے گھر کی لائٹس تقریباً آن تھیں اور دونوں طرف کے پورشنز کے درمیانی لان
کھلنے والے ہادی کے کمرے میں ہنگامی جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔

اسے جی بھر کر حیرت ہوئی۔

"کیا پتا، ہادی کا کوئی پرائز بانڈ وغیرہ نکل آیا ہو۔ ورنہ اس کے بغیر تو ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہو
سب کو اس کے کمرے میں جمع ہونے پر مجبور کر دے۔" تجسس میں ہادی کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے
اس نے سوچ ڈالا تھا مگر اسے دروازے کی دہلیز عبور کرنے کی جگہ بھی نہ مل سکی اصل میں کمرہ چھوٹا تھا
زیادہ، تبھی تو رمشہ اور ثنا تقریباً کمرے سے باہر کھڑی تھیں۔

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"سعد کی اپنے روم میٹس سے لڑائی ہو گئی تھی انہوں نے اسے بہت بری طرح سے زدوکوب کیا۔"
ثنا نے اس کے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں استفسار کرنے پر کسی عام سی بات کی طرح بتایا تھا۔

"کیا۔" بے تحاشا پریشان ہو کر وہ اچک اچک کر اندر جھانکنے لگی تبھی اسے بیڈ پر مضمحل سے انداز
لیٹا سعد دکھائی دے گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ خجالت آمیز تاثرات تھے اور بے تحاشا زردی۔ چہرہ
سوجا ہوا تھا۔ ماتھے، بازو اور پیر پر پٹیاں بندھی تھیں۔

اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ فوراً کس طرح ری ایکٹ کرے تبھی ثنا پر الٹ پڑی۔

"تم تم سے کم مجھے فون ہی کر دیتیں۔"

"اس سے کیا ہو جاتا؟"

"میں جلدی آ جاتی۔" اسے سخت تاسف کا سامنا تھا۔

"جلدی آ کر تم کیا کر لیتیں؟......" ثنا کے اس تیکھے سوال نے اسے پل بھر کے لیے خاموش کروا دیا۔

"اور اگر تم اس کی تیمارداری کی وجہ سے کہہ رہی ہو تو اس کے لیے یہاں پہلے سے ہی بہت لوگ
ں۔" ثنا کے لہجے میں اب سب کے لیے طنز تھا۔

"مگر جھگڑا ہوا کس بات پر تھا؟"

"یہاں سب لوگ یہی سوال باری باری اس سے پوچھ چکے ہیں۔ تم بھی جا کر پوچھ لو۔ ورنہ کچھ صبر کر
اب تو سعد بہت دن تک یہیں رہے گا کبھی نہ کبھی تو پتا چل ہی جائے گا۔"

"بہت دن۔" صبا کی آنکھیں کسی خیال سے چمک اٹھی تھیں۔

اندر اس کی امی سعد سے کہہ رہی تھیں۔

"میں تو مان ہی نہیں سکتی کہ جھگڑے میں تم نے پہل کی ہوگی، تم تو اتنے ٹھنڈے مزاج کے بچے ہو۔
دی! یہ تم نے بہت اچھا کیا جو اسے ساتھ ہی لے آئے۔ ان نامرادوں کی کیا خبر؟ ہم نے تو پہلے بھی کئی بار کہا
کہ یہیں آ کر رہو مگر بیٹے! تمہیں ہی ہم سے غیریت برتنے کا شوق ہے، حالانکہ ہم نے کبھی تم میں فرق نہیں
کیا۔"

اس وقت یہاں کوئی اجنبی بھی آ جاتا تو با آسانی اندازہ کر سکتا تھا کہ سعد احسان کو ملنے والی اہمیت اور
پسندیدگی کا گراف اس گھر میں کتنا بلند ہے۔

"جی ممانی! آپ کا شکریہ۔" اس کی آرام سے سو جانے کی خواہش دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی
مگر یہاں کسی کو احساس ہی نہ تھا۔

"ارے شکریہ کیسا بیٹے...... میں تو کہتی ہوں تم عباد کے کمرے میں چلے چلو۔ وہ کمرا بڑا بھی ہے اور
ٹھنڈا بھی، پچھلی طرف جو کھڑکی ہے ادھر سے بڑی اچھی ہوا آتی ہے۔" انہوں نے گویا لالچ دیا۔

عالیہ ممانی نے کچھ تمسخرانہ نگاہوں سے جیٹھانی کو دیکھا اور بولیں۔

"آئے تو عادل کا کمرہ کیا برا ہے۔ کشادہ بھی ہے پھر کھڑکی سے ہوا نہیں آتی خیر سے اے سی لگا ہوا
ہے۔"

"اصل میں، میں ہادی کے ساتھ ہی ریلیکس رہ سکوں گا۔ ابھی دو تین روز تک تو مجھے اٹھنے بیٹھنے میں
بھی مدد درکار ہوگی اور عادل یا عباد ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتے جبکہ آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق
ہادی کو تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا تو چلیں چند روز یہ بھی کوئی کام کر لے گا۔ یہ کمرہ بھی اچھا خاصا ٹھنڈا ہے، البتہ

گنجائش کچھ کم ہے۔ یہ پیٹیاں یکسے اٹھا دیے جائیں تو اچھی خاصی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔"

"ارے ہاں کیوں نہیں...... یہ اٹھوا کر عالیہ کے اسٹور میں رکھوا دیتے ہیں ادھر کافی گنجائش ہے۔"

مصباح نے ایسے موقع پر گرفت کی تھی کہ وہ کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ اگر جو سعد موجود نہ ہوتا تو خوب اچھی طرح طبیعت صاف کرتیں۔ مگر خیر انہوں نے کون سا حساب رہنے دینا تھا۔ اب کا بدلہ کسی اور موقع پر لیتیں۔

سعد نے اکتا کر پہلو بدلا اور مدد طلب نظروں سے ہادی کو دیکھا، مگر بے کار کوشش تھی فی الحال کوئی اٹھنے کو تیار نہ تھا۔

+

"آخر آپ یقین کر کیوں نہیں لیتیں کہ میں کافی بڑا ہو چکا ہوں۔ جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی...... جی نہیں مگر غلط اور صحیح کے درمیان فرق کرنا آتا ہے مجھے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میں جھگڑے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ البتہ کوئی خود پہل کر رہا ہو تو اسے بخشتا بھی نہیں ہوں۔ بزدلوں کی طرح پیچھے ہٹنے کا فائدہ۔

اصل میں ارباز نے مجھ سے کچھ رقم ادھار لے رکھی تھی کل میں نے واپسی کا تقاضا کیا تو وہ صاف مکر گیا۔ بس یہیں سے تھوڑی بحث ہو گئی۔ بات یہیں تک رہتی تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر ارباز نے مغلظات شروع کر دیں تو میری برداشت بھی ختم ہو گئی۔ گردن سے اسے پکڑ کر منہ پر اتنے گھونسے مارے کہ فوراً سیدھا ہو گیا۔"

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھا سعد موبائل پر بات کر رہا تھا جبکہ اسائنمنٹ مکمل کرتے ہادی کے لبوں پر مستقل ایک مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔

سعد کا انداز گفتگو تھا بھی تو اس قدر دلچسپ۔

"ہاہاہا...... آپ بھی کمال کرتی ہیں امی! اپنے اتنے ٹیلنٹڈ بیٹے کے ٹیلنٹ پر تو آپ کو بھروسہ ہی نہیں ہے۔ تبھی تو اس طرح کہہ رہی ہیں۔"

"نہیں، نہیں...... اس وقت تو میں نے ارباز کو ٹھیک کر کے رکھ دیا تھا مگر شام کو وہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر آ گیا اور ان کے پاس میری طرح صرف گھونسے نہیں تھے بلکہ بڑے موٹے ڈنڈے تھے...... اللہ کا شکر بھئی میں زندہ سلامت ہوں۔ یقین کریں ایک بھی ہڈی نہیں ٹوٹی۔ میں اسی لیے آپ کو اطلاع نہیں دے رہا تھا کہ پھر آپ رونا شروع کر دیتی ہیں مگر یہ ہادی کا بچہ......"

اس نے ہادی کی طرف دیکھ کر دانت کچکچائے۔

"اسی لیے کہتے ہیں، بیوقوف دوست سے دانا دشمن بھلا...... ذرا آپ رونا اور فون دونوں بند کریں

پھر میں اس بیوقوف دوست کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔

بس بھی کریں امی، اصل میں تو آپ جیسی چھوٹے دل کی مائیں ہی اپنے بیٹوں کو محبت کا واسطہ دے دے کر بزدل بنائے رکھتی ہیں۔ جی نہیں میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔ ارباز گروپ کو تو ضرور مزہ چکھانا ہے۔"

"ہادی کو...... اب اسے کون سی انسٹرکشنز دینی ہیں آپ نے؟...... اوکے، اوکے لیں کر لیں بات۔"

"لو میاں کروا اپنی پھپھی جان سے بات۔" سعد نے فوراً ہی موبائل اس کی جانب اچھال دیا تھا جسے ہادی نے بمشکل کیچ کر لیا۔

"جی پھپھو! السلام علیکم...... جی جی اللہ کا شکر ہے آپ سنائیے۔" اب وہ بول رہا تھا اور سعد سن رہا تھا۔

"نہیں پھپھو! سعد نے جھوٹ نہیں کہا۔ چوٹیں تو خیر آئی ہیں مگر اتنی شدید نہیں ہیں۔ انشاء اللہ ایک ہفتے میں دوڑنے لگے گا۔ ہاہاہا! جی جی آپ اس کی فکر نہ کریں، یہ اب یہیں رہے گا ہاسٹل کا تو اب بس نام ہی یاد رہنا ہے اسے۔ کہتا ہے تو کہنے دیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اس پر بھروسہ نہیں ہے تو کم سے کم مجھ پر ہی کر لیں۔ میں اسے کہیں جانے نہیں دوں گا...... کون وہ ارباز وغیرہ، کہاں ٹینشن فری ہو جائیں۔ ان سے تو اب میں سعد کا سامنا ہی نہیں ہونے دوں گا۔"

"جی ہاں؟ سعد تو چھوٹا سا بچہ ہے نا جس کی انگلی پکڑ کر یہ اسے چلائیں گے۔"

سعد بدمزگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہے بنا نہ رہ سکا۔ امی کی تشویش اپنی جگہ درست تھی مگر جس قسم کے بزدلانہ درس وہ اسے دے رہی تھیں وہ اس کے لیے قطعی ناقابل عمل تھے۔

تب ہی اس کی نگاہ صبا پر پڑی۔ وہ دروازے میں کھڑی غالباً تذبذب کا شکار تھی۔

"ارے صبا! وہاں کیوں کھڑی ہو اب تک؟ اندر آ جاؤ۔"

صبا مسکراتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ ایک نظر موبائل پر مصروف ہادی پر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سعد کی طرف بڑھا دی۔

"یہ امی نے تمہارے لیے بھجوایا ہے۔" سعد نے پلیٹ کو دیکھا پھر اسے۔

"کیا ہے؟"

"گاجر کا حلوہ۔"

"واقعی۔" سعد نے ایک دم پر جوش ہو کر ہاتھ بڑھایا تھا مگر تازہ زخم تھا ایک کراہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی تھی۔

"احتیاط سے بھئی...... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" صبا نے پلیٹ اس کے قریب رکھ دی۔ چمچہ بھی ساتھ لائی تھی۔ سعد نے کھانے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا۔

"زبردست..... مگر اس موسم میں گاجریں کہاں سے مل گئیں اور تمہیں کیسے پتا کہ مجھے گاجر کا حلوہ پسند ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"مجھے تو نہیں پتا تھا سب کچھ، امی نے کیا ہے صبح سے لگی ہوئی تھیں۔"

اس نے فوراً ہی جتا دیا۔ اپنی دلچسپی کے باوجود خود کو ہمیشہ ہی برتر مقام پر دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا۔

"اچھا" جانے کیوں وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ان دونوں کے مابین خوشی کا مختصر سا وقفہ آیا تو کمرے میں ہادی کی آواز گونج رہی تھی تب ہی صبا نے پوچھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"بڑی جلدی خیال آ گیا" اس کے لہجے میں بڑا واضح شکوہ تھا۔ صبا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"میں تو کل بھی پوچھنا چاہ رہی تھی مگر ایک تو ادھر سب جمع تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ دوسرا میں نے سوچا کہ تم آرام کر لو تو یہی بہتر ہے۔ حال تو بعد میں بھی پوچھا جا سکتا تھا۔"

سعد نے نظریں اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی وضاحت کی سچائی کا یقین کرنا چاہتا ہو۔

"مجھے لگا تم ناراض ہو؟" کیا یہ خدشہ تھا؟ صبا نے یقین کرنے کی کوشش کی اور لاپروائی سے بولی۔

"وہ بھلا کیوں؟"

سعد کو شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی تب ہی خاموش سا ہو گیا پھر جیسے بہت سوچ کر بولا۔

"میں نے تم سے مس بی ہیو کیا تھا؟"

"مس بی ہیو کی بھی کوئی وجہ تھی۔" اس کے انداز میں اب بھی پہلے کی سی لاپروائی تھی۔ تبھی ہادی موبائل آف کر چکا تو، وہ اٹھ کھڑی ہوئی حالانکہ دل ابھی اٹھنے پر راضی نہ تھا۔

✦

"ثنا کے لیے جو پرپوزل آیا ہوا تھا اس کا کیا بنا؟"

صبا کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے قانتا نے پوچھا تھا۔ پلیٹ میں فرنچ فرائز اور نگٹس کے ساتھ ڈرنک کا ٹن بھی تھا۔

"ہونا کیا تھا یار! وہ لوگ آئے، کھایا پیا اور چلے گئے۔" صبا کے لہجے میں تلخی جھلک رہی تھی۔

"انہیں تو اتنی بھی توفیق نہ ہو سکی کہ ایک پانچ روپے کی کال کر کے معذرت ہی کر لیں۔ بے حس ہوں تو۔ دوسروں کو امید و ناامیدی کے درمیان چھوڑتے ہوئے ان کے دلوں کو کچھ نہیں ہوتا؟ اصل بات ہے کہ لوگوں نے دوسروں کی اولاد کو اپنی مرضی کے مطابق ٹریٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ انسان کو شو پیس ہی سمجھتے ہیں۔ آئے، دیکھا، پسند آیا تو ٹھیک ورنہ چھوڑ کر آگے چل دیے۔ شو پیسز کے بھی کوئی احساسات کرتے ہیں؟"

وہ گرل پر کہنی ٹکائے ڈرنک کا تلخ گھونٹ بھر رہی تھی۔

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ذرا دیر پہلے برسنے والی چند ہی بوندوں نے عجب سی تازگی ہر طرف بھر دی تھی۔ آسمان کئی رنگوں میں بٹا دکھائی دینے لگا تھا اور ہوا میں بے حد تراوٹ تھی۔

"کول ڈاؤن صبا! اس طرح اپنا خون جلانے سے بھلا ہو بھی کیا سکتا ہے۔" قانتا ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

"اصل میں، میں آج تمہاری طرف آئی ہی اس سلسلے میں ہوں۔ مما تو مجھ سے کب سے کہہ رہی تھیں کہ تم سے بات کروں بس آج دھیان آیا تو چلی آئی۔"

صبا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑا تھا۔ اس کی ساری حسیات چونک کر قانتا کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ ایک خیال ذرا مختلف انداز میں پورا ہونے جا رہا تھا۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے، ثنا ہی سہی۔"

اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں ساری کلکولیشنز مکمل کر کے گویا بڑے دل سے فیصلہ کر ڈالا تھا۔

قانتا کا ایک آخری بھائی جو فی الحال غیر شادی شدہ تھا۔ شاید قانتا اسی کے متعلق بات کرنے جا رہی تھی۔

"میری خالہ کا بیٹا ہے نعمان، ایم کام کر رکھا ہے اور بینک میں جاب کرتا ہے، گو کہ خالہ کا گھرانا بہت امیر نہیں ہے مگر پھر بھی ان کی مالی حیثیت بہت اچھی ہے۔ نعمان کے علاوہ دو بہنیں ہیں بڑی والی میرڈ ہے جبکہ چھوٹے کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے، خالہ کا ارادہ نعمان اور افشاں کی شادی ایک ساتھ ہی کرنے کا ہے۔"

"خالہ کا بیٹا..... بینک میں ملازم اچھی مالی حیثیت، دھت تیرے کی۔" اسے جیسے انتہائی مایوسی ہوئی۔

"یہاں تو ذات برادری کا جھنجھٹ بھی نہیں ہے کہ تم لوگ بھی شیخ ہو اور ہم بھی۔ تم آنٹی سے بات کرو اور اگر مناسب لگے تو کسی روز ہمارے یہاں ہی ملاقات رکھ لیتے ہیں، نعمان بھائی کو بھی میں بلوالوں گی تم ظاہر ہے کہ ثنا کے خیالات سے واقف تو ہو گی ہی۔ تو انہی خیالات کی روشنی میں نعمان کو پرکھ لینا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں صبا کہ تمہیں ان سے مل کر ذرا بھی مایوسی نہیں ہو گی۔ شکل بھی اچھی ہے اور عادات تو خیر بہت ہی اچھی ہیں بس..... ایک ہی خامی ہے جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مالی حیثیت تھوڑی کمزور ہے۔"

"یہ کوئی معمولی خامی ہے، بلکہ یہی تو سب خامیوں کی جڑ ہے۔ دولت ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، بس اچھے لوگ ہونے چاہئیں پڑھے لکھے اور عزت دار" بظاہر اس نے بڑی لاپروائی سے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میرا خیال ہے نیکسٹ سنڈے رکھ لیتے ہیں۔" قانتا بہت پرجوش ہو کر بولی۔

"میں خود سے تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتی البتہ امی سے بات کرنے کے بعد تمہیں کال کر دوں گی۔" اس

نے حقیقتاً جان چھڑائی تھی اور بات پلٹنے کی غرض سے نیچے لان میں جھانک کر بولی۔

''ان لڑکوں کو تو نجانے آج کیا ہوگیا ہے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔''

قانتا اس کی تقلید میں نیچے کی طرف دیکھنے لگی، وہ چونکہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی اس لیے تقریباً سب سے واقف تھی۔ مگر وہ لڑکا، جس کے ماتھے اور بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور جو اس وقت عالیان سے بیٹ لینے کے لیے بحث کر رہا تھا۔

''یہ بلو شرٹ والا لڑکا کون ہے؟...... تمہارا کزن تو نہیں لگتا۔''

''کیوں؟ میرا کزن کیوں نہیں لگتا؟...... جو میرے کزن ہیں، ان کے کیا ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ میرے کزن ہیں۔'' صبا نے تعجب سے کہا۔

''یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ تمہارا کوئی بھی کزن اتنا ہینڈسم نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ شرارتی تھا، صبا نے بلا تکلف اس کے شانے پر چپت رسید کی۔

''خوامخواہ...... تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ ورنہ میرے سارے کزنز ہی ہینڈسم ہیں۔'' وہ خود بھی مسکرا رہی تھی۔

''اور ان میں سب سے زیادہ ہینڈسم تو ہادی ہی ہوگا۔'' وہ اب دائیں طرف کے برآمدے میں الگ تھلگ بیٹھے ہادی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ صبا پھر حیران ہوئی۔

''ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' اس نے ہادی کی جانب بغور دیکھا۔

''تمہارے کزنز میں صرف ایک ہادی ہے جس میں تمہیں دنیا جہاں کی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں تو ظاہر ہے کہ ہینڈسم بھی سب سے زیادہ وہی لگتا ہوگا۔'' قانتا نے اسے بڑی سنجیدگی سے چڑایا۔

''خیر میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا تھا اس میں دنیا جہاں کی خوبیاں ہیں اور نہ ہی میں نے کبھی اسے ہینڈسم کہا ہے مگر وہ اچھا ہے آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟'' وہ اب پہلے سے بھی زیادہ برآمدے کے فرش پر بیٹھے ہادی کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں خیر برائی تو کوئی بھی نہیں ہے بس قد تھوڑا چھوٹا ہے۔ شکل سے تھوڑا گاوّدی بھی لگتا ہے اور رنگ تھوڑی کالی ہے۔'' اس کے لہجے میں تمسخر ہی تمسخر تھا۔

''تو جو شکل سے گاوّدی لگتے ہیں کیا وہ انسان نہیں ہوتے؟ قد اس کا چھوٹا نہیں ہے بے حد نارمل ہے اور اگر چھوٹا ہے تو کوئی خاص فرق نہیں خیالات چھوٹے نہیں ہونے چاہئیں۔ رنگت کالی ہو پر دل کالا نہ ہو باقی تو سب خیر ہے۔''

''کم آن صبا! تم تو سیریس ہی ہوگئی ہو۔ بھئی میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

''یہ بھی خوب رہی، کسی کی پوری ذات زیر بحث آگئی اور آپ کا ٹھہرا مذاق۔''

''اچھا! سوری اب تمہارے اس ہادی کی شان میں میرے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکلے گا...... اب خوش، تم سے کب اب ہی بتا دو کہ اس ٹام کروز سے تمہاری کیا رشتہ داری ہے؟''

''بس رشتہ داری ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے۔'' بدلتے ہوئے موضوع پر اس کا موڈ کافی خوشگوار ہوا تھا۔

''رشتہ داری کبھی کبھی بس رشتہ داری نہیں ہوتی کوئی تو ہوتی ہے دور کی یا قریبی۔''

''اور اس رشتہ داری کو کیا کہتے ہیں جس کا تعلق براہ راست دل سے جڑا ہوتا ہے قریبی یا دور کی؟'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا اور متبسم بھی۔ قانتا چونکی۔

''یہ صرف قریبی رشتہ داریاں نہیں ہوتیں بے حد قریبی ہوتی ہیں...... ویسے اگر میں غلط نہیں سمجھ رہی تو یہ سعد ارسلان ہے نا۔ ہادی کا پھپھی زاد بھائی۔''

صبا نے مسکراتے ہوئی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر جیسے ساری دنیا کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

''ہوں۔'' قانتا نے پر سوچ ہنکارا ابھرا۔ اس کی نگاہوں میں سعد کے لیے بے حد ستائش دکھائی دے رہی تھی۔

''تو یہ ہیں وہ موصوف، جنہوں نے ہماری صبا کی راتوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔'' اچھی طرح سے سعد کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد قانتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ صبا ہنستے ہوئے کرسی پر جا بیٹھی۔

''جی نہیں...... اصل میں یہ ہیں وہ موصوف جن کی راتوں کی نیند میں نے اڑا رکھی ہے۔''

''اس نے تمہیں خود بتایا ہے۔'' قانتا تجسس سے اس کے قریب آ بیٹھی۔

''منہ سے تو نہیں بتایا مگر کوئی زبان آنکھوں کی بھی ہوتی ہے۔'' وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔

''دھت تیرے کی۔'' قانتا نے ناگواری سے کہا۔

''یہ مرد بڑے چالباز ہوتے ہیں ان کی محبت پر تب تک یقین نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ یہ منہ سے نہ کہہ دیں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں جب منہ سے کہہ دیں تب بھی یقین نہیں کرنا چاہیے انہیں تو زبان سے پھرتے بھی دیر نہیں لگتی۔''

اس کی بات پر صبا جو ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

''تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے بہت تجربے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہو۔''

''محترمہ! ہر ایک کو سبق حاصل کرنے کے لیے تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی کوئی چیز مشاہدہ بھی ہوتی ہے۔'' اسے اپنے موقف پر ڈٹے دیکھ کر آخر کار صبا کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

''لیکن یہ سعد اپنے گھر والوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتا۔''

''اس کے گھر والے دبئی میں رہتے ہیں اور یہ خود بہت عرصے سے پڑھائی کے سلسلے میں پاکستان آیا

ہوا ہے۔ بہت شروع سے ہی یہ ہاسٹلز میں ہی رہا ہے مگر اب اس کے ہاسٹل میں کوئی مسئلہ ہو گیا تھا اس لیے ہادی اور ابو اسے یہاں لے آئے۔ اب سعد یہیں رہے گا۔"

"پھر تو یہ مسئلہ تمہارے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔ سنا ہے، محبوب آنکھوں کے سامنے رہے تو بڑا اچھا فیل ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو خیر اس معاملے میں تقریباً صفر ہی ہے مگر تم مجھے اپنی فیلنگز ضرور بتانا تاکہ پتا تو چلے اس میں کتنی سچائی ہے۔

ویسے ایک بات ہے جب تک تم نے مجھے سعد کے بارے میں نہیں بتایا تھا تب تک میں سمجھتی تھی کہ تم ہادی میں انٹرسٹڈ ہو۔"

صبا اس وقت پانی پی رہی تھی یکدم ہی اسے بری طرح اچھو لگ گیا۔

"دماغ تو نہیں خراب تمہارا...... میں اور ہادی...... او مائی گاڈ...... یعنی کہ حد ہو گئی۔"

اس نے گویا بڑی انوکھی بات سنی تھی تب ہی عجیب لگنے کے ساتھ ساتھ اسے ہنسی بھی آ رہی تھی۔

"سعد کو دیکھنے کے بعد مجھے تمہاری پسند کا صحیح انداز ہوا ہے اور اب واقعی اس بات پر ہنسی آ رہی ہے کہ میں کتنا غلط سوچ رہی تھی۔ مگر صبا! میری ایک بات کو تم غلط نہیں کہہ سکتیں کہ جتنی تم ہادی کے ساتھ اٹیچ رہتی ہو اور جتنا اسے فیور کرتی ہو اس سے تو کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے۔ ممکن ہے خود ہادی بھی ایسا ہی سوچتا ہو۔"

"ہادی معصوم ہے، بے وقوف نہیں...... وہ میرا دوست ہے اور یہ بات وہ خود بھی بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ کیونکہ اسے ہمدردی اور محبت میں فرق بہر حال کرنا آتا ہے۔" اس نے بہت واضح انداز میں قانتا کو رد کر دیا تھا۔

"ہادی تمہارا دوست ہے۔ وہ تمہاری سوچ سے واقف ہے اور بقول تمہارے اسے ہمدردی اور محبت میں فرق کرنا بھی آتا ہے۔ مگر میری پیاری سہیلی! یہ فرق ہر کسی کو کرنا نہیں آتا ہے۔ ہادی کو تم دوست سمجھتی ہو مگر ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کی سوچ تمہاری طرح صاف ستھری ہی ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں اسے فیور کرنے میں اب تھوڑی احتیاط کرنی چاہیے خصوصاً اب جب کہ سعد بھی اسی گھر میں آ گیا ہے۔"

قانتا نے ایک اچھی سہیلی کی طرح اسے خبردار کیا تھا۔ صبا کچھ دیر اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی پھر وہ اٹھ کر گرل تک آ گئی۔ لان میں ابھی بھی ہنگامہ تھا۔ بس پوزیشنز بدل گئی تھیں۔

سعد کے ہاتھ میں اب بیٹ آ چکا تھا جبکہ ہادی کینو کے درخت کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جانے محض چند لمحوں میں ان دونوں کا تقابل کر لیا تھا۔

ان دونوں میں واقعی بہت فرق تھا۔ ایسا فرق جسے کوئی بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ صبا کے ذہن نے بہت تیزی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہادی اور سعد کے مابین سر اٹھا کر کھڑے، اس فرق کو نہیں بدلنا چاہتی تھی۔

اسے اپنی قسمت کو بدلنا تھا اور قسمتیں کوششوں سے ہی بدلا کرتی ہیں۔

+

"کام کوئی چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایک بات تو طے ہے کہ اس کام کے پیچھے اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور کار فرما ہوتی ہے اور میں تو اس بات پر دل سے یقین رکھتا ہوں کہ مصلحت جلد یا بدیر دکھائی بھی ضرور دے جاتی ہے۔ اب دیکھو خدا نے گنجے کو ناخن نہیں دیئے تو اس کے پیچھے جو مصلحت ہے وہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ بھائی! اس کا اپنا ہی تو نقصان ہے۔ مگر یار! ایک بات مجھے اب تک سمجھ نہیں آئی۔ اللہ نے تمہیں گزارے لائق بھی عقل نہیں دی تو اس کے پیچھے کون سی مصلحت ہے۔ کیا تم اس ایک پوائنٹ پر روشنی ڈالنا پسند کرو گے۔"

"روشنی تو نہیں البتہ میں تمہیں اس کمرے سے باہر پھینکنا ضرور پسند کروں گا، پتا نہیں وہ کون سا منحوس لمحہ تھا جب میں نے تمہیں اپنے کمرے میں رہنے کی اجازت دی تھی۔"

"آہا...... بھلا کیا خوش فہمی اور غلط فہمی ہے۔ تم سے اجازت مانگی کس نے تھی۔"

سعد نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس کا مذاق اڑایا تھا۔

"اور جناب محترم! یہ تو ہماری محبت تھی جو آپ کے اس کابک میں رہنے چلے آئے، ورنہ ہمیں تو گھر کے سب سے اچھے رومز آفر کیے گئے تھے۔ ایک میں اے سی تھا، دوسرے کی کھڑکی بہ ذات خود اے سی تھی۔"

"اور میرے بھائی! تجھے اللہ کا واسطہ ہے مجھ پر تو پہلے ہی کئی محبتوں کے بار ہیں ایک اور کا اضافہ نہ کر تیری مرضی ہے جس کمرے میں جا۔ قسم خدا کی میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے۔"

"ہک ہا...... میری ہی غلطی ہے یار! بندے کی شکل دیکھ کر بات کرنی چاہیے، اب میں ایسے شخص سے کیا امید کروں اور کیا اس کی سوچ میں تبدیلی لانے کی کوشش کروں جو محبتوں کو "بار" سمجھتا ہے سر دبا دوں تمہارا؟"

"نہیں۔" وہ تڑخ کر بولا۔ ایسے ناز نخرے کب اٹھائے تھے کسی نے اس کے۔ بیمار بھی ہوتا تو کسی کو خبر تک نہ ہوتی اور بیچارا خود ہی بھلا چنگا ہو جاتا اور پھر ایک وہ وقت بھی آیا جب اس کے نزدیک چھوٹی موٹی بیماریوں کی اہمیت بھی مٹ گئی۔

"اچھا پھر گلا دبا دوں؟" سعد ابھی تک پچھلے موڈ میں تھا۔

"ہاں مہربانی ہوگی۔" وہ پھر جھنجھلا کر بولا۔

"ارے چھوڑو یار! ایسی بھی کیا مہربانی؟...... بھئی ہم تو یاروں کے یار ہیں۔" نہایت لاپروائی کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ ہادی کی گردن کی جانب بڑھائے تھے۔

ہادی کو اب اس حد تک بھی سعادت مندی کی امید نہیں تھی، جھنجھلا کر اس کے ہاتھ جھٹکے اور اٹھ کر بیٹھ

گیا۔

"سعد! دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔" ایک تو تیز بخار، پھر سعد کی زچ کر دینے والی گفتگو اور حرکتیں۔

"سو فیصد...... البتہ تمہارا دماغ ذرا بھی ٹھیک نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔" وہ گھما پھرا کر بات کو بالآخر وہیں لے آیا تھا، جس نقطے سے ہادی کترا رہا تھا۔

"میں بیمار ہوں۔" اس نے جیسے اسے احساس دلانے کی کوشش کی مگر سعد، سعد تھا جس نقطے پکڑ جاتا پھر اس نقطے سے اسے ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا تھا۔

"بات ساری برداشت کی ہے، ورنہ ایک مدت سے میں خود بیمار ہوں مگر تمہاری طرح واویلا تو نہیں مچایا۔"

گو کہ جب سعد اس طرح کے موڈ میں ہوتا تھا تو اس سے سنجیدگی کی امید تقریباً عبث ہی تھی مگر اس وقت ہادی چونک سا گیا۔

"کیا بیماری ہے تمہیں؟" اس نے کسی قدر تشویش سے سعد کی شکل دیکھی تھی۔ سنجیدگی سے جواب ملا۔

"دنیا کی سب سے جان لیوا بیماری...... یعنی کہ عشق۔"

"لعنت ہے سعد! آخر تم کبھی سنجیدہ کیوں نہیں ہوتے؟"

"تم سے کس نے کہا کہ میں سنجیدہ نہیں ہوں اور میرے بھائی! جب تک جذبے میں سنجیدگی نہ ہو عشق، عشق نہیں بنتا...... لیکن خیر تمہیں ان باتوں کا کیا پتا، بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔"

"ٹھیک ہے پھر تم سنجیدگی سے عشق کرتے رہو مگر میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مت خراب کرو میرا دماغ۔" اس نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں لیٹ کر تکیہ منہ پر رکھا تھا۔

"جو چیز سرے سے ہے ہی نہیں اس کے خراب ہونے کا اتنا خدشہ کیوں رہتا ہے تمہیں؟ یقین کرو ہادی! دماغ خراب ہونے کے لیے دماغ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تم نے خوامخواہ کی ٹینشن پال رکھی ہے۔ اگر تمہارے پاس دماغ ہوتا اور اس دماغ میں تھوڑی بہت عقل ہوتی تو اب تک تم ایک صحیح فیصلہ نہ کر چکے ہوتے۔"

"سعد! پلیز......"

"انف ہادی!" سعد یکدم ہی بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔

"رات امی کا فون آیا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کنوینس کروں اور یار! آخر اس میں برائی بھی کیا ہے؟ اچھا ہے تمہارا کاروبار سیٹ ہو جائے گا۔"

"یار! میرے تینوں ماموں، ان کے سارے بچے ملازمت پیشہ ہیں، صرف عباد نے کچھ عرصے کے لیے ایک فوٹو اسٹوڈیو کھولا تھا مگر پھر جاب مل جانے کے بعد وہ بھی بند کر دیا۔ سعد! تم سمجھتے کیوں نہیں

ہمارے خاندان میں دکان داری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"دکان داری۔" سعد کو بڑے زور کا جھٹکا لگا۔

"ہال پر بڑی کلاس کا شوروم سیٹ کرنے کا ارادہ ہے ہمارا، تم ٹھاٹ سے منیجر کی کرسی سنبھالنا۔"

ہادی مسکرا دیا۔

"اور دکان دار اور منیجر میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"نہیں کوئی فرق نہیں ہے، جب گدھے میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر دکان دار اور منیجر میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔" سعد بہت غصے میں تھا۔

"میں کسی کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتا مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس گھر کے افراد کے خیالات نے تمہیں اتنی بری طرح سے جکڑا ہوا ہے کہ تم اپنے لیے بھی صحیح غلط کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہے، نہ ہی تمہیں قول و فعل کا فرق سمجھ آتا ہے، ورنہ سوچنے کو تو تم یہ بھی سوچ سکتے ہو کہ اشفاق ماموں نے بھی تو اسپیئر پارٹس کی دکان کھول رکھی ہے۔"

"وہ ان کا پارٹ ٹائم کام ہے۔"

"ہے تو نا۔"

"پھوپھو کو میری طرف سے شکریہ کہہ دینا سعد اور ان سے یہ بھی کہنا کہ میں ان کی محبت کی، دل سے قدر کرتا ہوں مگر......"

"رہنے دو یار! میں سمجھ چکا ہوں تمہیں اتنی عمر میں بھی محبت کی قدر کرنا نہ آئی اور نہ ہی اصل محبت کی پہچان ہو سکی۔"

"بالکل صحیح...... وہ شکلیں کوئی اور ہی ہوتی ہیں جو محبتوں کو پہچان کر ان کی قدر کرتی ہیں۔" صبا کی آواز پر وہ دونوں چونک کر دروازے کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ پھولا ہوا چہرہ، خفا خفا سا انداز گفتگو۔

دو نگاہوں نے اسے بڑے دل سے دیکھا تھا۔

"اور سعد! تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔" وہ ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گئی تھی۔

"ایک طویل مدت سے میں اسے یہی سب سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے "اصلی محبت" کا چہرہ دکھانے کی خواہش میں، میں بوڑھی ہو جاؤں گی مگر یہ شخص اپنے خول سے باہر نہیں نکلے گا۔ کاش میں نے بھی اپنے دل کو سمجھا لیا ہوتا۔"

اس نے ٹرے میز پر پٹخی اور باہر نکل گئی۔

ہادی نے اٹھ کر ٹرے پلنگ پر اپنے اور اس کے درمیان رکھی اور "بسم اللہ" کہہ کر شروع ہو گیا۔

جب کہ سعد کی نگاہیں دروازے سے اور دل و دماغ صبا سے نہیں ہٹ پا رہا تھا گو کہ، اس کے الفاظ جو

اس نے کہے وہ بے حد سادہ تھے مگر اس کے مفہوم کی گہرائی کو صرف وہی پا سکا تھا۔

اس کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ایسی لکیریں جو ناپسندیدگی اور تفکر سے مشروط ہوتی ہیں۔

+

موسم بے حد خوشگوار تھا۔

ذرا دیر پہلے برسنے والی بارش نے عجیب سی تازگی بھر دی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے کئی رنگوں میں ملے ٹکڑے، ہوا سے اڑتے پھر رہے تھے۔

سفیدے کی نرم شاخوں میں جو فاختہ کا ننھا سا گھونسلہ تھا، وہ تیز بوچھاڑ کے باعث لٹک چکا تھا۔ گو اسے بے مکیں ہوئے کافی دن گزر چکے تھے مگر جب بھی اس کی نگاہ پڑتی تو اسے شاخوں میں اٹکا دیتا۔ کیا خبر کب کون سا بھولا بسرا راہی سفر کی تکان اتارنے کو ٹھہر جائے۔

اس کے بعد اس نے جھاڑو اٹھایا اور ڈھیلے ہاتھ سے سارے پتے ایک طرف کرنے لگا۔ آج کچھ فراغت بھی تھی اور بے توجہی کا احساس بھی۔ تب ہی لان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اچھے وقتوں میں بنا ہوا گھر تھا تب ہی اب تک ساتھ دیئے جا رہا تھا اور وہ بھی خاصے مناسب طریقے سے، ورنہ ماموؤں کے آپس کے جھگڑوں نے تو کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ ہر کسی نے اپنی پسند و ضرورت کے حساب سے کمرے بنوالیے تھے لہٰذا یہ گھر نانا جی کے اس گھر سے بہت مختلف اور کم گنجائش والا لگنے لگا تھا جس میں وہ یتیمی کا سایہ لے کر داخل ہوا تھا۔

لان بھی اگر اچھی حالت میں بچ گیا تھا تو یہ صرف ہادی کی ہی محنت و لگاؤ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ گھر کے اکثر ہی افراد کو اس کی کچھ خاص ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ یہ جو قطعہ ارضی لان کے نام پر بچارہ گیا تھا اس سے متعلق ہر ایک کے ذہن میں تعمیری نقشہ موجود تھا مگر فی الحال یا تو حوصلے کی کمی تھی یا پیسے کی۔

''اس گھر کے کمرے، کمرے کم کابک زیادہ لگتے ہیں۔'' اسے سعد کے الفاظ یاد آئے تو لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہ ابھی کچھ دیر پہلے کہیں جانے کا کہہ کر نکلا تھا۔

وہ اس وقت کیاریوں کی نلائی کر رہا تھا جب عقب سے اس نے صبا کی آواز سنی۔

''تم کتنی دیر میں فارغ ہو جاؤ گے ہادی؟''

''ابھی تو وقت لگے گا...... کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟'' وہ پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح پلٹ کر اسے دیکھا۔

''ہاں مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہو میں سن رہا ہوں۔'' وہ پوری تندہی سے نلائی کر رہا تھا۔

''نہیں یوں نہیں۔'' صبا نے کہا۔ ''کیا تم وہاں برآمدے میں آ کر میری بات نہیں سن سکتے ہو؟ ضروری بات ہے اور مجھے ذرا تفصیل سے بات کرنی ہے۔''

اس کے انداز میں وہی ہمیشہ والی دھونس تھی۔

ہادی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر کھر پی پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ہاتھ دھولوں۔'' اس نے صبا سے پوچھا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر دائیں طرف لگی باڑھ کے ساتھ نصب نلکے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ہاتھ دھوتے ہوئے صبا کی اس بات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے اپنے بھیگے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر لیا تھا اور صبا کے ساتھ برآمدے کی جانب چل دیا تھا۔ صبا اسے برآمدے کے آخری سرے پر لے آئی تھی جو ذرا سی ترچھی شکل میں پچھلے حصے کی طرف جاتا تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے ہادی کو فرش پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہوں کہو۔'' صبا کا ہر انداز اسے تجسس میں ڈال رہا تھا۔

''ہادی! تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ بالکل ایسے کہہ رہی تھی، جیسے اپنی بنائی ہوئی چائے یا کسی اور ڈش کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

ہادی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''عجیب سوال ہے؟ اچھا یہ بتاؤ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟'' اس نے ایک بار پھر سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا تھا۔

''اچھی ہو تو اچھی ہی لگتی ہو۔'' چند لمحے تک اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہنے کے بعد اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''لیکن صبا! تمہیں ہوا کیا ہے؟ یہ کس قسم کے سوال پوچھ رہی ہو تم؟''

''اُفوہ...... پتا نہیں، میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ تمہیں ہر بات پوری وضاحت کے ساتھ جب تک نہ بتائی جائے تمہیں سمجھ نہیں آتی۔ اب یہی دیکھ لو بڑی صاف سی بات ہے مگر، تمہیں خود سے سمجھ نہیں آئی اور مجھے ہی اپنے منہ سے اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

بلآخر بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ ہادی بہت بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے کیا کہا؟ ذرا دوبارہ کہنا۔''

صبا کے لبوں پر بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''میرے منہ سے بار بار اعتراف سن کر تمہیں خوشی ہو گی ناں۔''

"صبا! تم مذاق کر رہی ہو نا میرے ساتھ؟"

اب کی بار صبا نے بڑی خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں ایسا مذاق کیوں کروں گی ہادی؟ بلکہ مجھے لگتا ہے تم میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ کیا تمہیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں تمہارے لیے کوئی خاص جذبہ رکھتی ہوں۔ میں نے بہت انتظار ہادی! کہ شاید تم خود اظہار میں پہل کرو مگر......" وہ مایوسی سے بولی۔

"وہ...... میں مجھے نہیں پتا کہ......" وہ انتہائی بے یقین تھا۔ اسی پل اندر سے فون کی گھنٹی بجنے کی سنائی دی تھی۔ ہادی کو وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب لگا تو تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

اس غیر متوقع صورت حال کی پریشانی اور عجلت میں وہ برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ پر بازو باندھ کر کھڑے سعد کو نہیں دیکھ سکا تھا مگر صبا اسے بہت پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سعد کو سامان پیک کرتے دیکھا تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" چند لمحے اس کی حرکات کو بغور دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"سامان پیک کر رہا ہوں۔" بہت مصروفیت بھرے انداز میں جواب ملا۔

"کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"دبئی، شام چھ بجے کی فلائیٹ ہے۔"

"ایں......" وہ بری طرح چونکا۔

"اچانک، خیریت تو ہے نا سعد۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہاں خیریت ہے۔" ہادی کو سعد مسلسل حیران کر رہا تھا۔ وہ کبھی بھی اس قدر مختصر جملوں میں بات نہیں کیا کرتا تھا۔

"پھر اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو؟"

"یار!" سعد جیسے اکتا گیا تھا۔ "میں سب گھر والوں کو بہت مس کر رہا ہوں، بس اسی لیے جا رہا ہوں۔ کچھ روز پہلے پلان بنا تھا اور آج ہی کی سیٹ کنفرم ہوئی تھی۔"

"کمال ہے اور تم مجھے آج بتا رہے ہو۔" ہادی نے شکوہ کیا۔

"دس روز پہلے بتا دیتا تو تم نے کیا کر لینا تھا۔" اس کا لہجہ بہت اجنبیت بھرا تھا۔ ہادی چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ پایا۔

"آج تو گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تقریباً سب ہی لوگ کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں تم اس طرح بغیر ملے جاؤ گے تو شاید کسی کو بھی اچھا نہ لگے۔" اس نے ایک بار پھر جھجکتے ہوئے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑے گا ہادی! میں یہاں رہتا ہوں یا چلا جاتا ہوں گھر والوں کو اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟" اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی تھی۔

"تم! تم ہو یار! میں نہیں کہ کسی کو فرق ہی نہ پڑے۔" ہادی نے سوچا تھا۔

"سعد!...... کیا تمہیں یہاں کوئی پرابلم ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ کوئی بات بری لگی ہے کسی کی۔"

اس پر سعد نے خود کو مسکرانے پر مجبور محسوس کیا تھا اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ وہ ہادی سے اس طرح تلخ انداز میں گفتگو کر کے اچھا نہیں کر رہا۔ بھلا اس میں اس کا قصور ہی کیا تھا۔

"نہیں ہادی! مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کسی کی کوئی بات بری نہیں لگی۔ میں نے کہا نا گھر والوں کی بہت یاد آ رہی ہے، آج کل پڑھائی بھی کوئی اتنی خاص نہیں ہو رہی اس لیے میں جا رہا ہوں مگر ظاہر ہے کہ لوٹ کر تو میں نے یہیں آنا ہے۔ اگر کسی کو میرے جانے پر اعتراض ہو گا تو میں آ کر اس سے ایکسکیوز کر لوں گا...... یار! آئی ایم سوری، تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو مگر میں بھی پیکنگ کر رہا ہوں پلیز، ہو سکے تو ایک کپ اچھی سی چائے ہی پلوا دو۔" ہادی اس کی بات سن کر مطمئن ہوا تھا یا نہیں مگر وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد سعد نے اپنی ایک شرٹ بیگ میں رکھی پھر دوسری اٹھائی مگر اسے بیگ میں رکھنے کی بجائے ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک عجیب طرح کی بے بسی محسوس کر رہا تھا اور اپنی یہ بے بسی اسے غصہ دلا رہی تھی گویا صبا کی ہادی کے ساتھ ہمدردی بے سبب نہیں تھی۔ حقیقت وہی تھی جسے پورے طرح محسوس کرنے کے باوجود خود کو جھٹلانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا مگر اس کی ساری کوششیں اس روز صبا کے منہ سے اعتراف سن لینے کے بعد دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

گو کہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ ایسے کوئی عہد و پیماں تو نہیں ہو گئے تھے ان دونوں کے درمیان کہ وہ غم کو دل سے لگا کر بیٹھ جاتا مگر اسے لگ رہا تھا کہ وہ براہ راست ریجیکٹ کیا گیا ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار ریجیکٹ کیا گیا تھا اور وہ بھی ہادی کے مقابلے میں۔

کوئی ایسا ہوتا جو کم سے کم اسے اپنے برابر کا لگتا تو پھر بھی برداشت کرنا آسان رہتا مگر ہادی۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔" پہلے دھیرے سے دستک سنائی دی پھر آواز آئی۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔" اس نے اسی قدر جواب دینا مناسب سمجھا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

"ہادی بتا رہا تھا کہ تم جا رہے ہو؟" کچھ لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے سے ہی آگے آ گئی تھی۔

سعد نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ وہ ٹیبل پر بکھری کتابیں ترتیب سے رکھنے لگا۔

"واپس کب آؤ گے؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"جب دل کرے گا واپس آ جاؤں گا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے۔" اس کا لہجہ بہت اکھڑا اکھڑا تھا بالکل بھی برا نہیں لگا تھا بلکہ کچھ سوچتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

"نہیں مجھے تو کوئی کام نہیں ہے بلکہ میں تو اس لیے یہاں آئی ہوں کہ شاید جانے سے پہلے تم کچھ کہنا چاہو۔" سعد نے پلٹ کر کسی قدر تعجب سے دیکھا۔ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"میں کیا کہنا چاہوں گا...... اور کیوں؟"

"اب یہ بھی میں بتاؤں؟" وہ جیسے اس کی ناسمجھی پر ہنس دی تھی اور سعد کے تعجب میں اضافہ ہوا۔

"اچھا کیا تم یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ تم مجھے پسند کرتے ہو؟" اب کی بار وہ خاصی سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ سعد کے تاثرات بہت کم لمحوں میں تبدیل ہوئے تھے۔

"نہیں۔" اس نے رخ بدل کر اپنی توجہ ٹیبل کی طرف لگانے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا۔" صبا کو جیسے بے حد مایوسی ہوئی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر میں کہہ دیتی ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔" اس نے بہت آرام سے اعصاب پر دھماکہ کیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا پھر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔

"یہی بات تم نے ہادی سے بھی کہی تھی کچھ روز پہلے۔"

"ہاں کہی تھی۔" وہ بہت دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر اتنی جلدی ارادہ کیسے بدل گیا۔" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ صبا زور سے ہنس دی۔

"ارادہ تو نہیں بدلا ارادہ تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا مگر اب میں ڈر گئی ہوں کہ کہیں اس مذاق کے چکر میں، ہمارا کوئی نقصان نہ ہو جائے۔" وہ سر جھکا کر اپنی انگلیاں مسلنے لگی۔

"اس روز میں نے ہادی سے جو کچھ بھی کہا وہ صرف ایک مذاق تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تم وہ سب ردعمل کے طور پر اپنی فیلنگز کا اظہار کرو مگر اظہار تو بہت دور کی بات ہے تم تو یہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہے ہو۔" وہ اب شکوہ کر رہی تھی، سعد کے لبوں پر محظوظ کن مسکراہٹ بکھر گئی محض چند لمحوں میں وہ خود کو حد ہلکا پھلکا اور ہر طرح کی فکر سے آزاد محسوس کرنے لگا تھا۔

"کیا ہادی جانتا ہے یہ سب کچھ۔" اس نے پوچھا تو صبا چند لمحے کچھ بول ہی نہیں سکی پھر جھجکتے ہوئے انداز میں بولی۔

"ظاہر ہے اگر اسے پتا نہیں ہوتا تو ہم یہ ڈرامہ کیسے کر سکتے تھے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ کسی چیز کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے حیرت ہے میرا اندازہ غلط کیسے ہو گیا، حالانکہ میں سمجھ رہی تھی کہ تم بھی...... خیر میں چلتی ہوں آئی ایم سوری سعد! میں نے تمہارا بہت وقت ضائع کر دیا۔" بہت دلگرفتگی سے کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھی تھی مگر سعد اس کے راستے میں آ گیا۔

"ہو کہ، ایسا فضول مذاق کرنے پر تمہیں بہت سخت سزا ملنی چاہیے۔ مگر یہ جو میرا کمبخت دل ہے نا یہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس لیے سزا دینے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا، ذرا یہاں تشریف رکھیے محترمہ! جو کچھ اپنے دل میں تھا وہ تو کہہ لیا اور جو میرے دل میں ہے وہ کون سنے گا۔" وہ پرانے والے سعد کی ٹون میں بول رہا تھا صبا نے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر اس کی جھکی پلکوں والی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"حالانکہ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ اپنے دل کا حال تمہیں شادی کے بعد ہی سناؤں گا مگر تمہیں تو بہت ہی جلدی ہے۔" وہ اب اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ صبا نے خفگی سے اسے دیکھا پھر وہ دونوں ہی ہنس دیے۔

دل کی دنیا اس وقت گلرنگ ہو رہی تھی اور اسے اب ہمیشہ ہی ایسا رہنا تھا۔

✦

"سعد کی موجودگی میں کتنی رونق رہتی تھی گھر میں اور اب کیسی اداسی ہو رہی ہے نا۔"

سعد کو گئے ہوئے غالباً وہ پانچواں روز تھا اور ان پانچ دنوں میں اس نے یہ بات کم و بیش ہر ایک کے منہ سے سنائی تھی۔ اس کی امی اٹھتے بیٹھتے ایک اسی بات کی تسبیح پڑھے جا رہی تھیں۔

وہ اس وقت ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھی چینل سرچنگ میں مصروف تھی جب اس نے امی کو عالیہ چچی سے کہتے سنا تو بے ساختہ مسکرا دی۔

ریموٹ ایک طرف پھینکا اور قدرے نیم دراز ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔ اسے تو کوئی اداسی، وداسی نہیں ہو رہی تھی، البتہ بوریت ضرور محسوس کر رہی تھی۔ جتنے دن تک سعد یہاں تھا وہ کم سے کم اپنے مقصد کے حصول کی کوشش میں تو مصروف تھی مگر چونکہ اب فراغت ہی فراغت تھی اس لیے وہ خاصی بور ہو رہی تھی، پڑھنے پڑھانے کا اسے کبھی بھی شوق نہیں رہا تھا بمشکل بی اے کر سکی تھی۔

جاتے ہوئے اگر سعد نے اسے یقین نہیں دلایا ہوتا کہ وہ اپنے والدین کو راضی کر کے ہی لوٹے گا تو وہ "والدین حضرات" کو ہی راضی کرنے کے طریقوں پر غور و خوض شروع کر دیتی مگر اب تو یہ مسئلہ بھی نہیں تھا باقی بچے اس کے والدین...... تو ان کی رضا سے وہ بخوبی واقف تھی۔

اس نے یونہی گردن موڑ کر دیکھا۔ ہادی امی کو ہفتہ بھر کے راشن کی رسید دے رہا تھا تخت پر اس کا لایا ہوا سامان پڑا تھا۔

"ہادی! ایک کام میں نے بھی تم سے کہا تھا۔" اس نے وہیں سے پکارا تھا۔ ہادی نے بنا اس کی جانب

دیکھے ایک شاپر میں سے خاکی لفافے میں لپٹی کتاب نکال کر تپائی پر رکھ دی۔

"یہ رکھی ہے، لے لینا۔"

"وہاں رکھنے کا مقصد؟ بھئی میں ادھر بیٹھی ہوں یہیں پکڑا دو۔" اس نے کہا تو ہادی ذرا
جھجک سا گیا پھر اس نے کتاب اٹھائی اور صبا کی طرف بڑھا دی۔

صبا بغور اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور ہادی کے انداز میں موجود جو تذبذب کی سی کیفیت تھی
سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

ویسے بھی وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ہادی اس سے کترانے لگا ہے وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتا
وہ موجود ہوتی تھی وہاں سے راستہ بدل دیتا تھا۔

"ہادی! تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے کتاب پکڑنے کی بجائے سوال کیا تھا۔

"مجھے کچھ بھی نہیں۔" وہ خفیف سا مسکرایا، اس کا انداز کم سے کم صبا کو ضرور تحیر میں ڈال رہا تھا۔

"اونہوں کچھ تو ہے، میں کئی دن سے نوٹ کر رہی ہوں تم مجھ سے بات نہیں کر رہے ہو۔ بس
ہوں تو بس جواب دیتے ہو اور اگر میں کہیں موجود ہوتی ہوں تو یا تو وہاں آتے ہی نہیں ہو یا اٹھ کر چلے
ہو آخر چکر کیا ہے؟"

"کوئی بھی بات نہیں ہے صبا! تم یونہی محسوس کر رہی ہو۔" ماتھے پر چمکتا پسینہ پونچھتے ہوئے اس
کتاب صوفے پر رکھ دی۔

تب ہی صبا کے ذہن میں کوئی جگنو سا چمکا اسے یاد آیا کہ یہ محسوس کن سی جھجک وہ ہادی کے اندر
اس روز سے دیکھ رہی ہے جس روز اس نے اظہار محبت کیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی کہ ہادی اس سے اس وجہ سے کترا رہا ہے اسے بڑی زور سے گدگدی ہوئی تھی۔

"اچھا سنو ہادی!" اس نے اپنی چمکتی آنکھوں اور کھنکتے لہجے میں اس کو پکارا تھا پھر آواز
رازداری سے بولی۔

"وہ میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔"

"کون سی بات؟" پتا نہیں کیوں وہ گردن گھما گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"وہی محبت والی بات، میرا خیال ہے اب تمہیں بھی میرے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ تم
محبت کرتے ہو۔"

اس نے جتنے آرام سے کہا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ بوکھلا کر سیدھا ہوا۔

"پپ، پلیز صبا! اس طرح کی باتیں مت کرو، اگر کسی نے سن لیا تو؟" اس کی سراسیمگی
صبا کو بہت لطف دیا تھا۔

"سنتا ہے تو سن لینے دو۔ ویسے بھی وہ محبت ہی کیا جس میں ظالم سماج کی انٹری نہ ہو۔" فقرہ مکمل کر
کے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ہادی گدھے کے سر سے سینگوں کی مانند غائب ہو چکا تھا۔
وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا شروع ہوئی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ یہ ساری صورت حال اس قدر دلچسپ ہو
جائے گی اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔

✦

"عموماً فلموں، ڈراموں یا ڈائجسٹ کی کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے کہ اظہار محبت میں پہل لڑکی کرتی
ہے۔ مگر یہ اچھا تو نہیں لگتا نا اظہار کرتے ہوئے تو لڑکے ہی اچھے لگتے ہیں...... کیوں ثنا؟"
بظاہر کھانا کھاتے ہوئے اس نے یونہی ایک سوال کیا تھا مگر رغبت سے کھانا کھاتے ہادی کے لیے
نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔

جتنا وہ اس بات سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اتنا ہی صبا کھینچ کھانچ کر اسے اس موضوع کے سامنے لا
کھڑا کرتی تھی۔

"پتا نہیں میں نے کبھی غور نہیں کیا۔" ثنا نے مصروفیت بھرا جواب دیا۔ وہ ٹوکری میں سے پیاز نکال
رہی تھی اور اس وقت کچن میں وہی تینوں موجود تھے۔

"کمال ہے، اتنی اہم بات پر غور نہیں کیا...... چلو خیر میں بتا دیتی ہوں لڑکیاں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔
شرم و حیا بھی کسی چیز کا نام ہے مگر یار! مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی اگر وہ لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے
ہوں لیکن لڑکا ذرا سا بزدل ہو، میرا مطلب ہے اس میں اظہار کرنے کی ہمت نہ ہو تو ایسے میں لڑکی کو کیا کرنا
چاہیے؟ کیا خیال ہے، اچھا ہادی! تم ہی بتاؤ کچھ اس بارے میں۔"

اب توپوں کا رخ اس کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ اور بھی بوکھلا گیا۔

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے بہت عجلت میں کھانا شروع کر دیا تھا۔

"تمہیں پتا بھی کیسے ہو سکتا ہے تمہیں پتا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔" اسنے نہ صرف آواز بلکہ مسکراہٹ دبا
کر بھی کہا تھا مگر ظاہر ہے کہ جس کو سنانا مقصود تھا اس نے سن بھی لیا تھا اور اتنا شرمندہ ہوا تھا کہ بس حد نہیں۔

"ثنا! کھانا کر یہ برتن دھو دینا اب یہ نہ ہو کہ یہ چار برتن شام تک پڑے رہیں سنک میں۔" ثنا صبا کو
تاکید کرتی پیاز بھری ٹوکری لے کر باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی ہادی نے غٹا غٹ پانی کا گلاس چڑھایا
اور اٹھنے لگا تو صبا نے ٹوک دیا۔

"تم کدھر جا رہے ہو؟...... کھانا تو کھا لو۔"

"میں کھا چکا ہوں۔" اس کے انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ بیل رسی تڑوا کر بھاگ جانا چاہتا
ہے۔

صبا سے مزید اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہوگیا اور یوں بھی اب تو ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"خدا کے لیے ہادی! اب بس کرو، جا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھو، یوں تو لڑکیاں بھی نہیں شرماتیں
جیسے تم شرماتے ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

ہادی نے برتن سنک میں رکھتے ہوئے خفگی بھری نظر اس پر ڈالی۔

"بات شرمانے کی نہیں ہے بس...... مجھے یہ باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں۔"

"اچھا..... پھر کیسی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ایک بار بتا دو پھر میں ویسی ہی باتیں کروں گی، بے شک
دونوں بچپن سے ایک ساتھ ہیں مگر تم نے کبھی مجھے اپنی پسند ناپسند کے بارے میں نہیں بتایا، کم سے کم اب تو
دو آفٹر آل ہمیں آنے والی زندگی......"

"صبا! تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم پہلے ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔" اس کے چہرے پر زچ ہو جانے
والی فکرمندی تھی۔

"اس لیے کہ پہلے میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی۔"

ترنت جواب آیا۔ ہادی نے ایک بے بس نظر اس پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

"بے وقوف۔" وہ مسکراتے ہوئے برتن سمیٹنے لگی۔

✦

"شکر ہے فون تم نے اٹھایا ہے، ورنہ تمہارے یہاں یہ بہت مسئلہ ہے۔ دس لوگ پہلے بھگتانے پڑتے
ہیں پھر کہیں جا کر تم سے بات ہو پاتی ہے۔"

پھپھو اپنے مخصوص تیز تیز انداز میں بول رہی تھیں۔ ہادی نے مسکراتے ہوئے پورے دھیان سے ان
کی بات سنی۔ پھپھو اس قدر تیز بولنے کی عادی تھیں کہ کبھی کبھار تو پورا کا پورا جملہ ہی اس کے سر پر سے گزر
جایا کرتا تھا۔

"اصل میں آج گھر پر کوئی بھی نہیں ہے سب لوگ ثنا کے لیے لڑکا دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔" اس نے
جملہ جوں کا توں ان تک پہنچا دیا جس طرح عموماً گھر میں بولا جاتا تھا۔

"اچھا...... چلو اللہ مبارک کرے، اچھے لڑکے ملنا کوئی آسان ہے آج کل، پچھلی بار بھی تمہاری
ممانی سے بات ہوئی تو وہ بڑی فکرمندی کا اظہار کر رہی تھیں، ثنا کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں پریشان ہونے کا
کیا فائدہ؟ جب قسمت ہوگی تب اچھا بر مل ہی جائے گا۔ ویسے سچ کہوں ہادی! سب کیا دھرا تمہاری ممانی کا
ہی ہے، چار سال پہلے جب میں نے پاکستان کا چکر لگایا تھا تو ان دنوں ثنا کے لیے بڑے اچھے اچھے رشتے
آئے ہوئے تھے مگر ان ماں بیٹیوں کے نخرے، توبہ توبہ ایک لڑکے کو تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا قد چھوٹا
ہے۔ بتاؤ لڑکے کا قد چھوٹا تھا تو ثنا کہاں کی حور پری تھی۔ مگر تمہاری ممانی نے یہ بھی نہیں سوچا۔ اب دیکھو

انکار کرکے یہ دقت لے آئی ہیں کہ ثنا کے لیے اچھے رشتے بھی آنا بند ہوگئے ہیں۔"

"اوفوہ امی! بس بھی کریں۔" سعد کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

"سعد بھی موجود ہے آپ کے پاس؟" ہادی نے پوچھا تھا۔

"ہاں یہیں ہے نمبر تو اسی نے ملا کر دیا ہے مجھے، اور سنو ہادی! اس لڑکے نے تو مجھے پریشان ہی کر
چھوڑا ہے، اب نیا بخار چڑھا ہے۔"

"امی! آپ نے ہادی سے کچھ پوچھنا تھا۔ یہ نہیں بتانا تھا کہ مجھے کون سی بیماری ہوئی ہے۔" سعد کی
آواز پھر آئی۔

"ارے لڑکے! چھری تلے دم تو لو۔ ذرا بات سے بات نکلتی ہے۔ یونہی تو نہیں ہر بات ہو جاتی نا۔
ہاں ہادی بچے! پھر تم نے کیا سوچا ہے کاروبار کے بارے میں؟"

"پھپھو! وہ میں......"

"اب میں انکار نہیں سنوں گی ہادی! کیوں اپنے ہی ہاتھوں اپنے پیر پر کلہاڑی مار رہے ہو۔ بتاؤ
ماموؤں کو پسند نہیں ہے تو کاروبار نہیں شروع کرنا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو بھئی سچی بات کہوں گی۔ اصل
میں تمہارے ماموؤں کے پاس کبھی اتنا سرمایہ ہی نہیں تھا کہ وہ ذاتی کاروبار کے متعلق سوچتے۔ اسی لیے
اب تک انگور کھٹے ہیں۔"

"میری پیاری ماں! اتنی دور سے فون کیا آپ نے چغلیاں کرنے کے لیے کیا ہے؟ بابا کو پتا چل گیا
کہ آپ نے پاکستان اتنی لمبی کال کی ہے تو بس قیامت ہی آ جائے گی۔ اب میری باری ہے تھوڑی سی بات
مجھے بھی کرنے دیں۔"

اس نے ریسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ہاں ہادی! ٹھیک ٹھاک ہو؟"

ہادی نے بڑی سکون بھری سانس بھری تھی۔ "شکر ہے تم نے فون لے لیا ورنہ پھپھو نے ایموشنل ہو
جانا تھا۔"

"تمہارے معاملے میں تو خیر وہ ہمیشہ سے ہی بہت ایموشنل رہی ہیں۔ آفٹر آل ان کے مرحوم بھائی
کی اکلوتی نشانی ہو؟ خیر کل تم نے ایس ایم ایس کیا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے ہو۔ کہو، سوری یار!
کل میں فون نہیں کر سکا کچھ مصروفیت رہی۔"

"تم واپس کب آ رہے ہو؟ کل میں تمہارے ڈپارٹمنٹ گیا تھا کلاسز تو ریگولر ہو رہی ہیں۔"

"آ جائیں گے واپس بھی یار! آج کل میں جس مشن پر کام کر رہا ہوں وہ ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔"
اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ایسا کون سا مشن ہے بھئی۔" اس نے بھی دلچسپی سے پوچھا تو وہ بولا۔

"واپس آ کر بتاؤں گا۔ دعا کرنا کہ کامیاب لوٹوں، فی الحال تو تم اپنی کہو کون سی ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔"

"سعد...... یار! اصل میں، میں بہت کنفیوز ہو رہا ہوں، سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیا کہوں...... اصل میں یہ بات یہاں بھی کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔"

"ہادی! کھل کر بات کرو آخر مسئلہ کیا ہے؟" اس نے تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ ہادی نے ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے سوچا پھر آہستہ آہستہ اسے صبا کے متعلق بتانے لگا۔

"یار! بات تو واقعی سیریس ہے، لیکن یہ بتاؤ اس مذاق کو اور کتنے دن تک چلانے کا ارادہ ہے!" ہادی کے خاموش ہونے پر سعد نے بہت ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا تھا۔

"سعد! میں مذاق نہیں کر رہا۔ تم خود سوچو، میں اس طرح کا مذاق کیوں کروں گا؟" اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"مگر صبا نے تو مجھ سے کہا تھا کہ......" سعد کچھ کہتے کہتے رک گیا ہادی چونکا۔

"کیا کہا تھا صبا نے تم سے۔"

"وہ...... اچھا ہادی! میں تم سے پھر بات کروں گا۔" اس نے عجلت میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

ہادی ریسیور ہاتھ میں لیے کچھ نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت کے زیر اثر ریسیور کو دیکھ رہا تھا۔

+

وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی مگر اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہنسی میلوں دور بیٹھے اس شخص پر کیا اثر کر رہی ہے۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟...... اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟"

اسے اگر ہادی پر ہنسنے سے فرصت ہوتی تو سعد کے لہجے میں نمایاں ہوتی سنجیدگی کو ضرور محسوس کر لیتی۔

"اس میں صرف ہنسنے کی ہی تو بات ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہی آخر تم اس بات کو لے کر اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ جب کہ میں نے تمہیں ساری بات پہلے ہی بتا دی تھی کہ میں اور ہادی تم سے مذاق کر رہے تھے۔" اس نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔" سعد نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"ہادی بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔"

"مذاق کو سچ ثابت کرنے کے لیے سنجیدہ تو ہونا ہی پڑتا ہے۔" صبا نے ہر فکر سے آزاد کھنکتے لہجے میں کہا۔

"تم کیوں پریشان ہو رہے ہو سعد! اصل میں، میں نے ہادی کو ابھی تک نہیں بتایا کہ میں تمہیں حقیقت بتا چکی ہوں اور وہ بے چارہ اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس لیے تمہیں بے وقوف بنا کر مزہ لے رہا ہوگا، بہرحال تم فکر مت کرو۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ وہ اب ایسی بات نہیں کرے گا۔"

"اچھی بات ہے مگر سنو صرف سمجھانا نہیں ہے، بلکہ بہت اچھی طرح سے سمجھا دینا ہے۔ میں مذاق میں بھی ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

صبا چند لمحے کیلئے، اس کے لہجے پر غور کرتی رہی۔

"مذاق کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت بھی کیا ہے، میں نے یونہی کہا تھا کہ میں ہادی کو پسند کرتی ہوں۔"

"تم نے یونہی کہا تھا مگر کیا پتا ہادی نے اس بات کو یونہی نہ سمجھا ہو۔ میرا خیال ہے کوئی بھی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور سینے میں دل رکھنے والا انسان تمہیں ناپسند نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ بہت کچھ جتاتا ہوا تھا۔ صبا کا حلق کڑوا ہونے لگا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہارے دوست میں کوئی سوجھ بوجھ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اعلیٰ درجے کا بے حس انسان لگتا ہے وہ مجھے۔ دوسری بات دل سے تعلق رکھتی ہے جو کہ بے کار ہی ہے، ورنہ ہم دونوں بہت عرصے سے ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے دل میں یکا یک میرے لیے کوئی جذبہ جاگ اٹھا ہو، بلکہ میرے لیے تو کیا میرا خیال ہے اس کے دل میں کبھی بھی کسی بھی لڑکی کے لیے کوئی جذبہ نہیں جاگ سکتا۔ ایسا ہی بے حس ہے وہ۔" وہ بنا کسی گنجائش کے بولی تھی۔

"اور میرا خیال ہے، اس کی بے حسی پر تمہیں بہت افسوس ہے۔" ایک بار پھر بظاہر عام سے لہجے میں وہ کافی کچھ جتا گیا تھا۔ صبا خاموش رہ گئی۔

"سعد! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ صرف......"

"ہاں تم مجھے بتا چکی ہو کہ، وہ صرف مذاق تھا اور ہادی تمہارے اس مذاق میں شامل تھا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ساری صورت حال ہادی پر بھی اچھی طرح سے کلیئر کر دو تاکہ وہ نہ تو مجھ سے دوبارہ اس قسم کی بات کرے اور نہ خود کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔" سعد نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے یا نہیں، یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ فیئر ہوں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"صبا...... صبا! سمجھنے کی کوشش کرو بھئی۔"

"ہاں میں سمجھ گئی ہوں اور ہادی کو بھی سمجھا دوں گی......بس یا کچھ اور؟" اس نے بہت ناگواری سے پوچھا تھا اور اس ناگواری کو سعد نے محسوس بھی کیا۔

"نہیں اور کچھ نہیں۔"

"پھر میں فون بند کر دوں؟"

"کیا مطلب، اتنی جلدی۔ ہم نے صرف ہادی کے بارے میں بات کی ہے آج۔ کیا ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی؟"

"یہ تو تمہیں پتا ہو گا کیونکہ فون تم نے کیا ہے۔"

"اب تم ناراض ہو گئی ہو۔" صبا خاموش رہی، جو بھی تھا اسے اپنی انا کی تسکین تو بہر حال درکار تھی۔

"کم آن صبا! آخر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے کہ تم ناراض ہی ہو گئیں......اوکے آئی ایم رئیلی ویری سوری......اب ہم اس بارے میں بات ہی نہیں کریں گے مگر تم ہادی کو بریف ضرور کر دینا۔"

گو کہ، بات اب بھی وہی تھی جس پر اسے اعتراض تھا مگر ہادی کا نام آتے ہی وہ اپنی مسکراہٹ روک ہی نہیں سکی تھی۔

"بالکل ہی احمق ہے، گدھا۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

اور پھر فیصلہ تو اس نے یہی کیا تھا کہ اب ہادی کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرے گی مگر مسئلہ یہ نہیں بلکہ ہادی کی شکل کا تھا۔ جب بھی دکھائی دیتی ضروری کوئی نہ کوئی ایسا جملہ دل میں مچلنے لگتا جو سے ہادی کو بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیتا تھا۔

+

وہ دونوں غالباً ساتویں دکان سے خالی ہاتھ باہر نکلے تھے۔

"یہاں تو کچھ بھی اچھا نہیں ہے، کہیں اور دیکھتے ہیں۔" ہادی نے سعد کے پیچھے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار! آخر چکر کیا ہے؟ تم ہر دکان میں جاتے ہو، دس بارہ گفٹ آئٹم کھلوا کر دیکھتے ہو، پھر ناپسند کر کے باہر آ جاتے ہو۔ آخر وہ کون سا نادر و نایاب تحفہ ہے جو تمہیں خریدنا ہے؟" بائیک کو سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

وہ دو روز پہلے پاکستان آیا تھا اور بے حد خوش تھا کیونکہ اس نے امی اور ابو کو راضی کر لیا تھا۔ چند دن بعد امی اور اس کی چھوٹی بہن نے بھی آ جانا تھا، وہ لوگ باقاعدہ طور پر صبا کا رشتہ لینے آ رہے تھے۔ سعد خوش تھا اور اس نے آتے ہی یہ خوشی کی خبر صبا کو بھی سنا دی تھی۔

"یار! نادر و نایاب تحفہ تو نہیں خریدنا چاہتا، البتہ ایسا تحفہ ضرور خریدنا چاہتا ہوں جو بہت اچھا ہو۔" اس

نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"پہلے میرا ارادہ تھا کہ رنگ خرید لوں مگر، پھر سوچا کہ یہ کچھ مناسب نہیں لگتا، پہلے کوئی باقاعدہ بات وغیرہ ہو جائے تو پھر......"

"ہوئے......! رنگ وہ کس کے لیے؟" سعد نے شرارت سے پوچھا۔

"میری غیر موجودگی میں، کہیں میری بھابی تو پسند نہیں کر لی۔ کمال ہے ہادی تو شکل سے تو اتنا باصلاحیت نہیں لگتا۔"

ہادی نے جواباً ایک ہاتھ اسے رسید کیا تھا پھر جھینپتے لہجے میں بولا۔

"سب سے پہلے تمہیں ہی بتا رہا ہوں، اب تم پھپھو سے کہہ دینا تا کہ وہ ماموں سے بات کر لیں۔ میں خود کہتا تو اچھا نہیں لگوں گا نا۔"

وہ بے چارا اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا، مگر سعد چونک سا گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے بائیک ایک طرف کر کے روک دی تھی۔

"کیا ہوا؟......بائیک کیوں روک دی؟" ہادی حیران ہوا۔

"امی......کیا بات کریں گی، میرا مطلب ہے کس بارے میں بات کریں گی ماموں سے؟" گو کہ، اس کے شک پر تصدیق کی مہر نہیں لگی تھی اس کے باوجود اس کے لہجے میں ناگواری سی در آئی۔

"صبا کے بارے میں یار! اور کس کے بارے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔"

سعد کی پیشانی پر چند لکیریں نمودار ہوئی تھیں۔ اس کا دل چاہا تھا کہ گھوم کر ایک زوردار گھونسا اسے رسید کرے اور شاید وہ ایسا کر بھی دیتا مگر ہادی کے چہرے پر ضرور کوئی ایسی بات تھی، جس نے اسے کچھ بھی کرنے سے باز رکھا۔

"ہادی!......تم اب بھی مذاق کر رہے ہو نا۔" وہ گھوم کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کی بات پر ہادی کے چہرے پر کچھ اور نا سمجھی کے تاثرات ابھرے تھے اور وہ بائیک سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا۔

"اس میں مذاق والی بات آخر ہے بھی کیا؟......اور میں اس طرح کا مذاق کروں گا بھی کیوں؟" اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"تم سے صبا نے کچھ نہیں کہا؟"

"پہلے تو امی نے کہا تھا تب ہی تو میں بھی سوچنے پر مجبور ہوا، ورنہ تم جانتے ہو سعد! میں تو......"

"چھوڑو انہیں یہ نہیں کچھ اور نہیں کہا اس نے تم سے؟" سعد جھنجھلا کر پوچھ رہا تھا۔

"مثلاً کس حوالے سے......؟" وہ بیچارا سچ مچ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سعد اس سے کیا اگلوا رہا ہے۔

"میرے اور اس کے حوالے سے؟" ہادی نے بہت متعجب ہو کر اسے دیکھا۔ "کیا اس نے تمہیں یہ

نہیں بتایا کہ اس نے جو کچھ بھی تم سے کہا وہ صرف ڈرامہ تھا تا کہ میں......"

سعد بہت جوش میں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

ہادی کے چہرے پر جو بے یقینی لکھی تھی، اس نے اسے کافی کچھ سمجھا دیا تھا۔ صبا سے اس کی
تھی یا شاید وہ اسے پسند کرتا تھا۔ مگر ہادی اس کا بہترین دوست تھا۔ وہ صبا کو اتنا نہیں جانتا تھا کہ
بارے میں کچھ بھی وثوق سے کہہ سکتا، مگر وہ ہادی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کے بارے
بہت یقین سے کہہ سکتا تھا اور اسے حیرت تھی کہ اس نے صبا کی بات پر یقین کیوں کیا جبکہ وہ خود
سادہ لوحی سے بخوبی واقف تھا۔

"بیٹھ جاؤ ہادی! مجھے لگتا ہے ابھی کچھ ایسا ہے جس کی وضاحت ہم دونوں کے لیے بہت ضروری
اور یہ وضاحت صبا دے گی۔"

بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بائیک کو کک لگائی تھی۔

+

"حقیقت مذاق محبت۔"

یہ وہ تین الفاظ تھے جو اس لمحے اسے اپنی زندگی کے سب سے ناگوار الفاظ محسوس ہو رہے تھے
وہ تین الفاظ تھے، جن کے درمیان اسے اپنا آپ ذرے کی مانند اڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟"

اسے غائب دماغی سے مسلسل اپنی جانب دیکھتا پا کر صبا نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا
اسے ہادی کی ڈھٹائی مزید تپ چڑھا رہی تھی۔ ایک تو اس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا اور اب اتنا کچھ سن لینے
باوجود احمقوں کی طرح کھڑا اس کی شکل تک رہا تھا۔ یہ نہیں کہ اس سے معذرت ہی کرے۔ کم سے کم
طرح سعد کو اس کا یقین ہی آ جاتا۔

"اگر نہیں دیکھی تو اب ضرور دیکھ لینا۔ تمہاری غلط فہمی ضرور دور ہو جائے گی کہ، میرے جیسی لڑ
سے محبت کر سکتی ہے؟"

ہادی اب بھی خاموش تھا۔ اس کے پاس صبا کی باتوں کے جواب میں کہنے کے لیے ایک بھی لفظ
تھا۔ وہ تو بس ایک دم بخود کیفیت میں اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اتنا زوردار جذباتی جھٹکا اسے صبا کے
اظہار محبت سن کر بھی نہیں لگا تھا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا صبا! تم نے خود کہا تھا...... ایک بار نہیں کئی بار۔" اسے اپنی آواز کسی
کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

صبا دنگ رہ گئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہادی اس سے باز پرس کر سکتا ہے۔ اس نے

بھی اگر وہ کوئی وضاحت دے رہی تھی (بلکہ وضاحت کیا دے رہی تھی سراسر برس رہی تھی اس سے اپنی بات
کا جتلایا جانا برداشت نہیں ہو رہا تھا) وہ بھی صرف سعد کی وجہ سے، جس نے آتے ہی اس سے جواب طلبی
کی تھی۔

ہادی کی بات پر سعد نے ایک بہت طنز بھری کاٹ دار نظر صبا پر ڈالی اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

صبا کا بس نہیں چلا کہ ہادی کا سر پھاڑ دے۔

"اسی لیے کہتے ہیں بیوقوف دوست سے دانا دشمن بھلا۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے اس دوستی کے پردے میں
کوئی دشمنی ہی نکالی ہے تم نے مجھ سے۔ بتاؤ! کسی چیز کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا نہیں...... یا شاید ہر چیز کی کوئی
حد ہوتی ہے مگر، تمہاری بے وقوفیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے سارے احساسات مر چکے
ہیں مگر، عقل ابھی باقی ہے مذاق اور ہمدردی کو سمجھ سکتے ہو۔ میں تم سے باقی گھر والوں کی نسبت ہنس کر بات
کر لیتی ہوں۔ تمہاری طرف داری کر دیتی ہوں تو اتنی سی باتوں کو تم نے ہمدردی کی بجائے محبت سمجھ لیا۔"

"تم ہی نے کہا تھا صبا......" اس نے کہنا چاہا مگر صبا نے اسے بات مکمل ہی نہیں کرنے دی۔

"مذاق میں کہا تھا اور دوستوں میں تو مذاق چلتا ہی رہتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں نے کب کوئی
ایسی بات کہہ دی جسے تم نے اتنی سنجیدگی سے لے لیا، نہ صرف یہ بلکہ سعد سے بھی کہہ دیا، حالانکہ تم جانتے تھے
کہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔"

"نہیں صبا! مجھے نہیں پتا تھا کیونکہ، کیونکہ تم نے کبھی مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"کمال ہے اب کیا میں ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اپنے منہ سے بتاتی پھروں۔ سب گھر والوں نے بھی تو یہ
بات خود ہی محسوس کی ہے۔ میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا۔"

ہادی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے یہ بات دیگر تمام باتوں کی نسبت زیادہ مزاحیہ لگی
تھی۔ اپنا تمسخر اڑاتی ہوئی۔

"اب جو بھی بات تھی میں تمہیں بتا چکی ہوں، امید ہے تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ ویسے تو میں
نے کوئی غلط بات نہیں کی لیکن اگر میری کسی بات سے تم ہرٹ ہوئے ہو تو ہادی آئی ایم سوری! مگر سچ یہ ہے
کہ تمہاری اس بات سے میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔ ایک دوست جب دوسرے دوست کے کام ہی نہ آ
سکے تو کیا فائدہ ایسی دوستی کا۔

بجائے اس کے کہ تم سعد کو کنوینس کرتے۔ تم نے اپنی ہی مصیبت بیچ میں ڈال دی۔ قسم سے، مجھے تم
سے ایسی امید ذرا بھی نہیں تھی شاید...... شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی۔

سعد کو منانے کا دردِ سر ابھی باقی ہے، مگر ایک گزارش ہے کہ کچھ روز میں سعد کی امی آنے والی ہیں،
برائے مہربانی! ان کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دینا۔ میں بڑی شکر گزار رہوں گی تمہاری۔ کچھ اور

نہیں تو اتنی پرانی دوستی کا ہی مان رکھ لینا۔"

وہ زہر انڈیل کر چلتی بنی مگر ہادی وہیں کھڑا رہا۔ اپنی نہایت معمولی شکل و صورت، کمزور قوت ارادی، بے جان شخصیت اور شکستہ سوچوں کے ساتھ۔

+

اسے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے بہت دیر گزر چکی تھی۔

وہ اس کی زندگی کی پہلی ایسی رات تھی جو اس نے انتہائی اضطراب کی کیفیت میں سڑکوں پر پھرتے ہوئے گزاری تھی۔

اس رات، اس کے اندر سے احساس ذمہ داری ختم ہو گیا تھا اور اسے اپنا دماغ پھٹتا محسوس ہوا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ "دوسروں" کی نظر میں اس کی ذات، کیا حیثیت رکھتی ہے اور یہ ادراک اس کے نہایت اذیت کا باعث بنا تھا۔

کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی وضاحت صبا نے نہیں دی تھی مگر وہ ساری باتیں اسے از خود پتا چل گئی تھیں۔ کمال تو یہ تھا کہ ہر بات کا ہر سرا جا کر سعد کی ذات سے مل رہا تھا۔

پچھلے دو چار سال میں جو اس کے ساتھ صبا کا رویہ تبدیل ہوا تھا۔ وہ جو وقتاً فوقتاً اس کی حمایت کرتی تھی۔ وہ جو بار بار اس سے اپنا حق لینے کی بات کرتی تھی۔ تو اسے اب سمجھ آیا تھا کہ ایسا صرف سعد کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایسے تمام موقعوں پر صبا کے منہ میں سعد کی زبان ہوا کرتی تھی۔ وہ جو کہتی تھی یا جو کرتی تھی اس کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا صرف اور صرف اس کا اپنا فائدہ۔

مگر کوئی یوں بھی کرتا ہے، اتنا بڑا دھوکہ ایسی بے حسی...... کسی کی ذات کا سارا فخر چھین لو۔ ہنسنے کو کرے تو کسی کے مان کی دھجیاں بکھیر دو اور پھر کہہ دو یہ تو صرف مذاق تھا۔

"تو ہادی ابراہیم! یہ ہے تمہاری حیثیت۔ جس کا دل چاہے، جیسے دل چاہے تمہیں استعمال کرے پھر چھوڑ دے۔ صبا صحیح ہی تو کہتی ہے میں واقعی بے حس ہوں مجھ میں کچھ محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ مجھے دوسروں کی زیادتیاں سہنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ مجھے مذاق بھی سمجھ نہیں آتا...... مگر کوئی یہ تو بتا کیا معصومیت میرا گناہ ہے؟ میرا سادہ مزاج ہونا میری غلطی ہے۔

اگر ہے تو کوئی مجھے اس غلطی، اس گناہ کی سزا کے طور پر مار کیوں نہیں دیتا۔ کوئی مجھے زہر دے دے، گولی مار دے مگر، مگر میرے احساسات سے، میرے دل سے تو نہ کھیلے۔" اس نے سختی سے اپنی آنکھیں ڈالیں۔

مرد روتا ہوا اچھا نہیں لگتا مگر اس رات احساس بے بسی سے کئی بار اس کی آنکھیں بھیگی تھیں۔ بار بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ چیخیں مار مار کر اتنا روئے کہ سارا غبار بہہ جائے۔

مرد تھا تو کیا ہوا سینے میں دل تو رکھتا تھا۔ احساسات تو اس کے بھی تھے جنہیں ٹھیس پہنچی تھی اور وہ بھی اس کے ہاتھوں جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی اور اسی دوست نے اس کی ذات کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

ہتک و تمسخر کا ہر احساس اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ جتنا اس بات کو بھولنے کی کوشش کرتا تھا، وہ جتنا اپنے دل و دماغ کو صبا کے حق میں کرتا، وہ اتنا ہی اس کے خلاف چلے جاتے تھے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے کچھ خواب دیکھے تھے۔ زندگی میں پہلی ہی بار اس کے اندر آگے بڑھنے اور زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی مگر...... اور اس مگر سے آگے اسے منہ کے بل گرنا پڑا تھا۔

"حد ہوتی ہے کسی بات کی، آخر تمہیں یہ بات کب سمجھ آئے گی ہادی! کہ اپنا، اپنا کہہ کر یہاں سب ہی تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔"

"بے وقوف اور احساسات سے عاری انسانوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے یعنی اس کے ارد گرد رہنے والے سارے لوگ اس کی ذات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔"

اسے وقتاً فوقتاً صبا کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کم سے کم آج تو جا کر اسے بتا ہی دے کہ بے وقوف تو بہرحال وہ تھا تب ہی تو اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا مگر احساسات سے عاری کبھی بھی نہیں تھا۔ یہ اس گھر کے مکینوں کے احسانات تھے جو اسے سر اٹھانے نہیں دیتے تھے۔

زندگی میں جب کبھی بھی اس کی حق تلفی ہوئی اس نے خود کو کئی طرح کے دلائل سے مطمئن کر کے احتجاج سے روکے رکھا کہ، جہاں اس گھر نے اس پر اتنے احسانات کیے وہیں کچھ حق تلفیاں بھی سہی مگر صبا نے اس پر کون سے احسانات کیے تھے کہ وہ اس کی خطا کو درگزر کر دیتا۔

اتنا بڑا ظلم کیا تھا کہ حد نہیں۔

"ہادی...... ہادی!" کسی نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ اس نے جھکا سر اٹھایا۔ اس کے قریب سعد پریشان صورت لیے کھڑا تھا۔

سعد چند لمحے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے کیا وقت ہو رہا ہے؟...... رات کے تین بج رہے ہیں، میں سارے شہر میں تمہیں ڈھونڈتا آ رہا ہوں۔ تم چلو میرے ساتھ۔" اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تھا مگر ہادی نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔

"تم جاؤ میں آ جاؤں گا۔" اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔ سعد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"نہیں تم میرے ساتھ چلو، پتا ہے گھر میں سب کتنے پریشان ہیں۔" اس نے ہادی کی بات کو یکسر نظر انداز کیا تھا۔

"کون سے گھر میں...... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" دوٹوک انداز تھا۔

سعد ایک بار پھر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ہادی سے کیا کہے جبکہ وہ ساری صورت حال سے بھی واقف تھا۔ گو کہ جو ہوا اس میں نہ تو اس کی کوئی غلطی تھی نہ اس سب میں اس کی رضا بھی وہ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ پھر جیسے وہ تھک کر اس کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

"ہادی! میں سمجھتا ہوں یار! جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا افسوس ہے......"

بہت دیر تک سوچ بچار کے بعد اس نے کہنا شروع کیا تھا مگر ہادی نے بیچ میں ہی اسے ٹوک دیا

"افسوس کے لیے شکریہ۔ لیکن مجھ سے ہمدردی مت کرو سعد! جتنا نقصان مجھے اس ہمدردی لہجے نے پہنچایا ہے کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔"

"ہادی!...... صبا نے۔" اس نے پھر کہنا چاہا۔

"صبا کی بات مت کرو سعد! میں اس کے بارے میں اب کبھی بھی بات نہیں کرنا چاہتا، مگر احسان مند ہوں اس نے مجھے آئینہ دکھا دیا ہے۔ جو بات اس کی دوستی نہیں سمجھا سکی تھی وہ اب طرح سمجھ آگئی ہے۔ چلو چلتے ہیں، شاید، واقعی سب پریشان ہوں گے، انہیں مفت کے ملازم ڈھونا پڑ جائے۔" ہادی اس کی بائیک کے پاس جا رکا تھا جبکہ سعد اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ہادی تھا جسے اب تک وہ جانتا تھا۔

✦

پھر سب نے دیکھا کہ ہادی ابراہیم کی شخصیت میں تبدیلی آتی چلی گئی۔

گو کہ، یہ تبدیلی ظاہری شخصیت کے حوالے سے نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق مزاج سے تھا۔

"مجھے تو سمجھ نہیں آتی اس لڑکے کو ہوا کیا ہے۔ مزاج ہی ٹھکانے پر نہیں ہے کوئی کام کہو انکار کر دیتا ہے، موڈ ہوا تو کر دیا ورنہ نہیں۔ صبح کو بھی گھر سے جلدی نکل جاتا ہے اور رات کو بھی ہے۔ میں کہتی ہوں ذرا پتا کرواؤ اس کے بارے میں۔ مجھے تو اس کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگتی الٹے سیدھے کام میں پڑ گیا تو بدنامی تو ہماری ہی ہے۔"

صبا نے اپنی امی کو بھری محفل میں کہتے سنا تھا۔ جواباً اس کے ابو نے رات کو ہادی کی کلاس لینے کا اظہار کیا تھا۔ یہ ساری باتیں سن کر وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔

کسی وجہ سے سعد کی امی پاکستان نہیں آسکی تھیں، پچھلے ڈھائی ماہ سے یہ سلسلہ ملتوی ہو رہا اسے سعد کے رویے میں بھی کچھ رکھائی محسوس ہوئی تھی۔ وہ ہاسٹل شفٹ ہو چکا تھا اور اس دوران

ے صرف تین بار رابطہ کیا تھا۔ گو کہ، اس کا انداز نارمل تھا مگر صبا کو کوئی بات پن کی طرح چبھ رہی تھی۔
لے اندر ہی اندر یہ احساس بہت شدت سے تھا کہ جب تک وہ ہادی کو نہیں منا لیتی۔ سعد اپنی امی کو نہیں بلوائے گا۔ پھر اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ہادی کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے تب ہی اس نے ہادی سے معذرت کرنے کی کوشش کی۔

مگر ہادی نے اس کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھا رکھی تھی شاید، بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس روز وہ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ مگر ہادی نے فوراً اس سے وہاں سے جانے کے لیے کہا تھا۔

"نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھ سے بات نہیں کرو گے، میں نہیں جاؤں گی۔ دیکھو ہادی! میں تم سے ایکسکیوز بھی کرنے کو تیار ہوں مگر تم خود بتاؤ کیا دوست ایک دوسرے سے مذاق نہیں کیا کرتے...... او کے آئی ایم سوری! اتنی پرانی دوستی کو ایک ذرا سی بات پر ختم کر دینا تو ٹھیک بات نہیں ہے۔"

ہادی نے اس کی بات بہت خاموشی سے سنی تھی اور اس کی بات ختم ہوتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر نکال دیا تھا۔

"ہاں اتنی پرانی دوستی کو اتنی سی بات پر ختم نہیں کیا جا سکتا، مجھے امید ہے میری اس بات کو بھی تم مائنڈ نہیں کرو گی۔"

صبا ہکا بکا بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہادی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔

"دفع دور! نہیں تو نہ سہی، جناب کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے اور یہ میری ہی غلطی ہے۔ ذرا سی اہمیت کیا دے دی یہ تو سر ہی چڑھ گیا۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھنے لگا ہے...... حد ہو گئی۔ لوگ پتا نہیں خود کو بھی شیشے میں کیوں نہیں دیکھتے۔

ٹھیک ہے ایسا ہے تو ایسا ہی سہی...... اب اس کو منانے آتی ہے میری جوتی۔ سعد کو اور اس کی ماں کو میں خود ہی سنبھال لوں گی۔"

جل بھن کر اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

پھر اس رات تو نہیں مگر کچھ روز بعد ابو نے واقعی ہادی کی کلاس لے ڈالی تھی۔

"ہاں برخوردار! ہوتے کہاں ہو؟ دن کی روشنی میں تو گھر پر دکھائی نہیں دیتے۔" ان کے لہجے میں طنز کی وہ مخصوص کاٹ تھی جو اس گھر کے مکینوں کا وطیرہ تھی۔

"جی یہیں ہوتا ہوں۔" ہادی نے آہستگی سے کہا تھا، نجانے یہ بات کسی اور نے محسوس کی تھی یا نہیں مگر صبا کو احساس تھا کہ ہادی مؤدب تو تھا مگر اس روز اس کے لہجے میں وہ تابعداری کا عنصر مفقود تھا، جو ہمیشہ

سے اس کی ذات کا حصہ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ماموں! میں آوارہ گردی کرتا ہوں، گھر کا کوئی کام نہیں کرتا۔ میں
منصور، عباد اور احمر کی طرح گھر کی ذمہ داریوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ مگر ماموں! میں تو ہمیشہ سے ہی ایسا
اگر آپ کو یاد ہے تو کچھ ایسی ہی شکایات مجھ سے پہلے بھی تھیں تو جب یہ شکایات اتنے عرصے میں
ہو سکیں تو اب کوئی معجزہ تو ہو گا نہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میں شروع ہی سے آپ لوگوں کے لیے پریشانی کا سبب رہا ہوں مگر اب
لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کروں گا کیونکہ میں ہاسٹل شفٹ ہو رہا ہوں۔ آپ لوگوں نے اتنا عرصہ
ذمہ داری برداشت کی، میں اس کا احسان نہیں چکا سکتا مگر میں ساری زندگی آپ لوگوں کا احسان مند
گا۔"

اتنا مضبوط اور بے لچک لہجہ، وہاں موجود ہر شخص کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

✦

"صبا! ہم لوگ جا رہے ہیں اٹھ کر دروازہ بند کر لو...... اور ہاں سنو! میں نے ٹی وی پر کچھ کتابیں
ہیں ابھی تھوڑی دیر میں ندرت کا چھوٹا بھائی آئے گا اسے دے دینا...... اور پلیز اب اٹھ جاؤ کہیں ایسا
میں اور امی جا بھی چکیں اور تم سوتی ہی رہ جاؤ۔"

ثنا کے آخری بار پکارنے پر، اس نے پوری آنکھیں کھول کر اور ہاتھ لہرا کر اسے چلے جانے کا
دے دیا تھا مگر سارے گھر میں خاموشی چھا جانے کے باوجود وہ بہت دیر تک اسی خالی الذہن کیفیت میں
رہی پھر، بہت دیر بعد خیال آیا تب کہیں جا کر دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں چلی آئی۔

نیند کو آنکھوں سے جدا ہوئے بہت دیر گزر چکی تھی مگر، سستی ابھی باقی تھی یا شاید اسے بوجھل
چاہیے جواب مستقل ہی طبیعت کا گھیراؤ کیے رہتا تھا۔ ایک بھرپور بے فکر نیند تو خیر کب کی خواب و خیال
چکی تھی۔ پے در پے زندگی نے ایسے جذباتی جھٹکے دیے تھے کہ ہر طرح کی فکر اور خیال سے آزاد ہو کر
کا خیال بھی مضحکہ اڑاتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ وہیں صوفے پر لیٹ کر زندگی کے اس رخ پر غور کرنے لگی۔ کتنا کچھ تبدیل ہو گیا تھا زندگی میں
اس تبدیلی نے ذاتی ترجیحات کو کتنا بدل کر رکھ دیا تھا۔

پہلے گھر کا بٹوارا ہوا۔ دادا کے زمانے میں بنے گھر میں دیواریں کھڑی ہوئیں پھر ثنا کی شادی کا افسوس
ناک انجام، کبھی کبھی تو صبا کو اس لڑکی کے صبر پر رشک آنے لگتا تھا۔ ایک طویل عرصہ اس نے اچھے
تلاش میں صرف اس لیے گزار دیا تھا کیونکہ اس کے والدین کے خیال میں بس لڑکی کی شادی ہی ہونی
اسے چولہا سنبھالنا ہوتا ہے اور بچے پالنے ہوتے ہیں کیریر ویریئر کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

کبھی کبھی صبا کو لگتا تھا اخلاقیات کا وہ سبق جو اس کے ماں باپ نے ثنا کو پڑھایا تھا وہ اس اخلاقی سبق سے بہت مختلف تھا جو انہوں نے اسے پڑھایا تھا۔ اسے کافی سارے معاملات میں چھوٹ دی گئی تھی اور اس چھوٹ کا نتیجہ صرف وہی بھگت رہی تھی۔ معاشی ناہمواریوں، اچھے رشتوں کا بروقت نہ ملنا، بیٹی کا گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو جانے کا خوف ایسے مسائل تھے جو فی زمانہ کم و بیش تمام والدین کو درپیش ہوتے ہیں۔ لہٰذا ثنا کے معاملے میں امی ابو نے جتنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں اتنا ہی اس کے معاملے میں پہلو تہی سے کام لیا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ اس کی شکل اور عقل کے ساتھ ساتھ قسمت پر بھی بے حد بھروسہ کرنے لگے تھے۔

مگر قسمت دوسروں کی مرضی سے ہی رخ بدلنے لگے تو کیا بات ہے۔

چند معمولی وجوہات کی بنا پر ثنا کی طلاق ہو گئی۔ ان دنوں ابو کو معاشی دقتوں نے پریشان کر رکھا تھا وہ بالکل ہی ڈھے گئے۔ ان دنوں پالیسی تبدیل ہو رہی تھی کئی افراد کو جبراً ریٹائر کر دیا گیا انہی میں ابو بھی شامل تھے۔

کئی دن تک گھر میں سوگ کا سا سماں رہا پھر امی کو اس کی فکر ستانے لگی۔

"اس ہادی احسان فراموش نے تو جا کر خبر ہی نہ لی۔ ایک اس کی پھپھی ہے جانے کب سے لارا لگا رکھا ہے۔ میں کہتی ہوں صبا! ذرا سعد کو فون کر کے تو پوچھو آخر کب لا رہا ہے اپنی ماں کو؟"

صبا کا دل چاہا کم سے کم آج تو ہمت کر کے امی سے کہہ ہی دے کہ ہادی کو احسان فراموش نہ کہیں ہو سکے تو اس کی منت کر لیں کہ وہ ان کی بیٹی کو معاف کر دے۔ ایک معمولی سے مذاق کی سزا اتنی سخت تو نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ مذاق آج حرف بہ حرف حقیقت بن چکا ہے۔

مگر وہ انہیں نہیں بتا سکی تھی۔ اس سے تو انہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ سعد کی امی اب کبھی اس گھر میں نہیں آئیں گی اور یہ کہ "لارا" سعد کی امی نے نہیں لگایا تھا سعد کی امی نے نہیں آنا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے، میں تم سے شادی کروں گا نہیں کبھی نہیں۔" ہادی کے چلے جانے کے عرصے بعد اس نے کہا تھا اور صبا کی شخصیت کا سارا کروفر خاک ہو گیا تھا۔

"آج سے پہلے میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ جب تم ہادی کے ساتھ مذاق کر سکتی ہو، اس کی فیلنگز سے کھیل سکتی ہو تو، یہی سب تم میرے ساتھ بھی تو کر سکتی ہو مگر، میرے دل میں ابھی گنجائش تھی تمہارے لیے۔ تب ہی میں اپنے دماغ کو سو طرح کی تاویلوں سے بہلاتا رہا مگر آج کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، پتا ہے کیوں؟ کیونکہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کبھی بھی ہادی کے سحر سے نہیں نکل سکتیں، تم سر سے لے کر پاؤں تک اس کے حصار میں ہو اور میں کبھی ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا جس کے گرد کسی اور کے خیالات کی دیواریں کھڑی ہیں۔"

وہ سعد کو جھٹلانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتی تھی مگر اس نے اپنے دفاع میں ایک لفظ نہیں کہا تھا کیونکہ کچھ حقیقتیں ہمیشہ سے تسلیم شدہ ہوتی ہیں اور یہ بھی ایک ایسی ہی حقیقت تھی جس کا اس نے گزرے سات سالوں میں کئی بار کیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ کس نامراد لمحے نے، اسے اس شخص کا اسیر بنا دیا جو جاتے ہوئے بس ایک شکوہ بھری نگاہ ہی اسے دے سکا تھا۔ وہ بس یہ جانتی تھی کہ وہ اب بھی اس کے اثر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔

ہر طرح کی بے چینی اور ذہنی اذیت کے باوجود۔

"اب پتا چلا اپنی تسکین کے لیے کسی کا دل توڑ دینا کتنا آسان ہے جبکہ اسے جوڑنا کتنا مشکل۔"

سعد کی شادی پر جب اس نے اسے مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا تب ہادی کے متعلق پوچھنے پر سعد نے کسی قدر طنز سے کہا تھا۔

"تم اس طرح کہنے کا حق رکھتے ہو میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ بے شک مجھے دنیا کی بری ترین لڑکی سمجھتے ہوئے، جتنے چاہو طعنے دے لو مگر بس ایک بار ہادی کا کونٹیکٹ نمبر دے دو پلیز سعد! تم اندازہ نہیں کر سکتے میں کتنی اذیت میں ہوں۔" وہ تقریباً رو دی تھی۔

"نہیں...... میں جانتا ہوں۔" سعد نے بے اختیار کہا تھا اور پھر وہ دونوں ہی کچھ نہیں کہہ سکے تھے۔ صبا جانتی تھی کہ سعد نے سچ مچ اس سے محبت کی تھی۔ خود اس کی محبت (جو کہ محبت نہیں تھی) وہ تو مادی نظر رکھتی تھی۔ سعد کی طرف اس کا جھکاؤ صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ جانتی تھی سعد کی زندگی میں شامل ہو کر اسے وہ ہر سہولت و آسائش ملے گی، جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ مگر خواب، خواب ہی رہا۔

"کچھ روز پہلے، مجھے اپنے پاکستانی دوست سے پتا چلا ہے کہ ہادی انگلینڈ جا چکا ہے۔ مگر انگلینڈ میں وہ کہاں ہے اس بارے میں کوئی خبر نہیں ہے، البتہ مجھے جیسے ہی پتا چلے گا میں تمہیں ضرور بتا دوں گا۔"

اور پھر اس کرب میں رہتے چوتھا سال تھا جب سعد نے بذریعہ فون اسے اطلاع دی۔

"وہ یہاں آ گیا ہے۔ آج کل تو ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔ میں نے اسے تمہارا پیغام دیا تھا مگر وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتا صبا! اور...... اور میں اسے فورس بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں یاد ہے صبا تم اسے پتھر کہا کرتی تھیں۔ وہ پہلے پتھر نہیں تھا۔ وہ اب پتھر ہو گیا ہے اور اسے پتھر بنانے والی تم ہو۔"

یہ سعد سے ہونے والا آخری ٹیلی فونک رابطہ تھا۔

"صبا باجی! امی کہہ رہی ہیں چائے بنانی ہے تھوڑی سی پتی دے دیں۔"

پڑوس کی دیوار سے ارسلان کی آواز نے اس کے خیالات میں رخنہ ڈال دیا۔ اس نے کچن سے چائے کی پتی کا پورا جار اٹھایا اور ارسلان کو دے دیا۔ اسے پتا تھا اس بات پر اسے امی سے ڈانٹ پڑے گی مگر انسان عادت سے مجبور ہوتا ہے۔

زندگی کے ایک بہت اہم معاملے پر دھیان نہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اب وہ اکثر چھوٹے موٹے معاملات میں لاپروائی برت جاتی تھی۔

ذرا دیر بعد اسے اپنے لیے چائے بنانے کا خیال آیا پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا اور اسکول کے بچوں کی کاپیاں چیک کرنے بیٹھ گئی، کچھ بھی تھا مگر ملازمت کر لینے سے وقت مثبت انداز میں کٹنے لگا تھا۔

ابھی دو ہی کاپیاں چیک کی تھیں کہ گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ٹی وی پر رکھی کتابیں اٹھائیں اور باہر کی جانب چل دی گو کہ، اس مختصر سے لاؤنج سے نکل کر گیٹ تک آنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا مگر ندرت بھائی کو شاید کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

صبا نے اپنی ناگواری پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا مگر گیٹ کے عین سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی۔

"ہادی......!" اس کے لبوں نے خفیف سی جنبش کی۔ وہ اسے سات سال بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے با آسانی پہچان گئی تھی، حالانکہ ہادی کی شخصیت میں بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا اعتماد کے ساتھ ساتھ مونچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت پہلے کے مقابلے میں بے حد صاف ہو چکی تھی اور وہ پہلے کی طرح دبلا پتلا بھی نہیں رہا تھا۔

"اگر تم میرا جائزہ لے چکی ہو تو میں اندر آ جاؤں؟" ہادی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ صبا پھر بھی اسے دیکھتی رہی۔ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ہادی واپس آ چکا ہے۔

ابھی چند روز پہلے تو اس نے سعد سے ایک بار پھر گزارش کی تھی کہ وہ کسی طرح ہادی کو اس سے بات کرنے کے لیے راضی کرے اور اب وہ اس کے سامنے تھا۔ ایک بالکل نئے روپ میں۔

"صبا! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ بھئی یہ میں ہوں، ہادی۔"

صبا جیسے کسی خیال سے چونک کر چند قدم پیچھے ہٹی۔

"نہیں پہچان چکی ہوں، آؤ۔"

اپنی زندگی کی مشکل ترین صورت حال سے دوچار تھی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہادی اس کے سامنے موجود ہے۔ اس نے صبا کو دیکھ کر نفرت سے منہ بھی نہیں موڑا۔

ہادی نے اندر آ کر گیٹ بند کر دیا۔ اس کے ساتھ دو بھاری بھرکم سوٹ کیس تھے، جو اس کی مالی حیثیت کے شاندار ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

"صبا! تم کیسی ہو؟"

اس نے پوچھا تھا اور جنوری کے مہینے میں پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو پونچھتے ہوئے صبا نے

بمشکل سر ہلا دیا۔

"کوئی اور گھر میں دکھائی نہیں دے رہا، باقی سب لوگ کہاں ہیں؟" اپنے اور اس کے درمیان

اس خاموشی کو ہادی نے ہی ختم کیا تھا۔ وہ دونوں آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے۔

"ابو اس وقت دکان پر ہوتے ہیں، امی اور ثنا میلاد پر گئی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آ جائیں گی
بھائی وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہتے۔"

ہادی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔ ہادی چونکا۔

"تمہارے ساتھ نہیں رہتا تو پھر کہاں رہتا ہے؟" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"وہ اپنی بیوی کے گھر میں رہتے ہیں...... ڈیفنس میں، تم فریش ہو جاؤ میں کھانا گرم کرتی ہوں"

"میں ابھی زبردست سی چائے پینا چاہتا ہوں۔ کھانا اب رات کو ہی کھاؤں گا۔"

صبا سر ہلا کر کچن میں آ گئی۔ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کے باوجود، وہ کچھ بھی سوچ نہیں
تھی۔ اسے اپنا دماغ ایک دم سے خالی محسوس ہو رہا تھا۔ جس وقت وہ چائے مگ میں نکال رہی تھی ہادی
میں چلا آیا۔

"تم باہر چل کر بیٹھو، میں چائے وہیں لا رہی ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"چائے تو یہاں بیٹھ کر بھی پی جا سکتی ہے۔" وہ چھوٹی سی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے
گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

صبا نے خاموشی سے اس کے سامنے گھر میں ریفریشمنٹ کے نام پر جو کچھ بھی موجود تھا رکھنا
دیا۔ جب وہ سب کچھ رکھ چکی تو ہادی نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"تم آج کل کیا کر رہی ہو؟"

"میں......" اسے جواب دینے میں کچھ وقت ہوئی، کیونکہ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"تم اتنا اچانک کیسے آ گئے؟...... اطلاع دے دیتے تو کوئی تمہیں ریسیو کرنے ہی آ جاتا۔"

"سوچا تھا، اچانک جا کر سرپرائز دوں گا مگر شاید میں نے غلطی کی ہے...... تمہیں شاید میرا
نہیں لگا۔" بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہادی نے کہا صبا گڑبڑا سی گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو......"

"کیا میں تو؟...... بات مکمل کرو صبا!" پتا نہیں وہ واقعی انجان تھا یا صرف پوز کر رہا تھا مگر اس
لاتعلقی نے صبا کو حوصلہ فراہم کیا۔

"سعد نے تمہیں میرا میسج دیا تھا۔" میز کی صاف سطح پر نگاہیں جماتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ صبا تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر، تب میرا پاکستان

پلان بن گیا تھا اسی لیے میں نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"

"اور اس سے پہلے کے میسجز؟"

"ہاں وقتاً فوقتاً وہ میسجز بھی مجھے ملتے رہے ہیں مگر، تب میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ،
کیونکہ تب میں تم سے خفا تھا۔" ہادی نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ صبا متعجب اسے دیکھے گئی۔ جس انداز میں
وہ بات کر رہا تھا ایسی شرمندگی تو خود اس کے لہجے میں ہونی چاہیے تھی۔

"اور اب......؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر ہادی ہنس دیا پھر جھینپتے ہوئے بولا۔

"نہیں اب میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ اب تو میں تم سے خفا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کبھی دیکھا
ہے کہ کوئی اپنے محسن سے خفا ہو جائے؟"

اس نے مسکراتے ہوئے صبا کی جانب دیکھا جو نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں سمجھیں؟...... ٹھیک ہے میں سمجھاتا ہوں۔

جب میں، یہاں سے گیا تھا تو واقعی تم سے بہت خفا تھا۔ میں بہت زیادہ ہرٹ ہوا تھا۔ میں نے سوچا
تھا صبا! جب مجھے اپنا دوست کہنے والی لڑکی میرے احساسات کا مذاق اڑا سکتی ہے، مجھے اپنے مقصد کے لیے
استعمال کر سکتی ہے تو وہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے جو مجھے اپنا دوست نہیں مانتے۔

بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جتنی بڑی مجھے لگی مگر، تمہارے اس معمولی مذاق نے مجھے میری زندگی کا
بہت بڑا پوائنٹ سمجھا دیا تھا اور وہ پوائنٹ تھا کہ، اس دنیا میں کوئی بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔

مگر جب غصہ اتر گیا تو میں نے اس نقطے کی تلاش شروع کی جس کی بنیاد پر تم نے سعد کو اہمیت دی تھی
تب ہی مجھے پتا چلا کہ، غلطی تمہاری نہیں بلکہ میری ہی تھی۔ سعد کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کو بھی متوجہ کر
سکتا ہے۔ پُراعتماد شخصیت، دولت وجاہت اور اس کے مقابلے میں میرے پاس کیا تھا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی
نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو یقیناً وہ سعد کو ہی ترجیح دیتی۔

تب...... ہاں تب میرے دل نے تمہارے حق میں گواہی دی اور میری جدوجہد کا آغاز ہوا۔ دیکھو
ایک اس لمحے کی وجہ سے آج میں کہاں کھڑا ہوں۔ میرے پاس پُراعتماد شخصیت ہے، دولت ہے البتہ بہت
زیادہ وجاہت نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے اب کوئی لڑکی مجھے ریجیکٹ نہیں کرے گی کیوں؟"

ہادی نے بہت شرارتی انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا، اگلے ہی پل مسکراہٹ اس کے لبوں سے
غائب ہو گئی۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟...... پلیز صبا کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟ اوہ میرے خدا...... آئی ایم
سوری صبا! میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

وہ پریشانی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

''اس طرح کی باتیں مت کرو ہادی! ہرٹ تو تمہیں میں نے کیا تھا۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''ہرٹ کیا تھا، اور اب اس کا نتیجہ بھی دیکھ رہی ہو۔ تمہارے اس مذاق سے کیا کمی آ گئی ہے میری زندگی میں...... الٹا میں نے حاصل ہی کیا ہے۔ اس گھر میں رہ کر میں کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اس گھر سے نکلنے کا موقع مجھے تم نے فراہم کیا تھا۔ اس حساب سے تو تم نے مجھ پر احسان کیا اور میں یہ بات بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ، میری محسنہ کی آنکھوں میں آنسو آئیں...... چلو شاباش اپنی آنکھیں صاف کرو اور اپنے دل سے ہر وہم کو نکال دو میں تم سے ناراض نہیں ہوں، بلکہ میں تم سے کبھی بھی ناراض ہی نہیں سکتا۔''

اس کا لہجہ بہت اپنائیت بھرا تھا۔ صبا نے اس اپنائیت پر بھروسہ کرتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

''تمہاری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے، میں اور بنا دیتی ہوں۔''

''پہلے تم منہ دھو کر آؤ کیونکہ، آنکھیں پونچھ لینے کے باوجود تم فریش نہیں لگ رہیں اور مجھے ہنستی مسکراتی فریش سی صبا ہی اچھی لگتی ہے۔''

گو کہ بہت عام سی بات اس سے بھی عام لہجے میں کہی گئی تھی مگر بے اختیار ہی صبا نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا، چند پل وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے تھے اور پھر دونوں ہی ہنس دیے۔

اور یہ وہ لمحہ تھا جسے ان دونوں نے ہی یادوں میں قید کیا تھا۔

''صبا! میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں، دوبارہ شاید موقع نہ مل سکے۔''

جب وہ دروازے تک پہنچ چکی تو ہادی نے پکارا۔ صبا نے مڑ کر دیکھا تب وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''میں اس گھر سے، تمہاری وجہ سے گیا تھا اور...... میں اس گھر میں واپس بھی صرف تمہاری وجہ سے آیا ہوں، ورنہ میرے لیے اس گھر میں کوئی اٹریکشن نہیں تھی۔''

اس لمحے صبا کو وہ، وہی ہادی ابراہیم لگا جو بہت سوچ سمجھ کر بولتا ہے کہ کہیں اس کی بات رد نہ کر دی جائے اور رد کرنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ تب ہی وہ کھل کر مسکرا دی۔

محبت اپنے منطقی انجام تک پہنچنے کو تھی۔

+

''جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے سامنے ہی تو ہے بیٹا! جس قسم کے حالات ہمیں برداشت کرنے پڑے ہیں، وہ تو اچھے اچھوں کی مت مار دیں۔ تمہارے ماموں کی حالت تو اللہ کے کرم سے پھر بھی سنبھل چکی ہے ورنہ کچھ عرصہ پہلے تم دیکھتے تو......''

مامی کی آواز بری طرح رندھ گئی تھی۔ ہادی ان کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اس سے ایک بھی لفظ نہیں بولا

گیا۔

''تمہارے دونوں ماموؤں نے تو خیر ہمارے ساتھ جو کیا، سو کیا اصل دغا تو ہمیں عباد نے دیا ہے۔ میری لڑکی سے شادی کی، پھر بے غیرتوں کی طرح بیوی کا در پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تم خود بتاؤ ہادی! ایسے میں بھی تمہارے ماما کی طبیعت صحیح رہتی تو کیسے، پھر ثنا کے ساتھ جو بھی ہوا اس نے تو انہیں بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیا۔ زمانہ بھی تو بدل گیا ہے انسانوں کی حقیقت پتا چلے بھی تو کیسے؟ خدا گواہ ہے کہ ہم نے پوری چھان بین کی تھی مگر نجانے کہاں کمی رہ گئی۔ ایسے دھوکے باز لوگ نکلے کہ بس۔ بدبختوں کو اپنی پھول سی بچی سونپ دی مگر ان کی جان تو جہیز میں ہی اٹکی تھی، مطالبات تھے کہ ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ سچ کہتی ہوں ہادی! میری ثنا کا ہی حوصلہ ہے جو سات ماہ اس جلاد کے ساتھ رہی۔

اب تو بس شفیق کی اتنی ہی خواہش ہے کہ دونوں بچیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں تمہاری پھپھی نے بھی تو...... خیر چھوڑو اس بات کو۔ گزری باتوں کا کیا ذکر کرنا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ہادی! وہ جو کہتے ہیں کہ دنیا مکافاتِ عمل ہے کیا انسان کو اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے تو مجھے سچ ہی لگتا ہے۔ جانے انجانے میں ہم تمہیں مصیبت سمجھتے رہے تھے، تمہارے معاملے میں ضرور ہم سے کوتاہیاں ہوئی تھیں اسی کا نتیجہ......''

''چھوڑیے بھی مامی! ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں، گزری باتوں کا ذکر کرنے کا فائدہ؟ تو بھول جایئے جو بھی ہوا آپ بس اللہ سے اچھی امید رکھیں اور دعا کیا کیجئے، دعاؤں نے تو بڑے بڑوں کی مشکلات حل کی ہیں ان کے مقدر بدلے ہیں۔''

بہت پیار و اپنائیت سے مامی کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے انہیں تسلی دی تھی۔ مگر باوجود ضبط کے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ہی گئے۔

صبا قریب سے گزر رہی تھی انہیں روتا دیکھ کر چونک سی گئی۔

''کیا ہوا؟...... امی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' ساتھ ہی اس نے استفہامیہ نظروں سے ہادی کو دیکھا۔

''کچھ نہیں ہوا تم بھاگ کر جاؤ اور مامی کے لیے ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔''

ہادی نے اپنائیت سے مامی کے کندھوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا اور گو کہ، صبا کی تسلی نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی، کچن کی جانب بڑھ گئی۔

''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں مامی! آپ کے پاس عباد نہیں ہے تو کیا ہوا میں جو ہوں آپ کا بیٹا۔ بس! آج سے آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ اس گھر کے سب ہی مسائل آج سے میری ذمہ داری ہیں۔''

مامی نے بے ساختہ اسے دیکھا پھر سر جھکا لیا غالباً ماضی کی کوئی یاد حافظے میں لہرائی تھی۔

''کیسے پریشان ہونا چھوڑوں ہادی! جب تک صبا اور ثنا اپنے اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں پریشانی ختم

ہی نہیں ہوسکتی...... یہ صبا نے بھی تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، اتنے اچھے اچھے رشتے تھے پچھلے دنوں
کا بھتیجا تو خیر ہم سب کو ہی پسند آیا تھا۔ اچھا بھلا کاروبار بھی تھا اس کا مگر یہ صبا مانے بھی تو... بس
رٹ ہے کہ شادی نہیں کرنی۔ مجھے تو لگتا ہے سعد کا ہی خیال لے بیٹھا ہے اسے......"

آخری بات مامی نے کچھ جھجکتے ہوئے کہی تھی ہادی نے غیر محسوس انداز میں اپنا بازو ان کے
سے ہٹا لیا۔

"لیکن اب کیا ہوسکتا ہے مامی! سعد تو شادی کر چکا ہے......" مامی خاموش رہیں تو وہ بولا۔

"بہر حال صبا بہت حقیقت پسند لڑکی ہے۔ آپ اب اس سے بات کر کے دیکھیں مجھے یقین
انکار نہیں کرے گی۔"

اس کے اس قدر پراعتماد لہجے میں کہنے پر مامی نے کچھ الجھی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ
ہنس دیا۔

"مجھ پر بھروسہ کیجیے مامی! اب کی بار وہ آپ کی بات ضرور مان لے گی لیکن اس بار میں اسے
گا۔"

تب ہی صبا پانی لے کر آ گئی تو انہوں نے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ انہیں غالباً ہادی کی
حقیقتاً تسلی ہوئی تھی۔

"امی! تہمینہ خالہ کا فون ہے۔" اندر کمرے سے ثنا کی آواز سنائی دی تو وہ آناً فاناً اندر بھاگیں۔

"ہادی! امی رو کیوں رہی تھیں؟" امی کے جانے کے بعد صبا نے اس سے پوچھا۔ ہادی
پرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔

"مامی! ثنا کے لیے بہت فکر مند رہتی ہیں۔"

صبا تاسف سے تخت پر بیٹھ گئی۔

"فکر مند نہ ہوں تو کیا کریں پھر تمہیں پتا ہے ہادی! جب ثنا یہاں آ گئی تھی تو وہ دن تو بہت
تھے۔ ابو بیمار، امی پریشان اور ثنا کی حالت تو بہت ہی خراب رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو بالکل ہی ہسٹریکل
تھی، ہم لوگ چاہ کر بھی ان دنوں کی تلخی نہیں بھلا سکتے۔ اب تو پھر بھی اس کی حالت بہت سنبھل
پہلے دیکھتے تو......"

"بس بھی کرو صبا! آخر ان باتوں کو یاد رکھنے کا فائدہ ہے بھی کیا؟ پھر ثنا اب بہت بہتر ہے۔
ہے ملازمت نے اسے سنبھلنے میں بہت مدد کی ہے۔" ہادی نے کہا۔

"اور پلیز تم اپنی شکل درست کرو۔ یہ بات سن کر تم نے جیسی شکل بنائی ہے اس کے ساتھ مامی
کیا خاک تسلی دو گی۔"

اس کے ہلکے پھلکے انداز پر صبا آہستگی سے مسکرا دی۔ البتہ منہ سے کچھ نہیں کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔
"میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے۔ پتا نہیں تم اس خبر کو سن کر خوش ہو گی یا نہیں مگر میں بہت خوش
ہوں۔" صبا نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولا۔

"پرسوں پھپھو آ رہی ہیں پاکستان۔ وہ دو دن یہاں رکیں گے۔ پھر ایبٹ آباد اپنے سسرال چلی
جائیں گی مگر، جانے سے پہلے وہ ماموں سے ایک خاص بات کرنے والی ہیں اور میرا خیال ہے وہ خاص
بات، سن کر تم خوش ہو گی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے صبا کی جانب دیکھا وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔
وہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی اس بارے میں اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اطمینان تھا تو
بس یہی کہ اچھے دن اب اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہیں۔

+

"میں نے ابھی اگلے مہینے ہی پاکستان آنا تھا۔ میرے چھوٹے دیور کی بیٹی کی شادی ہے۔ پندرہ تاریخ
کو۔ مگر ہادی نے تو فون پر جلدی جلدی کا شور ہی مچا دیا تھا...... صبا! میری چائے میں آدھا چمچہ شکر ڈال دینا
ڈاکٹر تو کہتے ہیں میٹھے کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دو مگر مٹھاس کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔"

پھپھو کے جلے بھنے انداز میں کہنے پر وہ مسکراتے ہوئے شکر حل کرنے لگی۔

پھپھو کی پرسوچ نظریں کچھ دیر کو ٹھہریں پھر انہوں نے ہادی کی جانب دیکھا۔ وہ مگن انداز میں اپنے
ماموں سے محو کلام تھا۔

"ثنا دکھائی نہیں دے رہی۔" اچانک ابو نے کہا تھا۔

"وہ نماز پڑھ رہی ہے ابو۔" صبا مختصر جواب دے کر سب کو چائے سرو کرنے کے بعد اپنا کپ لے کر
بیٹھ گئی۔

"آپ کی دونوں ہی بیٹیاں ماشاء اللہ بہت پیاری ہیں، بیٹیاں تو خیر ساری ہی پیاری ہوتی ہیں۔ ڈر تو
بس ان کی قسمتوں سے لگتا ہے۔" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ثنا کے بارے میں مجھے ہادی نے بتایا تھا، یقین کریں بہن! مجھے بے حد افسوس ہوا۔ آج کا دور تو
ایسا ہے کہ انسان خود پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ وہ جو ایک کہاوت ہوا کرتی تھی ہمارے ماں باپ کے زمانے میں
کہ اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا تو اب غلط ہی ہو چکی ہے۔ آج کل تو سب سے زیادہ نقصان بھی
اپنے ہی پہنچاتے ہیں۔ اب ایسے میں بندہ غیروں سے کیا شکوہ کرے، بہر حال بات کہاں سے کہاں جا رہی
ہے۔ بڑا ہی مناسب وقت ہے، بھائی صاحب بھی موجود ہیں تو میں...... صبا بیٹی! آپ ذرا ثنا کو تو بلا
لائیے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل آئی پھپھو نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' ثنا سامنے کے کمرے سے نکل کر اس کے قریب آ رہی تھی اور تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے، کچھ بھی نہیں۔'' اپنے دل کی بے ہنگم دھڑکن کو سنبھالتے ہوئے وہ ہنس دی اور اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

''اچھا...... چلو پھر اندر چلتے ہیں کچھ دیر تو ہادی کی پھپھو کے پاس بیٹھنا چاہیے، مجھے کچھ کرنے ہیں۔''

دل میں آئے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ثنا نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تو صبا نے ہی روک دیا۔

''ابھی نہیں ثنا...... تھوڑی دیر میں چلیں گے۔''

''کیوں؟'' ثنا نے الجھ کر اسے دیکھا تو وہ بے بسی سے ہنس دی اور بولی۔

''چلو اندر ہی چلتے ہیں تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔'' اس کا دل ایک انجانی لے پر دھڑک رہا کمال بات یہ تھی کہ اسے یہ سب اچھا بھی لگ رہا تھا۔

''لو یہ بچیاں بھی آ گئیں۔'' ثنا کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پھپھو کی آواز اور بس ایک نظر ہی سب کے گلرنگ چہروں کی جانب دیکھا تھا۔ پھر تکلف سے صوفے پر ٹک گئی تھی دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''ارے بیٹا! تم ادھر کیوں بیٹھ رہی ہو یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

اس نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے نگاہ اٹھائی اور اصل میں چونکنے کا موقع تو یہی تھا۔ پھپھو اس نہیں ثنا سے مخاطب تھیں۔

پھر اس نے ثنا کو تذبذب کی کیفیت میں ان کے قریب بیٹھتے دیکھا۔

پھپھو نے اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا کر اسے قریب کر لیا تھا۔ ان کے دوسرے ہاتھ میں ننھی سی مخملی ڈبیا تھی۔

صبا کو اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ بہت بے یقینی سے پھپھو اور ثنا کو دیکھ رہی تھی۔

''بھائی صاحب آپ کی اجازت ہے؟'' پھپھو نے اجازت طلب نظروں سے ابو کی جانب دیکھ اس مخملی ڈبیا میں سے ایک انگوٹھی نکال کر ثنا کی انگلی میں پہنا دی۔

''بس آج سے آپ کی یہ بیٹی، میرے ہادی کی نشانی ہے، آپ کے پاس۔'' انشاء اللہ دو اپنی بیٹی کو رخصت کروا لیں گے۔'' پھپھو نے ثنا کی پیشانی کو چومنے کے بعد کہا۔

صبا نے اب کی بار بے حد بے یقینی اور سراسیمگی سے ہادی کی جانب دیکھا اور، اور بس پھر اس کا دل سانس لینا بھول گیا۔

ہادی بھی اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کچھ جتاتی ہوئی، کچھ بتاتی ہوئی۔ ایک ایسی بات کا احساس دلاتی ہوئی مسکراہٹ جس کا شائبہ تک اس کے گمان کی سرحد کو چھو کر نہ گزرا تھا۔

''آج حساب برابر ہو گیا ہے۔ اب تمہارا کوئی قرض مجھ پر واجب الادا نہیں ہے۔''

اس کی مسکراہٹ میں بس یہی لکھا تھا اور اس تحریر کو صبا حرف بہ حرف پڑھ سکتی تھی۔

کچھ کہنے یا سننے کے لیے اب رہ ہی کیا گیا تھا۔ اس نے سر جھکایا اور شکستہ قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہادی ابراہیم نے اس کے قدموں کی شکستگی کو محسوس کیا اور چند لمحوں کے توقف سے صوفے کی بیک سے سر ٹکا دیا۔ ابھی اس کمرے میں اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ اس کے ایما پر ہو چکا تھا اور وہ اپنے اندر تک سکون ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود دل کے کسی کونے میں کہیں دور دکھ کی ایک ننھی سی چنگاری روشن ہو گئی تھی۔

''بس آج سے میرے سکون کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ تم نے جو دکھ مجھے دیا تھا صبا شفیق! وہ میں تمہیں سود سمیت لوٹا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ میں تمہارے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ بس ایک کام تھا میرے ہاتھ میں اور وہ یہ کہ میں تمہارے سارے احساسات کو زندگی بھر کے لیے اپنی مٹھی میں قید کر لیتا اور تمہاری بہن کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ کم سے کم اس معاملے میں تو تمہیں میرا احسان مند ہونا ہی پڑے گا۔

جو سزا میں نے تمہارے لیے تجویز کی ہے گو کہ، وہ بھی کچھ کم نہیں ہے تم کبھی مجھ سے جواب طلبی نہیں کر سکو گی۔ تم اپنی بہن سے اپنا حال دل نہیں کہہ سکو گی حتیٰ کہ اپنی ماں کو بھی اپنا غم نہیں بتا سکو گی، الٹا سب گھر والوں سمیت تمہیں ساری زندگی میرا احسان مند رہنا پڑے گا کہ میں نے تمہاری طلاق یافتہ بہن کو سہارا دے دیا۔

تمہیں یاد ہو گا صبا! تم نے مجھ پر ایک احسان کیا تھا۔ میں اس احسان کا بدلہ تمہاری بہن کو اپنا کر اتار رہا ہوں مگر میں کبھی ثنا کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہونے دوں گا کہ وہ میری تسکین کے لیے مہرہ بنی ہے۔

تم واقعی میری محسنہ ہو صبا! تمہارے اس ایک مذاق نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ میری ساری جدوجہد کے پیچھے صرف اور صرف تمہارا وہی مذاق کارفرما تھا۔ میں نے تم سے پوچھا تھا نا کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا ہے؟ میں بتاؤں تمہیں کہ تمہارے اس مذاق نے مجھ سے کیا چھینا؟

تمہارے اس مذاق نے ہادی ابراہیم کو مار ڈالا صبا! اس مذاق نے میرا ظرف مجھ سے چھین لیا صبا!

میری وسعت قلبی سے مجھے محروم کر دیا۔اس مذاق نے مجھے پتھر بنا ڈالا ہے صبا اور......

اور یہ کم ظرف انسان تمہیں معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔اب تمہیں اجازت ہے صبا! مجھے بے حس کہو یا جو مرضی کہو۔مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ حساب برابر ہو چکا ہے۔"

دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے زور سے آنکھیں میچ کر نمی کو بھگایا تھا، خود کو اس محفل میں گم کر دینے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

اس نے کہیں پڑھا تھا "محبت کی فکر نہیں کرنی چاہیے وہ تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتی ہے لیکن اگر انا ہو جائے تو پھر اسے سر اٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔"

اور اس نے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچا کر زندگی بھر کے ملال سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔

محبت کی خیر تھی کبھی نہ کبھی مل ہی جانی تھی اور نہ بھی ملتی تو کیا فرق پڑتا ہے۔مردہ دلوں کو جس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

آرزو، انتہا، موت

لگژری بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے والے شخص نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بیڈ پر اچھال دیا تھا۔اس کے لبوں پر مسلسل ایک مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جبکہ نگاہوں اور وجود سے خاص طرح کی "تراوٹ" جھلک رہی تھی۔

"اصغر! یار ایک اچھی سی کافی تو لانا۔"

دروازہ بند کرنے سے قبل اس نے دروازے سے منہ نکال کر ملازم کو پکارا تھا اور اس کے بعد وہ کمرے کے دائیں دیوار کے ساتھ رکھے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے آن رکا تھا۔

ایش گرے کلر کے تھری پیس سوٹ نے اس کے کسرتی جسم اور سرو قد کو کچھ اور نمایاں کر رکھا تھا مجموعی طور پر وہ بے تحاشا ہینڈسم تھا۔اس بات کی گواہی اس کا دل دے رہا تھا اور آئینہ بھی۔پھر ابھی کچھ دیر قبل اس بات کا برملا اعتراف احسان منیر کی طرف سے ارینج کی جانے والی گیدرنگ میں ملنے والی فرنچ حسینہ نے بھی کیا تھا۔

"یو آر دا موسٹ ہینڈسم مین ان دس پارٹی۔" ایشلے بروکر کے کہے گئے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔نتیجتاً کچھ مزید خوشگواریت اس کے اندر اتر گئی اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے اس نے اس شام کی گیدرنگ کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے ذہن میں زندہ ہوتے دیکھا۔

کافی عرصے بعد ایشلے جیسی حسین و نازک اندام دوشیزہ کی قربت میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے وہ اپنی پسندیدہ مخصوص دھن گنگنا رہا تھا۔اصغر کو کافی لاتا دیکھ کر وہ واپس بیڈ پر آ بیٹھا تھا۔

"شاباش بہت جلدی لے آئے۔" مگ لیتے ہوئے اس نے خوشگواریت سے کہا پھر پوچھا۔

"میرا کوئی فون تو نہیں آیا۔"

"جی گاؤں سے فون آیا تھا۔" اصغر نے مودبانہ انداز میں بتایا تو وہ سپ لیتے ہوئے چونک کر اسے

دیکھنے لگا۔

"باباصاحب کا فون آیا تھا؟"

"نہیں جی! فرزانہ بی بی کا فون تھا۔"

"اچھا۔" اس نے ایک اور بڑا سپ لیا۔

"کوئی میسج چھوڑا ہے بی بی نے میرے لیے۔"

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ گھر آتے ہی ان سے بات کرلیں۔" اس نے سر ہلایا پھرا
اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ...... اچھا سنو! بی بی کو میرے بارے میں کیا بتایا تھا کہ میں کہاں گیا،
متوقع خدشے کے پیش نظر اس نے پوچھا۔

"یہی کہ آپ سائیٹ پر گئے ہوئے ہیں۔" اصغر کا جواب تسلی بخش تھا۔

اس نے مگ میں موجود باقی ماندہ کافی حلق میں انڈیلی، پہلے کوٹ اتار کر بیڈ پر رکھا پھر کا
اٹھا کر نمبر پریس کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد کال ریسیو کرلی گئی تھی اور توقع کے عین مطابق دوسری طر
ہی تھی۔ جس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"کہاں تھے آپ، میں نے گھر پر بھی فون کیا اور آفس میں بھی مگر آپ......"

"اصغر نے بتایا تو ہے تمہیں سائیٹ پر گیا ہوا تھا میں اور موبائل اتفاق سے گھر بھول گیا تو
سائیٹ پر بھی موبائل میں زیادہ تر آف ہی رکھتا ہوں۔ اب بندہ ایک وقت میں ایک کام ہی
کام کی طرف دھیان دے یا بیوی کی طرف اور تم کب کال کرلو یہ بھی پتا نہیں ہوتا پھر تمہاری آ
میں کس کمبخت کا دل لگتا ہے۔"

اس نے وہی زبان استعمال کرنی شروع کی تھی جو فرزانہ کو پسند تھی۔

"اس وقت آپ کیا کر رہے تھے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"پندرہ منٹ پہلے سائیٹ سے واپس آیا ہوں اور تم ہی کو یاد کر رہا تھا اور ریئلی فری اما
مس کر رہا ہوں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ بلیوی اب تو آفس میں دل نہیں لگتا
اس قسم کے جھوٹ بولنے کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ سو ڈائیلاگ ڈلیوری پہلے کی نسبت کا
جذبات سے لبریز تھی۔

"آپ بھی مجھے بہت یاد آرہے ہیں سکندر! کچھ دنوں کے لیے گاؤں آجایئے نا۔"

"دل تو میرا بھی بہت چاہ رہا ہے مگر ابھی آ نہیں سکتا۔ کچھ آفیشل پرابلم ہیں۔ پھر آ
فیکٹری کھولنے کے متعلق پروگرام بنا رہا ہوں۔"

"بھاڑ میں جائے آپ کا پروگرام بس مجھے نہیں پتا کچھ دنوں کے لیے آجائیں۔" اس نے ہٹ دھرمی
سے کہا۔ سکندر کو حیرت نہیں ہوئی حالانکہ فرزانہ نے ایسا انداز پہلی بار اپنایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ
کہتا، ٹیرس پر باباصاحب کی آواز گونجی تھی۔
سکندر نے ٹھٹک کر ریسیور کو دیکھا۔ "تو کیا فرزانہ اتنی رومینٹک نوعیت کی گفتگو باباصاحب کے سامنے
کررہی تھی؟"

"السلام علیکم باباصاحب! آپ کیسے ہیں۔"

"شکر الحمدللہ...... سنو سکندر! جتنی جلدی ہوسکے گاؤں پہنچو ہمیں تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

"مگر باباصاحب۔" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر باباصاحب نے موقع نہیں دیا۔

"کل شام تک گاؤں پہنچ جاؤ۔"

"کیوں اب تو آرہے ہیں۔" فرزانہ کی آواز ایک بار پھر چہکی۔ اس نے مختصراً بات کر کے فون بند کر
دیا مگر وہ الجھ گیا تھا۔ باباصاحب کا تحکم آمیز رویہ اور فرزانہ کے چند معنی خیز جملے اسے حیران کر رہے تھے۔
گردن کے پیچھے ہاتھ رکھتے پرسوچ انداز میں اس کی نگاہ اپنی گرے شرٹ کی آستین تک گئی تھی۔
آج شام ایشلے بروکر کے ہونٹوں پر لگی ریڈ لپ اسٹک اب اس کی آستین پر منتقل ہو چکی تھی۔ وہ مسکرا
کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔
ذہن میں صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ اور کچھ دیر میں وہ نازک اندام ایشلے بروکر اس کے گھر میں
ہوگی۔

آج کی رات...... ایک اور حسین رات ہوگی۔

+

تحیر عین فطرت انسانی ہے لیکن تب کیا کیا جائے جب تحیر بھی آپ کو متحیر کر دینے پر بضد ہو۔
سکندر مبین حیات کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ تحیر کی شدت سے بے بس کھڑا ایک ٹک
اسے دیکھ رہا تھا جس کی موجودگی کو مان لینے پر نہ دل راضی تھا اور نہ دماغ۔
یک لخت اس کے دل نے شدت سے آرزو کی تھی کہ یہ محض خواب ہو۔ مگر وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔
دل میں برچھیاں اتارتی اور اعصاب پر کوڑے برساتی حقیقت...... جسے نہ وہ مان سکتا تھا اور نہ جھٹلا سکتا
تھا۔

خواب تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ خواب میں تو اسے سکندر نے تب بھی نہیں دیکھا تھا جب اس کے
قدم سے قدم ملا کر چلنے میں ایک لطف آتا تھا۔

قبول اور رد کی ملی جلی کیفیت میں اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا اور دل نے دماغ کی پوری [illegible] کے ساتھ ''قبول'' پر مہر لگا دی۔

وہ ''وہی'' تھی جسے آج سے چار ماہ قبل اس نے آخری بار دیکھا تھا۔

بڑے سے پلنگ کے بیچوں بیچ میرون رنگ کے نہایت شاندار سے عروسی جوڑے میں ملبوس اس کا [illegible] اور طمطراق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ حسین تو خیر وہ تھی ہی مگر اس وقت نفاست سے کیے گئے میک اپ نے اسے حسین تر بنا دیا تھا۔

اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہاں آ کر اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ ہرگز نہ [illegible] اسے یاد آیا کہ جب وہ بابا صاحب کی معیت میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس نے گھونگھٹ نکالا تھا مگر پھر نہ جانے گھونگھٹ کیسے کھل گیا اور برق نے پنجے جھاڑ کر اس پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید اور غیر متوقع تھا کہ وہ جہاں کا تہاں ساکت رہ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ بابا صاحب اس کے قریب کھڑے بہت غور سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔

نجانے انہیں شادی جیسے معاملات میں اتنی عجلت دکھانے کا شوق کیوں تھا؟ پہلے اس کی اور فرزانہ کی شادی بھی کچھ اس تیز رفتاری سے کروائی تھی کہ وہ کچھ سوچ سمجھ بھی نہ سکا تھا اور اب یہ ایک اور شا[illegible]......اول تو اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو بھلا کیا کر پاتا وہ پہلے فرزانہ کی دفعہ [illegible] کے سامنے احتجاج نہیں کر پایا تھا تو اب تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ بابا صاحب کی حیثیت کسی بھی طرح [illegible] سے کم نہ تھی۔ سکندر کے ایک حرف احتجاج کے نتیجے میں وہ عاق بھی کر سکتے تھے۔

سکندر مبین حیات ابھی تک اپنی نگاہیں اس پر سے ہٹا نہیں سکا تھا۔ وہ بابا صاحب سے کچھ کہنا چاہتا مگر قوت گویائی مکمل طور پر سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ بابا صاحب کا مرتبہ اور حیثیت نہیں بلکہ [illegible] دھچکہ تھا جو اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔

بنیادی طور پر وہ اشرف المخلوقات کی اس کیٹگری سے تعلق رکھتا تھا جہاں کے باشندے کسی بھی معا[illegible] کو چٹکیوں کی زد پر اڑا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت وہ خود کو اپنی تمام تر خوبیوں اور صلا[illegible] سے تہی پا رہا تھا۔ بھلا کہاں کی چٹکیاں اور کہاں کی کیٹگری اس کے ذہن میں تو بس دھماکہ ہوا تھا اور [illegible] اعصاب زلزلے کی زد میں آ گئے تھے۔

اگر نکاح سے قبل ہی کچھ ضروری نوعیت کی معلومات حاصل کر لی ہوتیں تو یقیناً اس صورت [illegible] سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ بابا صاحب کی اکلوتی اولاد ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کر سکتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے عاق کیے جانے کا خیال بھی نہ کرتا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ [illegible] صورت میں اصل حقیقت اسے بابا صاحب کے گوش گزار کرنی پڑتی اور وہ حقیقت اسے پہلی بار شرم [illegible]

ذلت آمیز لگی تھی۔ کچھ دیر قبل جب نکاح کی رسم ادا کی جا رہی تھی تو وہ بجائے قاضی کی آواز سننے کے محض بابا صاحب کے چہرے کی طرف دھیان لگائے بیٹھا تھا۔

ان کے سنجیدہ و بردبار چہرے پر فقط اطمینان اور خوشی تھی۔

پھر اس نے فرزانہ کو ٹٹولنا چاہا کہ اعتراض کا پہلا حق وہی رکھتی تھی مگر وہ بھی بے حد پرسکون بلکہ کسی حد تک خوش دکھائی دی تھی اور اب وہ تھی جو خواب گاہ میں نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور، اور اس کے ہونٹوں کے کونوں میں بڑی واضح مسکان تھی۔

سکندر کو یاد آیا کبھی یہی مسکان دیکھ کر وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ مگر یہ کیا ہوا؟ اس نے تو کبھی ایسا نہ سوچا تھا اس کے لیے مزید وہاں رکنا محال ہو گیا۔ اس نے خود کو باہر کی سمت قدم بڑھاتے دیکھا تھا۔ ایک بوجھ تھا جو اس کے اعصاب کو چٹخنے پر مجبور کر رہا تھا ایک خلش تھی جو پے در پے کچوکے لگا رہی تھی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ حویلی میں کتنے بہت سے لوگ موجود ہیں اور بابا صاحب آپ کو مردانے میں بلا رہے ہیں۔''

یہ فرزانہ تھی۔ اس کی بیوی جس نے تیزی سے جاتا دیکھ کر روکنا چاہا تھا۔

''بابا صاحب سے کہہ دو میں شہر جا رہا ہوں بہت ضروری کام ہے۔'' اسے اپنی آواز اندھے کنویں کے سناٹے سے مشابہ لگی تھی۔

''لیکن باہر تو مینہ برس رہا ہے طوفان آیا ہوا ہے۔ کیسے جائیں گے آپ، پھر ابھی تو......''

وہ رکا نہیں تھا۔ رک سکتا بھی نہیں تھا۔ فرزانہ کے ادھورے جملے سے وہ واقف تھا مگر وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ باہر کا طوفان اندر کے طوفان سے زیادہ زور آور نہیں ہے ہر طرف برسنے والی بارش اس الاؤ کو نہیں بجھا سکتی جو اس کے اندر سلگ رہا تھا اور اس الاؤ کا نام تھا روشانے قمر، ہاں وہی روشانے جو بڑے طمطراق سے اس بڑی حویلی کی خوب صورت خواب گاہ میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔

موسلا دھار بارش اور کڑاکے دار بجلی کو خاطر میں لائے بغیر اس کی لینڈ کروزر شہر کی طویل اور سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی اور کانوں میں ایک آواز کے نقارے گونج رہے تھے۔

''ہم سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے سکندر مبین حیات! تم کو لوٹ کر یہیں آنا ہے اور تم لوٹ کر یہیں آؤ گے۔'' بے ساختہ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ دیے تھے۔ بہت زور سے بجلی کڑک کر خاموش ہو گئی تھی جب کہ بادل ہنوز گرج رہے تھے اور برس رہے تھے۔ اسٹیرنگ وہیل چھوڑ دینے کی بنا پر کروزر بدمست ناگن کی طرح لہکنے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ یہ ناگن کسی درخت سے سر پھوڑتی اس کا پاؤں بریک پہ تھا ہاتھ اسٹیرنگ کو قابو کر چکے تھے۔

''دیکھا ہم نہیں تو ہمارا احساس ہی تمہارے ساتھ ہے، کہو سکندر کیسے بچ پاؤ گے اس احساس سے۔''

آواز اس کی سماعت سے ٹکرا کر گویا بند شیشوں کے بیچ بھٹکنے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں بھینچ کر اپنے اعصاب پرسکون کرنا چاہا تبھی کرتے کی داہنی جیب میں رکھے موبائل نے بجنا شروع کر دیا۔

کئی سیکنڈ بعد اس نے اپنے ماتھے پر چمکتے پسینے کو صاف کرتے ہوئے موبائل جیب سے نکالا تھا۔ اسکرین پر آنے والے نمبر اور نام سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پچھلی رات گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ بنا کال ریسیو کیے اس نے موبائل آف کر دیا تھا اور ڈیش بورڈ پر اچھال دیا تھا۔ وہ اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی بجائے اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

ماضی کے گڑھے میں کودنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ کیچڑ آپ کے دامن پر کا اندیشہ ہوتا ہے، جس سے آپ بڑی احتیاط سے بچ نکلے ہیں۔

پھر سکندر مبین حیات، حال کا مکین تھا جو اس اصول پر کاربند تھا کہ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ پیچھے دیکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر کبھی کبھی اصول بدلنے پڑتے ہیں اور وہ کام بھی انجام دینے ہوتے ہیں جو کرنا پڑ ہوتے ہیں۔

سکندر مبین حیات بڑی بے بسی سے ماضی کی جانب گھسٹ رہا تھا کوئی انجانی طاقت اسے کھینچ رہی تھی۔

آسمان پر گرجتے بادلوں نے بجلی کو کچھ اور پرطیش کر دیا تھا۔ بارش ایک تسلسل سے برس رہی تھی۔

+

پرائیویٹ ہاسٹل کے مخصوص کمرے میں داخل ہوتے ہی جس قسم کے والہانہ استقبال کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اس کی توقعات کے عین مطابق تھا۔

سکندر مبین حیات جیسے امیرزادے چمچوں کی ایک فوج ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ اب بھی وہ گاؤں میں تقریباً بارہ روز گزار کر آیا تھا اور سبھی چمچوں یعنی دوستوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے اپنے والہانہ دوستانہ انداز اور چاپلوسی بھری خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"چار دن کا کہہ کر بارہ دن بعد واپس آنا کہاں کی شرافت ہے یار! میرا دل تو بالکل نہیں لگا تمہارے بغیر۔"

"کیوں میں کیا تیری بیوی ہوں۔" مکرم کے محبوبانہ سے شکوے پر اس نے کہا تھا۔ جہاں سب ہی تھے مکرم نے بڑی عقیدت سے کہا تھا۔

"تو تو اپنا جگر ہے۔"

"شاباش اے بھئی۔" (شاباش ہے بھئی) سہیل نے اپنے مخصوص انداز میں داد دی۔ سکندر کے ہاتھ

ب یہ فضول باتیں سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ کسی گرما گرم موضوع سے دل بہلانا چاہ رہا تھا۔ بارہ دن بابا
اب اور مہینوں نے اسے خاصا بور کر دیا تھا۔

"یار اپنی یہ چخ چخ بند کرو اور یہ بتاؤ کہ کس کس حسینہ نے تمہارے یار کی یاد میں درد بھرے نغمے گائے ن کون شاعرہ ہوئی، کس نے بھوک ہڑتال کی......"

"کسی نے کچھ نہیں کیا۔ سب کی سب ہٹی کٹی ہیں۔" عبید جل کر بولا تھا۔ "مجھے تو لڑکیوں کی سمجھ ہی ہیں آتی۔ شکل سے کتنی بھولی بھالی لگتی ہیں اور فطرتیں...... توبہ توبہ...... استغفار...... جہاں کوئی پہلے سے زلو کا نظر آیا وہیں اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں۔"

"تمہیں تو شاید تازہ ڈوز ملی ہے۔" جوتوں سمیت بیڈ پر گرتے ہوئے سکندر نے تائید طلب نظروں سے عبید سمیت سب کو دیکھا تھا اور سب کی ہنسی اس پر بہت کچھ عیاں کر گئی تھی۔

"اب کیا ہوا؟" قریب پڑا انگلش میگزین اٹھاتے ہوئے اس نے پھر سے عبید کو دیکھا تھا۔

"عبید کو چھوڑو اس کی تو ہوتی رہتی ہے۔" شہاب کے معنی خیز انداز پر وہ بھی ہنسا تھا۔

"رودابہ کیسی ہے؟" اس نے شہاب ہی سے پوچھا تھا۔

"رودابہ کو دفعان کرو میرے پاس تمہارے لیے ایک اور اچھی خبر ہے۔" اس نے سنسنی پھیلانی چاہی لر سکندر کی توجہ میگزین کی طرف زیادہ تھی جس میں صنف نازک کی مختصر ترین لباس سے مزین تصاویر اس کے ذہن و دل کو خاصی تراوٹ بخش رہی تھیں۔ پھر وہ ماس کمیونیکیشن کی روداب علوی کے بارے میں سننا چاہ رہا تھا جس سے ملاقات ہونے کے محض دو روز بعد وہ گاؤں چلا گیا تھا اور یہی اصل میں افسردہ کرنے کی بات تھی۔

"پروفیسر ہاشمی انتقال فرما گئے کیا؟" اس نے لاپروائی سے کہا۔ وہ اسے سخت ناپسند تھے۔

"اس سے بھی اچھی اور دلچسپ خبر ہے سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔"

"اب بتا بھی دو۔" وہ چڑ سا گیا۔

"خفا کیوں ہوتے ہو؟ بتا تو رہا ہوں۔ اس اچھی خبر کا نام ہے روشانے۔"

"روشانے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "یار! کچھ عجیب نام نہیں ہے روشانے جیسے دوشانے یا پھر سوا چار آنے۔" شہاب کے جوش کو خاطر میں لائے بغیر اس نے کہا تھا۔

"آنے چار ہوں یا چھ۔" مکرم بازوؤں کا تکیہ بنا کر چت لیٹ گیا تھا۔ "ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ محترمہ نے آتے ہی آدھی یونیورسٹی کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور تمہارے دوستوں کا شمار اسی آدھی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔" مکرم کے انداز کا سحور کن عنصر بھی اسے متاثر نہ کر سکا تھا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ اس کے دوست ہر نئی لڑکی کی تعریف کم و بیش اسی انداز میں کرتے ہیں۔

"یہ محترمہ کہاں سے ٹپک پڑیں؟"

"ٹپکی نہیں ہیں بلکہ مائیگریٹ ہو کر آئی ہیں پنجاب یونیورسٹی سے۔" سہیل نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

شاباش اے بھئی کیا خوب صورت لڑکی ہے۔"

ان کی آنکھیں یہ ہم سے کہتی ہیں
ہم پہ تصنیف اک کتاب کرو

احمر کی آواز پر وہ قدرے چونک گیا تھا مگر اظہار نہیں کیا تھا۔ احمر ان سب میں نسبتاً پڑھاکو اور تحریر کے معاملے میں مستند رائے کا مالک تھا۔ اس کا تعریف وتنقید کا اپنا مخصوص شاعرانہ انداز تھا۔

"ہوسکتا ہے روشانے قمر کی خوب صورتی شہزادہ سیف کی بدر جمال سے زیادہ ہو لیکن......" عبید کہا۔

"لیکن مجھے تو اس کی آواز نے زیادہ متاثر کیا ہے...... واہ کیا آواز ہے۔ قسم سے دل چاہتا ہے وہ بولتی رہے اور ہم سنتے رہیں، سنتے رہیں، سنتے ہی رہیں۔"

"اور اس کے سیل ختم نہ ہوں۔ یار بیٹری سے چلتی ہے کیا؟"

کروٹ بدلتے ہوئے خاصے مصنوعی تجسس اور سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔ عبید نے اگلے چند اسے خفگی سے گھورنے میں صرف کیے تھے جو کروٹ کے بل سر کے نیچے ہتھیلی ٹکائے سنجیدہ چہرے اور شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو جب اس سے گفتگو کرو گے نا تب بتانا۔" بڑے صبر کے بعد اس نے جل بھن کر کہا تھا۔

"ویسے دعا ہی کرو کہ محترمہ تمہیں شرف گفتگو بخش دیں۔ اللہ کے کرم سے خاصی نک چڑھی لگتی ہیں۔"

"ہیں...... ہیں۔" اب کی بار وہ حقیقی دلچسپی سے اٹھ بیٹھا تھا۔

"جی ہاں! محترمہ کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کو بھی پڑھ جاتی ہیں۔"

"زبردست اب تو ملنا ہی پڑے گا۔ خاصی دلچسپ خصوصیات کی مالک لگتی ہیں تمہاری...... محترمہ نام بتایا؟" اس کے انداز سے ابھی بھی مسخرہ پن جھلک رہا تھا۔

"روشانے۔" شہاب بولا تھا۔

"عبید کو تو تم رہنے ہی دو۔ اس کا تو یوں بھی بے عزتی سمسٹر چل رہا ہے۔ یاد نہیں جناب عزت مآب عبید الطاف صاحب نے پچھلے مہینے ہی فائنل کی باجی سے تھپڑ کھایا ہے۔"

شہاب کے یاد دلانے پر سب کا مشترکہ بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا تھا اور اس میں عبید کی اپنی جھینپی ہوئی ہنسی بھی شامل تھی۔

دراصل عبید کو فائنل ایئر کی لڑکی سے زبردست قسم کا عشق ہوا تھا اور اظہار کے نتیجے میں پہلے پہل لڑکی نے خود اس کی عزت افزائی کی تھی اور پھر اس کو خاصی پرتشدد کارروائی سے گزرنا پڑا تھا جسے انجام دینے والے اس لڑکی کے بھائی تھے۔

اگلے آدھے گھنٹے تک اس کمرے میں عبید الطاف کی خوب ہی "ریڑھ" لگائی گئی تھی۔

+

ایک بار پھر اکتا کر اس نے ریسٹ واچ دیکھی تھی اور پھر جیسے زچ ہو گیا تھا۔

"آخر کب آئے گی وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھوں والی۔" اس کے لہجہ و انداز میں اکتاہٹ کا عنصر غالب تھا۔

صبح ڈیپارٹمنٹ آنے کے بعد سے وہ اپنے دوستوں کے بے حد اصرار پر پہلی دو کلاسز اٹینڈ کر چکا تھا۔ کیونکہ وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی تمام کلاسز باقاعدگی سے اٹینڈ کرتی تھی۔ جسے دیکھنے کا فطری سا تجسس تو خود اس کے اندر بھی جاگا تھا۔ تبھی تو اس نے یہ دو کلاسز اٹینڈ کی تھیں حالانکہ وہ کبھی بھی ایسی "باقاعدگی" نہیں دکھاتا تھا۔

اتنی کڑی مشقت کے بعد اس نے بڑے آرام سے سب کو کینٹین جانے کا عندیہ دیا تھا۔

"کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔" سہیل نے کہنا چاہا۔

"ٹھیک ہے تم بیٹھ کر انتظار کرو میں جا رہا ہوں۔" وہ خاصی بے مروتی سے کہہ کر باہر آ گیا اور سکندر حیات کے نقش قدم کی پیروی اس کے دوستوں پر تقریباً فرض تھی۔

اور اب وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کینٹین میں اس کے منتظر تھے۔ سکندر کو اپنی کج فہمی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس لڑکی نے کون سا کہیں غائب ہو جانا تھا۔ جب اسی ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتی تھی، پھر اس پر مستزاد یہ کہ کلاس فیلو بھی تھی۔ تو آج یا کل نظر آ ہی جاتی بھلا اس کے لیے پورا دن ضائع کر کے اپنی بہت امپورٹنٹ قسم کی ڈیٹس کینسل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

"ان پندرہ بیس دنوں میں تو ایسا پہلی بار ہی ہوا ہے کہ وہ یونیورسٹی نہیں آئی یا بے چاری کسی مشکل میں پھنس گئی ہو۔"

شہاب کی فکرمندی اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ لوگ کینٹین میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ داخلی دروازے سے قریب ہونے کی بنا پر آنے جانے والوں پر نگاہ بھی رہتی تھی اور بیک وقت

بیرونی معاملات بھی حد نگاہ میں رہتے تھے۔

"اگر کسی مشکل میں پھنس بھی گئی تو کیا فرق پڑتا ہے آخر تم جیسے بھائی کس دن کام آئیں گے" سہیل نے جملہ مکمل کر کے داد طلب نظروں سے سب کو دیکھا تھا جبکہ شہاب کی تو گویا غیرت پر لگی تھی۔

"بہن ہو گی تیری۔" وہ باقاعدہ لڑنے کو تیار تھا۔ باقی سب نے اپنی اپنی مسکراہٹ اپنے جذبات کے اظہار پر مشکل سے چھپاتے ہوئے اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ چند جملوں نے اس کے مزاج کا قدرے کم کر دیا تھا پھر سہیل نے بھی اپنی "نہایت نامعقول" بات کو واپس لے لیا تھا۔

"ویسے یار! اتنی اچھی لڑکی کو بہن بنانے میں آخر برائی ہی کیا ہے؟" عبید کی رگِ ظرافت پھڑکی تھی۔ شہاب نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ اچھائی تم کیوں نہیں انجام دے لیتے؟"

"توبہ استغفار خدا یہ اچھائی دشمنوں کو ہی نصیب کرے بھئی میں تو اسے گناہ سمجھتا ہوں۔"

"آخر ایسی کیا خاص بات ہے اس روشانے قمر میں جو تم لوگ لڑے مرے جا رہے ہو۔"

سکندر کی جھنجھلاہٹ اس وقت تک اوج کو چھونے لگی تھی۔ احمر، عبید، شہاب اور سہیل نے اسے تھا۔

"ایک بار اسے دیکھ لو سکندر! تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔" احمر نے اس ساری گفتگو پہلی بار حصہ لیا تھا۔

"اچھا یارو! دیکھ لیں گے تمہاری اس توپ کو بھی۔ فی الحال تو مجھے وہ سامنے سے آنے والی بندی رہی ہے۔" اس کی نگاہیں داخلی دروازے سے باہر تھیں۔ ان سب نے اس کی نگاہوں کی تقلید میں وسطی راستے سے گزر کر زرقا اسی جانب آ رہی تھی۔

"اچھا بھئی میں تو چلا اب شام کو ملاقات ہو گی۔" دونوں ہتھیلیوں سے میز پر دباؤ ڈال کر اٹھتے اس نے کہا۔

"خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تمام تر لوازمات سے لیس ہو کر آئی ہیں زرقا بی بی لگے ہوئے ہیں۔ جا میرے بچے تجھے خدا کی حفاظت میں سونپا۔" عبید کا انداز خاصا مادرانہ اور معنی مندی کا غماز تھا۔ اس کے یوں ہاتھ اٹھا کر دعا دینے پر سب مسکرائے ضرور تھے۔

"یار واقعی حسن کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ ریڈ سوٹ میں تو کمبخت بالکل پٹاخہ لگ رہی ہے" نے رائے دینا ضروری سمجھا۔ اب ان کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"یار مجھے تو اس لڑکی کی ایک ہی بات پسند ہے۔ ایسے ہی خوامخواہ دوپٹے کی پروا میں مرے نہیں

بھی دیکھو کتنے آرام سے ایک طرف ڈال رکھا ہے اور یار...... اس کی کالر بون کتنی خوب صورت لگ رہی ہے۔" یہ شہاب کا کہنا تھا۔

"شاباش اے بھئی، کیا تیز نظر ہے۔"

"شرم کرو بہن ہے وہ تمہاری۔" سکندر نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی زحمت نہ کی تھی البتہ اسے چھیڑا ضرور تھا اور یہ بات شہاب کو ناگوار بھی نہ گزری تھی۔

"تم اسے میری بہن کی بجائے بھابی بھی بنا سکتے ہو۔" شرارتی سے انداز میں اس نے حساب چکتا کیا۔

"ہائی فٹ۔" اس نے نہایت نخوت سے کہا تھا۔

"یہ اس قسم کی لڑکیاں نہ کسی کی بہن ہوتی ہیں اور نہ بھابیاں بلکہ یہ تو ہر ایک کی بہنیں ہوتی ہیں اور ہر ایک کی بھابیاں۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ جہاں زرقا نے اس کا اور اس نے زرقا کا بے حد خوش دلی سے استقبال کیا تھا۔

+

"روشانے قمر" اس کی توقعات سے بڑھ کر حسین تھی۔ بلکہ اس کے لیے حسین کا لفظ استعمال کرنا سراسر زیادتی تھی۔ وہ حسین کی اصطلاح سے بڑھ کر تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اس نے اب تک حسن دیکھا نہیں تھا۔ وہ حسین گرل فرینڈز ہیئر اسٹائل کی طرح تبدیل کرنے کا عادی تھا۔ مگر روشانے قمر کو مارکیٹ میں دیکھ کر وہ واقعی کچھ دیر کے لیے بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا اس کے دوستوں کا روشانے کے لیے رطب اللسان ہونا کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔

مارکیٹ میں احمر نے ہی اس کی توجہ روشانے کی جانب دلوائی تھی۔

"فنٹاسٹک۔" روشانے قمر کے لیے اسے یہی لفظ مل سکا تھا اور احمر نے اسے یوں دیکھا تھا گویا کہہ رہا ہو "دیکھا ہم نہ کہتے تھے۔"

وہ رات اس نے بڑی مشکل سے گزاری تھی۔ روشانے قمر کو اس نے کافی فاصلے سے دیکھا تھا اور اب قریب سے دیکھنے کی خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی۔ زرقا، فہمینہ، عندلیب یا اسی قسم کے ناموں والی گرل فرینڈز قصہ پارینہ بن گئی تھیں۔ وہ جلد از جلد روشانے قمر سے متعارف ہونا چاہتا تھا۔

اپنی ڈریسنگ اور پرسنیلٹی کے معاملے میں وہ ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔

اس کی ڈریسنگ ہمیشہ لاجواب ہوتی تھی۔ اگلے روز ڈیپارٹمنٹ جاتے ہوئے اس نے تیاری میں

قدرے زیادہ وقت صرف کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دوست ہمیشہ اس کی تعریف کرتے ہیں مگر
نے آئینے کی رائے کو مستند جانا۔

اس کی کامیابی میں وجاہت کے ساتھ ہی جاگیردارانہ بیک گراؤنڈ بھی ہمیشہ معاون ثابت ہوا
پرفیوم کا ڈھیر سارا چھڑکاؤ کرنے کے بعد اس نے آج ڈیپارٹمنٹ جانے کے لیے لینڈ کروزر کی بجائے
ماڈل کی سیاہ کار کا انتخاب کیا تھا۔ سیاہ رنگ ایک دم سے کسی کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول کرلینے کی
صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر نئی کار کے تو لشکارے بھی قابل دید تھے۔

اب وہ مکمل طور پر تیار تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی لڑکی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اتنا اہتمام
کیا تھا۔

پہلی کلاس پروفیسر عبداللہ انصاری کی تھی۔ کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اسے پہلی ہی رو میں
عرشیہ اور مریم کے ساتھ بیٹھی نظر آ گئی تھی۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ کسی بھی مصنوعی پرت سے بے نیاز
بے حد خوب صورت سے کٹاؤ دار ہونٹ، مکرم نے اسے اگر ٹہوکا نہ دیا ہوتا تو یقیناً وہ وہیں کھڑا اسکی مسکراہٹ
دیکھتا رہتا۔

ان لوگوں نے چن کر ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے روشانے کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا
پروفیسر انصاری کے کلاس میں آ جانے تک وہ سب لوگ سرگوشیوں میں اس کے متعلق بات کرتے رہے
تھے۔ سوائے سکندر کے۔ اپنی انگلیوں کے درمیان بال پوائنٹ گھماتے ہوئے وہ بس اسے دیکھ رہا تھا۔

کب پروفیسر انصاری نے لیکچر کا آغاز کیا تھا، کب کس نے سب سے پہلے گفتگو میں شمولیت اختیار
کی، بات کہاں سے چلی اور کہاں تک پہنچی۔ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر بس اسے دیکھے جارہا تھا کوشش
کے وہ اپنی نگاہ و دھیان اس پر سے ہٹا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

دل میں پیدا ہونے والے گداز میں کھلبلی تب مچی تھی جب اس نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔

"اصل میں مسئلہ شروع ہی تفریق سے ہوتا ہے۔ جب دو ایک جیسے انسانوں میں تفریق کر کے ایک کو
بڑا اور دوسرے کو چھوٹا کہا جائے گا۔ ایک کی مراعات چھین کر دوسرے کے حوالے کی جائیں گی۔ زمین کے
مکینوں کو چاند کی سواری کروائی جائے گی تو مسئلے تو پیدا ہوں گے ہی۔" عبید نے صحیح کہا تھا۔ وہ واقعی قابل
سماعت تھی اتنی خوب صورت آواز، ایسا نرم سا لب و لہجہ کم سے کم اس نے اب تک نہیں سنا تھا۔ مگر یہ کہنا
غلط کہ وہ دید سے زیادہ قابل سماعت تھی۔

"مسائل تب تک حل نہیں ہو سکتے سر! جب تک ہمارا حاکم طبقہ خود کو عوام کی سطح تک نہ لے آئے۔
وزیراعظم یا صدر تب تک عوام کے مسائل درست طور پر حل نہیں کر سکتے جب تک وہ خود کو عوام نہ سمجھنے
لگیں۔"

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ بھکاریوں کے مسائل سمجھنے کے لیے ہمیں خود کو بھکاری سمجھ لینا چاہیے۔"
سکندر نے ایک دم سے اس کی بات میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ اہم مقصد صرف اسے اپنی طرف متوجہ کرنا
تھا اور اس مقصد میں اسے کامیابی بھی ہوئی تھی۔ روشانے قمر نے گردن کو خفیف سا موڑ کر اسے دیکھا تھا اور
پھر اسی نرم لہجے میں بولی تھی۔

"کچھ دیر کے لیے ایسا سمجھ لینے میں برائی نہیں ہے۔"

"لیکن اس کے لیے تو اپنی مال و متاع سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی عقل مند
ایسی حماقت کر سکتا ہے۔"

روشانے کی بات کو باسہولت کیچ کرتے ہوئے اس نے خفیف سا طنز کیا تھا اور یہ بات یقیناً اسے اچھی
نہیں لگی تھی۔

"کسی کے بھی مسائل سمجھنے کی کوشش وہی کرتا ہے جو انہیں سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یقینی طور پر
ایسا کوئی عقل مند ہی کرے گا اور جو عقل مند ایسا کرے گا وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ میں نے کچھ دیر کے لیے
بھکاری سمجھنے کے لیے کہا ہے مکمل بھکاری بن جانے کے لیے نہیں۔" وہ بہت متانت سے بول رہی تھی۔

"سوری! لیکن میں آپ کی بات ابھی بھی نہیں سمجھا۔" سکندر نے پھر کہا۔ وہ اس کے انداز کا طنز پا گیا
تھا۔

"اٹس ناٹ مائی ہیڈک۔" وہ گردن گھما کر اب پوری طرح سے سر انصاری کی طرف متوجہ ہو گئی تھی
اور اصولاً تو اس بات پر سکندر کو شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں ہوا تھا۔

سوشیالوجی کی پہلی کلاس ختم ہو گئی تھی۔

دوسری کلاس فری تھی تبھی اکثر لوگ باہر نکل گئے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں کو کینٹین جانے کا اشارہ
کیا تھا اور لمحہ ضائع کیے بغیر خود اس کے پاس آ گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی مس روشانے۔" اس کی کرسی کی بیک پر رک کر اس نے پکارا تھا۔

"جی۔" وہ بھی یقیناً باہر جارہی تھی۔ فہمینہ اور مریم پہلے ہی باہر نکل گئی تھیں۔

"مجھے سکندر حسین حیات کہتے ہیں۔" اسکے خیال میں جواباً خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے
کم سے کم مسکرانا تو چاہیے تھا مگر وہ خاموشی سے کھڑی بے حد بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر
نے ہلکی سی سبکی محسوس کی مگر پھر فوراً اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"دراصل......" بڑے سبھاؤ سے بولتے ہوئے اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو تسخیر کرنے کی
صلاحیت رکھتی تھی۔

"دراصل پچھلے کچھ روز میں ڈیپارٹمنٹ نہیں آ سکا۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو کیا آپ مجھے اپنے پچھلے

ایک ہفتے کے لیکچرز کے نوٹس دے سکتی ہیں۔"

اگرچہ طریقہ خاصا گھسا پٹا تھا مگر وہ بخوبی واقف تھا کہ اکثر لڑکیوں سے تعلقات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

"آئی ایم سوری، میں اپنے نوٹس کسی کو نہیں دیتی۔"

سکندر بدمزا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ (کسی قدر استہزائیہ) ابھری تھی۔

"کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے پھر کہا۔

"ضرور پوچھ سکتے ہیں۔" اس نے روشانے کو بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے دیکھا تھا۔

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ میں آپ کو وجہ بتاؤں بھی۔" وہ باہر نکل گئی تھی۔

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔" اس کے پیچھے آتے ہوئے وہ منہ میں بڑبڑایا تھا۔

"آپ شاید خفا ہو گئی ہیں؟" اس نے خیال کا اظہار کیا جس پر روشانے نے خاصی حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"میں آپ سے کیوں خفا ہوں گی؟"

"میں نے آپ کی بات سے اختلاف کیا تھا..... شاید اس لیے....."

جواباً روشانے ہولے سے ہنسی تھی۔ سکندر بے اختیار ہی اسے دیکھے گیا تھا۔

"میں ہر ایک سے خفا نہیں ہوتی جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ میں عمل بھی ظاہر کروں۔ اپنی رائے کا اظہار ہر ایک کا حق ہے۔ ٹھیک اس طرح اختلاف کرنا بھی آپ کا حق ہے۔" وہ رسان سے بولی تھی۔

"آپ کن لوگوں سے خفا ہوتی ہیں؟" وہ دونوں کلاس روم کے باہر کھڑے تھے اور سکندر نے ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے دیگر باتوں کو نظر انداز کر کے پوچھا تھا۔

روشانے قمر کی نگاہوں میں اب الجھن آئی تھی۔

"آپ یہ جان کر کیا کریں گے؟" اس کے چہرے پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

"یونہی..... میری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔" اس کی خود ساختہ متانت سے وہ خاصا محظوظ ہوا تھا۔

"آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا میری ذمہ داری نہیں ہے۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چل دی تھی۔ سکندر بھی ساتھ تھا۔

"واقعی یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔" اب کی بار وہ بے حد سنجیدگی سے بولا تھا اور یہ سنجیدگی سراسر مصنوعی تھی۔ "لیکن جو بات آپ نے ابھی کلاس روم میں کہی تھی۔ بلیوی میں واقعی سمجھ نہیں سکا۔"

"اگر آپ نے میری بات سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو یقیناً آپ کو سمجھ آ جاتی۔" وہ طنزیہ بولی تھی۔

"میں اب کوشش کرنا چاہتا ہوں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "کیا آپ میری مدد کریں گی؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟" وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ بنا پوچھ رہا تھا۔ روشانے قمر کے قدموں نے وقفہ کیا تھا۔

"اگر آپ کو کچھ سمجھنا ہے تو پروفیسر عبداللہ انصاری کی کلاس میں چلے جایئے۔ وہ بہت بہتر طریقے سے وضاحت کر دیں گے کیونکہ یہ ان کا فرض بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔"

لفظوں کو بے حد چبا چبا کر ادا کرنے کے بعد وہ چلی گئی تھی۔ اب کی بار سکندر نے اس کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس کی کمر پر جھولتی موٹی سی ریشمی چٹیا کو دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار ہی اس ریشم کو چھو کر محسوس کرنے کی تمنا ہتھیلیوں میں سر ابھارنے لگی تھی۔ اس نے اضطراری انداز میں مٹھیاں بھینچ کر کھولیں اور ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ اس کے ہاتھ کوئی تمنا کریں اور وہ تمنا کو رد کر دے۔

"لڑکی حسین بھی ہے اور عقلمند اور غصیلی بھی..... بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا سکندر مبین حیات۔" روشانے سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں دوہراتے ہوئے اس نے خود کو باور کروایا۔ کاریڈور سے گزر کر وہ کینٹین کی طرف جا رہا تھا۔ مگر سامنے سے آتی زرقا کو دیکھ کر اس نے راستہ تبدیل کر لیا تھا اور ڈپارٹمنٹ کی پچھلی جانب سے ہوتا ہوا پارکنگ میں اپنی کار تک آ گیا تھا۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل سے احمر کے موبائل پر کانٹیکٹ کیا تھا۔

"زرقا میرے بارے میں پوچھے تو کہنا پندرہ دنوں کے لیے گاؤں گیا ہوں۔"

وہ اپنا ہیئر اسٹائل تبدیل کرنے کے موڈ میں تھا۔

+

چاند اترا میرے آنگن میں نہ تارہ چمکا
تیری صورت نظر آئی نہ تیرا خط آیا
کسی جھونکے میں نہ مہکی تیرے تن کی خوشبو
کوئی غنچہ نہ تبسم کی حکایت لایا
بستہ لب درد کشاں

یوں تو کاٹی ہیں تیرے شہر میں کتنی راتیں

شوق لیک......"

وہ احمر کو بہت دھیان سے سن رہا تھا، جب اس نے روشانے کو لائبریری کی طرف جاتے دیکھ
پچھلے کئی دنوں کی طرح آج بھی وہ لڑکی اُس کی تمام تر توجہ کھینچ لے گئی تھی۔ ایپل کلر کے سادے سے
وہ خاصی منفرد سی دکھائی دی تھی۔ سکندر نے ایک بار پھر خود کو بے بس محسوس کیا۔

ان پانچ چھ دنوں میں اس نے ہر وہ ممکن کوشش کر ڈالی تھی جو روشانے کو متوجہ کر سکتی اور وہ جانتا
متوجہ تو وہ ہو ہی چکی ہے۔ سکندر مبین حیات کے سحر سے بچ نکلنا اب ایسا آسان نہ تھا۔ مگر یہ لڑکی اس
ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

صرف اس لڑکی کی وجہ سے وہ ان پانچ دنوں میں اپنے سابقہ ریکارڈ توڑتے ہوئے باقاعدگی
ساری کلاسز اٹینڈ کرتا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریں سارا وقت اس کو اپنے حصار میں لیے رہتی تھیں
اسے مسکراتا دیکھ کر دل اس کا طواف کرنے لگتا۔ جب وہ بولتی تو سماعت اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے
دیکھے جاتی۔ لمبے گھنے بال ہتھیلیوں میں اضطراب بھر دیتے اور وہ مزید شدت سے اس لڑکی کے جھکنے کا
ہو جاتا۔

وہ روشانے کے بارے میں ایک اندازہ لگا پایا تھا۔ وہ بے حد پڑھا کو اور ذہین تھی۔ اس کی اسائنمنٹس
کی پروفیسرز تعریف کرتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کے دوران بہت زیادہ نہ سہی مگر کسی حد تک اس
رائے اس کے پوائنٹ آف ویو کو اہمیت ضرور دی جاتی تھی۔ سکندر مبین حیات کو ایسی لڑکیوں سے چڑ
کرتی تھی۔ مگر روشانے قمر سے اسے چڑ نہیں تھی۔ فی الحال ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ محض اس کی وجہ سے وہ
دیگر گرل فرینڈز کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

اس نے روشانے کو لائبریری میں جاتا دیکھا تھا وہ تنہا تھی۔ حسب معمول فہمینہ، مریم میں سے کوئی
اس کے ساتھ نہ تھی۔ اس سے پیشتر وہ ہمیشہ دو تین لڑکیوں کی ہمراہی میں نظر آتی تھی۔ وہ لائبریری کی طرف
آ گیا۔ دروازے میں رک کر سارے میں نگاہ ڈالی کونے والی قطار کے اختتام پر وہ کسی کتاب میں سر دیے
بیٹھی تھی۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں۔"

اس نے قریب جا کر دریافت کیا۔ اسے یہاں بھی الگ تھلگ دیکھ کر خاصی مسرت ہوئی تھی۔

"ایکسکیوز می مس! کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں۔" اب کی بار قدرے بلند آواز میں پوچھتے ہوئے اس
نے لائبریری رولز اینڈ ریگولیشنز کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

روشانے نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور بے حد بے تاثر سے انداز میں

"ہاں" کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

سکندر نے کرسی گھسیٹ کر اس کی کرسی کے قریب کی پھر نشست سنبھال لی۔ لائبریری میں اس وقت
اکا دکا لوگ ہی تھے۔ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جھک کر اس کی اسائنمنٹ دیکھنی شروع
کر دی تھی۔

اگلا لمحہ اس کی توقع کے برعکس نہیں تھا۔ روشانے نے اپنی کتابیں سمیٹ کر پیچھے پڑا بیگ کندھے پر
ڈالا تھا اور باہر نکل گئی تھی ظاہر ہے کہ سکندر نے اس کی تقلید کرنی ہی تھی۔ اسے روشانے کا یہ مغرور انداز مزہ
دے رہا تھا۔

"آپ باہر کیوں آ گئی ہیں مس روشانے!" قدم سے قدم ملاتے ہوئے اس نے دریافت کیا، خاصی
معصومیت سے۔

"کیوں؟ کیا میں باہر نہیں آ سکتی۔" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ناگواری تھی۔

"آپ مجھ سے بچنے کی خاطر لائبریری سے اٹھ آئی ہیں نا؟"

"خاصے سمجھدار ہیں آپ۔"

"شکر الحمدللہ، اچھا کیا آپ نے۔ یوں بھی انسان لائبریری کے گھٹن زدہ ماحول میں کھل کر بات نہیں
کر سکتا۔" روشانے نے یقیناً اپنی رائے دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

"ویسے آپ کو ایک بات بتاؤں اس یونیورسٹی میں رہتے ہوئے آپ سکندر مبین حیات سے نہیں بچ
سکتیں۔"

"کیوں؟ کیا یونیورسٹی آپ کے باپ کی ہے؟" وہ تنک کر بولی تھی۔

"نہیں میرے بچوں کے باپ کی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ روشانے ایک دم رک کر اس کی طرف
پلٹی تھی۔

"آپ کے بارے میں میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا ہے مسٹر سکندر مبین حیات۔ آپ انتہائی
ڈھیٹ اور بدتمیز ہونے کے ساتھ ہی ایک ایسی مصیبت بھی ہیں جو بلاوجہ گلے پڑ جاتی ہے۔" تنفر سے کہہ کر
وہ پھر تیز تیز چلتا آگے بڑھ گئی تھی اس کی تلملاہٹ نے سکندر کو خاصا لطف دیا تھا۔

"مصیبت گلے پڑنے کا محض محاورہ ہی سنا ہے آپ نے، کبھی ایسی مصیبت دیکھی ہوتی تو یقیناً مجھے یہ
لقب دے کر نہ جاتیں۔" اس کا انداز خاصا استہزائیہ تھا۔

"اچھا ... لیکن لوگ کہتے ہیں میں بہت اچھا انسان ہوں۔"

"ایسا کہنے والے بھی یقیناً آپ جیسے ہی ہوں گے۔"

"جی نہیں...... کچھ آپ جیسے بھی ہوتے ہیں...... بے حد نرم گو، مترنم اور......اور خوب صورت۔"

اس کی گہری نگاہ روشانے کی غصہ بھری نگاہوں سے ٹکرائی تھی۔

''دوستی کریں گی مجھ سے۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟'' انداز بے حد دوستانہ تھا۔

''میری مرضی۔'' وہ لفظوں پر زور دے کر بولی۔

''اوکے ایز یو وش۔'' وہ کھل کر مسکرایا۔ ''لیکن غصہ کرنے کا بے حد شکریہ مس روشانے! آپ جا
ہیں جب کوئی کسی پر غصہ کرتا ہے تو دراصل شناسائی کی طرف پہلا قدم بڑھاتا ہے۔ یقیناً اب اس کھیل
مزہ آئے گا۔'' بڑی گہری مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر وہ رکا نہیں تھا۔ بلکہ ڈیپارٹمنٹ کے لان
بیٹھے دوستوں کی طرف آ گیا تھا۔ جو یقیناً شدت سے اس کے منتظر تھے کیونکہ وہ ان دونوں کے مابین ہو
والی گفتگو کی بابت جاننا چاہتے تھے۔ وہ اب دونوں کو لائبریری سے نکل کر ساتھ ساتھ جاتا دیکھ چکے تھے۔

''کیا خاص بات ہونی ہے یارو! کچھ بھی تو نہیں...... بس لڑکی ذرا ٹیڑھی ہے اور سکندر بھی جا
ٹیڑھے راستوں پر چلنے میں مزہ آتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب ہی ٹک گیا تھا۔

''یار ذرا پتا تو کرو۔ محترمہ کہاں سے آئی ہیں۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور کس بات پ
اکڑتی ہیں۔'' اس نے پرسوچ انداز میں شہاب سے کہا۔ وہ ملتان ہی کا رہائشی تھا اور لڑکیوں کے معاملے
اس کی سی آئی ڈی ہمیشہ ہی سے خاصی تیز رہی تھی۔

''جو حکم میرے آقا! مگر پہلے کچھ کھابا ڈابہ نہ ہو جائے۔'' وہ سمجھ گیا اشارہ کس جانب ہے سکندر
حیات جیسا لینڈ لارڈ دوست ہو تو کس کافر کا دل کینٹین بار بار، بے شمار بار جانے کو نہیں چاہے گا۔

+

روشن تیری آنکھوں میں
وفا کے جو دیے ہیں
سب تیرے لیے ہیں
سب میرے لیے ہیں
روشن تیری آنکھوں......

اس نے بڑی مستی بھرے انداز میں تان لگا کر ان سب کی جانب دیکھا تھا جو وسط میں رکھے
ہوئے پزا کے ڈبوں اور پیپسی کے ٹن سے بے نیاز اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ بہت اہم قسم کی معلومات ان کے گوش گزار کر چکنے کے بعد اب داد کا متقاضی تھا۔

''شہاب تم نے صحیح طرح سے تو معلوم کیا ہے نا۔'' سکندر نے پوچھا تھا۔

''یہاں سے پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی کے بارے میں غلط معلومات دی ہیں تمہیں۔'' وہ گویا برا ہی مان
گیا تھا۔

''میری معلومات اس دفعہ بھی ایک سو ایک فیصد درست ہیں بہت ہی باوسوخ ذرائع سے پتا کیا ہے
میں نے۔''

وہ لوگ سکندر کے اپارٹمنٹ میں جمع ہوئے تھے۔ بابا صاحب نے یہ اپارٹمنٹ، یونیورسٹی میں ایڈمیشن
کے وقت اس کی رہائشی ضروریات کے پیش نظر لے کر دیا تھا مگر اس نے ہاسٹل میں قیام کو ترجیح دی تھی۔ مگر
اکثر و بیشتر وہ یہاں آتا رہتا تھا۔

ان میں سے کوئی بھی شہاب کی فراہم کردہ معلومات پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ بلکہ ''روشانے قمر'' کو
دیکھ کر کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اصل میں وہ جس علاقے سے تعلق رکھتی ہے وہ ناگوار
ہونے کے باوجود ہمارے ''مہذب معاشرے'' کا حصہ ہے اور مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبھی وہ
''بازار'' ہے تو کبھی ''ریڈ لائیٹ ایریا'' تو کبھی ''ہیرا منڈی۔''

''نام روشن بائی، تعلق لاہور کی ہیرا منڈی سے، ماں اور نانی بہت اچھی رقاصائیں تھیں۔ بہن بالی وڈ
کی فلموں میں ''ربا'' کے نام سے ایکسٹرا کا رول کرتی ہے۔ جبکہ ایک بہن کسی سیاستدان کے عشق میں ناکام
ہو کر خودکشی کر چکی ہے۔ محترمہ روشانے قمر صاحبہ پہلے P.U میں زیر تعلیم تھیں پھر مائیگریٹ ہو کر یہاں
ملتان آ گئیں کیونکہ آبائی شہر میں ان کی نیک نامی کو برے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔''

یہ شہاب کا معلوماتی پیرا گراف تھا۔

''یار ویسے خبر ہے تو مزے دار۔'' کافی دیر بعد مکرم نے کہا تھا اور احمر نے اس کی نفی کی تھی۔

''کیا خاک مزے دار ہے...... بیچاری روشانے اتنی حسین صورت اور کتنی گندی جگہ سے تعلق۔ بس یہ
قسمت بھی نا کیسے کیسے تماشے لگاتی ہے۔ کیسے اچھے لوگوں کو کہاں لا پٹختی ہے۔'' اسے یونہی ہمدردی کے ابال
اٹھا کرتے تھے۔

''اب تم کیا کرو گے سکندر؟''

سکندر نے سر کی بجائے محض نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ حقیقتاً یہ خبر اس کے لیے بھی تحیر آمیز ہونے
کے ساتھ ہی چٹپٹی بھی تھی۔ یہ سوچ کر کہ روشانے قمر کا تعلق اصل میں کس قدر معزز گھرانے سے ہے اس کی
گردن آپوں آپ احساس تفاخر سے تن گئی تھی۔

''کرنا کیا ہے۔ اب ہم سیدھے اس اکڑو حسینہ کے پاس جائیں گے اور سارا کچا چٹھا ان کے سامنے
سنا دیں گے۔ پھر جب ان کا چہرہ سگنل ٹریفک کی طرح سرخ، زرد اور سبز رنگ بدلے گا تو صورت حال کو جی

بھر کے انجوائے کریں گے۔" عبید ابھی سے پرجوش ہوگیا تھا۔

"نہیں۔" سکندر نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی بھی ایسا کچھ نہیں کرے گا۔"

عبید کے جوش کو سکندر کے دوٹوک انداز نے جھاگ کی طرح بٹھا دیا تھا، ظاہر ہے جب سکندر دیا تھا تو گویا ان سب کو مذہبی احکام کی طرح اس کی پیروی کرنی تھی۔

"لیکن کیوں؟" عبید کی بجائے سہیل نے پوچھا تھا۔ "آخر تم کیا کرنا چاہ رہے ہو سکندر؟"

"یہی تو بات ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہ رہا۔"

اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سب اس کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑنا چاہتے ہو لیکن فی الحال یہی کہ تم لوگ اس بات کو لیک آؤٹ کرنے کی بجائے ہضم کر جاؤ۔ ایسے بھانڈے بیچ چوراہے میں گھروں کے اندر پھوڑے جاتے ہیں۔ موقع دیکھ کر وار کیا جاتا ہے۔"

ان سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے وہ گویا کسی ملک گیر مسئلے کی وضاحت کر رہا تھا۔

"ہم لوگ روشانے کے Origin سے واقف ہیں اس بات کو لیک آؤٹ کرنے سے فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔" اس نے ایک بار پھر کہا تھا۔

"اور ویسے بھی میرے خاندان کا ایک نام ہے۔ میرا باپ اس ملک کے معززین میں شا روشانے چاہے جتنی بھی خوب صورت ہو مگر ایک ایسی لڑکی کے ساتھ خالی خولی دوستی بھی میں برد کر سکتا جسے معاشرہ طوائف کہتا ہے۔ طوائف کو لائف میں لانا ہی حماقت ہے پھر چاہے اس کا روزہ ہو یا چار صدیوں کا۔"

اپنے گھٹنوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے بے حد نخوت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ اس کے لہ حقارت ہی حقارت تھی۔

خود کو معززین میں شمار کرتے ہوئے اور خود کو باکرداروں کی صف میں شامل کرنا وہ اپنا پیدا رہا تھا۔

بڑی سی کھڑکی میں رک کر سگریٹ سلگا کر اس نے مین روڈ پر بھاگتی ہوئی ٹریفک کو دیکھا تھا۔ قمر جیسی لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہرحال اسے افسوس تھا۔

+

روداب علوی سے ہونے والی اس چوتھی ملاقات نے اس کے موڈ پر خاصا خوشگوار اثر مرتب جو کہ اتنا بڑا روداب نے اس کی لنچ یا ڈنر کی آفر کا مثبت جواب دیا تھا مگر دن مقرر نہیں ہو سکا تھا۔

یا گے دن بھی طے کیا جا سکتا تھا۔

وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں میں تنہا بیٹھا شہاب وغیرہ کا منتظر تھا جب اس نے کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنی تھی۔ مڑ کر دیکھا۔ شک درست تھا بھلا ایسی مترنم ہنسی تو سارے ڈیپارٹمنٹ میں اور کسی کی نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر فائنل ایئر کی چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ بہت شدت سے ہنسنے کی بنا پر چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بھرنے والا پانی وہ یہاں سے بھی دیکھ رہا تھا۔

بلا ارادہ بے ساختہ وہ اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ تبھی روشانے نے ایک نظر اسے دیکھ کر واپس گردن موڑ لی۔ سکندر کو اس کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا اس کے ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔ دل و دماغ میں نخوت سر ابھار رہی تھی۔

"ابھی اگر میں تمہیں تمہارے اصل نام سے پکاروں تو تم ہنسنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی، آنکھوں میں شرمندگی کا پانی اتر آئے گا اور یہی گردن، جسے تم نے ابھی بڑی شان سے موڑا ہے جھک جائے گی پھر کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔" وہ سوچتا چلا گیا۔

"تمہارا طوائف ہونا بہت بڑی بدقسمتی ہے روشانے بی بی اور اس بدقسمتی پر جتنا افسوس مجھے ہے شاید ہی تمہیں ہو۔ یہی تو وہ کمزوری ہے جس نے تمہیں سکندر مبین حیات کے ساتھ سے محروم کیا ہے اور یہ تمہاری ایک اور بدقسمتی ہے۔"

افسوس میں سر ہلاتے ہوئے اس نے پھر سے اسے دیکھا جو اب کلاس روم کی طرف جا رہی تھی۔ انداز میں محسوس کیا جانے والا شاہانہ پن تھا ہر اٹھتے قدم تلے گویا وہ دنیا روند رہی تھی۔ گردن مغلیہ شہزادوں کے سے انداز میں تنی ہوئی تھی۔

سکندر نے منہ کا زاویہ بگاڑ کر گردن موڑ لی۔

"خدا حسن بھی چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور وہ بھی ایسیوں کو۔"

وہ بھی کلاس روم کی جانب چل دیا تھا اگرچہ پروفیسر ہاشمی کی کلاس شروع ہونے والی تھی مگر اپنے دوستوں کی غیر موجودگی میں تنہا بور ہونے سے تو یہی بہتر تھا کہ سب کے ساتھ مل کر بور ہو لیا جائے۔

+

اس کے لیے اپنی ہی سوچ مشکل بنتی چلی جا رہی تھی۔ دل تھا کہ روشانے قمر کی طرف سے منہ موڑنے کو تیار ہی نہ تھا۔ بہت زیادہ خفت کے باوجود وہ یہ بات تسلیم کر لینے پر مجبور تھا کہ روشانے اس کے حواس پر قبضہ جما چکی ہے۔

روداب علوی سے ہونے والی پانچویں ملاقات ہی خاصی پھیکی ثابت ہوئی تھی۔ وہاں ریسٹورنٹ میں وہ

اپنے سامنے رودابہ کی بجائے روشانے کو مسکراتے دیکھتا رہا تھا۔

عجیب مشکل سی مشکل تھی اور اس مشکل میں اس کا طوائف ہونا خود سکندر کو اپنی بدقسمتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حسین تھی اور وہ حسن کا پجاری۔

وہ دو متضاد کیفیات میں گھر گیا تھا۔ ایک طرف اپنے عزت دار گھرانے کا وقار تھا تو دوسری روشانے کے نام سے جڑا وہ رذیل حوالہ۔

وہ اپنے دل کے بے تکے مطالبے پر خود چڑ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے خدانخواستہ روشانے سے محبت وحبت ہو گئی تھی بلکہ اس نے تو کبھی کسی عورت کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس سے محبت کرتا۔ حصول کبھی بھی اس کا مسئلہ نہیں رہا تھا اور اب بھی وہ اس "حصول" کو اپنا مسئلہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ روشانے سے محض دوستی کرنے کی ایک آخری سی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا تبھی مطمئن تھا۔

یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے۔ وہ لائبریری بہت کم جایا کرتا تھا اور اس روز بھی بس یونہی گیا تھا۔ یونیورسٹی کی مین لائبریری میں بہت سی لڑکیاں دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

"تم مان لو سکندر مبین حیات سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ کا سب سے زیادہ ہینڈسم شخص ہے۔" وہ ٹھٹکا تھا۔ کتابوں کی الماری کی دوسری جانب سے آنے والی آواز خاصی بلند تھی۔

"اچھا تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔" یہ اکتائی ہوئی آواز تو وہ بنا شکل دیکھے بھی پہچان سکتا تھا۔

اس نے ایک کتاب بے حد احتیاط سے نکال لی۔ اب دوسری طرف دیوار کے ساتھ رکھی کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

صنف نازک کے مابین موضوع گفتگو بننا بھلا کس کمبخت کو برا لگتا ہے۔ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سننے لگا تھا۔

"کیوں روشانے! کیا تم اس بات کو نہیں مانتیں۔" فہمینہ کی آواز تحیر آمیز تھی۔

"مانتی ہوں۔" سکندر کے لبوں پر خاصی لطف لیتی مسکان بکھری تھی۔

"لیکن میرے ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"سکندر کو تو پڑتا ہوگا۔ میں نے نوٹ کیا ہے کافی غور سے دیکھتا ہے تمہیں اور یقیناً متاثر بھی ہے تم سے میں۔"

"مردوں کی عادت ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ تو کیا وہ سب ان لڑکیوں میں دلچسپی رکھتے ہوتے ہیں اور سکندر صاحب کی تو کچھ زیادہ ہی پختہ عادت ہے۔ کبھی یہ بھی غور کرنا وہ ہر لڑکی کو غور سے دیکھتا ہے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

سکندر کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ اپنی ہی سوچ میں وہ ان لوگوں کی اگلی باتیں سن نہیں سکا تھا۔

"سکندر مبین جیسے لوگ تو لڑکیوں کے آئیڈیل ہوا کرتے ہیں۔ اس کے پاس دولت ہے، وجاہت ہے۔"

"دولت اور وجاہت کا اچار نہیں ڈالنا فہمینہ! کردار بھی ہونا چاہیے۔" روشانے نے پھر اختلاف کیا۔

"کیوں کردار کا اچار ڈالنا ہے؟"

"بکو مت۔" وہ ہنسی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ لڑکیاں دولت و وجاہت کو اہمیت دیتی ہیں۔ اگرچہ یہ چیزیں بھی اہم ہیں لیکن کردار ان سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جہاں تک سکندر مبین کا تعلق ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ایسے لوگ لڑکیوں کو اپنی دولت سے متاثر کرتے ہیں، وجاہت سے متاثر کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ عورت کو ایک گھر نہیں دے سکتے جو کہ بہر حال عورت کی اول ترجیحات میں شامل ہے۔" سکندر کا چہرہ خفت اور احساس تحقیر سے سرخ ہو گیا تھا۔

"اور جو مرد عورت کو ایک گھر نہ دے سکے وہ تو مرد کہلانے کا بھی حقدار نہیں ہے۔"

اس کے جبڑے مضبوطی سے بھینچ گئے تھے۔ کنپٹی کے قریب رگیں ابھر آئی تھیں۔ پیشانی پر لکیروں کا جال بے حد نمایاں تھا۔

طیش کے شدید ترین احساس نے اس کے ہاتھوں میں سختی بھر دی تھی۔

کتابوں کے درمیانی فاصلے سے اس نے دوسری طرف دیکھا۔ روشانے کسی بات پر اب ہنس رہی تھی۔

وہ مزید وہاں نہیں رک سکا تھا۔ بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لائبریری کے داخلی راستے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کے دماغ میں شرارے سے پھوٹ رہے تھے اور آنکھوں میں نفرت کے سرخ ڈورے بڑے واضح تھے۔

+

"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

ائیر پیس پر ابھرنے والی مترنم آواز میں دیا جانے والا عندیہ اسے فتح کے احساس میں مبتلا کر گیا تھا۔ ایک بہت ہی گہرا پُرزور سا احساس اس کے گرد دھمال ڈال رہا تھا۔

اس کی پلاننگ توقعات کے عین مطابق بالکل صحیح جا رہی تھی۔

ملاقات کا وقت اور صحیح مقام طے کر لینے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر چھت

پرنگاہیں گاڑ دی تھیں۔

وہ اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

روشانے کی فون کال اس قدر جلدی موصول ہو جانے پر وہ حیران تو ہوا ہی تھا آج صبح اس سے ملا
کر لینے کے بعد وہ دو یا ایک روز تک انتظار کی توقع کر رہا تھا۔

صبح اسے ڈپارٹمنٹ کے لان میں تنہا دیکھ کر وہ اس جانب آ گیا تھا۔

"ہیلو۔" روشانے نے اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر قدرے اکتاہٹ سے سر جھکا لیا تھا۔ سکندر کو
حیرت نہیں ہوئی تھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ جیسے بار بار اس کے راستے میں آ رہا تھا۔ روشانے کا زچ ہونا
لازمی امر تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی جناب بھائی صاحب! آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

اس کے انداز سے جھلاہٹ واضح تھی۔ سکندر مسکراتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ کوئی بہن نہیں ہے میری۔ مجھے بہنیں بنانے کا شوق بھی نہیں
ہے اور آپ جیسی خاتون کو بہن بنانے کا شوق تو بالکل بھی نہیں ہے۔ سو برائے مہربانی آپ مجھے بھائی کہنے
تکلف مت کیجئے۔"

"آپ مجھے بلانے کا تکلف مت کیجئے میں آپ کو بھائی نہیں کہوں گی بلکہ آپ کی شکل بھی نہیں
دیکھوں گی بھائی صاحب۔" ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس نے تمام تر زور "بھائی صاحب" پر
دیا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی تپی ہوئی شکل دیکھتا رہا دلچسپی سے پھر خفیف سا ہنس دیا۔

"اب اگر میں یہ کہوں کہ لڑکیاں ہر لڑکے کو جان بنانے سے پہلے بھائی جان بناتی ہیں تاکہ ناکامی
صورت میں بھائی پر ہی گزارہ کر سکیں تو تم برا مان جاؤ گی۔"

اس نے روشانے کو قہر زدہ نظروں سے اپنی جانب دیکھتے پایا تھا۔

"ویسے لڑکی! تم ہو ذہین۔ مگر افسوس یہ ذہانت تم جیسی لڑکیوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔" افسوس بھی تھا
تمسخر بھی۔

"مطلب کیا ہے آپ کا۔" وہ پین جرنل پر پٹخ چکی تھی۔

"کوئی مطلب نہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غصہ ذہانت کا دشمن ہے اور تم تو بہت غصیلی ہو۔" وہ
تکلفی کی آخری حد بھی با آسانی عبور کر گیا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ میں بالکل بھی غصیلی نہیں ہوں۔ بلکہ آپ جان بوجھ کر مجھے غصہ دلانے والی حرکتیں
کرتے ہیں۔"

"غصہ دلانے والی حرکتیں...... مثلاً۔"

"یہی میرے پیچھے آنا، مجھ پر کمنٹس پاس کرنا، بلاوجہ مخاطب کرنا۔"

"پیچھے" اسے اچنبھا ہوا تھا۔ "نہیں بھئی میں کسی کے پیچھے نہیں آتا البتہ آگے آنے کی بات دوسری
ہے۔ میں کمنٹس پاس نہیں کرتا۔ وہ میرے دوست کرتے ہیں۔ جہاں تک مخاطب کرنے کی بات ہے تو وہ
ہی کرتا ہوں اور تم بخوبی آگاہ ہو کہ میں تمہیں کیوں مخاطب کرتا ہوں۔" اس نے بڑے دوستانہ انداز
جواب دیا تھا۔

"سنو دوستی کر لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ثابت ہو سکتے
ہیں۔"

"میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے دوستی نہیں کرنی۔" اس کا انداز بے حد جلا کٹا
تھا۔

"میں نے ایک بار تم کو دوستی کی آفر کی۔ تم نے انکار کر دیا۔ دوسری بار بھی انکار کر دیا اور تیسری بار
پوچھ رہا ہوں۔"

"اور میں اب بھی انکار کر رہی ہوں بہتر ہوگا کہ آپ چوتھی بار ایسی کوشش نہ کریں۔"

سکندر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے بے حد گہرا سانس بھرا تھا۔

"سکندر معین حیات سے دوستی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ بہت اثر و رسوخ والا ہوں میں۔"

"اپنا اثر و رسوخ سنبھال کر رکھیے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں بھی بہت اثر و رسوخ والی
ہوں۔" وہ بہت تحمل سے ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی جبکہ انداز بے حد سخت تھا۔

"اور اب میری برداشت جواب دے گئی ہے۔ مسٹر سکندر! آپ نے مجھے واقعی زچ کر دیا ہے۔ سمجھ
میں نہیں آتا کہ آپ کے لیے ڈھیٹ کا لفظ استعمال کروں یا بے شرم کا اور...... بہر حال جو بھی ہے اب میں
آپ کو وارن کر رہی ہوں کہ اگر آپ نے اپنی حرکتوں سے پرہیز نہ کیا تو میں ڈپارٹمنٹ کی اتھارٹیز سے
آپ کی شکایت کروں گی۔"

سکندر کا دل چاہا تھا کہ اس کے منہ پر طمانچہ دے مارے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کے
چہرے کے تاثرات میں خاصی سختی آ گئی تھی۔

"میں نے تمہیں اغوا کروانے کی کوشش کی ہے؟ تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ آخر ایسا کیا کیا ہے
میں نے جس کی تم شکایت کرو گی؟ صرف دوستی کی آفر کی ہے نا تو کسی بھی ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے
جو ایک لڑکے کو محض دوستی کی آفر کرنے پر گرفتار کرے، کجا سزا دینا۔ ڈپارٹمنٹ کی اتھارٹیز بھی اس بات پر
ایکشن نہیں لیں گی۔ چلو ہم اسی وقت ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس چلتے ہیں۔ تم انہیں یہ بتا دو کہ میں
تمہیں دوستی کی آفر کر رہا ہوں اور میں انہیں یہ بتا دوں گا کہ تم کتنی اثر و رسوخ والی ہو۔ کتنے ستاروں والے،

جھنڈوں والے تمہارے آستانے پر حاضری دینے آتے ہیں۔ تم کون سے علاقے سے تعلق رکھتی ہو، اصل نام کیا ہے، تمہارے خاندان کا پیشہ کیا ہے...... میں سب بتادوں گا انہیں۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ تمہارے خلاف ایکشن لیتے ہیں اور کیسے investigate کرتے ہیں۔''

اپنی بات ختم ہوجانے تک وہ اسے دیکھتا رہا تھا لفظوں کے تیر نشانے پر لگے تھے روشانے کے چہرے پر واقعی سگنل کی طرح رنگ تبدیل ہوئے تھے۔

اور اس کے بعد وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ اسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب بکری پہاڑ کے نیچے آچکی ہے۔

+

کار کے بند دروازے سے کمر ٹکا کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تھی۔ شام پانچ بجے کا عمل تھا ڈیپارٹمنٹ کا بیرونی حصہ خاصا سنسان تھا۔

بمشکل تین منٹ گزرے تھے جب سیاہ سن گلاسز کی اوٹ سے اس نے روشانے کو اپنی جانب آتے دیکھا تھا۔ وہ اسی لباس میں ملبوس تھی جو اس نے صبح پہن رکھا تھا اور اس پر پڑی شکنیں خاصی نمایاں تھیں گھنی چٹیا کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اسے ایک بار پھر برش نہیں کیا گیا۔ کئی لٹیں لاپرواہی سے کانوں کے گرد اڑسی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی قدرے نمایاں تھے شاید اس نے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

سکندر نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا۔ بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ محض ایک سچ اسے اس حال تک پہنچا دے گا۔

روشانے کار کے قریب آکر خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شکل پر بجے بارہ ایک بار پھر اسے مسکرانے پر مجبور کر گئے تھے۔ کار کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنی اس ہنسی کو قابو کیا اور اندر بیٹھ گیا۔

''کہاں چلنا ہے؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا مگر روشانے نے جواب دینے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔ سکندر نے دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور نگاہیں گود میں رکھے ہاتھوں پر جمی تھیں۔

''روشانے.....'' سکندر نے پھر پکارنا چاہا مگر اب کی بار وہ اس کی بات قطع کر چکی تھی۔

''تم کیا چاہتے ہو سکندر؟'' اس کی آواز محض سرگوشی سی تھی۔ اس کے انداز اور آواز دونوں پر بے بسی چھائی ہوئی تھی۔

''میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

سکندر نے بہت تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اس نے روشانے کو سر اٹھا کر حیرت آمیز نظروں سے

اپنی جانب دیکھتا پایا تھا۔

''منور روشانے.....'' اس نے کہنا شروع کیا اس دوران ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے بہت کچھ کہا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ روشانے اسے بہت غور سے سن رہی ہے۔

''تم میرے origin سے واقف ہونے کے باوجود مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں تمہارے origin سے واقف ہونے کے باوجود میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ اس نے کچھ اور الفاظ روشانے کو مطمئن کرنے کے لیے کہے تھے اور اپنی بات ختم کر کے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اگلے ہی پل اس کی کامیابی اس کی پیٹھ تھپک رہی تھی۔ روشانے مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا ہی پرسکون اور طمانیت آمیز تاثر تھا۔

''تم مجھے ہاسٹل تک چھوڑ دو گے؟'' اس پچیس منٹ کی ملاقات میں یہ تیسرا فقرہ تھا جو روشانے نے ادا کیا تھا۔ سکندر نے سر ہلا کر کار آگے بڑھا دی تھی۔

اس بے تحاشا حسن کی مالک لڑکی کی ہمراہی میں اس کا دل سینے کے اندر قہقہے لگا رہا تھا۔

''جو ہار جاتا ہے وہ سکندر نہیں ہوتا اور جو سکندر ہوتا ہے وہ کبھی ہارتا نہیں ہے۔'' اس نے اپنے دل کو کہتے سنا تھا۔

+

یہ اس سے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔

روشانے نے اسے اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی تھی۔ اسے تھوڑا سا اعتراض تھا۔ کیونکہ کچھ روز قبل اس نے بھی روشانے کو اسی قسم کی آفر کی تھی مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ اس انکار پر خاصا بدمزا ہوا تھا۔

بہرحال اس نے روشانے کی آفر قبول کر لی تھی۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کی طرف یہ ایک اور قدم تھا۔ وہ ملتان کے حدود اربع سے مکمل واقفیت کی بنا پر اسے اپنی پسند کے ایک چائنیز ریسٹورینٹ میں لے آیا تھا۔ کھانا بھی اس نے اپنی پسند سے آرڈر کیا تھا۔

ان دونوں نے بہت خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا تھا اور ویٹر کے بل لانے پر جب سکندر نے پے منٹ کرنی چاہی تھی تو روشانے نے ٹوک دیا تھا۔

''یہ لنچ میری طرف سے تھا لہٰذا بل بھی میں ہی پے کروں گی۔''

وہ اس بات پر ہنسا تھا۔

"میں یہ بالکل برداشت نہیں کرسکتا کہ ایک خوب صورت لڑکی میری موجودگی میں بل پے کرے۔"

"وہ سامنے والی میز پر بیٹھی لڑکی بھی خاصی خوب صورت ہے اور تنہا بھی تو کیا اس کا بل بھی تم ادا کرو گے۔" شرارتی سے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ سکندر نے والٹ سے رقم نکالتے ہوئے پہلے اس لڑکی کو دیکھا پھر اس کی طرف۔

"لڑکی واقعی خوب صورت ہے مگر میری فرینڈ نہیں ہے۔" رقم گلدان تلے رکھ کر اس نے والٹ جیب میں رکھ لیا تھا۔

"پلیز سکندر! یہ روپے تم رکھو یہ تمہارے ہیں۔"

"فرینڈز میں تمہارا ہمارا کچھ نہیں ہوتا۔" سکندر نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ اس کی خود ساختہ غیرت سے
بھی رہا تھا۔

"آج میں بل پے کر دیتا ہوں اگلی بار تم کر دینا۔"

جان چھڑوانے کی غرض سے اس نے کہا تھا۔ اپنی دولت کا رعب بھی تو جمانا تھا۔

پھر سننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا۔ وہی روشانے قمر جو سکندر مبین حیات کے سا
سے بھی گریزاں تھی۔ اب سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنے لگی۔

بہت سے لوگوں سمیت اس کے دوستوں کے لیے بھی یہ بات حیران کن تھی مگر خود اس کے لیے نہیں یہ اس کے التفات کی کرامات تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس میں ہر وہ خصوصیت موجود ہے جو کسی بھی لڑکی کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی ہے۔ لہٰ
میں روشانے کا اس کی جانب کھنچے چلے آنا کچھ ایسا غیر معمولی بھی نہ تھا۔ اس جیسے لوگ ہمیشہ "ایسی لڑ
کی good books میں شامل رہتے ہیں۔

✦

ان کی دوستی محض ڈپارٹمنٹ کی ملاقاتوں اور ٹیلی فونک گفتگو سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اب ان کی
شامیں اکٹھی گزرنے لگی تھیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی جب سکندر بہت چالاکی سے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا تھا۔ ان لوگوں
لانگ ڈرائیو کا پروگرام تھا۔

"میں اپنا موبائل گھر بھول آیا ہوں۔ یہاں سے صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ اگر تم اجازت
تو میں پہلے موبائل لے لوں۔" اس کے پاس بڑا موثر بہانہ تھا۔ روشانے کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بنا
تردد کے اس کے گھر آ گئی تھی اور یہاں آ کر بھی کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے کی بجائے وہ اس کی

ہمراہی میں اندر آ گئی تھی۔

"نجانے اور کتنوں کے گھر جاتی ہو گی۔" اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔

"تم میرے گھر پہلی بار آئی ہو خدمت تو کرنی ہی پڑے گی۔" سافٹ ڈرنک کا گلاس اسے تھماتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ روشانے نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"ویسے تمہارا اپارٹمنٹ خاصا خوب صورت ہے۔"

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ کبھی ہماری حویلی دیکھو۔"

"وہ بھی دیکھ لوں گی فی الحال تو سارا اپارٹمنٹ ہی دکھا دو۔ یہ ڈرائنگ روم تو بہت اچھا سجا رکھا ہے تم نے مگر تم تو ہاسٹلائزڈ ہو نا؟"

"ہاں...... وہ دراصل۔" اس نے خود کو بڑی مشکل سے بتانے پر آمادہ کیا۔ اس کی نگاہیں مسلسل اپنے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھی حسینہ کے گرد بھٹک رہی تھیں۔ وہ سر اٹھائے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور اسی عمل میں اس کی مرمریں گردن سکندر کی نگاہوں کی زد میں آ گئی تھی۔ اس کے دل میں کھدبد ہونے لگی تھی۔

"آؤ میں تمہیں سارا اپارٹمنٹ دکھاتا ہوں۔" اپنی نظروں اور دل کو قابو کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ سارے میں چکر لگا کر وہ سب سے آخر میں اسے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔

"واقعی سکندر! تمہاری پسند بہت شاندار ہے۔" بیڈ روم میں لگی ایک پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"ہاں میری پسند واقعی بہت شاندار ہے۔" وہ زیر لب نہیں با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔ وہ روشانے کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال نگاہوں کے سامنے تھے۔ اس کی انگلیوں میں اضطراب از سر نو بیدار ہونے لگا تھا۔

تنہائی میں تمام تر "جذبات" اپنی شدت سے بیدار ہونے لگتے ہیں۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا تھا کہ پیچھے عقب میں موجود دروازہ بند کر کے ہر مصلحت کو پس پشت ڈال دے اور...... مگر وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتا تھا۔

"جانتی ہو میرا گھر کبھی اتنا خوب صورت نہیں لگا جتنا کہ آج تمہاری موجودگی میں لگ رہا ہے۔" اس نے بہت جذب سے کہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا اور کھڑکی میں جا رکا تھا۔

"باتیں بنانے کے علاوہ تم اور کیا اچھا بنا لیتے ہو۔" اس نے روشانے کی سنجیدہ آواز سنی تھی۔

"کافی۔"

"اور میں پاستا بہت اچھا بناتی ہوں۔" وہ اس کے پیچھے آرہی تھی۔

"تو یوں نہ کریں تمہارے فلیٹ پر ایک چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کرلیا جائے۔"

"تو گویا طوائف اپنے رنگ میں واپس آرہی ہے۔" اس نے سوچا تھا اور جو کہا تھا وہ اس [illegible] تھا۔

"اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔"

اس شام اگرچہ طوائف اپنے رنگ میں واپس نہیں آئی تھی مگر سکندر کو یقین تھا کہ وہ وقت زیادہ [illegible] ہے جب وہ روشانے کو اپنے سامنے جھکا ہوا پائے گا۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب اس نے روشانے کو گرلز ہاسٹل کے سامنے ڈراپ کردیا تھا۔

ایک شام کے یوں بے رنگ گزر جانے کا اگرچہ اسے افسوس تھا مگر اس بات کا بھی یقین تھا کہ [illegible] اصل مقصد کی طرف ایک اور ہٹ لگا چکا ہے۔ وہ جس مقصد کے لیے روشانے کو یہاں لایا تھا وہ پو[illegible] روشانے قمر اس کی شرافت سے متاثر ہوگئی تھی۔

اس کے بعد وہ اکثر و بیشتر اس کے فلیٹ پر آنے لگی تھی...... فاصلے سمٹنے لگے تھے۔ وہ اس [illegible] نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ جلد کامیاب ہونے والا ہے۔ وہ عنقریب اس کے قدموں میں جھکنے والی تھی۔

✦

"تم مجھ سے خفا ہو؟"

فقرہ مکمل ہونے کے ساتھ ہی اس نے اپنے مضبوط ہاتھ پر ایک نرم سی گرفت محسوس کی تھی۔ [illegible] لمس کی لطافت کو محسوس کرنا چاہیے تھا۔ اسے روشانے کی پیش قدمی پر خوش ہونا چاہیے تھا مگر دوسر[illegible] وہ اپنا ہاتھ بے حد سرد مہری سے کھینچ چکا تھا۔

وہ اس وقت ڈپارٹمنٹ کی سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ روشانے نچلی سیڑھی پر [illegible] قدموں کے قریب بیٹھی تھی۔

فائنل ایئر کو دو دن پہلے ہی فیئر ویل پارٹی دی گئی تھی ایگزامز قریب آجانے کی وجہ سے [illegible] حاضری بے حد کم ہوگئی تھی۔ جو لوگ آتے تھے ان کا بھی بیشتر وقت لائبریری کی نذر ہوتا تھا۔ سکندر نہ تو پہلے پڑھنے کی غرض سے آتا تھا اور نہ اب...... اس کا مقصد اب بھی محض وقت گزاری تھا۔ [illegible] ایگزام دینے کے متعلق بھی سوچا تک نہ تھا۔ پچھلے پانچ ماہ بھی اگر روشانے کی نذر نہ ہوئے ہوتے [illegible] اس کے متعلق سوچ لیتا۔

"تم مجھ سے خفا ہو سکندر؟" اس نے پھر روشانے کو کہتے سنا تھا۔

"نہیں۔"

"مگر مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیا تھا۔

"میں ہر ایک سے ناراض نہیں ہوتا۔" اس نے بڑی لاتعلقی سے کہا تھا۔

"میں ہر ایک نہیں ہوں بلکہ تمہاری دوست ہوں۔" وہ رسان سے بولی۔

"اگر تم میری دوست ہوتی تو اسید ہمدانی کے ہمراہ کیوں نظر آتی ہو؟" وہ جیسے پھٹ پڑا تھا اور اسے خود بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے روشانے اسے نظر انداز کرتے ہوئے فائنل ایئرز کے اسید ہمدانی کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔

سکندر کو یہ سب بہت برا لگ رہا تھا اور اسے یہ برا لگنا بھی برا لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ روشانے قمر کے بارے میں وہ اتنی شدت سے کیوں سوچ رہا ہے کہ اسید اسے اپنا رقیب لگنے لگا تھا۔

"تم جانتی ہو وہ اسید کا بچہ کس قدر کرپٹ بندہ ہے۔ ایک نمبر کا فلرٹ اور دھوکے باز...... پرسوں پارٹی میں بھی تم زیادہ وقت اسی کے ساتھ تھیں۔ پھر اس سے بھی پہلے مکرم نے خود تمہیں اس کے فلیٹ سے نکلتے دیکھا تھا کیا تم مجھے بتانا پسند کروگی کہ یہ راہ و رسم کس لیے بڑھائے جارہے ہیں؟" وہ خود متحیر تھا کہ اتنا استحقاق بھرا سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔

روشانے نے اس کی بات بہت تحمل سے سنی تھی اور پھر سکندر نے اس کے لبوں پر بڑی محظوظ سی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔

"میں یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ تم میری اسید ہمدانی سے بے تکلفی پر کس طرح ری ایکٹ کرتے ہو۔" اس نے رسان سے کہا تھا۔ سکندر نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"پلیز اب مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو روشانے! یعنی صرف میرا ری ایکشن دیکھنے کی غرض سے تم اس جیسے کرپٹ اور لوز کریکٹر کے گھر گئی تھیں۔" اس نے بڑے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ روشانے اس کے گھر کیوں گئی ہوگی اس جیسی عورتیں کسی کے بھی گھر جاسکتی ہیں۔

"نہیں میں اس لیے اس کے گھر نہیں گئی تھی۔" اس نے روشانے کی اطمینان بھری آواز سنی تھی۔

"مجھے پتا ہے تم کیوں گئی تھیں۔" اس نے دل میں حقارت سے کہا تھا۔

"اگرچہ اسید ہمدانی سے بے تکلفی میں نے تمہارا ری ایکشن دیکھنے کے لیے ہی بڑھائی تھی مگر اس کے گھر میں اس کی بہن سے ملنے گئی تھی۔ اسید ہمدانی، ہما ہمدانی کا بھائی ہے جو میری روم میٹ تھی پھر اس کے بھائی نے یہاں گھر لے لیا تو وہ وہاں شفٹ ہوگئی۔ جس روز مکرم نے مجھے دیکھا میں ہما کی عیادت کے لیے اس کے گھر گئی تھی۔"

وہ بنا کسی لڑکھڑاہٹ کے بے حد رسان و اطمینان سے بتا رہی تھی۔ سکندر اگرچہ اس
مطمئن نہیں ہوا تھا مگر اس نے خود کو سمجھا بھی لیا تھا۔ اس کی سوئی کہیں اور اٹکی تھی۔

''کون ہما ہمدانی؟''

''وہی جو ایم کام کر رہی ہے۔''

''وہ اسید کی سسٹر ہے؟'' اسے اپنی بے خبری پر حیرانی تھی۔

''ہاں ویسے حیرت ہے کہ تم جیسا باخبر بندہ اس بات سے بے خبر ہے۔ حالانکہ کرم ایک روز
تھا کہ تم ہر ایک کے متعلق خبر رکھتے ہو۔ خاص طور سے لڑکیوں کے بارے میں۔'' اس کا لہجہ
سکندر اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا تھا۔

''تمہارے آنے سے پہلے ہی ہوتا تھا مگر تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

حقیقت کچھ اس کے برعکس بھی نہ تھی وہ روشانے کے چکر میں الجھ کر اپنی تمام گرل فرینڈز
تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے دوستوں کو بھی۔

روشانے نے اس کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ اف اتنی سریلی ہنسی۔ وہ کھو سا گیا تھا۔

''تمہاری ہنسی بہت خوب صورت ہے روشی۔'' اسے اپنا آپ بڑا بے بس سا لگا تھا۔ وہ مو
اسے تک رہا تھا۔ اب اس کے چہرے پر کچھ اور رنگ تھے جنہیں حیا سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

سکندر نے نوٹ کیا تھا اس کی تعریف پر وہ ایسے ہی سرخ ہو جایا کرتی تھی۔ لمبی لمبی پلکیں
لرزنے لگتی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ ہولے ہولے دبانے لگتی تھی۔

''کسی ایکٹر کی اولاد نہ ہو تو۔'' وہ منہ میں بڑبڑایا۔ اسے چھونے کی خواہش شدید ہوتی جا رہی تھ

✦

گاؤں میں دس دن گزار کر وہ واپس آیا تھا اور واپس آنے کے محض اگلے روز ہی وہ روشانے
ہاسٹل پہنچ گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے کچھ مضطرب اور الجھی الجھی سی لگی تھی۔ وہ معمول سے زیادہ
تھی اور سکندر کی اکثر باتوں کا جواب محض ہوں، ہاں میں دے رہی تھی۔ وہ اس کی کیفیت پوری طرح
نوٹ کر چکنے کے بعد بولا تھا۔

''میرے گھر کا کام کہاں تک پہنچا۔''

''ارے ہاں۔'' روشانے جیسے چونکی تھی۔ ''یہ لو چابی۔ تمہارے گھر کا کام مکمل ہو گیا ہے اور
انٹیریر میں نے تمہاری پسند کے مطابق ہی رکھا ہی۔'' اس نے پرس سے چابی نکال کر اسے تھمائی ہو
تھا۔ سکندر نے چابی لے کر جیب میں رکھ لی تھی۔

''کیا بات ہے؟ تم اتنی خاموش کیوں ہو؟'' بہت دیر بعد اس نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ ہنس کر ٹالنا چاہ رہی تھی مگر لہجہ بے حد کھوکھلا تھا۔

''مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی تمہارا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔'' اس نے پھر کہا تھا۔

''سنو! اگر کوئی پرابلم ہے تو شیئر کر لو شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے سکندر! یہ مسئلہ تو ساری زندگی کا ہے۔'' وہ افسردگی سے ہنسی تھی۔

''پھر بھی پتا تو چلے۔''

''ہم لوگ چاہے بیت اللہ کا طواف کر آئیں مگر لوگ ہمیں وہ درجہ دینے کو تیار نہیں ہوتے جو عزت دار
گھرانوں کی عورتوں کو حاصل ہوتا ہے۔ میں نے کبھی وہ کام نہیں کیا جو میری ماں اور نانی کرتی تھیں مگر اس
کے باوجود میں طوائف ہوں اور وہی رہوں گی۔ چاہے میں کسی بھی شہر میں چلی جاؤں اور کوئی بھی پروفیشن
ایڈاپٹ کر لوں۔ یہ حوالہ آکٹوپس کی طرح مجھے جکڑے ہوئے ہے۔ اسی حوالے کی وجہ سے میں محدود زندگی
گزارنے پر مجبور ہوں۔ سب لوگ میرے لہجے کی تعریف کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تقاریر کے
مقابلوں اور مباحثوں میں حصہ لوں تو یقینی طور پر پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک ٹائٹل ضرور میرے حصے میں
آئے گا۔ مگر اس کے بعد...... اس کے بعد کیا ہوگا؟ جتنی شہرت اتنی بدنامی۔'' وہ بڑی یاسیت سے جلے دل
کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ سکندر نے دل میں بھی شرمندہ ہونا مناسب نہ سمجھا۔ دوسروں کی ہمدردیاں
حاصل کرنے کا یہ بڑا موثر طریقہ ہے پہلے خود پر ترس کھایئے پھر دوسرے آپ پر کھائیں گے۔

''تم ان سب باتوں کو خود پر سوار مت کیا کرو روشی۔''

''میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی سکندر! مگر اپنے origin کو اپنی ذات سے اکھیڑ کر پھینکنا بھی ممکن
نہیں ہے میرے لیے۔'' اس کا لہجہ ابھی بھی ویسا ہی تھا۔ ''یہ میری مجبوری ہے۔''

''مجبوری کیا ہوتی ہے؟ صرف ایک احساس اور اس احساس سے پیچھا چھڑوانا ذرا بھی مشکل نہیں
ہے۔'' اس کا انداز خاصا لاپروا تھا۔

''مگر کیسے؟''

''وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جنہیں آپ مجبوری کا نام دے کر تبدیل نہیں کر سکتے انہیں پھولوں کی طرح
دھاگے میں پرو کر گلے میں مت پہنیں۔ انہیں گلے سے اتار کر جوتے کے نیچے لگا دیں۔ آپ کا ہر اٹھتا قدم
آپ کو یقین دلائے گا کہ آپ مجبور نہیں ہیں آپ مجبوری کو خود ہی روند ڈالیں گے۔''

''تم یہ کہہ سکتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کیونکہ تمہیں یہ سب آسان لگتا ہے۔ تمہارے یا تمہارے باپ کے
نام کے ساتھ کوئی ایسا حوالہ نہیں ہے جو تمہاری گردن جھکا دے اور اسے جھکا رہنے پر مجبور کر سکے۔ جبکہ میں
کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی کجا کہ اس کو کرنا۔'' اپنا ماضی بھلانا آسان نہیں ہوتا اور یہ سب تو یوں بھی

ماضی نہیں ہے میری ماں، بہن آج بھی اسی کام سے منسلک ہیں۔"

اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی سکندر کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

"تم یہ سب فراموش کر کے تو دیکھو روشنی! میں ہوں نا تمہارے ساتھ...... تمہارا دوست۔"

"تم ہمیشہ اپنے اور میرے رشتے کی وضاحت نہ کیا کرو سکندر! میں جانتی ہوں کہ ہم دوست ہیں"

سکندر نے اس کو ذرا حیرانی سے دیکھا تھا۔ روشانے نے اگرچہ تحمل سے کہا تھا مگر کچھ یوں جیسے گویا اسے یہ بات بری لگی ہو۔

"میری بڑی بہن نے یہ حقیقت بھلانے کی کوشش کی تھی جانتے ہو اس کے ساتھ کیا ہوا؟ اسے خودکشی کرنی پڑی اور اب ربا...... مجھے اس کی بہت فکر ہے جانتے ہو ایک فلم پروڈیوسر سے محبت کرتی ہے۔ میں اپنی بہن سے بہت محبت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ جو وہ چاہتی ہے اسے مل جائے۔

کبھی کبھی تو مجھے خدا پر بھی غصہ آنے لگتا ہے۔ بھلا کس بات کی سزا دی اس نے ہمیں۔ ہمیں بنایا، حسن دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دل بھی عام عورتوں جیسا دے دیا اور نام رکھ دیا طوائف۔

کم سے کم کوئی ایک چیز تو ایسی ہوتی جو ہمیں بھی ممتاز یا برابر کر دیتی۔ اب ہم اس معاشرے کی ضرورت ہیں مگر اس کا حصہ نہیں۔ اب عورتیں ہمیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ بچے ہم سے نفرت کرتے ہیں اور مرد...... مرد ہمیں استعمال کرنا جانتا ہے وہ ہمیں ایک گھر نہیں دے سکتا۔

سب لوگ ہمیں غلیظ سمجھتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ ان غلیظ وجودوں میں دھڑکنے والا دل عورت کا ہے جو ایک پرسکون اور عزت دار زندگی کی خواہاں ہے۔ جو مرد کی ہمراہی میں ایک گھر دیکھتی ہے۔"

"کیا تم بھی ایک گھر حاصل کرنا چاہتی ہو روشنی۔" اس نے پوچھا تھا۔ روشانے پھر [illegible] تھی۔

"میں نے کہا نا چاہے مجھ پر طوائف کا لیبل چسپاں ہے مگر میرے سینے میں بھی دھڑکنے والا دل عورت کا ہے جو گھر کی خواہش کرتا ہے۔ جہاں سکون ہو، عزت ہو اور...... اور سب کچھ ہو جسے میں اپنے ہاتھوں سے سجا سکوں اپنے ہاتھوں سے بگاڑ سکوں۔"

سکندر کو وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں لگی تھی۔

"اور اگر یہ گھر تمہیں میرے حوالے سے ملے...... تو؟" اس نے بنا ایک لمحہ ضائع کیے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

"تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو؟" یقیناً اس کے لیے یہ بات غیر متوقع تھی۔ وہ بے یقینی سے ... تھی۔ وہ مجروح سے انداز میں ہنسا تھا۔

"تم مجھے کبھی سمجھ نہیں سکیں اور تم کبھی مجھ پر یقین بھی نہیں کرتیں۔ بہرحال میں تمہاری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں اور یہ میری خواہش ہے کہ جو گھر تمہارا ہو اس کے ساتھ میرا حوالہ جڑا ہو۔ بتاؤ نا روشنی کیا تم وہ گھر قبول کرلو گی جو کہ میرا بھی ہو۔"

کہتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ روشانے نے ایک نظر اس کے ہاتھوں کو بہت جذب سے دیکھا تھا اور خوشی کی شدت سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا۔

"ہاں۔"

سکندر نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیے تھے۔

عورت کی ایک "ہاں" بہت سی باتوں پر قبولیت کی مہر لگا دیتی ہے اور ان باتوں میں وہ تمام باتیں شامل ہوتی ہیں جو اسے ناپسند ہوتی ہیں اور جو اسے پسند ہوتی ہیں۔

+

صبح دس بجے کے قریب وہ روشانے کو رخصت کرنے دروازے تک آیا تھا۔ اسی وقت احمر آ گیا تھا۔ روشانے چلی گئی تھی اور احمر اندر آ گیا تھا۔

"یہ روشانے اس وقت یہاں؟"

"وہ رات بھر یہیں تھی۔" اس کی حیرانگی کے جواب میں سکندر نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا اور اس کے تاثرات جانچنے لگا تھا۔ اس کے انداز میں فقط تعجب اور بے یقینی تھی۔

"ہیں...... یعنی کہ ساری رات؟"

"ہاں ساری رات۔" اس نے کندھے اچکا کر یوں کہا گویا یہ عام سی بات ہو اور واقعی یہ عام سی ہی بات تھی۔

"مگر ساری رات...... وہ یہاں کیا کرتی رہی؟" احمر کی معلومات ایسے معاملات میں قدرے محدود تھیں۔

سکندر نے گھور کر اس کی احمق شکل کو دیکھا۔

"گرامر کا کورس کرنے آئی تھی۔ ساری رات اس کے اسرار و رموز سمجھتی رہی۔"

سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کا تکیہ رکھتے ہوئے اس نے چھت پر نظریں گاڑ دی تھیں۔

کل شام میں برسنے والی مسلسل و متواتر بارش نے چاہے شہر میں جتنی بھی تباہی مچا دی ہو مگر یہ بارش اس کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی تھی۔

اگر کل بارش نہ برسی ہوتی تو یقیناً وہ، یہ سرور نہ حاصل کر پایا ہوتا۔ (اتنی جلدی) اگرچہ ایسا نہیں تھا کہ

وہ ''لطف'' کی اس حد تک پہلی بار شناسائی حاصل کر سکا تھا مگر روشانے قمر کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔
اپنے نام کی طرح تھی ''چاند کی طرح روشن''۔

سکندر کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ جو لڑکی ہنستے ہوئے پاگل کرتی ہے، روتے ہوئے پاگل
خود کر دے گی۔ وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ روتے ہوئے زیادہ حسین لگتی ہے یا ہنستے ہوئے
کبھی کبھی خواب اور حقیقت میں سے زیادہ خوب صورت کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے؟!
اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا بہر حال جو بھی ہوا تھا وہ کافی مسحور کن اور مبہوت کر دینے کی حد
تھا۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا بھلا...... روشانے جیسی لڑکی بھی ایسی ہو سکتی ہے۔'' احمر نے دکھ...
وہی ہمدردی کا ابال اس وقت دکھ میں بدل گیا تھا۔

''تم ایک طوائف سے اور کیا توقع کر سکتے ہو۔'' سکندر نے کہا تھا۔ بے شک وہ مبہوت تھا مگر
اس کے باوجود وہ حقیقت سے نگاہیں نہیں چرا سکتا تھا۔

کل رات جو بھی ہوا روشانے اس میں نہ صرف برابر کی شریک رہی بلکہ بار رضا بھی تھی اور جب
کی اپنی رضا بھی شامل ہو تو تنہائیاں کچھ اور حسین ہو جایا کرتی ہیں۔

+

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟''
وہ بدک کر پیچھے ہٹا تھا۔

''اس میں غلط کیا ہے سکندر؟'' سکندر نے بے حد نفرت سے اسے دیکھا تھا اور پھر ہاتھ میں...
گول مول کر کے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کچھ روز میں یہ مطالبہ ہوگا لیکن اتنی جلدی غیر متوقع...

''اول تا آخر سب غلط ہی تو ہے...... ایک طوائف کو وائف بنانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

وہ استہزائیہ بولا تھا۔ اپنے دل کی نفرت و حقارت کو لفظوں میں ڈھال کر اس تک پہنچاتے ہو...
نے مڑ کر دیکھا تھا۔ روشانے جس جگہ کھڑی تھی اب وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔
اس نے اپنی شرٹ کے کھلے بٹن بند کیے تھے اور کار کی چابی اور والٹ اٹھاتے ہوئے پھر ا...
تھا۔ اس کی چوٹی پھسل کر آگے آ گئی تھی۔ وہ کارپٹ پر دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ...
کے تاثرات دیکھ نہیں پایا تھا مگر اس کی شکل نہ دیکھ سکنے کے باوجود وہ اس کی سوچ سے واقف تھا۔
ہارے ہوئے انسان کے پاس سوچنے کے لیے اپنی ہار کے اسباب، وجوہات اور موجودہ حالات...
ہیں۔ جنہیں اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں بھر بھر کر وہ اپنے سر میں خاک کی طرح انڈیلتا ہے۔...

اس لمحے سے گزر رہی تھی۔
وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آ گیا تھا اور پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔
چند لمحے وہ اسے تمسخر آمیز ترحم سے دیکھتا رہا پھر کئی نوٹ اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔
''یہ آج کی قیمت ہے۔ میں تمہارے تمام واجبات ادا کر چکا ہوں اب مجھ پر کچھ بھی واجب الادا نہیں
ہے۔ ہمارے تمام حساب برابر ہو گئے۔
اور ہاں زندگی میں کبھی فرصت ملی تو تمہارے آستانے پر حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ جانتا ہوں کہ تم
اور تمہاری جیسی تمام باعصمت خواتین اپنے در ہمارے لیے ہمہ وقت کھلے رکھتی ہیں۔ ہاں بھئی ہم جیسے امرا تو
بڑی بزرگی بھی کرتے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔
''اچھا خیر چلتا ہوں ڈپارٹمنٹ میں تو ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ کسی چیز کی یا رقم کی ضرورت ہو تو بلا
جھجک مجھ سے کہہ دینا۔ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔''
اس کے بعد روشانے قمر یوں غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ
جس طرح اچانک آ کر سب کے حواسوں پر چھا گئی تھی بالکل ویسے ہی اچانک منظر سے غائب ہو کر حواسوں
سے دور بھی ہو گئی تھی۔

اپنے حساب سے وہ روشانے قمر سے آخری ملاقات کر چکا تھا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک بار پھر
اس سے آمنا سامنا ہوگا۔

اس نے اسے پورے چار ماہ بعد دیکھا تھا اور جس حلیے اور حیثیت میں دیکھا تھا وہ خاصا اعصاب شکن
تھا۔

اس کی بساط الٹ چکی تھی۔

+

''میں زندگی میں کبھی نہیں ہارا۔ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔''
میرے کان کے بہت قریب کسی نے بہت دھیمے سے سرگوشی کی تھی۔ کسی کے پُرغرور و پُرعزم لہجے نے
میرے ذہن کے دروازے پر بڑی زور سے دستک دی تھی۔
یہ بات کس شخص نے، کب اور کس انداز میں کہی تھی میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں کہ وہ شخص ابھی کچھ
دیر پہلے ہم سب کے سامنے رنگین پایوں والی کرسی پر براجمان تھا۔
میں اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ وہ جتنی دیر یہاں رکا کون سی سوچ اس کے دامن گیر رہی ہوگی۔
اگرچہ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ بساط کے یوں پلٹے جانے پر نا صرف حیران

بلکہ کچھ کچھ پریشان بھی ہوگا۔

کچھ بار حیا اور کچھ مسکارے کے بوجھ سے جھکی پلکوں کو نزاکت سے اٹھا کر میں نے ایک نظر
دیکھا بھی تھا اور پھر فوراً ہی نگاہیں اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر ٹکا دی تھیں۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا
اس کی گہری براؤن آنکھوں میں چپقلش، رنجش، حقارت، غصہ اور نفرت جیسی کوئی ایک چیز بھی نہیں تھی
فقط حیرانی ہی حیرانی تھی۔ اسے حیران ہی ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر
ہوش اڑے تھے۔ اب ایسے میں وہ مسرت آمیز دھمال تو ڈال نہیں سکتا تھا۔

ساٹھ کی دہائی کے بھاری فرنیچر سے آراستہ اس کمرے میں ہوش اڑا دینے والی دو ہی چیزیں
ایک میں اور دوسرا میرا دلہناپا۔

سکندر مبین حیات کے لیے یہ دونوں چیزیں ہی حیران کن تھیں۔ حیران کن چیزیں وہی ہوتی ہیں
توقعات کے برعکس ہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ سکندر مبین حیات کے ساتھ ہوا وہ اس کی توقعات کے
تھا۔ بعض دفعہ شکست انسان کو انگشت بدنداں کر دیا کرتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ سکندر مبین حیات
شکست سے دوچار ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے سکندر سے کہا تھا۔ ''نام سکندر رکھ لینے سے تقدیریں سکندری نہیں ہو
جاتیں۔''

اور تب اس نے گردن تان کر کہا تھا۔

''سکندر کی تقدیر بھی سکندری ہے۔ میں کبھی نہیں ہارا کیونکہ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔'' اور اب
دل چاہ رہا ہے کہ اس کی شکست پر قہقہے لگاؤں اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوں پھر پوچھوں۔

''کیوں میاں کہاں گئی وہ سکندری تقدیر جس پر آپ کو بڑا مان تھا۔''

لیکن چونکہ میں دلہن تھی اور مجھے شرمانا چاہیے تھا۔ سو میں وہی کر رہی تھی جو کہ موقع کا دستور تھا
وہ میری سوچ پڑھ چکا تھا تبھی وہ اس کمرے سے چلا گیا۔ ممکن ہے کہ اپنے اونچے شملے والے باپ
حقیقت سے آگاہ کرنے گیا ہو جس سے وہ پہلے ہی واقف ہے۔

لیکن نہیں...... اپنی عزت کو وہ کیسے رگید سکتا ہے۔ یہ تو اس بڑی حویلی کی شان نہیں ہے اور اب
چونکہ اس حویلی کی زینت بن چکی ہوں تو وہ اس زینت کو بٹا نہیں لگا سکتا۔

مجھے دلہن کے روپ میں دیکھ کر کتنی آگ لگی ہوگی۔ کتنے پیچ و تاب کھائے ہوں گے اس نے
کے دل و دماغ میں ہار کی اینٹھن اٹھی ہوگی۔ کتنا تلملایا ہوگا وہ۔ میں اس سب سے واقف ہوں۔ کیونکہ
بھی یہی سب محسوس کر چکی ہوں محض اس کی وجہ سے میں بھی صرف ایک نہیں بلکہ کئی راتیں تکلیف
پر سر رکھ کر سوئی تھی۔ صرف اس سکندر مبین حیات کی وجہ سے جسے اپنی تقدیر کے سکندری ہونے پر مان تھا

ہارنا کسی کو سکھایا نہیں جاتا۔ جیتنا بھی کسی کو سکھایا نہیں جاتا۔ یہ تو وہ ہنر ہیں جو انسان خود بخود سیکھتا

مجھے بھی جیتنا نہیں سکھایا گیا تھا کبھی ہارنا بھی نہیں سکھایا گیا تھا مگر صرف سکندر مبین حیات کی وجہ سے
مجھے ہار سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

کچھ کام انسان کو بغیر سیکھے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ سکندر کو بھی بغیر ہارنے کا فن سیکھے ہارنا پڑا تھا۔ کبھی
کبھی سکندری تقدیر ایسے موڑ بھی اختیار کرتی ہے جن سے انسان نہ منہ موڑ سکتا ہے اور نہ سامنا کر پاتا ہے۔
پنجاب سے زکریا یونیورسٹی تک کا مائیگریشن محض ایک احتیاطی تدبیر تھی۔

اگرچہ لاہور میں بھی مجھے بہت زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ میرا حلقہ احباب بے حد محدود تھا۔ جسے
چاہتے ہوئے بھی میں وسیع نہیں کر سکتی تھی وجہ ظاہر ہے کہ میرا ''اصل'' تھا۔ بس احتیاطاً ہی کسی متوقع خفت
سے بچنے کے لیے میں دو ماہ کے اندر ہی اندر ملتان آ گئی تھی مگر مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ایک بہت
بڑی مصیبت میری منتظر ہے۔

+

''میں آتا ہوں، میں دیکھتا ہوں اور میں فتح کر لیتا ہوں۔''

سکندر مبین حیات کی آنکھوں میں جو پہلی تحریر میں نے دیکھی وہ یہی تھی جو صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ
اس کا ہر انداز ہمیشہ چیخ چیخ کر یہی کہتا تھا۔

گر گیا ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ڈپلومیٹک رویے سے مات کھاتی آئی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا
تھا۔ حالانکہ عرشیہ نے مجھے اول روز ہی وارن کر دیا تھا۔

''یہ سکندر مبین حیات ہے۔ ذرا بچ کر رہنا اس سے، محترم زمیندار گھرانے کے اکلوتے چشم و چراغ
ہیں۔ ہر خوب صورت لڑکی کو اپنی ہپ پاکٹ میں رکھنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہیں اور لڑکیوں پر ندیدی
نظریں ڈالنا ان کا فریضہ ہے۔''

اس کی اس تعریف پر میں مسکرا ہی سکتی تھی سکندر مبین حیات اس وقت کلاس میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے
اسے ایک نظر دیکھا بھی تھا۔ عرشیہ کی کہی باتوں پر اس وقت تو ایمان لانا مشکل تھا البتہ اس شخص کی غیر معمولی
وجاہت واقعی قابل ستائش تھی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس وقت میں متاثر ہوئی تھی اور میرے ذہن میں
ایک بات نے ضرور سر ابھارا تھا کہ ممکن ہے ''عرشیہ اپنی کسی ذاتی چپقلش کی بنا پر اس کی کردار کشی کر رہی
ہو۔'' مگر میری یہ سوچ کچھ دیر بعد غلط ہو گئی تھی۔

کلاس میں ہونے والی اچھی خاصی سنجیدہ ڈسکشن کے دوران جس طرح سے اس نے میرے پوائنٹ

آف ویو کو رگیدا تھا وہ مجھے خاصا ناگوار گزرا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت اس کا پوائنٹ غلط یا بے معنی
اس کا بات کرنے کا انداز غلط تھا۔ محض چند جملوں کے تبادلے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ شخص بحث
برائے بحث کا قائل ہے۔

’’لڑکیوں کے مسائل سمجھنے کے لیے لڑکی بن جاؤ۔‘‘

’’جانوروں کے مسائل سمجھنے کے لیے جانور۔‘‘

مجھے کچھ اس قسم کے جملوں اور طنزیہ قہقہوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اپنی ناگواری کو قابو کرتے ہوئے میں
نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموش رہوں۔ اس کلاس کے فوراً بعد سکندر مبین حیات نے مجھ سے نوٹس مانگے تھے
میں نے صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ اس سے قبل میں بہت سے لوگوں کو اپنے نوٹس دے چکی تھی جن میں
لڑکے لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مجھے ہمیشہ دوسروں کے کام آ کر خوشی محسوس ہوتی تھی لیکن سکندر کو انکار
کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی برا نہیں لگا تھا۔ میرے دل نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ اس شخص سے کسی
بھی قسم کا رابطہ نقصان دہ ہو سکتا ہے پھر چاہے وہ نوٹس کے لین دین تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ اپنے انکار کے
جواب میں، میں نے اسے مسکراتے دیکھا تھا اور اس کی مسکراہٹ خاصی طنزیہ تھی۔ جس پر مجھے اپنی رائے
مثبت رہ جانے کا خدشہ تھا وہ بھی خراب ہو گئی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ بے حد بری لگی تھی اتنی دیر تک جو
اپنے لہجے کو نارمل رکھے ہوئے تھی وہ فوراً سخت ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اس طرح سے وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا مگر حقیقتاً یہ میری غلط فہمی تھی یہ تو آغاز تھا
میں سمجھ نہیں سکی تھی کہ سکندر کی یہ خاص عنایات صرف میرے لیے ہیں یا وہ ہر لڑکی کو اسی طرح سے ٹریٹ کرتا
ہے۔

کلاس روم میں وہ، بیٹھنے کے لیے میری چیئر سے قریبی چیئر چنتا تھا۔ کینٹین میں جس ٹیبل پر میں ہوتی
تھی اس کے قریب ٹیبل پر بیٹھتا تھا۔ ہر روز مجھے لفٹ کی آفر بھی ضرور کرتا تھا اور بار بار بلاوجہ مخاطب بھی کرتا
تھا۔ نجانے کیوں اسے میرے چہرے پر لگا نو لفٹ کا بورڈ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا حالانکہ ڈپارٹمنٹ کے
تمام لڑکے جو مجھے مخاطب کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے سبھی اپنی اپنی راہ لے چکے تھے سوائے
کے۔

مگر اسے مسلسل نظر انداز کرنے کی کوشش کامیاب رہی تھی۔ وہ نو دن خاصے سکون سے گزرے تھے
سکندر ان دنوں اگرچہ ڈپارٹمنٹ آتا تھا مگر اب اس نے مجھے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا اور میں نے بھی
سکون کا سانس لیا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ عرشیہ کی کہی ہوئی باتوں کا اثر ہو مگر میں سکندر مبین حیات کے بارے میں کوئی بھی مثبت
رائے قائم نہیں کر سکی تھی کچھ تو ڈپارٹمنٹ میں اس کے قصے مشہور تھے پھر کچھ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ

کوئی بھی اس کے بارے میں مثبت نہیں سوچ سکتا تھا۔
صنف مخالف سے نہ کبھی میں نے سخت رویہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی۔
مخاطب کرتا تو بات کر لیتی اور اگر نہ مخاطب کرتا تو پروا کسے تھی۔ مگر میرا انداز ہر ایک سے ہلکا پھلکا
ہی رہا تھا۔ کیونکہ ہر دو طرح سے آپ دانستہ یا نادانستہ طور پر دوسروں کو اپنے بارے میں متجسس کر
دیتے ہیں اور یہی تجسس میرے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔
میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ سکندر مبین حیات کی فضول سی گفتگو پر کان بند کر لوں اور اگر کان کھلے رہ
جاتے تو کم سے کم زبان پر ہی قابو رکھ لوں مگر نجانے وہ شخص کس مٹی سے بنا تھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات
کر دیتا تھا کہ اپنے آپ پر بے تحاشا قابو رکھنے کے باوجود میں اس کی بات کا جواب دے دیتی تھی اور وہ
باتوں سے باتیں نکال کر سامنے والے بندے کو زچ کر دینے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

✦

کلاس میں میری اسائنمنٹ پسند کی جاتی تھی۔ اکثر کلاس میٹ اسی کوشش میں ہوتے تھے کہ میری
اسائنمنٹ کاپی کروا لیں۔ ٹیچرز میری رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ محض ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی اندر میں کلاس
کے بہترین اسٹوڈنٹس میں شمار ہونے لگی تھی اور یہ مجھ جیسی لڑکی کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایسا نہیں تھا
کہ میں کوئی بہت آؤٹ اسٹینڈنگ تھی اور کم پڑھائی کر کے بھی یہ مقام حاصل کر رہی تھی۔ اسائنمنٹس تیار
کرنے کے لیے مجھے کئی گھنٹے سر کھپانا پڑتا۔ کسی بھی ٹاپک پر وسیع تر معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کئی کئی
طلباء سے سر کھپانا پڑتا تھا اور پھر کہیں جا کر میں اس قابل ہوتی تھی کہ پورے اعتماد سے اس موضوع پر
بول سکوں۔

کچھ دن سکون سے گزرے تھے اور ایک دفعہ پھر سکندر مبین حیات کے ڈرامے کی نئی قسط چل پڑی
میرا خیال تھا کہ اس کی دوستی والی پیشکش کے جواب میں کورا جواب سن کر وہ غیرت مندوں کی طرح
میرے راستے میں نہیں آئے گا مگر وہ ڈھیٹ نہیں ڈھیٹوں کا سردار تھا غیرت کرنا تو اس نے سیکھا نہ تھا۔
اپنے وجود کا احساس دلانے پہنچ جاتا تھا۔

یونین الیکشن کے غلغلے نے تقریباً ساری یونیورسٹی کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ اس روز کلاسز آف
تھیں مگر مجھے پروفیسر ہاشمی کی اسائنمنٹ کی وجہ سے آنا پڑا تھا۔ وہ خاصے سخت ٹیچر تھے اور اسی وجہ سے اکثر
سٹوڈنٹس ان سے خائف رہتے تھے۔ اسائنمنٹ جمع کرانے کا وہ آخری دن تھا۔ لہٰذا میرے علاوہ کچھ اور
بھی آئے ہوئے تھے۔ مریم، عرشیہ اور فہمینہ پہلے ہی اسائنمنٹ جمع کروا چکی تھیں۔ اسائنمنٹ جمع کروا
کر پروفیسر ہاشمی کے آفس سے باہر نکلی تو موسم خاصا اچھا ہو چکا تھا ہلکے ہلکے بادل آسمان پر ہوا کے دوش

پر اڑتے پھر رہے تھے۔ بہار کی آمد ہی آمد تھی پچھلے کچھ دنوں سے بے رنگ ہوا ڈیپارٹمنٹ کالان لہلہا رہا تھا۔

میں وہیں سیڑھیوں میں بیٹھ کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے کچھ دیر ہی گزری جب میں نے ایک عجیب سا احساس محسوس کیا تھا۔ اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی موڑ کر دیکھا۔ دو تین فٹ کے فاصلے پر میری والی سیڑھی سے نچلی سیڑھی پر سکندر معین حیات بیٹھا ہوا تھا نے کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اسے اس طرح طرف دیکھتا پا کر میں حقیقتاً اندر تک کڑوی ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟" میرے دیکھنے پر اس نے جھٹ سے بڑے دوستانہ انداز میں تھا۔ اور میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کہہ دوں "تمہارے آنے سے پہلے تو بہت اچھی تھی البتہ اب ہوں۔" مگر میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے یوں بتایا تھا جیسے میں اس کی خیریت جاننے کے لیے بے ہوں۔

"آپ آج تنہا آئی ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"جی۔" میں نے جان بوجھ کر اختصار سے کام لیا تھا۔

"میں نے آپ کو تنہا بیٹھے دیکھا تو سوچا شاید آپ بور ہو رہی ہوں۔ تبھی کمپنی دینے آ گیا۔"

"ناحق زحمت کی آپ نے میں بور قطعاً نہیں ہو رہی تھی بلکہ میں تو ہمیشہ تنہائی کو انجوائے کرتی ہوں"

میں نے حتی المقدور لہجہ روکھا رکھا تھا پتا نہیں اس پر اثر ہوا تھا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہو گیا تھا طویل خاموشی یقیناً اس کے مسلک میں کفر تھی۔

"آپ کو معلوم ہے یونین صدر کے انتخاب کے لیے ووٹنگ پرسوں ہوگی۔"

"جی۔"

"کس کو ووٹ دیں گی آپ۔" نجانے اسے ان معلومات میں کیا دلچسپی تھی۔

"علی حسن کو۔"

"کوئی خاص وجہ۔" میں نے تیکھی سی نظر اس پر ڈالی پھر جواب دیا۔

"ظاہر ہے وہ میرا ڈیپارٹمنٹ فیلو ہے اب اس کے علاوہ میں اور کسے ووٹ دے سکتی ہوں۔"

"اگر میں یونین الیکشن میں حصہ لوں تو کیا آپ مجھے ووٹ دیں گی؟" اس کا سوال میرے لیے غیر متوقع تھا۔ میں نے پہلے متعجب ہو کر اسے دیکھا اور وہ بے حد جاندار طریقے سے مسکرا رہا تھا اور

میں بے حد اشتیاق کے ساتھ ہی شرارت بھی وافر مقدار میں تھی۔

"نہیں۔" میں نے جلا کر کہا۔ "مجھے اپنا ووٹ ضائع کرنے کا شوق نہیں ہے۔"

"ارے کیوں بھئی! میں تو آپ کا کلاس فیلو بھی ہوں اور پھر آپ کا ووٹ ضائع کیسے ہوگا۔"

وہ بڑے تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

"ہار تو آپ نے یوں بھی جانا ہے پھر اپنا ووٹ آپ کو دے کر میں کسی اور کا نقصان کیوں کروں۔"

میں نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں وضاحت دی۔

"ساری دنیا کا احساس دل میں لیے گھوم رہی ہیں۔ کچھ ادھر بھی دھیان دیجئے۔ میں بھی اس بنی نوع انسان میں سے ہوں آپ کی ایک ہاں بڑی سودمند ہو سکتی ہے میرے لیے۔" میں نے اس کی بات پر دھیان دینا مناسب نہ سمجھا۔

"ویسے ایک بات بتاؤں مس روشانے اگر میں الیکشن میں کھڑا ہو گیا تو جیت صرف میری ہو گی۔ چاہے آپ مجھے ووٹ دیں یا نہ دیں۔" اس کا پرزعم لہجہ مجھے اندر تک جھلسا گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں "میں آتا ہوں، میں دیکھتا ہوں، میں فتح کر لیتا ہوں۔" والا تاثر پوری شان سے چمک رہا تھا۔

"نام سکندر رکھ لینے سے تقدیریں سکندری نہیں ہو جاتیں۔" میں چاہتے ہوئے بھی اپنی ناگواری چھپا نہ سکی تھی۔ میری بات سن کر وہ ہنسنے لگا تھا۔ بالکل ایسے جیسے میری بات سے لطف لے رہا ہو۔ اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھ کر اپنی گردن تان کر کہا تھا گویا کسی کم فہم بچے کو سمجھایا جا رہا ہو۔

"سکندر کی تقدیر بھی سکندری ہے۔ میں کبھی نہیں ہارا کیونکہ مجھے ہارنا سکھایا ہی نہیں گیا۔"

مجھے اس کا لہجہ، اس کا انداز، اس کی شکل، اس کی آواز سب کچھ ہی بہت برا لگا تھا۔

"کچھ کام بغیر سیکھے بھی کرنے پڑتے ہیں سکندر صاحب! ذرا دیکھ بھال کر چلیے کہیں ایسا نہ ہو منہ کے بل گرنا پڑے۔" میں نے اسے تنبیہ کی تو وہ کسی قدر میری طرف گھوم گیا۔ اس کے لبوں پر بڑی محظوظ کن سی مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ اول روز سے مجھے زچ کر رہی تھی۔

"کچھ لوگ پیدائشی ہارے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ کون سے لوگ ہوتے ہیں کبھی فرصت سے آپ کو بتاؤں گا۔ فی الحال تو آپ یہ بتائیے کہ آپ میری شکست پر اتنی پریقین کیوں ہیں؟"

"آپ اپنی جیت پر اتنے پریقین کیوں ہیں؟" میں نے سوال در سوال کیا تھا حالانکہ میرا ایسا ارادہ نہیں تھا۔ میری برجستگی پر اس نے ابرو اچکائے تھے۔

"آپ اسے خود آگاہی کہہ سکتی ہیں۔"

"مگر میں اسے خوش فہمی کہتی ہوں۔" میں نے پھر تیزی سے کہا تھا مگر اس کا زعم کم ہونے میں نہیں آ رہا

تھا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اگر میں الیکشن میں کھڑا ہوا تو جیت میری ہی ہو گی۔'' وہ ابھی بھی پُر...
مجھے مزید تاؤ آ گیا۔ خاموش رہنے کا معاہدہ رائیگاں ہی گیا۔

''اول تو الیکشن میں کھڑے رہنا ہی آپ کے لیے مشکل ہے اور اگر رہ بھی گئے تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ جلد ہی بیٹھ جائیں گے۔ میں اس پر شرط بھی لگا سکتی ہوں۔''

میں جانتی ہوں کہ اس وقت کے حساب سے یہ بہت بڑا دعویٰ تھا مگر مجھے اس وقت وہ بہت برا لگ رہا تھا لہٰذا میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھی۔

''سوچ لیجیے مس روشانے! کیونکہ ناکام ہونے کی صورت میں آپ کو وہی کرنا پڑے گا جو کہ میں کہوں گا۔'' وہ تو جیسے اپنی جیت کنفرم کیے بیٹھا تھا۔

''مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں ہار آپ کی ہی ہو گی۔'' میں نے بڑ[ے] اطمینان سے کہا تھا اگر پُر وثوق وہ تھا تو پُر یقین تو میں بھی تھی۔

''ہار میری نہیں ہو گی بلکہ 'ہار' میرے ہوں گے اور وہ بھی فتح کے۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''مگر مجھے وہ فتح منظور نہیں ہو گی کیونکہ اس میں آپ میرے ساتھ شامل نہیں ہوں گی۔''

مجھے اس کی چالاکی پر ہنسی آ گئی تھی جسے میں نے ضبط کر لیا تھا۔

''اب خوامخواہ میرے کندھوں پر رکھ کر بندوق تو مت چلائیں۔''

''توپ چلا دیں۔'' اس کا انداز دوستانہ تھا۔ وہ ناقابل اصلاح تھا میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کھڑ[ی] ہوئی تھی جب وہ بولا تھا۔

''ویسے ایک بات ہے آپ مانیں یا نہ مانیں ہماری صحبت نے آپ کو باتیں کرنے کا فن سکھا[دیا] ہے۔''

''اف......'' میرا دل چاہا اپنا سر پیٹ لوں اس شخص کو ہر کریڈٹ اپنے سر لینے کا خبط تھا۔ اب میر[ی] حاضر جوابی کو بھی وہ اپنی ہی کرم فرمائی سمجھ رہا تھا۔

''ہر برا کام شیطان کی صحبت ہی سکھاتی ہے۔'' میں طنز سے مسکرائی۔

اب وہاں مزید ٹھہرنا میرے لیے مشکل تھا اور اپنے پیچھے میں نے سکندر کو ہنستے سنا تھا۔

✦

سکندر کی مستقل مزاجی پر میں جتنا بھی کڑھتی وہ کم تھا۔ ہمیشہ تنہا پا کر وہ مزید شیر ہو جاتا تھا۔ ایسا نہیں [تھا] کہ اس نے کبھی کوئی غیر اخلاقی حرکت یا بات کی ہو۔ مگر مجھے اس سے چڑ سی تھی جو اس کی حرکتوں پر مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ہر دفعہ ناگواری سے بات کرنے کے باوجود وہ مجھے بار بار مخاطب کرتا تھا۔

اس روز میں مریم اور ثمینہ کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی چونکہ کچھ پڑھائی کا ارادہ تھا تبھی ہم لوگ دیگر لوگوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب مریم نے بھوک بھوک کا شور کر دیا۔ میرا کینٹین جانے کا ارادہ نہیں تھا تبھی وہ دونوں چلی گئیں۔ مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ ابھی وہ مصیبت ٹپک پڑے گی تو میں بھی چلی جاتی۔

سکندر نے کچھ دیر بے تکی سی گفتگو کے بعد پھر سے مجھے فورس کرنا شروع کر دیا تھا۔

''میں آپ کو وارن کر رہی ہوں سکندر صاحب! اگر آپ نے اپنی حرکتوں سے پرہیز نہ کیا تو میں ڈپارٹمنٹ کی اتھارٹیز سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔''

میں جانتی ہوں یا میرا خدا...... کہ یہ دھمکی میں نے کس قدر راکتا کر دی تھی مگر مجھے رتی بھر اندازہ نہیں تھا کہ اب مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات کسی بھی صدمے سے کم نہیں تھی کہ وہ میری حقیقت سے واقف ہے۔

''چلو ہم اسی وقت ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس چلتے ہیں۔ تم انہیں یہ بتا دو کہ میں تمہیں دوستی کی آفر کر رہا ہوں اور میں انہیں یہ بتا دوں گا کہ تم کتنی اثر و رسوخ والی ہو۔ کتنے ستاروں والے جھنڈوں والے تمہارے آستانے پر حاضری دینے آتے ہیں۔ تم کون سے علاقے سے تعلق رکھتی ہو تمہارا اصل نام کیا ہے تمہارے خاندان کا پیشہ کیا ہے میں سب بتا دوں گا انہیں پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کس کے خلاف ایکشن لیتے ہیں اور کسے investigate کرتے ہیں۔''

وہ بول چکا تھا اور میں بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ایک بار پھر میرا سامنا اسی خفت سے ہوا تھا جس سے میں ہمیشہ پہلو بچاتی آئی تھی اور جو بچپن سے میری راہ میں پتھر بکھراتی آئی تھی۔ میں اب تک سمجھ نہیں سکی کہ میری غلطی کہاں نکلتی ہے۔ کیوں مجھے ایک ایسی جگہ پھینک دیا گیا جہاں غیرت پاؤں کے نیچے رلتی ہے اور بے غیرتی اونچے استھانوں پر براجمان رہتی ہے۔ آخر وہ کون سی خطا ہے جس کے نتیجے میں مجھے ''بازارِ حسن'' کے ایک چوبارے میں پیدا کیا گیا۔ میری ماں ایک مشہور رقاصہ تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟ میری بہن عصمت فروش تھی تو اس کا بھگتان میں کیوں بھگتوں؟

لیکن ایسے سوالوں کے جواب نہیں ملا کرتے ایک نسل کی عیاشیوں کی تو کبھی خطاؤں کی سزا اگلی نسل کو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔

اپنی قسمت کو بہت زیادہ کوس لینے اور جی بھر کر رو لینے کے بعد میں نے سکندر مبین حیات کو فون کیا تھا۔ اس کا فون نمبر میں نے کیسے حاصل کیا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ اسے ڈپارٹمنٹ آنے کا کہہ کر میں خود پہلے ہی

وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس سے دوستی کرنا اب میری مجبوری تھی چاہے میرے دل میں اس کے لیے کتنی ناپسندیدگی تھی مگر اب اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو واپس پلٹ جانے سے قبل ہی مجھے تھامنا تھا یہ موقع کا تقاضا بھی تھا اور میری مجبوری بھی۔

میرا دیک پوائنٹ اس شخص کے ہاتھ لگ چکا تھا اور اب اس کی بات نہ مان کر میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتی تھی۔ میری انکار کی صورت میں میرے ہی خلاف کچھ ایسی باتیں ڈپارٹمنٹ میں پھیلائی جاسکتی تھیں جنہیں بنیاد بنا کر مجھے با آسانی rustigate کیا جاسکتا تھا۔

پھر میں نے خود کو سکندر کی شخصیت کے مثبت پہلو دکھا کر مطمئن کر لیا تھا۔ وہ اتنا بھی برا نہیں تھا جتنا میں سوچتی تھی۔ اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو میرے لیے باعث شرمندگی ہوتی۔ ہاں وہ مجھے بار بار مخاطب کرتا تھا۔ تو یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی اور لڑکے بھی مجھے بار بار مخاطب کرتے تھے اور اس کی وجہ میرا مترنم لہجہ تھا۔ جس کی اسکول میں پھر کالج کی لڑکیوں سے لے کر ٹیچرز تک معترف تھیں۔

ہاں سکندر کی ایک خامی بہت نمایاں تھی اور وہ تھے اس کے زبان زد خاص و عام افیئرز لیکن میں نے یہاں بھی خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کون سا اس کے ساتھ کوئی افیئر چلانا ہے۔ میں اس سے ایسی ہی عام سی دوستی کروں گی جیسے دو لڑکوں کی دوستی ہوتی ہے یا دو لڑکیوں کی...... لیکن یہ میری غلطی تھی۔ میں بھول ہی گئی تھی صنف نازک اور صنف قوی کے درمیان کبھی بھی ''دوستی'' نہیں ہوسکتی۔

''مرد'' مرد ہوتا ہے اور ''عورت'' عورت ہوتی ہے۔

اور جہاں کہیں مرد اور عورت اکٹھے ہوتے ہیں وہاں شیطان بھی ضرور ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ محفل ہو یا تنہائی۔

مقررہ وقت پر جب میں ڈپارٹمنٹ کے باہر پہنچی تو وہ کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا تھا میں خاموشی سے جا کر اس کی کار میں بیٹھ گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔

''روشانے۔'' اس نے ہولے سے مجھے پکارا تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بول نہ سکی تھی۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اپنی کم مائیگی پر رونا بھی۔

اس نے مجھے پھر پکارا تھا اور اب کی بار میں نے پھر جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تمام باتیں جو میں سوچ کر آئی تھی میرے ذہن میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔

''تم کیا چاہتے ہو اسکندر؟'' اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کر کے میں نے کہا تھا میں جو کہنا چاہتی تھی وہ میں نے نہیں کہا تھا مجھے اس وقت بہت زیادہ رونا آ رہا تھا۔

''میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

''کیا......'' سکندر کی بات میرے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ میں ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔

میری حیرت پر وہ بہت دلکشی سے مسکرایا تھا۔

''کیوں؟ کیا میں تمہیں نہیں چاہ سکتا؟''

مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا حالانکہ اس کی آنکھیں مجھ سے وہ سب کچھ کہہ رہی تھیں جو میں آج تک سن نہ سکی تھی۔ میں اب بھی خاموش رہی تھی۔

''کیا کسی کو پسند کرنا غلط ہے؟ کسی سے دوستی کی چاہ کرنا غلط ہے؟ دیکھو روشانے میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری چاہ کا جواب مثبت دو مگر دوستی...... دوستی کرنے میں کیا برائی ہے۔'' اس کے لہجے میں خاصی عاجزی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ناپسند کرتی ہو۔ بہت بری سوچ ہے تمہاری میرے بارے میں۔ لیکن روشانے...... بلیو می اس برے شخص نے زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کو اس قدر مسلسل سوچا ہے۔'' اس کی تمام باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

''تم میرے origin سے واقف ہونے کے باوجود مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

''ہاں۔'' کچھ سوچتے رہنے کے بعد ایک گہری سانس کی صورت یہ ہاں اس کے منہ سے باہر آئی ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم کہاں سے تعلق رکھتی ہو یا تمہارا ماضی کیا تھا؟ یا تمہاری ماں بہنیں کیا کرتی ہیں۔ مجھے سرے سے ان باتوں کی پرواہ ہی نہیں کیوں کہ تم میرے لیے اہم ہو اور کوئی نہیں بلکہ میں تو ان باتوں کا حوالہ بھی نہیں دینا چاہتا تھا وہ تو بس...... بے اختیاری میں آئی ایم ساری روشانے! میں جانتا ہوں میری باتوں نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن تم سے دوستی کرنے کا مجھے صرف ایک یہی رستہ نظر آیا تھا۔''

اس کے لہجے میں شرمندگی اور معذرت خواہانہ انداز بھی کچھ میرے لیے عجیب تھا۔

لیکن عورت ہمیشہ مرد کے ڈپلومیٹ رویے سے مار کھاتی آئی ہے اور میں بھی ہار گئی تھی۔ مجھے اس کی اکثر باتوں پر خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔

میرے سامنے بالکل ایک نیا سکندر مبین حیات تھا جو اس سکندر سے بالکل مختلف تھا جو اب تک میں نے ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا اور لوگوں سے سنا تھا۔

میں نے اس سے دوستی کر لی تھی اور اس بات کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا کہ میں واقعی اس روز ہار گئی تھی لیکن کاش میں یہ بھی اسی روز جان لیتی کہ کتا تبھی پلٹ کر حملہ کرتا ہے جب آپ کا پاؤں اس کی دم کو کچلتا ہے۔ یا آپ کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں جھانک کر چیلنج کرتی ہیں۔ میں نے یہ دونوں کام ہی نادانستہ طور پر کیے تھے۔

میں نے اسے لنچ کی آفر کی تھی اور یہ میری منزل کی جانب پہلا قدم تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد جس مہک کو میں نے اپنے سب سے قریب پایا وہ الکحل کی مہک تھی۔

سب سے زیادہ جو آوازیں میں نے سنیں وہ گھنگھروؤں کی چھنکار تھی، کبھی طبلے کی آواز ے ہم تو کبھی ہارمونیم کے سروں سے رچی ہوئی۔ نتیجتاً مجھے ان آوازوں سے نفرت ہوگئی۔ مجھے اپنے ماحول نفرت ہوگئی اور کبھی کبھی تو مجھے خود سے بھی نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔ جب جب اپنی خوبصورتی کا ہوا اپنا چہرہ خود ہی داغنے کو دل چاہتا تھا مگر میں اتنی بہادری کبھی نہیں دکھا سکی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ میرا باپ کون ہے اور یہ تو شاید میری ماں بھی نہیں جانتی تھی اسے تو بس یہ کہ خدا نے اس پر خاص مہربانی کرتے ہوئے تین خوب صورت بیٹیوں سے نوازا ہے۔ جو حسین ہو ساتھ ساتھ خوش گلو بھی ہیں۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے ہم تینوں کو بہت پیار سے پالا تھا۔ یہ سوچ کہ اب بڑھاپے میں انہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ ان کی دونوں بڑی بیٹیوں نے ان کی ام پوری کی تھیں۔ ان دونون کی وجہ سے ہمارا انداز رہائش، ہمارے مخصوص علاقے کے رہائشیوں سے قد بہتر تھا۔ ہم ان میں بہت خوش قسمت تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن رما اور ربا کی طرح میں نے وہ تما کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میری ماں جنہیں ہم آپا جان کہا کرتے تھے بہت پریشان تھیں مگر انہو میری بات مان لی تھی۔ میں ان کی سب سے لاڈلی جو تھی مگر اس کے باوجود اس ماحول میں رہنا میری مج تھی۔ تبھی میں نے "گانا" شروع کر دیا۔ اکثر محفلوں میں میں گا کر بہت کچھ حاصل کرتی تھی۔

دراصل ہمارے یہاں آنے والے لوگوں کی مختلف ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔ کچھ عورت چاہتے ہیں عورت کی آواز...... مجھے اسی چیز نے فائدہ پہنچایا تھا اور جسم فروخت کرنے کی بجائے آواز فروخت کر ترجیح دی تھی۔ حالانکہ اپنے اس فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لیے میں نے بہت سے تردد کیے تھے۔

موسم بہار کی دس چھٹیاں گزارنے میں لاہور آئی تو آپا جان مجھ پر برسنے کو تیار بیٹھی تھیں۔

"کیا سوچا ہے تم نے...... آخر کرنا کیا ہے؟ کیسے گزرے گی زندگی؟"

"کرنا کیا ہے آپا جان! ایم اے کر رہی ہوں ذرا ڈگری ہاتھ میں آلینے دیں پھر میں اچھی سی نوکر کروں گی اور بس۔" میں نے بڑے آرام سے انہیں اپنے آئندہ منصوبے سے آگاہ کیا۔

"ہاں جیسے نوکری دینے والے تو بس اسی انتظار میں بیٹھے ہیں کہ تم ڈگری دکھاؤ اور وہ نوکری پلیٹ رکھ کر تمہیں دے دیں...... ہونہہ...... کسی خوش فہمی میں مت رہنا بی بی! آج کل نوکری دینے والے ڈگری نہیں شکل دیکھتے ہیں۔ ایم اے کو مارو گولی تم تو اگر دس جماعتیں پڑھ کر بھی نوکری مانگنے جاتی

...... اور پھر ملازمت مل جاتی اور پھر......"

تمہیں ایم ڈی کی سیکرٹری کی جلد مل جاتی اور پھر......"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا جان۔" ان کا جلا کٹا انداز مجھے الجھن میں ڈال گیا تھا۔

"انہونی باتیں تو نہیں کر رہی۔ ساری ہی سچی باتیں ہیں۔" انہوں نے پھر تڑخ کر کہا تھا پھر خاموش ہو کر انہوں نے سر ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ یہ ان کا غصہ کم کرنے کا نسخہ تھا۔

ان کے ذہنی خلفشار کی بنیادی وجہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی۔

"روشن! ہم جیسی عورتوں کے لیے تو عزت بھری زندگی کا خواب دیکھنا بھی مشکل ہوتا ہے...... میں چاہتی ہوں کہ تمہیں واقعی عزت کی زندگی مل جائے اور اس کے لیے تمہیں خود ہی تھوڑی بہت کوشش کرنی پڑے گی۔" کافی دیر بعد انہوں نے کہا تھا۔

"اس سے پہلے کہ مناسب وقت گزر جائے کچھ سوچ لو۔"

"مثلاً کیا؟"

"یونیورسٹی میں پڑھتی ہو تم، کوئی نہ کوئی ایسا شخص تمہارے حسن سے متاثر تو ہوگا۔"

"لیکن......" میں نے کہنا چاہا مگر انہوں نے مجھے ٹوک دیا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم ایسا نہیں چاہتیں لیکن کوئی بھی شریف شخص اتنی آسانی سے تم سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ یہ مرد خود چاہے کیسا بھی ہو مگر عورت پر شریف گھرانے اور شرافت کا ٹھپا ضرور ہی دیکھنا چاہتا ہے اور...... اور تمہارے پاس یہ ٹھپا نہیں ہے۔ اصول بدلنا مشکل ہوتے ہیں لیکن ناممکن نہیں۔ تمہاری خوب صورتی تمہارا پلس پوائنٹ ہے۔ اپنے اصول بدل کر اسی پلس پوائنٹ کو استعمال کرو میری جان! ڈھونڈو کوئی ایسا شخص جو تمہاری خوب صورتی سے ہی اتنا متاثر ہو جائے کہ کسی اور چیز کو اہمیت ہی نہ دے...... تم سے محبت کرے اور تم سے شادی...... شادی کر کے تمہیں عزت کی زندگی دے دے۔"

"میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کہاں سے تعلق رکھتی ہو۔"

"تم میرے لیے امپورٹنٹ ہو اور کوئی نہیں۔"

آپا جان کی آواز کے بعد جو آواز میرے کانوں میں گونجی تھی وہ سکندر مبین حیات کی تھی۔

اور میری نگاہوں نے اس کے انداز کا وارفتہ پن دیکھا تھا۔

میں مسکرانے لگی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آپا جان کے خدشات رائیگاں جائیں گے۔

میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ اتنے واضح اظہار

کے بعد اگر چہ کسی مزید بات کی ضرورت نہیں رہ جاتی مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی اس کے بعد ان
دنوں میں ہماری دوستی خاصی پروان چڑھی تھی۔

مگر جو کچھ مجھے چاہیے تھا اس کے لیے صرف دوستی کافی نہیں ہوتی مجھے "دوستی" سے کچھ بڑھ کر
حاجت تھی اور جو کچھ مجھے چاہیے تھا وہ میں بارہا سکندر مبین حیات کی نگاہوں میں دیکھ چکی تھی۔ [illegible]
معنی جملوں سے سمجھ چکی تھی اور اسی بات نے میری امید بندھائی تھی۔

مگر مجھے لفظوں کی ضرورت تھی جو اس کی نگاہوں کی تحریر کو جملوں میں ڈھال کر معتبر بنا دیں [illegible]
معنی اور پر وزن جملے ہوں جن سے کسی قسم کا جھول ہی باقی نہ رہے۔

اور یہ صرف اسی صورت ممکن تھا جب میری جانب سے بھی کوئی پیش قدمی کی جائے۔ میں جانتی [illegible]
بلکہ مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے اپنے لیے کوئی حد بندی کر رکھی ہے تو اس کی واحد وجہ صرف میرا ابتدائی
رویہ تھا تبھی میں نے اپنے اصولوں میں چند ترامیم کر لی تھیں۔

ہم سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر، کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کے لیے
اصول ضرور بدلتے ہیں۔ کبھی یہ ہماری مجبوری ہوتی ہے تو کبھی ہمارے شاطر ذہن کا "مفید مشورہ"۔ [illegible]
شاطر ذہن نے بھی ایک صحیح منزل کے حصول کے لیے ایک نسبتاً ٹیڑھا راستہ اختیار کرنے کی صلاح دی
مگر کاش میں جان سکتی کہ یہ مفید مشورہ میرے لیے ایک ایسا موٹا رسا ثابت ہوگا جس میں پاؤں الجھ کر
مجھے منہ کے بل گرنا پڑے گا۔

اس روز وہ مجھے لانگ ڈرائیو پر لے جا رہا تھا اور اتفاق سے اپنا موبائل گھر بھول آیا تھا۔

وہ مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا تا کہ گھر سے موبائل لے سکے۔ میں نے اسے ایسا کرنے کی اجازت
دے دی تھی اور یوں مجھے پہلی بار اس کا اپارٹمنٹ دیکھنے کا موقع ملا۔

بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز، قیمتی پینٹنگز اور وال پیپرز سے مزین دیواروں والا بے [illegible]
اپارٹمنٹ تھا۔ وال ٹو وال بچھے قیمتی ہینڈ میڈ کارپٹس پر قدم رکھتے ہوئے میرے دل میں واقعی ایک [illegible]
بھرتی گئی تھی۔ ایسے شاندار اپارٹمنٹ میں قیام کرنا کتنا پر لطف ہوگا؟ اگر چہ ایسا قیمتی اور آنکھوں کو [illegible]
گھر میرے خوابوں کا حصہ نہیں تھا لیکن اگر وہ میری قسمت بن جاتا تو اس میں برائی کیا تھی۔

واپسی کے وقت میں خاصی مسرور تھی۔ ایک ایسے شخص کی نگاہوں اور انداز میں اپنے لیے [illegible]
عزت دیکھنا، جس کے لیے آپ اپنے دل میں بھی پسندیدگی محسوس کر رہے ہوں۔ یقیناً خوش آئند [illegible]
میں سکندر مبین حیات کے ساتھ تنہا تھی۔ وہ جو بھی چاہتا با آسانی میرے ساتھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس [illegible]
کچھ بھی نہیں کیا تھا بلکہ اس نے تمام وقت ہمارے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک
نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ مجھے اس کی نگاہوں میں پاکیزگی ہی پاکیزگی نظر آئی تھی۔

اور آپ کے خیال میں کردار کی مضبوطی کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ آنکھ کے علاوہ اور کوئی ہو سکتا ہے؟

+

اسید ہمدانی سے دوستی میری پلاننگ کا حصہ نہیں لیکن اسے ایک اہم موڑ ضرور کہا جا سکتا ہے۔
مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر رقابت میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہاں! جو کچھ میں نے اس کی
آنکھوں اور انداز میں دیکھا۔ اسے رقابت کے علاوہ کچھ بھی کہنا غلط ہے۔
لیکن اس کے جلاپے اس کی کلبلاہٹ نے مجھے خاصا مزہ دیا تھا۔ یوں میں نے جان بوجھ کر اسید
ہمدانی کے ساتھ کچھ مزید وقت بتایا محض سکندر کو دکھانے کے لیے۔ اور نتیجتاً میری خواہش کے عین مطابق
تھا۔ اس کی حد درجہ پوزیسونیس نے مجھے اندر تک پرسکون کر دیا تھا۔ ظاہر ہے جذبہ رقابت وہیں ابھرتا ہے
جہاں محبت ہو۔
کوئی تھا جو میرے دل میں رہتے ہوئے دماغ کے در پر متواتر دستک دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔
"سکندر مبین حیات تمہارا دیوانہ ہے۔"
مجھے دنیا کبھی اتنی اچھی نہیں لگی جتنی ان دنوں لگنے لگی تھی۔ ایک برے ماضی کے بعد پرسکون حال
گزارتے ہوئے یہ احساس ہر پل میرے ساتھ رہنے لگا تھا کہ ایک شاندار مستقبل میرا منتظر ہے۔ مجھے اپنی
اسٹڈیز کی بھی اتنی پروا نہیں رہی تھی۔ ہائیر اسٹڈیز کا صرف ایک مقصد تھا۔ "اچھی پر آسائش نوکری" تو جب
پر آسائش زندگی میری ہونے والی تھی تو پھر مجھے خوامخواہ دماغ کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔
میں اور سکندر...... ہم دونوں کا ہی ارادہ اگلے سال امتحان دینے کا تھا لیکن ہماری ملاقاتیں ڈپارٹمنٹ
میں جاری تھیں۔ ایک ایسی ہی ملاقات میں، میں نے اسے سگریٹ پیتے دیکھا تھا اور اس کا انداز اسے
سراسر چین اسموکر ظاہر کر رہا تھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی ظاہر ہے کہ اپنی بے خبری پر۔
وہ گاؤں جا رہا تھا اور جانے سے پہلے ایک کام مجھے سونپ گیا تھا۔ نیو ملتان میں اس نے گھر خرید لیا تھا
اور اس کا انٹیریئر میرے ذمے لگا گیا تھا۔ حالانکہ یہ میرے لیے بہت بڑا کام تھا اور میں نے انکار بھی کیا تھا
لیکن چونکہ وہ میرے انٹیریئر ڈیزائننگ کے کورسز کے متعلق جان گیا تھا اسی لیے یہ کام میرے ذریعے ہی
کروانا چاہتا تھا۔
"روشنی! تم میرا اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتیں۔"
اس نے خفگی سے کہا تھا اور میں اسے خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی خفگی برداشت بھی نہیں کر سکتی
تھی میرے لیے تو ایسا سوچنا بھی مشکل تھا کیونکہ آپ ہر اس شخص کی خفگی سے خائف رہتے ہیں جس سے
آپ محبت کرتے ہیں۔

اور میں سکندر مبین حیات سے محبت کرنے لگی تھی۔

میری اس کے ساتھ وابستگی بڑھتی جارہی تھی اور اس میں میرا کوئی دانستہ عمل دخل نہ تھا۔ یہ ایک بے اختیاری کیفیت تھی جو مجھے کھینچ کر اس کے نزدیک کرتی جارہی تھی۔ مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا گھنٹوں اس سے فون پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ ہر فارغ وقت میں میں اسے ہی سوچتی تھی۔ میں اپنے ہر [illegible] شیئر کرنے لگی تھی اپنے دل کا غبار اس کے سامنے نکال کر مجھے خاصا سکون ملتا تھا۔ اس کے تسلی آمیز جملے میرے لیے مرہم ثابت ہوتے تھے۔ وہ بنا کہے بھی میرے اضطراب کو بھانپ لیا کرتا تھا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔

میں رباب کے لیے حقیقتاً بے حد پریشان تھی فلموں میں کام کرنے کی خواہش نہ جانے کیسے اس عمر کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔

میں نے اپنے دل کی ساری بھڑاس سکندر کے محض ایک بار پوچھنے پر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی میں نے کہا نا وہ میرا دوست تھا، میری محبت تھا۔ اس کے الفاظ میری تسلی و تشفی کا موجب ہوا کرتے تھے اس نے میری توقع کے عین مطابق تسلی دی بلکہ یہ ہی نہیں میرے یہ کہنے پر کہ عورت ہمیشہ ایک گھر کی خواہش کرتی ہے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں بھی ایک گھر چاہتی ہوں اور ظاہر ہے کہ میں بھی کیا الگ تو نہ تھی اور تب...... ہاں تب...... اس نے وہ کہا جو میری توقع کے لیے بہت بڑا خوش آئند دھچکا تھا۔

"اور اگر وہ گھر تمہیں میرے حوالے سے ملے تو کیا تم وہ گھر قبول کرلوگی روشنی؟"

مجھے یاد ہے...... مجھے سب یاد ہے...... حرف بہ حرف اور مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ اس پل اس کی نگاہوں میں آس و نراس کی کتنی بے چینیاں تھیں۔ وارفتگی کی کتنی حکایتیں تھیں۔ رد کیے جانے کا کیسا خدشہ لرز رہا تھا مجھے یوں لگا تھا گویا وہ اپنا کشکول لیے میرے سامنے بیٹھا ہو اور اگر میں نے اس کشکول کو نہ بھرا تو وہ مر جائے گا۔

میں نے ہاں کہہ دی میں واقعی بیان نہیں کرسکتی کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔ وہ وہی بات کر رہا تھا جو میں اب تک سننے کو بے چین تھی۔

"بتاؤ نا روشنی! کیا تم وہ گھر قبول کرلوگی جو کہ میرا بھی ہو۔"

اور یہی تو میں چاہتی تھی یہی حوالہ تو میری تمنا تھی۔ میری من چاہی زندگی بس مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ان دو دنوں میں ہر پل بس اسی خوب صورت دور کو اپنے تخیل میں مجسم کیا تھا۔

دو روز بعد شام میں سکندر کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ ہاسٹل کے باہر میرا منتظر تھا۔ کپڑے میں کچھ دیر قبل تبدیل کیے تھے تبھی نیم گیلے بالوں کو ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی میں باندھ کر میں باہر آ گئی۔ موسم خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے سے بادل تھے اور ہوا چل رہی تھی۔

"تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" کار میں بیٹھتے ہی میں نے اس سے پوچھا تھا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔

"تمہیں دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔" میری پلکیں فوراً جھک گئی تھیں۔ کسی مرد کے منہ سے ایسی بات سننے کا پہلا تجربہ تھا۔ یکدم مجھے اس سے بے تحاشا جھجک محسوس ہونے لگی تھی اور اسی جھجک کو دور کرنے کی غرض سے میں نے پوچھا تھا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں سکندر؟"

"دنیا کے اس پار، نیلے گگن میں، ستاروں کے جھرمٹ......"

"کہیں کوئی نشہ وشہ تو نہیں کر رکھا۔" اس کے قطعی غیر سنجیدہ انداز پر میں نے مصنوعی فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"ارے۔" وہ ہنسا تھا "تمہارے خیال سے بڑا نشہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔"

میں نے باہر دیکھنا شروع کردیا تھا کچھ دیر بعد جب کار رکی تو ہم اسی اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے تھے جسے کچھ روز قبل میں نے سکندر کی فرمائش پر ڈیکوریٹ کیا تھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

ظاہر ہے کہ میری حیرانی بجا تھی۔ سکندر نے جواب دیے بنا مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

"شاید کوئی خامی رہ گئی ہو۔" میں سوچتے ہوئے اندر آئی مگر وہاں کوئی خامی نہیں تھی سارے گھر میں چکر لگاتے ہوئے سکندر نے وہاں کی کلر اسکیم سے لے کر پلانٹس سیٹنگ تک کی بے حد تعریف کی تھی اور سب سے آخر میں وہ میری طرف پلٹا تھا اور میری حیرانی پر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ گھر میرا تھا لیکن اب نہیں ہے۔ یہ گھر آج سے تمہارا ہے روشنی! صرف اور صرف تمہارا۔"

اس نے میرے ہاتھ پر گھر کی چابیاں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں پہلے تو اس غیر متوقع بات پر ساکت ہوئی تھی اور پھر شدت تشکر سے لبریز ہوتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

"مجھے اعتراف کرلینے دو سکندر کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں، اور میرے دل کو کبھی اس بات پر پچھتاوا نہیں ہوگا، تم واقعی اس قابل ہو کہ تم سے محبت کی جائے......"

مجھے اپنی آنکھوں میں نمی محسوس ہوئی تھی۔ سکندر میری بات سن کر ہنسا تھا۔

"میں نہیں جانتی کہ تمہارا احسان کس طرح اتاروں۔ میں یقیناً تمہارا احسان کبھی نہیں اتار سکتی۔"

"تم میرا احسان ایک طرح سے اتار سکتی ہو روشنی!" میرے گال اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی تو وہ ایک دم بے حد معصومیت سے بولا

"میں تمہارے ہاتھ سے بنا ہوا پاستا کھانا چاہتا ہوں۔"

اور مجھے روتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی۔ اس کے بعد ہم سکندر کے موجودہ رہائشی اپارٹمنٹ آ گئے کیونکہ وہاں کوکنگ رینج کا انتظام ابھی ادھورا تھا۔

+

مشرومز باریک باریک کاٹتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا سکندر ڈائننگ چیئر پر بیٹھا میری جانب دیکھ رہا تھا اس کے سامنے سافٹ ڈرنک کا ٹن کھلا پڑا تھا۔

"تم اتنی خوب صورت ہو۔ ٹی وی کمرشلز وغیرہ میں ٹرائی کیوں نہیں کرتیں۔ میرا خیال ہے تمہیں اچھا کام مل سکتا ہے۔" میں گردن موڑ کر واپس اپنے کام میں مگن ہو گئی تھی۔

"ہاں مجھے اچھا کام مل سکتا ہے بشرطیکہ میں ایسا چاہوں۔ میں ایسا کام کرنا نہیں چاہتی۔"

"تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں روشنی۔" میں نے اسے کہتے سنا تھا۔ تبھی لاؤنج میں رکھا فون بجنے لگا۔ سکندر ایک منٹ کہہ کر باہر نکل گیا اور میں اپنے کام میں مگن آنے والے دنوں کے حسین خواب کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

"کتنے خوب صورت اور پرسکون دن ہوں گے وہ جب میں اور سکندر شادی کے بعد ایک دوسرے کی ہمراہی میں گزار دیں گے۔" میں سوچ رہی تھی اسی وقت لائیٹ چلی گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ تین سیکنڈ تک میری آنکھیں اس ملگجے اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئی تھیں۔ پہلے تو میں نے ہاتھ سے چھری پنچی تھی پھر کھڑکی پر پڑا پردہ ہٹا کر دیکھا۔

کچھ دیر قبل آسمان پر زیادہ بادل نہیں تھے لیکن اس وقت سارا کا سارا آسمان گھرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ وقت بہت زیادہ تو نہیں ہوا تھا مگر موسم کی کارفرمائی کے تحت یوں لگ رہا تھا گویا رات ہونے کو ہے۔

مجھے گھبراہٹ نہیں البتہ پریشانی ضرور ہوئی تھی۔

میں نے وارڈن سے پرمیشن لیٹر سائین نہیں کروایا تھا لہٰذا زیادہ دیر تک باہر رہنے کی صورت میں مجھے ہاسٹل میں گھسنے نہیں دیا جانا تھا۔

"روشنی! ڈر تو نہیں لگ رہا؟" سکندر نے باہر سے آواز دے کر پوچھا تھا۔

"یہاں کون سے آسیب بس رہے ہیں جن سے میں ڈروں۔" شیلف سے کمر ٹکا کر سوچتے ہوئے میں نے جواب دیا تھا۔

"ہاں بس تو نہیں رہے مگر سنا ہے بھوت پریت بہت جلد خوب صورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے

اس کی مجسم آواز سنتے ہوئے میں مسکرائی تھی۔

"اس لیے تم یہاں لاؤنج میں آ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ واقعی کوئی جن تنہا دیکھ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے ہو۔ پہلے والے کیبنٹ کے نچلے حصے میں کینڈلز پڑی ہوں گی وہ لیتی آنا، لائیٹر ہے میرے پاس۔"

میں کینڈلز نکال کر باہر آئی تھی اور سکندر سے کہنے والی تھی کہ وہ مجھے بارش تیز ہونے سے پہلے ہی واپس ہاسٹل چھوڑ آئے مگر اسے سگریٹ پیتا دیکھ کر میں حد درجہ تپ گئی تھی۔ مجھے اس کی بو سخت ناگوار لگتی تھی۔

"تم یہ منحوس چیز پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

وہاں لاؤنج میں بھی بہت ہلکا سا اجالا تھا۔ میں سکندر کی نقل و حمل دیکھ سکتی تھی، مگر آنکھیں پٹپٹا کر۔

میری بات پر مسکراتے ہوئے اس نے سگریٹ کا باقی ماندہ ٹکڑا ایش ٹرے میں مسل دیا تھا پھر لائیٹر جلا کر میرے پاس آیا تھا۔

"تم کہو گی تو پینا چھوڑ دوں گا۔" موم بتی کو شعلہ دکھاتے ہوئے اس نے کہا تھا اور مجھے حقیقتاً اس کا یوں کہنا اچھا لگا تھا۔

"تم میرے لیے سگریٹ پینا چھوڑ دو گے سکندر۔" لرزتے ہوئے شعلے سے نگاہ اٹھا کر میں نے پوچھا تھا۔

اور نگاہ اٹھانے کے ساتھ ہی مجھے ایک احساس ہوا تھا۔ میری انگلیوں میں تھمی موم بتی پر سکندر کا ہاتھ تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں پر اس کا لمس محسوس کیا تھا۔ موم بتی ہماری انگلیوں کے درمیان بہت چھوٹی رہ گئی تھی۔ اپنے ہاتھ پر طاری ہونے والی لرزش کو میں نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

اور میں سمجھ نہیں سکی کہ سکندر میرے قریب پہلے آیا یا شیطان...... بہرحال موم بتی بجھ گئی تھی۔ لاؤنج میں پہلے سے بھی زیادہ اندھیرا چھا گیا تھا۔

میں نے اپنے قریب ایک مبہم سے سائے کو دیکھا تھا۔ مجھے وہ لمس اچھا لگ رہا تھا۔

میرے ذہن میں صرف چند باتیں تھیں۔ اور وہ یہ کہ میں اور وہ چند دنوں میں شادی کرنے والے ہیں۔۔۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

میں نے آنکھیں موند لی تھیں۔ اندھیرا بہت زیادہ ہو گیا تھا مگر میں نے یہ اندھیرا قبول کر لیا تھا اور کسی بھی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میری من چاہی زندگی مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے سکندر بمعہ حیات کو اپنے قریب، بے حد قریب آنے دیا تھا۔

"تمہارے لیے تو میں زندگی بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

اندھیرے میں اپنے قریب میں نے سرگوشی سنی تھی اور طمانیت میرے اندر سرائیت کر گئی تھی۔

صبح میری آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ چند لمحے تو میں یہی نہیں سمجھ سکی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ پھر
ایک کرنٹ سا خون کے ساتھ ہی دوڑا تھا اور میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

ایک دم سے زیاں کا شدید احساس ہوا تھا۔ میری حماقت مجھی کو لتاڑ رہی تھی۔ محض کچھ گھنٹوں کی سیر
کے لیے میں نے وہ کرلیا تھا جو اب تک نہیں کیا تھا۔

اپنی ہی سوچ میں گم مجھے سکندر کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔

''گڈ مارننگ۔'' میرے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے میرے گال کو بہت نرمی سے چھوا تھا اور میں نے
لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔ مجھے اس سے بے تحاشا جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانتی ہوں
کہ اس وقت میرا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا۔ کچھ گناہ کے احساس سے اور کچھ شرم سے۔

''سکندر! کل رات جو کچھ ہوا......'' بہت دیر بعد میں بولنے کے قابل ہوئی تھی مگر سکندر نے میری
بات قطع کر دی تھی۔

''وہ سب بہت ہی مسحور کن تھا۔ بلیومی کل کی رات میری زندگی کی سب سے یادگار رات تھی۔''

اس کے انداز میں واقعی سحر تھا میں اسے دیکھتی رہی اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

''مجھے اب جانا چاہیے۔'' وال کلاک کے الارم پر میں یکدم چونکی تھی سکندر نے چند منٹ کے توقف
سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے اسے کہتے سنا تھا۔

''ہاں......نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رات بھر ہاسٹل سے باہر رہی ہوں اگر وارڈن کو پتا
چل گیا تو ایسے میں تمہاری موجودگی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس وقت
سکندر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ میں نے اسے روٹین کے انداز میں لیا تھا۔ میں واقعی بھول گئی تھی کہ رات اس
نے کیا کہا تھا۔

ہاسٹل میں سب خیر خیریت تھی۔ میری روم میٹس ویک اینڈ گزارنے اپنے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں جبکہ
اردگرد میں میری کسی سے کچھ خاص صاحب سلامت بھی نہ تھی مجھے ایک گونا سکون حاصل ہوا تھا۔ لیکن یہ
سکون وقتی ہی تھا اگلے دو دن میں نے ایک عجیب سی الجھن میں گزارے تھے۔ اب تجزیہ کرنے سے اندازہ
ہوتا ہے کہ وہ عجیب احساس، احساس گناہ نہیں بلکہ احساس زیاں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میرا بے حد قیمتی اثاثہ
مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔

بہت زیادہ سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مجھے سکندر سے بات کرنی چاہیے کہ بہرحال وہ

ہم میں برابر شریک تھا۔

سب کچھ ٹھیک تھا ابھی کچھ ٹھیک تھا۔ وہ میرے سامنے میرا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں
محبت تھی اس کی باتوں میں محبت تھی۔ میرا دل چاہا ان لمحوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کر کے کہیں نہ جانے دوں
مگر یہ خیال، خیال ہی رہا سچائی سے مبرا یہ لمحات میرے تھے ہی نہیں پھر انہیں میں قید کیسے کر سکتی تھی۔

میری شادی کے ذکر پر وہ یوں بھڑک گیا تھا جیسے میں نے کوئی بہت غیر معمولی یا احمقانہ بات کر دی
ہو۔ اس کے لفظوں سے طیش کے تیر برسے تھے مگر اس کا انداز بے حد سرد اور حقارت آمیز تھا۔ اس تمام
عرصے میں میں نے پہلی بار اسے اس انداز میں بات کرتے دیکھا تھا۔

میں اس کی باتیں سن کر اس کے خیالات اپنے بارے میں سن کر حقیقتاً ساکت ہوئی تھی۔ یہ وہ شخص تھا
جس سے میں جب بھی ملی میں نے اس کے انداز میں محبت اور پسندیدگی محسوس کی مگر آج......

''اور حیرت تو مجھے تم پر ہے۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں یعنی سکندر مبین حیات تم سے شادی
کرے گا......مائی فٹ تم جیسی عورتوں کو وقتی طور پر تو بیڈروم کی زینت بنایا جا سکتا ہے مگر حویلیوں کی زینت
نہیں؟......اب جلد از جلد اپنی شکل یہاں سے گم کرو۔ چار دن کے تعلق کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم سے نکاح
ہی پڑھوا لوں۔ ایک گھر کی ڈیمانڈ کی تھی تم نے اور وہ میں تمہیں دے چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کی امید نہ تو
مجھ سے رکھو اور نہ ہی میں تمہیں دوں گا۔''

مجھے اپنے پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی مزید کھڑے رہنا گویا ناممکن ہی تھا میں گھٹنوں کے بل
نیچے گر پڑی تھی۔ میرے گھٹنوں پر خاصی زوردار ضرب لگی تھی مگر یہ تکلیف اس اذیت سے کم تھی جو میرے
چاروں اطراف میں سرخ آندھی کی طرح دھمال ڈال رہی تھی۔ میرے سینے میں سانس اٹک گیا تھا اور چیخیں
حلق میں بھڑک رہی تھیں۔

''یوں مت کہو سکندر! خدا کے لیے یوں مت کہو......تم تو میری مسکراہٹ کی تعریف کرتے تھے۔
تم کہتے تھے مجھ سے سکندر! تم کہتے تھے تم مجھ سے شادی کرو گے......تم نے کہا تھا تم مجھ کو چاہتے ہو۔''
میری آنکھوں میں بے تحاشا مرچیں بھر گئی تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں قریب تھا کہ میں اس کے
قدموں میں ہی جھک جاتی کیونکہ میں تو دل کے ساتھ ساتھ عزت بھی اسے دے چکی تھی......قریب تھا کہ
میں اس کے پاؤں پکڑ کر التجائیں کر لیتی مگر مگر آپ جانتے ہیں اس نے کیا کہا؟

''ہاں میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں چاہتا ہوں تو تم جیسی عورتوں کی ''چاہ'' کون سا مشکل ہے دیکھو میں
نے تمہاری چاہ کی اور تمہیں حاصل بھی تو کر لیا۔''

میں خاموش رہی میں بول سکتی بھی نہیں تھی۔ لوٹ لیے جانے کا شدید احساس مجھے مٹی کر رہا تھا
اتار رہا تھا اور وہ...... وہ بولتا ہی جا رہا تھا بے رحمی سے، بے گانگی سے، نفرت سے اور حقارت سے۔

''میں تمہاری مسکراہٹ کی تعریف بھی کرتا تھا۔ میں اب بھی تمہاری مسکراہٹ کی تعریف کرتا رہا
کرتا بھی رہوں گا مگر صرف مسکراہٹ اچھی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ایک طوائف سے شادی کر
لوں گا۔ میں نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ کہ تم سے شادی کروں گا۔ اسلام تو
تھیں جو ایسا سوچتی تھیں...... میرا کیا دماغ خراب ہے کہ ایک ایسی عورت سے شادی کر لوں گا۔''

''مجھے طوائف مت کہو سکندر......!'' میں نے التجا کی تھی مگر وہ اس بے رحمی سے بولا تھا۔

''پھر کیا کہوں فاطمہ جناح، مدر ٹریسا یا مقدس مریم۔'' اس کے انداز میں اتنا طنز تھا کہ میں کٹ کر
گئی میں نے پہلی بار اپنے اندر غصہ محسوس کیا تھا۔

''نہیں تم کچھ بھی مت کہو بلکہ ان پاکیزہ عورتوں کے نام بھی مت لو جن کی عزت نہیں کر سکتے۔ ان کے
نام بھی تمہاری زبان سے ادا نہیں ہونے چاہئیں۔''

''ارے واہ عزت کی بات کرتی ہو۔'' وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

''تم بھول رہے ہو سکندر مبین حیات! کہ اسی طوائف کو تم اپنے بیڈ روم تک لے جا کر اپنی ہوس پوری
کر چکے ہو۔'' میں چیخی تھی۔

''نہیں روشن آرا بیگم! میں نہیں بلکہ تم بھول رہی ہو کہ میری ہوس کو بھڑکایا بھی تو تم ہی نے تھا۔
کیا...... عورت ایسا ہی کرتی ہے پہلے ہماری پیاس بھڑکاتی ہو اور جب ہم پیاس بجھانے کا انتظام کر لیں
تو سارا الزام ہمارے سر ڈال دیتی ہو اور یہ بیڈ روم میں لے جانے کی بات بھی خوب کی تم نے۔ میں
تمہیں گن پوائنٹ پر بیڈ روم تک لے گیا تھا۔ اگر تم ایسی ہی فرشتہ صفت اور پاکباز تھیں تو میرے گھر
کیوں آتی تھیں میں تو اچھا آدمی نہیں تھا۔ تم تو میری عزت نہیں کرتی تھیں۔ یہی خیالات ہوا کرتے تھے
تمہارے میرے بارے میں؟

میں نے تمہیں کبھی مجبور نہیں کیا تھا اپنے گھر آنے کے لیے تم ہر بار اپنی مرضی سے آتی تھیں۔
برے آدمی کے گھر آتی تھیں جو کہ تمہارے خیال میں کسی عورت کو ایک گھر بھی نہیں دے سکتا تو یہ
روشن بائی! میں نے تمہیں گھر دیا اور تم نے مجھے وہ دے دیا جو کہ کسی بھی مرد کی خواہش ہو سکتی تھی۔ تمہارا
خیال ہے جسم سے لباس چپکا کر اور گلوں میں رسیوں کی طرح دوپٹے ڈال کر پھرنے والی تم جیسی عورتوں
سے مرد محبت کر سکتا ہے؟ نہیں بی بی نہیں ایسی عورتوں سے مرد صرف ایک چیز کی خواہش کرتا ہے اور وہ
ہے؟ یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے مجھے۔''

وہ ساری عورت ذات کو گھسیٹ لایا تھا۔ میں نے اس روز اس شخص کے منہ سے وہ وہ باتیں سنی تھیں

جو میرے وہم و گمان سے دور تھیں۔ اس نے وہ گالیاں دی تھیں جو کوئی شریف عورت تو کیا مرد بھی نہ جان
پائے۔

میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں کچھ کیسے کہتی۔ ایک شخص جو عورت ذات کو ہی عزت نہیں دے سکتا تھا جو
عورت کو بکری کے مترادف جانتا تھا اس کے نزدیک ایک ایسی عورت کی حیثیت کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر
پڑنے والی ہنڈیا سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کے خیالات جان چکی تھی۔ اب کسی قسم کی التجا اور آس
بے معنی تھی۔

+

سمندر خشک ہو جائیں
تو ساری مچھلیاں بے آبرو ہو کر
کیلے، بدمزہ کیچڑ کے ڈربوں سے نکل کر
ساحلوں پر بے رفاقت موت مر جائیں
کسی دن یہ بھی ہونا ہے
کہ سورج اپنی تنہائی کے کرب بے اماں سے ڈر کے
گھبرا کر سوا نیزے پہ آ جائے
زمین بے آب ہو کر
تشنگی کی موت مر جائے
ابھی تو ہجرتوں کے در کھلے ہیں
موسموں کا ذائقہ اتنا نہیں بدلا
ابھی سورج نہیں اترا
کہ خود اپنے تنفس سے ہی
بوئے تشنگی آئے
چلو ہم لوٹ جاتے ہیں
اسی فردوس گم گشتہ کو
جس کو چھوڑ آئے تھے
اسے تو ڈھونڈنا ہو گا
ممی اپنا اس کے پاس اپنا سب کچھ گنوا کر آئی تھی۔

اور پتا نہیں کیسے بنا بتائے ہی وہ سب کچھ جان گئی تھیں۔ شاید سبھی مائیں جان جاتی ہیں اپنی [illegible] خوشی، اپنی اولاد کا غم...... اور اس جذبے کی تقسیم نے عورت اور طوائف کا فرق روا نہیں رکھا۔

اس روز آپا جان اچانک میرے سامنے آ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے صرف چند لمحے مجھے ٹوٹی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر بیتابی سے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

نجانے انہیں کس نے بتایا تھا۔ میری آنکھوں کی وحشت نے، میرے وجود کے اضمحلال نے، میرے لفظوں کی کمیابی نے یا جھکی پلکوں پر لکھی بے بسی کی تحریر نے۔

''میں نے تم سے کہا تھا...... کتنی بار سمجھایا تھا کچھ بھی ہو جائے مگر مرد کی بات کا یقین مت کرنا۔''

میں نے انہیں کہتے سنا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سکندر مبین حیات کی جانب سے ملنے والے شدید بلکہ شدید ترین جھٹکے کے بعد مجھے ایسے ہی سہارے کی ضرورت تھی...... میں بے تحاشا روئی تھی اتنا جتنا کہ [illegible] سکتی تھی۔

عزت حاصل کرنے کے چکر میں، میں نے ایسی چوٹ کھائی تھی کہ اب زخم کا بھرنا مشکل تھا۔ لیکن زخم کو بھر دینا میرے لیے ضروری تھا۔ کیونکہ قطرہ قطرہ ملنے والی موت بے حد خوفناک ہوتی ہے اور میں بہت بزدل تھی لہٰذا ایک جھٹکے کی موت بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

میں اور میری ماں عزت کی ''موت'' پر بین کر رہے تھے۔

عزت ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو معتبر کرتی ہے۔ اس سے قبل کم سے کم میں اپنی نگاہوں میں تو معتبر تھی۔

میں زندگی میں پہلی بار اس طرح روئی تھی۔

میں زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے لیے روئی تھی۔

کچھ دیر بعد میں اپنی ماں سے علیحدہ ہو گئی تھی۔

میں زندگی میں آخری بار اس طرح رو چکی تھی۔

میں زندگی میں آخری بار کسی مرد کے لیے رو چکی تھی۔

''میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گی میں وہ سب کام کرنے کے لیے تیار ہوں جو آپ کرتی رہی ہیں۔''

میں نے مردنی سے کہا تھا۔ ہم جیسی عورتوں کے پاس ناکامی کی صورت میں اور کوئی راستہ نہیں بچتا ہمیں وہی کام کرنے پڑتے ہیں جنہیں دھتکار چکے ہوتے ہیں کہ بہرحال پیٹ کا دوزخ ہر چیز سے زیادہ سفاک ہوتا ہے۔

میرا فیصلہ سن کر آپا جان نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ بھی مجھے عزت کی زندگی دینا چاہتی تھیں مگر اپنی کوشش

میں ہم دونوں ناکام ہو رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد میں نے اپنا آپ فروخت کر کے پہلی روزی حاصل کی تھی۔

+

بابا صاحب کا بلاوا جتنا غیر متوقع تھا روشانے قمر کا سامنا اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ جب اس کی لینڈ کروزر حویلی کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی تھی تبھی حویلی کی غیر معمولی چہل پہل نے اسے چونکایا تھا مگر بس صرف ایک لمحے کے لیے ہوا تھا۔

بابا صاحب ہمیشہ سے بلاوجہ ہنگامی دعوتیں کرنے کے شوقین رہے تھے۔ ہر دوسرے ہفتے گاؤں کے معززین اور ارد گرد کے چودھری اکٹھے کر کے اچھے خاصے پر تکلف طعام کا بندوبست کر لیا کرتے تھے۔ وہ بچپن سے ایسا ہی دیکھتا آیا تھا لہٰذا اسے یہ سب معمول کا حصہ لگا تھا۔ مگر جو کچھ وہاں ہونے جا رہا تھا وہ معمول کا حصہ نہیں تھا۔

ان چار مہینوں میں اس نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ اگر کبھی اتفاق سے روشانے قمر سے ملاقات ہو گئی تو وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گا۔

جب عام ملاقات کے بارے میں نہیں سوچا تھا تو ایسی ملاقات کے متعلق سوچنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

اس کے تو سان و گمان کی حدود سے بھی دور تھا کہ جس لڑکی کو اتنی نفرت و حقارت سے دھتکار چکا ہے وہی اس کی زندگی میں اتنی اہم حیثیت اختیار کر جائے گی۔

قدرت اس کے ساتھ ڈبل گیم کھیل چکی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خود کو آگے کنواں پیچھے کھائی والی صورت حال میں پایا تھا اور اب ہمیشہ اسے اسی درمیان میں اٹکے رہنا تھا۔ وہ کبھی آر پار نہیں ہو سکتا تھا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کی بیوی یعنی روشانے قمر کی اصلیت سے بھی آگاہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں خود اس کی اصلیت سے پردے اٹھ سکتے تھے۔

نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد بھی اس نے فرزانہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار اس کا ردعمل ایک سا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ نہیں پتا چل سکا تھا کہ وہ ناخوش ہے یا اسے یہ بات ناگوار گزری ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ حرف اعتراض اٹھا ہی نہیں سکتی تھی وہ اس سب کی عادی تھی خود اس کے باپ نے دو [illegible] کی تھیں۔ پھر کچھ عرصہ قبل ہی اس کے بھائی نے دوسری بیوی کو طلاق دے کر تیسری شادی کی تھی۔ مگر اس بار فرزانہ اسے خاصی پرسکون اور مسرور دکھائی دی تھی۔

جاگیردارانہ طرز حیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ شادیوں کا تناسب چاہے زیادہ نہ ہو مگر بیویوں کا

تناسب ہمیشہ زیادہ رہتا ہے اور پھر بیویاں جائز ہوں یا ناجائز......اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا مگر
سکندر مبین حیات کی پوزیشن کو اس جائز بیوی کی وجہ سے خاصا فرق پڑنے والا تھا۔

آج شادی ہوئی تھی۔ کل کو بچے بھی ہوں گے پھر جائیداد کی تقسیم، مربعوں کا بٹوارہ اور یہی وہ نہیں
چاہتا تھا۔ مگر اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا وقت اس کے ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح نکل چکا تھا۔ مدثر شاہ
کی حیثیت حویلی میں بے حد مضبوط ہو چکی تھی۔

وہ جانتا تھا دعوتوں کی طرح بابا صاحب کا ایک اور شوق بھی ہے اور وہ ہے شادیاں کروانا۔ وہ گاؤں
کے کئی کنوارے کنواریوں کو رشتہ ازدواج میں بندھوا چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں شادیاں کروانے کا شوق
ہے مگر یہ نہیں پتا تھا کہ شادی کرنے کا بھی شوق ہے۔ نکاح سے کچھ دیر قبل ہی عقدہ کھلا تھا کہ شادی خود
بابا صاحب کی ہے۔

باپ کے نکاح پر لوگوں نے اسے گلے مل مل کر مبارک دی تھی۔ ان سب کے انداز میں طنز کا عنصر
غالب تھا۔ دبی دبی ہنسی میں تمسخر صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

یہاں تک بھی سب ٹھیک تھا اصل ہوش تو تب اڑے تھے جب وہ اپنی نئی ماں سے ملنے خواب گاہ میں
گیا تھا۔

اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔

✦

کوئی ''بھی'' مرد کسی بھی عورت کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا جب کہ عورت خود نہ چاہے۔ سکندر مبین
حیات نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اس میں میری رضا بھی شامل تھی۔ اگر آپ کو میری بات سمجھ نہیں آئی تو
اس سطر کو تین بار پڑھیے آپ کو میری بات کا مفہوم سمجھ آ جائے گا۔

اس ''بھی'' سے پہلے میں نے ایک اور مرد کا ذکر کیا ہے اور وہ انسان سکندر مبین حیات ہے۔ شاید
نادانستہ طور پر میرے نزدیک عزت ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ میں نے دولت اور وجاہت کو غیر معمولی
اہمیت دی اور سزا بھی پالی۔ تو غلطی صرف میری ہی تو نہیں تھی سکندر مبین حیات اس میں برابر کا شریک تھا تو
جب مجھے سزا ملی تو کچھ تو اسے بھی ملنا چاہیے تھا۔

ملک مبین حیات......میری دنیا میں آنے والا دوسرا شخص اور زندگی میں آنے والا پہلا شخص تھا۔
وہ میرا پہلا اور آخری گاہک بھی تھا۔ مبین حیات تک رسائی حاصل کرنے اور اسے کھینچ کر اپنے قدموں
تک لانے کے لیے میں نے اور میری ماں نے کیا کیا پاپڑ بیلے وہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں جانتی تھی کہ میں
بہت خوب صورت ہوں اور یہاں میں نے اسی خوب صورتی کو استعمال کیا تھا۔

عاشق اگر جوان ہو تو وہ یا خود کو لٹاتا ہے یا دولت کو...... کسی بھی صورت میں وہ یہ دونوں چیزیں داؤ پر
نہیں لگاتا جبکہ عاشق اگر بوڑھا ہو تو وہ اپنا آپ بھی لٹاتا ہے اور دولت بھی اور فائدہ مند صرف اس کی دولت
ہوتی ہے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو سونے کا دل بنا کر پیش کرتا ہے۔
میں نے مبین حیات کے سامنے خوب صورتی کا کشکول رکھا تھا۔ وہ سونے کا دل کیسے نہ دان کرتا۔
ایک ہفتہ اس کے ساتھ گزار کر جب میں واپس جانے لگی تو اس نے مجھے روک دیا۔ میری ہر کوشش کامیاب
رہی تھی۔ وہ مجھ پر اس حد تک فریفتہ ہو چکا تھا کہ نکاح کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اور یہ میری منزل تھی
یہی تو میری منزل تھی۔

مگر اب کی بار میں نے پہلے کی طرح حماقت نہیں کی تھی، ایک اچھے مستقبل کے لیے کچھ حفاظتی
اقدامات ضروری تھے۔ حق مہر میں میں نے وہ حویلی وصول کی تھی جس کی اونچی دیواروں اور پرشکوہ جلوؤں پر
سکندر مبین حیات کو مان تھا۔ شہر میں ایک بڑا شاپنگ پلازہ میرا تھا۔ ڈیفنس میں ایک شاندار کوٹھی مبین
حیات نے منہ دکھائی میں مجھے دی تھی۔ زیورات اور بینک بیلنس الگ تھا۔

میں نے اپنی اولاد کے لیے بھی کچھ ضروری اقدابات کیے تھے۔

میں مبین حیات کی بے حد عزت کرتی ہوں وہ حقیقتاً میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے تب عزت دی جب
میں غلاظت سے لت پت تھی اور سکندر مبین حیات سے میں نفرت کرتی ہوں۔ کیوں؟ اس کی وجہ آپ
جانتے ہیں۔

یقیناً آپ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ مبین حیات سے شادی کر کے میں نے کون سا تیر مار لیا۔
تیر ہی تو مارا ہے۔ مجھے یاد ہیں وہ لمحات جب سکندر نے کہا تھا۔
''طوائف کو وقتی طور پر بیڈ روم کی زینت بنایا جا سکتا ہے مگر حویلیوں کی نہیں۔''
بقول اس کے۔ ''طوائف پاؤں کے نیچے رلنے والی ریت ہے اسے سر پر نہیں ڈالا جا سکتا۔'' تو اس
کے باپ نے مجھے حویلی کی زینت بنا لیا ہے۔ وہ مجھے اپنے سر کا تاج بنا چکا ہے۔ لیکن اس جیسے لوگوں کو اس
بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق صرف تب پڑتا ہے جب جائیدادوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگر
اپنے گناہ کی پیداوار کو اپنا نام دینے سے خائف ہوتے ہیں تو صرف ایک وجہ سے کہ کہیں جائیداد کی تقسیم کے
وقت ان کا حصہ بھی نہ نکالنا پڑ جائے۔

بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سکندر مبین حیات نے مجھے بازاری سمجھا۔ بلکہ اس جیسے کلی کلی منڈلانے والے
بھنورے ہر عورت کو یہی سمجھتے ہیں۔ پھر بھی نجانے کیوں ہمارے معاشرے نے عورتوں اور طوائف کی الگ
الگ تقسیم بنا رکھی ہیں۔

کبھی کسی نے سوچا ہے کہ عورت تو کبھی بھی تذلیل نہیں چاہتی پھر اسے ذلت کیوں ملی؟ عورت کو عورت کے حلقے سے کھینچ کر بازاری عورت کون بناتا ہے؟ جب وہ عزت چاہتی ہے تو اسے کیوں نہیں دی جاتی؟

سوال میرا نہیں بلکہ ہر اس روشانے قمر کا ہے جو ایسی ہی آگ میں جل رہی ہے۔ لوگ بازار حسن کی عورت کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے آپ نے کہ عورت تو وہ بھی ہے۔ اس کا بھی دل دھڑکتا ہے۔ عزت کی سانس لینا چاہتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہر گلی کے اختتام پر ایک منتظر ہے جو انہیں سجا سجایا ٹین کے ڈبے جیسا مکان تو دے سکتا ہے مگر گھر نہیں۔

پھول میں خوشبو نہ ہو تو پھول کا کیا فائدہ؟ ہوا میں تراوٹ نہ ہو تو کون اسے پسند کرے۔ اسی طرح انسان مکان نہیں گھر چاہتا ہے جہاں خوشیاں ہوں، محبت ہو اور...... اور عزت ہو۔

مبین حیات نے مجھے وہ دیا جو مجھے حقیقتاً چاہیے تھا۔ میں بے حد پر سکون ہوں اور اس سکون میں تب اضافہ ہوگا جب جب میں اس کے سامنے جاؤں گی اور مجھ سے مل کر اس کی وحشتیں ہیجان کریں گی۔

مجھے شدت سے اس دن کا انتظار ہے جب میں اس حویلی کے نئے وارث کو جنم دوں گی اور حیات کی ہاری ہوئی شکل دیکھوں گی۔ ظاہر ہے ایک سو بیس مربعوں میں سے صرف سات مربعوں کا ملنا کوئی خوش آئند بات تو نہیں۔

مجھے سکندر مبین حیات پر ترس آ رہا ہے اور خود پر رشک۔

جو میں چاہتی تھی وہ میں نے حاصل کر لیا۔ ہاں مگر ایک ذلت کے بعد...... لیکن میں مطمئن ہوں۔ میری ماں پیدائشی طوائف تھی۔ میں پیدائشی طوائف تھی کیونکہ نہ میری ماں اپنے باپ کے نام سے واقف تھی اور نہ میں۔ مگر میری بیٹی نہیں ہوگی۔ اس کی رگوں میں نہ صرف پاکیزہ خون دوڑے گا بلکہ ایک عزت کی چھت، مبین حیات کی صورت میں اس کے پاس ہوگی۔

لیکن میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ آرزو کی انتہا ہمیشہ انسان کی پاکیزہ روح کو ذلت بھری موت کے دہانے پر لے جاتی ہے۔ میں اپنی روح کو اس موت کی سفا کی سے نہیں بچا پائی تھی۔ مگر آپ کے پاس وقت ہے اور خرد مند نگاہ بھی، خود کو اس موت سے بچا لیجیے۔

لو اپنی بھی سحر ہوئی

وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھی تھی۔ کھڑکی کے کھلے پٹ سے سورج کی تر و تازہ کرنیں جیسے اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ نہایت ناگوار شکل بنائے اب وہ کھڑکی میں کھڑی سورج کی ان تر و تازہ کرنوں کو گھور رہی تھی جنہوں نے اب براہ راست اس کے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

"میں تم سے عشق کرتی بشرطیکہ تم روزانہ نہ آیا کرتے۔ اب بھگتو روز آ جانے کا نتیجہ۔" وہ سورج سے مخاطب ہوئی۔ پھر دھڑ سے دونوں پٹ بند کر دیئے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس سارے مکان میں اسے یہی ایک کھڑکی زہر لگتی تھی جو بد قسمتی سے تھی بھی اسی کمرے میں جو اس کا اور مائدہ کا مشترکہ مسکن تھا۔ اسے بارش بھی بہت اچھی لگتی تھی مگر تب زہر لگنے لگتی جب وہ بلا اجازت ہی اس کھڑکی سے اندر گھس کر زمین پر بچھا کارپٹ اور میز پر پڑی کتابیں گیلی کر دیتی۔ اٹھلاتی ہوا کتنی دلفریب محسوس ہوتی ہے مگر ذرا اس اٹھلاہٹ میں جوش آتا تو کمرے میں گرد کا ڈھیر لگ جاتا۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس گرد کو اس نے کبھی جھاڑنے کی ہمت نہ کی تھی۔ یہ کام کرنے کی حقدار بلا شرکت غیرے مائدہ ہی تھی) پھر سب سے بڑھ کر یہ بدتمیز سورج طلوع ہونے میں ایک پل کی بھی دیر نہ لگاتا تھا اور کم بخت طلوع بھی تو اسی کھڑکی کے عین سامنے ہوا کرتا تھا بلکہ "میہ" کو تو یقین تھا کہ سورج صرف اسی کو چڑانے کے لیے مشرق سے نکلتا ہے۔ ورنہ باقی کی تین سمتیں بھی سارا دن فارغ ہی رہتی ہیں۔ وہ بوجھل آنکھوں اور سست قدموں سے چلتی کچن میں آ گئی۔ مائدہ برتن سمیٹتے ہوئے کھڑی جانے کیا فرائی کر رہی تھی۔

"السلام علیکم پیا......" مائدہ نے ذرا سا سر موڑ کر اسے دیکھا پھر سلام کا جواب دے کر بولی۔

"بستر سے نکل آئی ہو تو کم سے کم منہ ہی دھو لو۔"

"تو کیا ضرورت ہے منہ دھو لوں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ "آپ نے سنا نہیں شیر کبھی منہ نہیں دھویا کرتے۔"

"یہ بات شیروں کے لیے کہی گئی ہے شیرنیوں کے لیے نہیں۔" اس کی بات پر میہ بھی تھوڑا سا مسکرائی

پھر میز پر سر ٹکا دیا۔

"پپا......" مائدہ کی پشت پر نظریں ٹکائے اس نے پکارا۔

"ہوں......"

"پپا! ہم اپنے روم کی کھڑکی بند نہ کروا دیں۔" نیند سے بوجھل آنکھیں موند کر کہا بلکہ پوچھا اور جواب میں کورا "نہیں" سننے کو ملا۔ جھنجھلا کر سر اٹھایا۔

"کیوں بھلا......؟ وہ آفتاب کا بچہ ہر روز مجھے تنگ کرتا ہے۔" اس نے الجھن بیان کی تو مائدہ بھی اس کے پاس آ بیٹھی۔

"رات کو جلدی سویا کرو آفتاب تنگ نہیں کرے گا۔" کوئی نئی شکایت تو تھی نہیں پھر رٹی رٹائی بات کے جواب میں رٹی رٹائی باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں۔ میبہ نے چڑ کر بازوؤں میں منہ چھپانا چاہا تو مائدہ نے ٹوک دیا۔

"جلدی سے ناشتہ کر لو پھر یونیورسٹی......"

"جی نہیں! یونیورسٹی نہیں جانا مجھے...... آج چھٹی ہے۔" اس نے مائدہ کی بات قطع کی۔

"یہ ہفتے میں چار چھٹیاں کب سے ہونے لگیں۔"

اپنی وہیل چیئر گھسیٹ کر اندر آتی بی بی نے اس کی آخری بات ہی سنی تھی۔ تب ہی اسے کڑی نظر سے گھورا۔

"جب چھٹیاں ہی کرنی تھیں تو ایڈمیشن لیا ہی کیوں تھا خوامخواہ اتنے روپے خرچ کر دیے۔"

"یہ یونہی کہہ رہی ہے بی بی!" مائدہ ان کی چیئر ڈائننگ ٹیبل کے قریب لے آئی۔ میبہ اب مزے سے آملیٹ کھا رہی تھی۔ سر اٹھا کر بولی۔

"میں یونہی نہیں کہہ رہی۔ آج واقعی گھر پر آرام کرنے کا ارادہ ہے میرا۔"

"ابھی تو تمہاری کلاسز اسٹارٹ ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔ شروع سال سے ہی اتنی چھٹیاں کرو گی تو ہو چکا تمہارا بی ایف اے۔" اس کے شہنشاہی انداز پر مائدہ نے بھی ذرا سختی سے گھرکا تو وہ منہ بنانے لگی۔

"پلیز پپا! صرف آج چھٹی کر لینے دیں نا پھر آج صفائی کون کرے گا جبران بھی تو آج نہیں آئے گا ہے۔" میبہ نے گھر اسانی

"اس کی تم فکر مت کرو۔ جانے سے قبل میں سب کام نمٹا کر جاؤں گی۔"

خاموشی اختیار کی۔ خبر تھی آج کوئی عذر کام نہیں آئے گا۔

"تمہاری فلائیٹ کتنے بجے ہے؟" بی بی نے مائدہ سے پوچھا تو میبہ چونک کر دونوں کی

دیکھنے لگی۔

"کس کی فلائیٹ؟"

"ساڑھے بارہ بجے۔" اس نے پہلے بی بی کو جواب دیا پھر کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں آج کراچی جا رہی ہوں۔"

"واپس کب آئیں گی؟"

"دو روز بعد۔"

"کیوں جا رہی ہیں؟" اس نے یونہی پوچھا تھا مگر خبر نہ تھی کہ بی بی کو اتنا ناگوار گزرے گا، ڈپٹنے والے انداز میں بولیں۔

"وہاں گھر ہے اس کا۔ جب چاہے جائے جب چاہے واپس آئے تم کو کیا تکلیف ہے جو یوں سوال پہ سوال کیے جا رہی ہو؟" مائدہ نے انہیں تھوڑی سی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اتنا طویل جملہ، وہ بھی ایک ہی سانس میں، یہ بی بی کا شیوہ تو قطعاً نہ تھا۔ اس نے میبہ کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر شرمندگی کی سرخی بکھری پڑی تھی۔

"مائدہ کی انگیجمنٹ ہو رہی ہے میں نے بتایا تھا نا تم کو؟" مائدہ کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر کچھ سوچ کر خود ساختہ جوش سے بولی۔

"میں بھی چلوں پھر ہم اکٹھے ہی واپس آ جائیں گے لیکن نہیں، مجھے دیکھتے ہی ماموں ایسی صورت بنا لیتے ہیں جیسے کڑوا کریلا نگل لیا ہو۔" اس کا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔

چند لمحوں کے لیے کچن کی گرم فضا بوجھل خاموشی سے لبریز رہی تھی پھر مائدہ ہی نے ماحول کی کثافت کو کم کیا اب وہ میبہ کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔

"کیمپس ضرور جانا، بی بی کو کھانا ٹائم پر کھلا دینا، میں نے سوپ بنا دیا ہے، بی بی کو ٹائم پر دوا کھلا دینا، رات کو سوتے ہوئے سب کھڑکی دروازے ٹھیک سے چیک کر لینا اور سب سے اہم بات رات کو جلدی سے سو جانا وغیرہ وغیرہ۔" میبہ چڑ گئی۔

"آپ دو دن کے لیے جا رہی ہیں یا دو صدیوں کے لیے؟" مائدہ ہنس دی

"تو جو بتا رہی ہے، دھیان سے سنو۔ کچھ تمہاری بھی ذمہ داریاں ہیں، آخر کب تک سنبھالے گی جب میبہ چلی جائے گی تو پھر کون کرے گا یہ سب؟" آج بی بی ان دونوں کو حیران کرنے پر بضد تھیں۔ سو وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سے نکلتے ہوئے اس نے مائدہ کی آواز

سی تھی۔

''مجھے کہاں جانا ہے بی بی! میں تو ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہوں گی۔'' میہ کے قدم وہیں دہلیز میں اٹک گئے، چوکھٹ پر ہاتھ رکھے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ مائدہ کے بازو بی بی کے گلے میں ہار کی طرح لٹک رہے تھے۔

''میں بھی تو یہی چاہتی ہوں پیا! کہ آپ کہیں نہ جائیں۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

+

ڈرم اسٹکس سے سجی پلیٹ پر پڑا آف وائٹ کڑھائی والا رومال ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر گیٹ کے دوسری جانب جھانکا، پورچ خالی تھا۔ دائیں طرف چھوٹا سا دالان بھی خالی تھا۔ برآمدے میں رکھا میز اور اس کے گرد پڑی سفید کرسیاں بھی کسی ذی نفس کا پتا نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے تھک کر ایڑھیاں بھی نیچے رکھ دیں۔ پچھلے دو منٹ میں اس نے پورے اکیس بار گھنٹی کا بٹن دبایا تھا۔ ایک بار بھی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ صبر کی خو تو یوں بھی اس میں نہ تھی نجانے دو منٹ صبر کیسے کر لیا تھا۔

پچھلے ایک سال سے یہ گھر خالی پڑا تھا اور اب جب آباد ہونے لگا تھا، تو وہ کافی تو نہیں البتہ خوش ضرور تھی کہ نئے نئے لوگوں سے ملنے میں اسے یوں بھی لطف آتا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے اس نے ٹرک سے سامان اترتے دیکھا تھا، وہ جلدی میں نہ ہوتی تو یقیناً کھلے گیٹ کے قریب کھڑی سوبر سی خاتون سے متعارف ضرور ہو گئی ہوتی لیکن چونکہ صبح وہ تعارف نہیں کروا سکی تھی تبھی اب بی بی سے اجازت لے کر نئے مکینوں سے ملنے چلی آئی تھی اور گیٹ تھا کہ کھلنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ شاید گھر والے پورا اصطبل فروخت کر کے سوئے ہیں، اس نے قیاس لگایا۔ ساتھ ہی گیٹ سے منسلک چھوٹے سے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ خوشی کے مارے بس چیخ لبوں سے باہر آتے آتے ہی رہ گئی۔ اس نے کندھے پر پڑا دوپٹہ درست کیا اور بے دھڑک اندر گھس گئی۔ گھر کے طول و عرض سے تو واقف ہی تھی، بالکل ان کے اپنے گھر کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ اسے لاؤنج تک پہنچنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

عین وسط میں پہنچ کر اس نے نظر نہ آنے والی مخلوق کو پکارا ''کوئی ہے۔'' جواباً بھائیں بھائیں کرتے سناٹے میں اس کی اپنی ہی آواز گونجی تھی۔ اچانک عجیب سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی، اس نے ناک سکیڑ کر بو کی سمت معلوم کرنی چاہی پھر وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا۔ ایک بار پھر با آواز بلند گھر کے مکینوں کو غیر میں پکارا، جواب ندارد۔ اس دوران پہلی بار اس کا دھیان لاؤنج کی ابتر حالت کی طرف گیا تھا۔ صوفوں پر ہنوز گرد سے اٹی سفید چادریں پڑی تھیں اور ان کے اوپر کپڑوں کا ڈھیر تھا جو نجانے صاف تھے یا میلے۔ سینٹرل ٹیبل پر چائے کے تین خالی مگ، الٹا ہوا شوگر پاٹ، جس کا چمچہ کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ تمام ممکنہ

بیگ جبکہ ایک میں تو آلمپٹ ے بیہ جات بھی موجود تھے۔ ایک دوہرے صوفے کے اوپر ''جہازی سائز'' جوڑا بھی رکھا ہوا تھا۔ نیلے رنگ کی ٹی شرٹ ماربل کے فرش پر دراز تھی۔

کوئی ایسی نفاست پسند نہ تھی، اکثر اپنی چیزیں یوں ہی بکھیرے رہنے پر مائدہ اور بی بی سے ڈانٹ کھا چکی تھی مگر اس تباہ حالی پر اس نے اچھی خاصی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھالی۔ ایک بار دل چاہا تھا کہ کمر پر دوپٹہ باندھ کر سارا ''جہان'' صاف کر ڈالے، تبھی وہ ناگواری بو پھر اس کے اندر گھس گئی۔ اس نے پھر ناک سکیڑ کر سمت معلوم کرنے کی سعی کی۔

ساتھ ہی ساتھ سوں سوں کی دھیمی آواز پر کان لگائے جو دائیں جانب سے کچن سے آرہی تھی، اس نے کچھ سوچ کر کچن میں جھانکا، برنر پر رکھی کیتلی سے چائے کا سیلاب کنارے توڑ کر آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے تیزی سے بڑھ کر برنر آف کیا پھر پھونکیں مار مار کر چائے کو اس کے اصل مقام تک پہنچایا، اس سے قبل وہ ڈرم اسٹکس والی پلیٹ ایک طرف رکھ چکی تھی۔

''نجانے سب لوگ کہاں ہیں۔'' اب کی بار ذرا تشویش سے سوچا تھا، ساتھ ہی کمر پر ہاتھ رکھ کر سارے کچن میں نگاہ گھمالی۔ یہاں کی حالت بھی کچھ مختلف تو نہ تھی۔

''چلی جاؤں یا رک جاؤں۔'' پیشانی مسلتے ہوئے اس نے سوچا پھر لاوارثوں کی طرح ٹھنڈی ہوتی چائے کی حالت پر رحم آگیا۔ اگلے پل وہ کیبنٹ میں سے مگ نکال کر کھنگال چکی تھی۔ اس نے اطمینان سے چائے مگ میں انڈیلی، سپ لے کر دیکھا، چینی سرے سے غائب۔ اب چینی کی تلاش شروع کی تو خیال آیا کہ شوگر لاؤنج میں رکھی ہے۔ لہٰذا وہاں آ کر شوگر پوٹ اٹھایا، کچھ تو موجود ہی تھی، ابھی وہ سیدھی ہوئی ہی تھی کہ عقب سے آواز آئی۔

''کون ہو تم؟'' وہ مڑی دوسرے پل شوگر پوٹ زمین پر تھا اور میہ کی دلدوز چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ چیک دار ٹراؤزر پر بنیان پہنے کندھوں پر تولیہ ڈالے آدھا چہرہ سفیدی کی زد میں جبکہ باقی آدھے پر ہلکے کالے کنکھجورے لیے وہ عجیب مخلوق اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی اور وہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جو چیخنا شروع ہوئی تھی تو اب تک نان اسٹاپ چیخ رہی تھی اور یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ بیچاری سی مخلوق اس کے یوں گلا پھاڑ کر چیخنے پر گھبرا گئی ہے۔ پہلے اسے خاموش کروانے کی ہلکی سی کوشش کی مگر وہ بے اثر رہی تو جھنجلا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔

''تم چیخ کیوں رہی ہو؟'' میہ کا گلا ایک پل کو گھٹا تھا۔

''خبردار! خبردار جو تم دوبارہ چیخیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' اس کو پھر سے منہ کھولتا دیکھ کر تنبیہ کی گئی۔

''اب بتاؤ گدھے کی طرح کیوں چیخی ہو؟'' خاصی درشتی سے دریافت کیا گیا اور کوئی وقت ہوتا تو میہ [illegible] کرتی مگر اب......

"دیکھو بھبھو...... بھوت بھائی......" وہ ابھی یہی کہہ پائی تھی کہ وہ چیخ اٹھا۔

"بھوت...... یعنی کہ میں۔" اس کی کلائی چھوڑ اپنے سینے پر شہادت کی انگلی رکھے وہ آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی، ایک حسین وجمیل اور جوان جہان لڑکے کو بھوت کہتے ہوئے۔" منہ سہلاتے ہوئے اس سفیدہ زدہ چہرے میں سے حسین وجمیل نقوش کو دریافت کرنا چاہا مگر لگتا تھا صدمہ پہنچا تھا۔ تولیے سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا۔ تب میہ سمجھی کہ یہ سفیدی شیونگ کریم تھی، وہ جوان جہان لڑکا اب لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"اور یہ تم نے منہ پھاڑ کر بھائی کسے کہا ہے؟" ایک اور سوال۔ "دیکھو لڑکی! میں کافی سے زیادہ حسن پرست ثابت ہوا ہوں، بہن بناتے ہوئے بھی اس نقطے کو سامنے رکھتا ہوں لہٰذا تم جیسی بمشکل قبول صورت لڑکی کو تو میں بہن بنانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی میں اپنے والدین کا اکلوتا ہونہار بیٹا ہوں۔"

"اور شکل تمہاری بھوت جیسی ہے۔" ترنت جواب دیا۔ وہ "بمشکل قبول صورت" جیسی بات میں بجھے تیر کی طرح لگی تھی اور سارا خوف بھی اڑنچھو ہو گیا تھا۔

"یہ تم جا کہاں رہی ہو، بیٹھو یہاں۔" وہ جو دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگی تھی، ایک ہی جھٹکے کاؤچ پر دھکیل دی گئی، وہ شخص اب اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوا تھا۔

"اب بتاؤ کون ہو تم! کہاں سے آئی ہو اور ہمارے گھر میں کس ارادے سے گھسی ہو؟ ویسے مجھے قطعاً نہیں چاہیے مال مسروقہ تو میں تمہارے ہاتھ میں دیکھ ہی چکا ہوں اور شکل سے تو تم پکی بلکہ ورانہ چورنی لگتی ہو۔"

"پہلے جا کر اپنی شکل آئینے میں دیکھو، ڈاکوؤں کے سرغنہ تو تم لگتے ہو۔"

"میں روز بلاناغہ آئینہ دیکھتا ہوں اور وہ مجھ سے ایک ہی بات کہتا ہے کہ تیمور عارف تم سے بڑھ کر میں کوئی بھی ہینڈسم اور ڈیشنگ نہیں ہے۔"

"اس سے پہلے کہ تمہارے سر پر بچی ہوئی ایک اور انڈوں کی ٹوکری گرے، جا کر ایک بار پھر دیکھ لو۔" میہ نے کافی تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

"اچھا اب مجھے زیادہ باتوں میں مت الجھاؤ۔ خوب سمجھتا ہوں میں تم جیسی چالباز لڑکیوں کو، چاہ رہی ہو نا تم کہ میں آئینہ دیکھنے اندر جاؤں اور تم سارے ساز و سامان سمیت چمپت ہو جاؤ۔ نا بی بی! احمق نہیں ہوں میں۔" وہ ہاتھ نچا کر بولا۔

"تم کتنے احمق ہو اور کتنے نہیں، اس بات کا اعلان تو تمہاری شکل ہی چیخ چیخ کر کر رہی ہے۔" تا

نزانہ نظر اس پر ڈالی گئی تھی۔ "اور میں بھی خوامخواہ ہی تم سے بحث کرنے بیٹھ گئی، حالانکہ تم تو شکل سے ہی پاگل لگتے ہو۔" اپنی عقل پر بے حد افسوس کیا گیا تھا۔

"آہا شکلیں بہت پڑھنی آتی ہیں تمہیں۔" جلبلا کر کہا۔ "اور ایک بات میں بھی بتا دوں، شکل سے ہے میں نیم پاگل ہی لگتا ہوں مگر کوئی مجھے غصہ دلانے کی کوشش کرے تو میں شہتوت پاگل ہو جاتا ہوں۔"

"میری بلا سے تم سکھ چین پاگل ہو جاؤ۔" وہ ذرا بھی نہیں ڈری تھی اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ "ہٹو میرے آگے سے۔"

"کیوں؟" وہ کچھ اور پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ میہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا پھر گلا پھاڑ کر چلائی۔ "مجھے گھر جانا ہے۔"

"یہیں سے فون کر دو بلکہ میں ہی کر دیتا ہوں۔ چڑیا گھر کا عملہ آتے ہوئے پنجرہ بھی ساتھ ہی لے کر آئے گا......"

"دیکھو......" میہ نے جارحانہ انداز میں انگلی اٹھائی۔

"دیکھ ہی تو رہا ہوں۔" اس کے چہرے پر عجیب پراسراری مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

"گھر بھی چلی جانا اتنی جلدی کیا ہے؟" میہ کو اس کی آنکھوں کا رنگ بہت عجیب سا لگا تھا۔ دل یکبارگی کانپا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی سمجھا دیں گے۔" بڑے دوستانہ انداز میں کہہ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔ میہ کی آنکھیں دہشت اور خوف سے پھیل کر کچھ اور بڑی ہو گئیں، وہ دھپ سے پیچھے گری۔ شکر ہے صوفہ موجود تھا، تبھی اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

"اچھا ہوا وسیم ونڈو! تم آ گئے۔" سائیڈ ٹیبل سے کارڈلیس اٹھا کر وہ سیدھا ہو گیا۔ میہ کے لبوں سے اٹکا ہوا سانس خارج ہوا مگر دوسرا پھر سے اٹک گیا، وہ کہہ رہا تھا۔

"چلو وسیم ونڈو! پولیس اسٹیشن فون کرو اور بتاؤ انہیں کہ ہم نے ڈاکو رانی کو پکڑ رکھا ہے۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" بڑی بارعب سی آواز تھی جو نجانے کس سمت سے آئی تھی۔ تیمور عارف دروازے میں کھڑے "عباس مصطفیٰ" کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا۔

"ک...... کچھ بھی تو نہیں۔" عباس نے اس کی ہکلاہٹ پر الجھ کر اسے دیکھا پھر قریب آ گیا، پیچھے ڈی ایس پی قاسم شاہ تھا۔

"یہ کون ہے؟" قاسم کی نگاہ کاؤچ میں دھنسے اس تھر تھر کانپتے وجود پر پڑی تھی۔ عباس بھی متوجہ ہوا پھر حیرانہ سوالیہ نظروں سے تیمور کو دیکھا پھر ذرا سا اس کی جانب جھک کر چہرے کے آگے چٹکی بجائی۔

''آر یو او کے مس......'' مس صاحبہ چونکی، پہلے تو فل پولیس یونیفارم میں سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اس قدر کوئیک سروس پر حیران ہوئی اور اگلے ہی پل وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ عباس نے جھنجلا کر تیمور کو دیکھا، قاسم کے تاثرات بھی کچھ مختلف نہ تھے، تیمور الگ پریشان بلکہ تپا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہے یہ اور یہ کیا ہو رہا تھا۔'' عباس نے کڑے تیوروں سے تیمور کو گھورا مگر اس سے پہلے وہ بولنے لگی۔

''دیکھیے میں نے کچھ بھی نہیں کیا......''

''او کے میں مان لیتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں کیا مگر پلیز رونا تو بند کیجئے۔''

''یہ مجھے جیل میں تو بند نہیں کریں گے۔'' اس نے پوچھا عباس سے تھا اور دیکھا قاسم کی جانب تھا۔ میبہ اتنی معصوم تو قطعاً نہ تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی مگر خوف اکثر انسان کو ویسا بنا دیتا ہے جیسا کہ وہ نہیں ہوتا۔ اس کے سوال پر دھیمی سی مسکان قاسم اور عباس کے ہونٹوں کو چھو گئی تھی۔ کچھ کچھ معاملہ تو سمجھ ہی گئے تھے، عباس نے وسیم کو پانی لانے کا اشارہ کیا جبکہ قاسم کہہ رہا تھا۔

''جب تم نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر کیوں بند کریں گے؟''

''لو پانی پیو اور آنکھیں صاف کرو۔'' اتنی نرمی سے کہنے پر اسے قدرے سکون ہوا تھا، سو پانی کا گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ گلاس میز پر رکھتے ہوئے نظر سامنے گئی۔ تیمور سامنے ہی بیٹھا اسے مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا، وہ کھڑی ہو گئی۔

''میں جاؤں، بی بی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اس نے عباس اور قاسم کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو تیمور بولا۔

''خوامخواہ جاؤں، ابھی تو تم سے مکمل انکوائری ہو گی اور کتنے ساتھی ہیں تمہارے چورنی......''

''اب اگر تم نے مجھے چورنی کہا تو میں تمہیں قتل کر دوں گی۔'' وہ بھڑک کر بولی۔ پھر عباس اور قاسم کی طرف پلٹی۔ ''آپ خود بتائیں کیا میں شکل سے چورنی لگتی ہوں۔''

''قتل کی دھمکی وہ بھی ڈی ایس پی کے سامنے۔'' تیمور نے حیرت سے خود کلامی کی۔ ''کوئی نہ کوئی دفعہ تو اس پر لگ جائے گی، کیوں قاسم۔'' تائید چاہی مگر میبہ نے اسے غضب ناک نظروں سے گھورا پھر دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی۔

✦

ہفتے کی رات تو وہ کبھی بھی جلدی سونے کی غلطی نہیں کرتی تھی، اپنے ساتھ ساتھ مائدہ کو بھی زبردستی

جاگنے پر مجبور کرتی تھی مگر رات وہ جلدی سو گئی تھی اور صبح بھی جلدی آنکھ کھلی تھی، حالانکہ یہ اس کا وتیرہ نہ تھا، ہمیشہ مائدہ کے جھنجوڑنے پر ہی بیدار ہوا کرتی تھی۔ رات اس کا فون آیا تھا، کسی وجہ سے اسے مزید تین دن وہیں ٹھہرنا پڑ رہا تھا۔ میبہ کی آنکھ چونکہ جلدی کھل گئی تھی اس لیے کچھ وقت پڑھائی میں صرف کیا پھر بی بی کے پاس آ گئی۔

''بی بی! واک کرنے چلیں۔'' اس نے اجازت لینے والے انداز میں پوچھا۔ پھر وہیل چیئر ان کے قریب لے آئی تا کہ بی بی کو اس پر شفٹ کر سکے مگر بی بی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے ابھی قرآن مجید پڑھنا ہے، تم جانا چاہو تو چلی جاؤ مگر جلدی واپس آ جانا۔'' وہ سر ہلا کر باہر نکل آئی، اسے کون سا کہیں دور جانا تھا، وہیں کالونی کے پارک میں ایک راؤنڈ لگا کر روڈ پر آ گئی۔ سست روی سے چلتے ہوئے وہ اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ روشنی تو خیر کافی پھیل چکی تھی۔ آسمان پر بادل یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی نے تازہ دھنکی ہوئی روئی پھیلا دی ہو۔ ٹھنڈی ہوا بھی خاصی خوش کن تھی۔ اکثر گھروں کی بیرونی دیواریں بوگن ویلیا اور عشق پیچاں کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ تبھی اس نے قدموں کی ہلکی سی دھمک پر ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا، پیچھے آنے والا شخص اس کے سامنے آن رکا تھا۔

''السلام علیکم۔'' وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے سادگی سے جواب دے کر ٹریک سوٹ میں ملبوس اس شخص کو دیکھا۔

''تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔'' اب کی بار وہ کھل کر مسکرائی۔

''جی نہیں، میں آپ کو پہچان گئی ہوں، آپ......'' وہ جھجکی۔ ''مگر مجھے آپ کا نام نہیں معلوم۔''

''عباس مصطفیٰ...... خیریت سے ہو تم۔'' اس نے پہلے بتایا پھر پوچھا۔

''جی بالکل۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''وہ جو سامنے سی گرین گیٹ والا پیارا سا گھر ہے نا میں وہاں رہتی ہوں، اس روز میں تو صرف گھر والوں سے ملنے کے لیے گئی تھی مگر وہ گھونچو ملنجانے کیا سمجھا۔''

''اور وہ جو سی گرین گیٹ والے پیارے سے گھر کے ساتھ والا گھر ہے نا، میں وہاں رہتا ہوں۔'' اس کا انداز صد ... شرارتی تھا، میبہ خوشگوار سی حیرت کے زیر اثر مسکرائی۔

''اس کا مطلب ہے آپ ہمارے نئے ہمسائے ہیں۔''

''ہاں اور اس گھونچو مل کی طرف سے میں تم سے ایکسکیوز کر رہا ہوں، ایکچوئیلی وہ ذرا شرارتی ہے۔''

''اور وہ ڈی ایس پی؟'' اسے اچانک یاد آیا تھا۔

''وہ قاسم تھا میرا دوست۔''

''وہ بھی آپ کے ساتھ رہتے ہیں، آئی مین آپ کے گھر میں۔''

''نہیں بھئی، کل تو وہ بس یونہی آیا تھا۔'' عباس ہولے سے ہنسا، اس کی الجھن سمجھ رہا تھا۔

"ہوں، میں بھی سوچ رہی تھی ہمارے ملک کی پولیس اتنی تیز کب سے ہوگئی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" عباس نے اسے بڑبڑاتے دیکھا تو پوچھا، وہ سر جھٹک کر بولی۔

"کچھ نہیں، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ میرا نام میبہ طارق ہے۔"

"نائس نیم.....کیا کرتی ہو، آئی مین پڑھی ہو یا......" اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا۔

"جی بی ایف اے کر رہی ہوں۔"

"بہت خوب۔" وہ مسکرایا۔ "جانتی ہو میں نے بھی بی ایف اے کر رکھا ہے اور پھر ماسٹرز بھی فائن آرٹس میں ہی کیا۔"

"ریئلی۔" وہ بے طرح خوش ہوئی تھی۔ "اس کا مطلب ہے میں اسٹڈیز میں آپ سے مدد لے سکتی ہوں نا۔"

"ضرور۔" عباس نے خوش دلی سے کہا۔ "خیر اسٹڈیز کے علاوہ اور کیا ہابیز ہیں تمہاری؟"

وہ اسے مزید بتانے لگی۔ عباس اسے بہت دھیان سے سن رہا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنس بھی رہا تھا، حاصل کلام یہ کہ گھر پہنچنے تک وہ دونوں بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ تیمور کافی دیر سے عباس کا منتظر تھا تبھی گیٹ پر ہی اس کا انتظار کر رہا تھا، اسے دیکھتے ہی باہر آ گیا۔

"کتنی دیر کر دی یار ماے۔" وہ عباس کو دیکھتے ہی بولا۔ میبہ نے الجھ کر عباس کو دیکھا۔

"ماے؟" عباس ہنس دیا پھر دونوں کا تعارف کروایا۔

"یہ تیمور ہے، میری اکلوتی بجیا کا اکلوتا بیٹا اور تیمور! یہ میبہ ہے میری نئی فرینڈ۔"

"امیبا.....کچھ عجیب سا نام نہیں ہے۔" تیمور نے براہ راست اسے دیکھا تو وہ چڑ ہی گئی۔ کتنی بری طرح اس کا نام بگاڑ دیا تھا اور یہ شخص تو اسے اول روز سے ہی زہر لگا تھا، لہٰذا نظر انداز کر کے عباس سے مخاطب ہوئی۔

"اس کا مطلب میں بھی آپ کو ماموں کہہ سکتی ہوں نا۔" وہ شرارت سے دریافت کر رہی تھی، تیمور جھٹ سے بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

میبہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟ آپ بھی تو کہتے ہیں۔"

"ہاں تو میرا ماما ہے، میں چاہوں تو ماما کہوں، چاہوں تو چاچا۔ خالو یا پھپھا کہنے کی بھی قید نہیں ہے، مگر تم نہیں کہو گی۔" بڑی سنجیدگی سے وہ لڑنے بھڑنے کو تیار تھا۔ شرارت سے لبریز آنکھیں صرف عباس کو گھور رہی تھیں اور میبہ کی سڑی شکل بھی۔

"م چھپی ہوئی! تم جو چاہو مجھے کہہ سکتی ہو۔" اس نے نرمی سے میبہ کا سر تھپتھپایا تو وہ فاتحانہ انداز میں تیمور کو دیکھنے لگی جو خود کو لاپرواظاہر کرنے کے لیے کان میں انگلی ہلا رہا تھا۔

"میں کے عباس بھائی! میں جاتی ہوں، بی بی انتظار کر رہی ہوں گی۔" رشتے کا تعین ایک پل میں ہی کر لیا تھا۔

"اچھا سنو! وہ ڈرم اسٹکس بہت اچھی تھیں، ان کے لیے تھینکس۔ تم نے بنائی تھیں۔" عباس نے پکار کر پوچھا، وہ اپنے گھر کا گیٹ کھول چکی تھی، وہیں سے بولی۔

"نہیں بیانے۔"

+

"وہ اتنے ہینڈسم ہیں کہ میں کیا ہی بتاؤں، سوٹ میں تو خیر غضب ڈھاتے ہی ہیں مگر کرتا شلوار کے تو کیا ہی کہنے۔ پرسوں انہوں نے بلیک کرتا شلوار پہن رکھا تھا، کسی فنکشن میں جا رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ جس فنکشن میں وہ جا رہے ہیں وہاں موجود لڑکیاں تو آہیں بھر بھر کر ہی مر جائیں گی۔" وہ اپنی بات کو خود ہی انجوائے کرتے ہوئے زور سے ہنسی تھی اور مائدہ بس مسکرا دی تھی۔ دو دن کا کہہ کر آج وہ دو ہفتوں کے بعد لوٹی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ امی، مائرہ اور معیز کا بے حد اصرار تھا۔ وہ ٹھہر تو گئی تھی مگر دھیان تمام تر بیبی بی اور میبہ میں اٹکا رہا تھا۔ آج صبح ہی واپسی ہوئی تھی اور میبہ اس سے سخت خفا تھی، خوب ہی منتیں کروا کر مانی تھی اور اب اس کے سامنے بڑے ذوق وشوق سے "عباس نامہ" نشر کر رہی تھی۔

"پتا ہے پیا! ان کی مسکراہٹ تو بے حد گریس فل ہے اور جب مجھے گڑیا کہتے ہیں تو سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے اپنا سٹوڈیو بھی دکھائیں گے۔"

"اور کون کون ہے ان کے گھر میں، میرا مطلب ہے بیوی بچے؟"

"اونہوں شادی ابھی تک نہیں کی انہوں نے......ویسے پتا نہیں کیوں نہیں کی؟" آخری جملہ اس نے ...سوچتے ہوئے کہا تھا، گویا واقعی اس "کیوں نہیں" کا جواب جاننا چاہ رہی ہو پھر سر جھٹک کر بولی۔

"ہاں ان کے ساتھ ایک گھونچو مل بھی رہتا ہے وسیم ونڈو بھی۔" لہجہ نہایت کڑوا تھا اور مائدہ کے لیے دونوں نام ہی حیران کن۔

"گھونچو مل؟"

"ہوں، تیمور عارف نام ہے اس کا، عباس بھائی کا بھانجا ہے، اس کے علاوہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ انتہائی بدتمیز ہے۔" اس نے وقتاً فوقتاً ہونے والی لڑائیوں کا حال سنایا تو مائدہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"کافی دلچسپ شخصیت کا مالک ہوا پھر تو۔" میبہ نے نہایت ناگواری سے سر جھٹکا۔

"مجھے تو زہر لگتا ہے دیکھنے میں، بالکل عباس بھائی کا ہم عمر ہی لگتا ہے اور پتا ہے، اتنے دھڑلے سے ان کا نام لیتا ہے۔" نجانے اسے کس بات پہ اعتراض تھا ہم عمر لگنے پر یا نام لینے پر۔

"اور یہ وسیم ونڈو کیا چیز ہے؟"

"جیسے ہماری جیراں ہے، ویسے ہی وسیم ونڈو ہے۔"

"ہاں مگر نام کچھ عجیب سا نہیں؟" میبہ ہنس دی۔

"دراصل اس کا نام وسیم باری ہے مگر تیمور اسے وسیم ونڈو تو کبھی وسیم کھڑکی کہہ کر بلاتا ہے۔ مجھے بھی اسے چڑانے میں مزہ آتا تھا، بس اسی لیے یہ نام زبان پر چڑھ گیا۔"

"ہوں، اسے چڑانے میں مزہ آتا ہے تو پھر جب تیمور تمہیں "امیبا خانم" کہتا ہے تو غصہ کیوں آتا ہے۔" مائدہ نے اسے غلطی کا احساس دلایا تو وہ خجل سی ہو کر ہنس دی۔

"اچھا اب تم جاؤ، مجھے کچھ دیر آرام کرنا ہے۔" وہ تکیہ درست کر کے لیٹ گئی۔ میبہ کو احساس تھا تبھی اٹھ گئی پھر دروازے میں رک کر پلٹی۔

"کل کالج جائیں گی آپ؟"

"ہوں، پہلے ہی کافی حرج ہو چکا ہے۔" پل بھر میں اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ میبہ نے لائٹ آف کی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ بی بی کمرے میں کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، سو وہ ٹیرس پر آ گئی۔ آسمان پر اودے اودے بادل منڈلا رہے تھے۔ ابھی تو بہار کی مہک نے پہلی انگڑائی ہی لی تھی اور دھرتی کا رنگ ہی بدل گیا تھا، وہ عقبی دیوار سے کمر ٹکا کر آسمان پر اڑتے بگلوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ یوں ہی دائیں طرف جھانکا، ان میں عباس نہ صرف موجود تھے بلکہ اتفاق سے ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر وش کیا۔ جواباً انہوں نے اسے اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی تھی، وہ معترض تھی مگر اصرار پر اچھا کہہ کر نیچے اتر آئی۔ بی بی کے کمرے میں جھانکا، وہ سو رہی تھیں۔ اس نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کچن مین برتن دھوتی جیراں کو بتا کر ان کی طرف آ گئی۔ گیٹ وسیم باری نے کھولا تھا، وہ اس کی بتیسی دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسے ہو وسیم باری!" اس سے پیشتر وہ خفا ہو کر بتیسی چھپا لیتا تھا مگر آج حیران ہو کر چھپائی تھی۔ جواب نہ تب ملتا تھا اور نہ اب ملا تھا، وہ لان میں رکھی چیئر پر براجمان عباس کی طرف آ گئی۔

"آؤ میں تمہیں اپنے پودے دکھاؤں۔" کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد عباس نے اس سے کہا، وہ اٹھ کر پودے دیکھنے لگی جو عباس نے بڑی محبت سے لگائے تھے۔ کچھ دیر بعد وسیم چائے لے آیا، پیچھے ہی تیمور بھی تھا۔

"آہا! میں بھی سوچ رہا تھا کہ ہمارے گھر میں اتنا اندھیرا کیوں ہو رہا ہے، وہ تو اب پتا چلا کہ امیبا صاحبہ آئی ہیں۔" میبہ کو سخت تاؤ آیا مگر خاموش رہی، جواب دینے کی صورت میں وہ بات سے بات نکالتا ہی چلا جاتا اور یہی میبہ نہیں چاہتی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" عباس نے تیمور کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ یکدم چونک کر اسے دیکھنے لگی، جبکہ تیمور ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں ماما! تم تو خوامخواہ ہی گھبرا جاتے ہو۔"

"خوامخواہ نہیں گھبراتا، جب اتنا تیز بخار تھا تو کیوں گئے تھے آفس، وہ تو شکر ہے مجھے وسیم نے فون کر دیا۔" عباس کی جھڑکیوں میں بھی بے حد اپنائیت تھی، تبھی تو تیمور مسکرائے ہی جا رہا تھا۔ میبہ نے پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا اور یہی دیکھنا حقیقتاً مصیبت بن گیا۔ چہرے پر کھنڈی زردی، آنکھوں میں پڑے سرخ ڈورے، ملگجے کپڑے، الجھے بال، جنہیں وہ انگلیوں سے سنوار رہا تھا، ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو...... اس کا چائے بناتا ہاتھ یکدم لرزنے لگا۔ عجیب سے احساس نے اسے نگاہ جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے حیرت سے اپنے دل کو ڈپٹا اور پوری کی پوری عباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"پیا واپس آ گئی ہیں۔"

"پیا ہی ہیں نا جو بہت اچھی ہیں اور جن کے بغیر تمہارا دل بالکل نہیں لگتا، جنہوں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور آج کل ایک پرائیویٹ کالج میں ایز اے لیکچرار جاب کر رہی ہیں اور جو بے حد انٹیلی جنٹ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔" عباس نے بہت شرارت سے کہا تو وہ بجائے خفا ہونے کے کھلکھلانے لگی۔

"جی ہاں، وہی ہیں۔"

"ہوں، کافی بریلینٹ خاتون معلوم ہوتی ہیں، ضرور مضبوط اعصاب کی مالک بھی ہوں گی۔ ظاہر ہے کمزور اعصاب والوں کا تمہارے ساتھ گزارا ذرا مشکل ہی ہے۔ خیر پھر کب ملوا رہی ہو ہمیں اس عظیم ہستی سے۔" تیمور کے سنجیدہ سے انداز پر وہ جل بھن کر کوئلہ ہو گئی، تڑخ کر بولی۔

"تمہیں تو ہرگز نہیں ملواؤں گی۔" پھر عباس سے بولی۔ "میں آپ سے مشورہ کرنے آئی تھی۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے عباس!"

"پیا کا برتھ ڈے آ رہا ہے نیکسٹ ویک...... میں انہیں کیا گفٹ دوں۔"

"میں سمجھا محترمہ ایفل ٹاور خریدنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔" تیمور کا آسودہ سانس کافی بلند آواز میں باہر آیا تھا۔

"مجھے کیا معلوم، انفیکٹ میں تمہاری پیا کی نیچر سے قطعی واقف نہیں ہوں اور گفٹس تو نیچر کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔" میبہ کو مایوسی ہوئی۔

"پھر بھی کچھ تو مشورہ دیجئے۔" عباس نے ایک پل کو سوچا پھر بولا۔

"تم نے کہا تھا کہ پیا کو لٹریچر سے دلچسپی ہے تو کوئی بک ہی گفٹ کر دو۔"

"اوہوں، وہ تو پچھلی بار دی تھی۔" اس نے تجویز رد کی۔

"پرفیوم۔"

"وہ اس سے پچھلی بار دیا تھا۔"

"پھر۔" میبہ نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ "خواتین کو جیولری پسند ہوتی ہے۔"

"جیولری اس سے پچھلی سالگرہ پر دی ہوگی۔" تیمور نے قیاس آرائی کی، یوں بھی اس لڑکی کے سامنے زیادہ دیر وہ خاموش نہیں رہ پاتا تھا۔

"پیا کو جیولری سرے سے پسند ہی نہیں ہے۔" اس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"پھر یوں کرو بادشاہی مسجد گفٹ کر دو۔" تیمور نے بروقت لقمہ دیا۔ اس نے عباس کی جانب دیکھا جو بے بسی سے کندھے اچکا رہا تھا۔

"یہ تیمور کا حلقہ احباب مجھ سے زیادہ وسیع ہے۔ گفٹس لینا اور دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے، اسی سے پوچھو، یہی بہتر مشورہ دے سکتا ہے تمہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف مڑی تو وہ بولا۔

"ٹھہرو، مجھے سوچنے دو۔" دائیں ٹانگ اضطراری انداز میں ہلاتے ہوئے وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا، گویا گفٹ وہیں سے برآمد کرنا ہو۔ میبہ بڑی شدت سے جواب کی منتظر تھی، تیمور کی نگاہ پیچھے پلٹی۔

"کتاب اور پرفیوم تم دے چکی ہو جیولری انہیں پسند نہیں ہے۔" ترچھی نگاہ میبہ پر ڈالی۔

"یوں کرو امیبا خاتون!" میبہ نے دانت کچکچائے، بولی کچھ نہیں اس وقت مشورہ جو درکار تھا۔

"گھوڑا گفٹ کر دو۔"

"لعنت ہو۔" لجاجت پل بھر میں غائب ہوئی، اس شخص سے عقلمندانہ بات کی توقع ہی فضول تھی۔

"گھوڑے کی بجائے گدھا نہ گفٹ کر دوں۔" اس کی نظر نے پوری سنجیدگی سے تیمور عارف کا گھیراؤ کر لیا تو وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں بھئی، گدھا آج کل ٹرینڈ میں نہیں ہے پھر تم خود سوچو بھلا تمہاری پیا گدھا گاڑی پر سوار بھی لگیں گی، تانگے کی تو خیر ایک گریس ہوتی ہے۔" وہ مزید چڑ گئی مگر ہار نہ مانی۔

"اور الو کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ایک دم بوگس، نہایت ہی بکواس۔ الو کے پیچھے تو چنگ چی بھی نہیں لگوائی جا سکتی۔ ویسے میرا خیال ہے چمگادڑ زیادہ موزوں رہے گی۔" متبسم و شریر انداز میں صاف اسے چوٹ کی گئی تھی، وہ تپ کر اٹھ کھڑی

ہوئی مگر عباس نے تیمور کو تنبیہی نظروں سے گھورا پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"یوں کرو گڑیا! تم اپنی پیا سے ہی پوچھ لو کہ وہ تم سے کیا گفٹ لیں گی۔"

"نہیں۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "پھر تو وہ صاف منع کر دیں گی۔ کیونکہ انہیں بچوں سے گفٹ لینا پسند نہیں ہے اور وہ مجھے اب تک بچہ ہی سمجھتی ہیں۔"

"چلو جی غلط فہمی تو دور ہوئی ورنہ میں تو واقعی انہیں عقلمند خاتون سمجھا تھا۔" اب کی بار وہ واقعی پاؤں پٹخ کر کھڑی ہوگئی تھی اور پھر عباس کے روکنے پر بھی نہیں رکی تھی۔

✦

آج وہ بہت اصرار سے بی بی کو گھر سے باہر لائی تھی۔ معذوری انسان کو کیسے زچ کر کے رکھ دیتی ہے اس کا اندازہ وہ بی بی کو دیکھ کر ہی کرتی تھی۔ معمولی سے روڈ ایکسیڈنٹ نے ان کی ٹانگیں چھین لی تھیں مگر گھر میں بند ہو جانے پر انہیں اس بات نے مجبور نہیں کیا تھا، وہ بات کیا تھی؟ بلاشبہ بی بی سمیت وہ دونوں ہی واقف تھیں مگر ایک خاموش معاہدہ پچھلے پانچ برسوں سے ان کے درمیان چلا آ رہا تھا اور اس معاہدے کی پاسداری ان تینوں کو ہی کرنی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بی بی؟" ایک طویل خاموشی آج بھی مائدہ نے ہی توڑی تھی۔

"کچھ نہیں۔" بی بی نے مختصراً کہا، حالانکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دلی حالات سے واقف تھیں۔ مائدہ نے وہیل چیئر روڈ کے ایک جانب روک دی اور خود سامنے بنی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھ گئی۔

"شجاعت کیسا ہے۔" بی بی نے جیسے کچھ فاصلے پر کھیلتے بچوں سے سوال کیا تھا۔

"پاپا ٹھیک ہیں۔" مائدہ نے جواب دیتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔ جھریوں بھرے چہرے پر دو بڑی آنکھیں ابھی بھی بے حد روشن اور چمکدار تھیں مگر تکان زدہ، جن پر پچھتاوے کا پردہ پڑا ہوا تھا، کسی غلط فیصلے کا غم، کچھ کھو دینے کا پچھتاوا۔ مائدہ کو لگا تھا کہ وہ سرمئی بدلیاں یک دم برسنے لگیں گی، تبھی ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"پاپا آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔" بی بی ہنس دیں، یہ تسلی عجیب بچگانہ سی لگی تھی۔

"ہاں کرتا ہی ہوگا، اس کا خزانہ جو میرے پاس ہے۔" ان کی ہنسی ٹوٹی پھوٹی سی، اپنا تمسخر اڑاتی ہوئی اور آزردہ سی تھی۔ مائدہ نے ان کا غم اپنے اندر بھی محسوس کیا تھا۔ تسلی کے دو حرف آج بھی اس کے پاس نہیں تھے۔ ناکردہ جرم کی سزا کا بار بہت زیادہ تھا اور بی بی بے حد کمزور۔ تبھی تو اب تلک اس بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔ کتنا چاہا تھا مائدہ نے کہ وہ یہ بوجھ سرکا دے مگر......

"پاپا کے دوست ہیں اطہر مبین، انہی کی بیٹی سے مائرہ کی منگنی ہوئی ہے۔" وہ ان کا دھیان بٹانے کی

غرض سے بولی تھی۔ ''بی بی! میں چاہ رہی تھی کہ ہم میبہ کی منگنی کر دیں، اگلے سال جب اس کا گریجویشن پورا
ہو جائے گا تو شادی کر دیں گے۔'' اس نے رائے لینے والے انداز میں انہیں دیکھا تو وہ بولیں۔
''میبہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔''

''ہوں۔'' اس نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''پھر منگنی کر دینے میں تو کوئی برائی نہیں ہے
دراصل میری کولیگ اپنے بھائی کا پرپوزل لانا چاہ رہی ہے میبہ کے لیے، اگر آپ کہیں تو......''
''تم جو مناسب سمجھو۔'' انہوں نے پاور آف اٹارنی ہی اسے سونپ دی پھر آنکھیں موند کر بولیں۔
''اب گھر چلو، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' مائدہ نے وہیل چیئر کا رخ موڑ دیا۔ ایک سے دوسرا قدم ہی اٹھایا
جب اپنے پیچھے آواز سنی۔

''اب آپ باؤلنگ کروائیں تیمور بھائی!'' ذرا سا اشتیاق جاگا تھا، سو گردن موڑ کر دیکھا۔ بلیک
ٹراؤزر کے ساتھ نیوی بلیو شرٹ پہنے وہ اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی، مگر سرسری۔ اچھا خاصا ہینڈسم تھا
فرنچ کٹ داڑھی چہرے پر سجائے ان بہت سارے بچوں میں بس ذرا بڑا بچہ ہی لگ رہا تھا۔ مائدہ کو میبہ کا
عباس مصطفیٰ کی تعریف میں قلابے ملانا یاد آ گیا تھا۔ ''کیا وہ شخص اس سے بھی زیادہ شاندار شخصیت کا مالک
ہو سکتا ہے؟'' اسے اپنے اس احمقانہ خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی تھی، تبھی ان بہت سارے بچوں کے درمیان
موجود بڑے بچے نے یوں ہی غیر ارادی طور پر نظر اس پر ڈال کر ہٹا لی تھی۔

+

میبہ کی فرینڈ کی منگنی تھی اور وہ تیار ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔
''کیسی لگ رہی ہوں۔'' ایئر رنگز پہنتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔
''ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے سادگی سے کہا اور ٹی وی آف کرتے ہوئے بولی۔
''جاؤ بی بی کو بتاؤ اور میرے کمرے میں بک شیلف پر کار کی چابی رکھی ہو گی وہ بھی لے آؤ۔''
دونوں کام نمٹا کر پورچ میں آئی تو مائدہ کار سے ٹیک لگائے منتظر تھی۔
''ویسے اپنی کنوینس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' چابی مائدہ کو تھماتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے
وائٹ نسان کو دیکھا تھا جو کچھ عرصہ قبل ہی ان لوگوں نے لی تھی۔ مائدہ ہنس کر کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ میبہ
نے گیٹ کھولا۔ کار باہر نکل چکی تو گیٹ بند کرتے ہوئے اس کی نظر عباس اور تیمور پر پڑ گئی۔ اس نے گیٹ
بند کیا پھر فرنٹ سیٹ کی کھڑکی میں جھک کر ''دو منٹ'' کہہ کر ان کی طرف آ گئی۔ عباس نے اس کا استقبال
مسکرا کر کیا۔ جبکہ تیمور نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اچھی خاصی حیرانگی کا اظہار کیا تھا۔
''یہ آج کہاں قیامت ڈھانے کا ارادہ ہے ایبا خانم!'' میبہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

(اب یوں دیکھنے کا کیا فائدہ ہم تو پہلے ہی اس قیامت کی زد میں آ چکے ہیں) اسے دیکھتے ہی یوں بھی بلا
وجہ غصہ آنے لگتا تھا پھر اس کی آگ لگانے والی باتیں۔
''میرا بس چلے تو تم پر ہی چلا دوں۔'' اس نے دانت کچکچائے، آپ جناب کا تکلف تو یوں بھی نہیں
برتتی تھی۔
''بس نہیں چلتی تو ٹرک ہی چلا دو۔'' بڑی جاندار مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھری تھی مگر میبہ غصے میں کسی
بات کی طرف دھیان دے ہی نہ پاتی تھی۔
''کیسی ہے ہماری گڑیا!'' عباس جو کار کا دروازہ کھول رہا تھا، رک کر پوچھنے لگا۔ جواباً وہ خفگی سے
بولی۔
''آپ تو بات ہی مت کریں مجھ سے۔''
''ارے کیوں بھئی؟''
''کہاں تھے پچھلے ایک ہفتے سے۔'' وہ باقاعدہ کمر پر ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ مائدہ کار سے باہر آ
گئی۔ تیمور کے ساتھ دوسرا شخص عباس مصطفیٰ ہی ہو سکتا تھا اور میبہ کب سے اسے عباس سے ملوانا چاہ رہی
تھی۔ مائدہ ان کے قریب آئی تو میبہ نے اپنی ناراضی بھول کر کافی پرجوش انداز میں تعارف کروایا تھا۔
''یہ میری پیا ہیں، آئی مین مائدہ حسین۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔ ''اور پیا! یہ عباس بھائی ہیں۔''
''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' رسم نبھائی تھی اور ساتھ ہی کمال خوبصورتی سے اپنی حیرانی چھپا گیا
تھا، اپنے اندر کا موسم بروقت چھپا لینے میں اسے یوں بھی ملکہ حاصل تھا جس طرح سے میبہ ''پیا'' کا ذکر کیا
کرتی تھی، ان لوگوں کے ذہن میں کسی بڑی سی عمر کی خاتون کا خاکہ ہی بن سکا تھا اور اس وقت ان کے
سامنے ایک دھان پان سی لڑکی کھڑی تھی۔
''اور میں تیمور ہوں، دشمنوں کی تو زبان جلتی ہے ہمارا نام لیتے ہوئے۔'' اس نے جتاتے ہوئے کہا
تھا۔ مائدہ ہنس دی۔ جبکہ میبہ نے حسب معمول اسے گھورا تھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی
نگاہیں بے ساختہ ہنستی مائدہ پر ٹکی تھیں۔ وہ نگاہوں کی زبان کبھی بھی سمجھ نہیں پائی تھی مگر اس پل ان نگاہوں
میں کیا تھا؟ ستائش، پسندیدگی یا...... یا کچھ بھی نہیں۔ عباس مائدہ سے رسمی سی گفتگو کر کے اس کی طرف متوجہ
ہوا۔
''ممی سیالکوٹ گیا ہوا تھا۔ ایکچوئیلی بجیا کچھ بیمار تھیں، بس اسی لیے...... تمہیں تیمور نے نہیں بتایا۔''
اس نے رک کر تیمور کی جانب دیکھا تو وہ یکدم چونکا۔
''ہوں کیا کہا؟'' اس کے کچھ دیر بعد وہ لوگ اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے تھے لیکن جو کچھ
عباس اور میبہ نے محسوس کیا تھا وہ شاید نہیں یقیناً مائدہ نہیں کر پائی تھی۔ عباس کو تو بس سرسری سی حیرت ہوئی

تھی جبکہ میبہ کو عجب سی بے کلی نے گھیر لیا تھا، وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا بات بری لگی ہے۔
"تیمور" کا "مائدہ" کو دیکھنا یا "تیمور" کو مائدہ کا دیکھنا اور وہ رات تیمور عارف نے [illegible] جاگتے ہوئے اور دانستہ اس عام سے حلیے والی لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری تھی۔

+

وہ اگرچہ تھک گئی تھی مگر موسم کی دلفریبی نے آدھی سے زیادہ تکان کھینچ لی تھی۔ آج اس کی [illegible] آصفہ نے اسے اپنی ادبی محفل میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی، اسے لٹریچر سے ایسی کچھ خاص دلچسپی [illegible] بس یوں ہی وقت گزاری کے لیے پڑھ لیتی تھی اور اسی وقت گزاری کے مصرف نے اس کے کمرے [illegible] ایک پورا ریک کتابوں سے بھر دیا تھا، اب بھی وہ بس آصفہ کے اصرار پر چلی گئی، محض دو گھنٹے ہی [illegible] سکی تھی کہ میبہ نے اسے جلدی واپس آنے کے لیے کہا تھا، وہ اسے اپنا بیگ کیا ہوا [illegible] نارمل اسپیڈ سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ٹینا ثانی کو سن رہی تھی کہ یکدم کار ہچکولے کھا کر رک گئی۔ اس [illegible] ناگواری سے گیئر لگایا پھر باہر نکل آئی۔ ٹائر تو سلامت ہی تھے، بونٹ کھول کر دیکھا، یہاں وہاں ہاتھ [illegible] پر سمجھ نہ آیا کہ خرابی کدھر ہے۔ سیکنڈ ہینڈ چیزیں یوں ہی عین وقت پر داغ مفارقت دے دیا کرتی ہیں۔ سڑک طویل اور سنسان تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر بے سود۔ دو ایک طویل الجثہ ٹرک ہی گزرے تھے۔ تھک کر فرنٹ ڈور سے کمر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ آسمان پر بکھری بدلیوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ابھی برس کر جل تھل کر دیں گی۔ پریشانی نے زیادہ کوفت اور جھلاہٹ ہوئی تھی، تبھی ایک ریڈ سوک اس کے سامنے سے گزری تھی پھر کچھ آگے جا کر ٹھہری اور ریورس ہو کر اس تک آئی، وہ محتاط سے انداز میں [illegible] ہوئی تھی۔ کار کی پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آنے والی شخصیت تیمور عارف کی تھی۔

"ہیلو۔" وہ اس کے قریب آ کر مسکرایا۔
"السلام علیکم۔" وہ جتانا نہیں چاہتی تھی، بس عادتاً ایسا کہا تھا۔ تیمور خجل سا ہو کر سر کی پشت کھجانے لگا۔
"وعلیکم السلام، کیسی ہیں آپ؟"
"بہت اچھی ہوں۔" اس لڑکے کو دیکھتے ہی میبہ کے دیے ہوئے کمنٹس یاد آ گئے تھے، وہ [illegible] سن کر مسکرایا۔
"وہ تو میں جانتا ہوں لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی [illegible] کر پوچھا تھا۔ ظاہر ہے شام جب رات کے دوراہے پر کھڑی ہو تو ایک تنہا لڑکی کا سنسان سڑک پر [illegible] کیا جواز رکھتا ہے۔ مائدہ نے اسے مختصراً کار کی خرابی کے متعلق بتایا۔
"میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں، لیکن میرے فرینڈز میرے ساتھ ہیں۔" اس نے یوں کہا کہ [illegible]

[illegible] ہو تو آ جائیں، وہ بولی۔
[illegible] کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر تم میری کار ٹھیک کر دو تو میں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔"
"ہوں۔" وہ سر ہلا کر بونٹ کی طرف آ گیا۔ مائدہ اسے ہاتھ چلاتا دیکھتی رہی، چند لمحے بعد وہ بونٹ بند کر کے اس کی طرف آ گیا۔
"معمولی سا فالٹ تھا، میں نے ٹھیک کر دیا ہے۔"
"تھینک یو سو مچ۔" مائدہ نے ٹشو پیپرز اسے تھمائے۔
"آپ گھر جا رہی ہیں۔" انگلیاں پونچھتے ہوئے تیمور نے پوچھا پھر مثبت جواب پا کر بولا۔
"مجھے لفٹ دے سکتی ہیں۔"
"ضرور۔" اب شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا اور وہ کافی سے زیادہ بامروت واقع ہوئی تھی، وہ سر ہلا کر سوک کی طرف چلا گیا۔ جھک کر دوستوں سے کچھ کہا پھر اس کے جانے کے بعد اس کی [illegible] آ گیا۔ مائدہ نے اس کے بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ کر دی تھی، ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران سفر کٹنے لگا۔
"کچھ عرصہ قبل ہی امی اور بابا سیالکوٹ شفٹ ہوئے ہیں، دراصل وہاں ہمارا آبائی گھر ہے۔ اب وہ لوگ تو وہاں ہیں اور بزنس کا سارا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر ہے۔ بابا تو بہت عرصہ پہلے ہی وہاں چلے جانا چاہتے تھے مگر بزنس کی وجہ سے نہیں جا سکتے تھے، اب جون ہی میرا ایم بی اے کمپلیٹ ہوا وہ بوریا بستر باندھ کر سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ اب خود تو سارا دن بیٹھ کر اخبار کھنگالتے ہیں اور امی ایک orphanage (یتیم خانہ) چلا رہی ہیں۔ ویسے میری ماں انتہائی ظالم خاتون ہیں۔ orphanage کی [illegible] جو لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے متعلق سوچتی رہتی ہیں، کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ بیٹے کے ہاتھ بھی [illegible] کر دیں۔" اس کے یوں مایوسی بھرے انداز پر مائدہ کو خوب زور سے ہنسی آئی تھی۔ تیمور نے بھی مسکراتے ہوئے ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی۔
"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک کامپلیمنٹ دینا چاہتا ہوں۔" وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ مائدہ نے کار [illegible] کو موڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
"آپ کی ہنسی بے حد خوبصورت ہے۔" اس کا انداز بے حد سادہ تھا۔ مائدہ بس مسکرا دی پھر کار سے [illegible] ہوئے بولی۔
"میبہ نے مجھے بتایا تھا کہ عباس مصطفیٰ بہت ہینڈسم اور گریس فل شخص ہیں مگر حیرت ہے کہ اس نے تمہارے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔"
[illegible]
"تم [illegible] تم بھی بہت ہینڈسم ہو۔"

''صرف ہینڈسم، گریس فل نہیں ہوں؟'' بہت شرارت سے دریافت کیا گیا۔

''میبہ تو تمہیں ہینڈسم بھی نہیں مانتی۔'' وہ کھلکھلائی تھی۔

''جی ہاں ہمارے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا، بغیر برا منائے ''تم زبر
مجھے ہینڈسم کہہ کر بدلہ چکا رہی ہیں۔''

''ارے نہیں بھئی۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ مسکرا دیا، کوئی پر
کامپلیمنٹ تو نہیں تھا، بس دینے والی شخصیت نئی اور انوکھی تھی (اس کے لیے)۔

''میبہ آپ کا بہت ذکر کرتی تھی، میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس کی پیا کوئی ایجڈ سی خاتون ہوں گی لیکن
تو خاصی کم عمر ہیں اور...... خوبصورت بھی۔ یہ بات میبہ نے بھی ہمیں نہیں بتائی تھی۔''

''تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔'' اس نے بڑی شان بے نیازی سے کہا تھا پھر وہ دونوں ہی ہنس پڑے
تھے۔

''اچھا سنو، یہ کم عمر کہلانے جیسے شوق مجھے قطعاً نہیں ہیں، میں دو چار سال تو ضرور بڑی ہوں تم
چاہو تو میبہ کی طرح تم بھی مجھے پیا کہہ سکتے ہو یا باجی، آپا، آپی جو بھی تم چاہو۔''

''جی نہیں، لڑکیوں کو بہن بنانے والی غلطی میں کبھی نہیں کرتا اور خوبصورت لڑکیوں کو تو بالکل
نہیں۔'' اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا مگر شرارت ہر انداز سے عیاں تھی۔

''البتہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں۔'' تیمور نے اپنی مضبوط
اس کے سامنے پھیلا دی۔

''آئی تھنک یہ ایک اچھی دوستی کی شروعات ہوگی۔'' مائدہ نے بغیر کسی جھجک کے اپنا ہاتھ اس
ہاتھ میں دے دیا تھا جس پر تیمور نے خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا پھر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔

''اب تم جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ میبا خاتون مجھے نظروں سے چنگاریاں اڑا اڑا کر ہی مار ڈالے۔''

''ہیں، کیا مطلب؟''

''وہ دیکھو کب سے وہ بندریا کی طرح ریلنگ سے لٹکی مجھے گھور رہی ہے۔'' مائدہ نے اس کی
دیکھا۔ میبہ واقعی ٹیرس پر موجود تھی۔ نظر ملتے ہی اسے اشارے کرنے لگی تھی۔ وہ مسکرائی پھر تیمور کو
دیکھ کر بولی۔

''تم اسے بہت تنگ کرتے ہو تبھی وہ تم سے خفا رہتی ہے۔''

''آئی سوئیر میں کبھی اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر نجانے کیوں اس لڑکی کو دیکھتے ہی زبان پر کھجلی س
ہو جاتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ یہ آواز دل سے آئی تھی۔ مسکرا

''اور جو دل میں کھلبلی مچتی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

دیکھا ادھر ادھر دیکھا، ریلنگ سے چپکی بندریا اب وہاں نہیں تھی۔

+

گھر کی پچھلی جانب جو ایک چھوٹا سا کچا صحن تھا، وہ وہیں بیٹھی زمین پر بکھرے خشک پتوں کو گن رہی
کے ننھے ننھے سفید پھول ہوا کے ہلکے سے جھونکے کی بھی تاب نہ لا پاتے تھے اور برف کی
زمین پر گرنے لگتے تھے۔ وہ اس طرف بہت کم آیا کرتی تھی مگر جب بھی آتی تھی مائدہ کو خبر ہو جاتی تھی
کسی بات پر خفا ہے، تبھی گوشہ نشینی اختیار کی گئی ہے ورنہ ایسی خاموشی اور تنہائی سے اسے ہمیشہ ہی
ہوتی تھی۔ مائدہ نے دروازے میں رک کر اسے دیکھا پھر دو اسٹیپس اتر کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

''یہ ناراضی کب تک قائم رہے گی۔'' میبہ اس کی آواز پر ذرا بھی نہیں چونکی۔

''میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔'' زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے وہ بے حد خفگی سے بولی
مائدہ کے لبوں پر مسکان دوڑ گئی۔

''ناراض نہیں ہو تو مجھ سے بات کرو۔''

''مجھے بات نہیں کرنی۔''

''کیوں؟''

''بس نہیں کرنی۔''

''میبہ!'' مائدہ نے بہت پیار سے اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ ''جانو! جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں
کہ خفا ہو میں کیسے تمہاری خفگی دور کر سکوں گی۔''

''ہاں آپ کو تو کبھی بھی کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔'' اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ ''جن سے محبت کی جاتی ہے
ان کو کہے بغیر ہی ہر بات معلوم ہو جاتی ہے اور مجھے پتا چل گیا ہے کہ آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں
مائدہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس بھر کر بولی۔

''کسی سے دوستی کرنا بری بات تو نہیں ہے پھر تیمور بہت اچھا لڑکا ہے۔''

''بس مجھے نہیں اچھا لگتا۔'' وہ جھلا کر قطعیت سے بولی۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تم تیمور کی برائی بلاوجہ کر رہی ہو۔''

''تمہیں......'' میبہ نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا، اس بات میں جو سچائی تھی وہ اسے خود بھی تسلیم نہیں کرنا

''تمہاری برائی ہی کی جاتی ہے اور وہ گھونچو ہے ہی برا۔'' اس نے دل کے ساتھ ساتھ مائدہ کو بھی
بالآخر زور دے کر بولی۔ ''آپ اس سے دوستی مت کریں نا، عباس بھائی زیادہ اچھے ہیں ان سے کر

لیں۔"

"میں عباس بھائی کی اچھائی سے انکار نہیں کرتی، وہ ضرور اچھا ہوگا مگر تیمور بھی بہت اچھا ہے لیکن شرارتی ہے۔"

"انتہائی فضول اور بدتمیز شخص ہے وہ اور آپ شرارتی کہہ رہی ہیں۔"

"میں تمہارے دوست کی برائی نہیں کر رہی، تم میرے دوست کی مت کرو۔" وہ قطعیت سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس کا ہاتھ بھی پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"بس اب کوئی فضول بحث نہیں ہوگی، اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔ ابھی تو فرنچ اور کافی ہمارے انتظار میں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" میبہ منہ بسور کر قدم بڑھانے لگی پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

"آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے۔" انگلی اٹھا کر پوچھا۔

"کون سا وعدہ؟"

"عباس بھائی والا۔" مائدہ کو یکدم یاد آیا تو سر ہلا کر بولی۔

"آؤ کوشش کرتے ہیں۔" وہ دونوں اندر آ گئیں اور کچھ دیر بعد جب وہ بی بی کے سامنے بیٹھی رہی تھیں تو میبہ اس کے کان میں گھسی "پوچھیں نا، پوچھیں نا" کی گردان مستقل کر رہی تھی۔

"وہ بی بی...... آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔" اس نے تمہید باندھی۔ بی بی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں، دونوں کی من من سے کھٹک تو گئی ہی تھیں۔ "وہ صبح میں نے آپ کو عباس مصطفیٰ سے ملوایا" وہ انہیں یاد دلا رہی تھی کہ صبح ہی تو واک پر جاتے ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ بی بی نے ہولے سے عرصہ دراز سے وہ لفظوں کا استعمال کم کر چکی تھیں۔

"تو ہم لوگ عباس اور تیمور کو لنچ پر بلانا چاہ رہے تھے۔"

"تیمور کو نہیں۔" میبہ نے اعتراض کرنا چاہا۔

"تم مناسب سمجھو تو بلا لو۔" وہی ہمیشہ کا ایک جواب۔ میبہ نے باقاعدہ یاہو کا نعرہ لگایا تھا۔

"رات کو واک کرنے جائیں گے تب عباس بھائی کو انوائٹ کریں گے۔ سنڈے کو ٹھیک رہے" بڑی خوشی سے مینیو سیٹ کرنے لگی تھی۔ اب تو اسے تیمور کے آنے پر بھی اعتراض نہ تھا۔ جب دونوں بھی ڈنر کے بعد اسٹریٹ میں واک کرنے نکلے تھے۔ عین وسط میں ان دونوں سے ملاقات ہو

"تم اچھی فرینڈ ہو، اس دن کے بعد ایسی غائب ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" تیمور نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا تھا۔

"دراصل یہ بہت مصروف رہتی ہیں، ہر ایرے غیرے سے ملنے کا ٹائم یوں بھی ان کے پاس نہیں ہوتا۔" میبہ نے مسکرا کر طنز کیا اور عباس کے ساتھ ہی چلنے لگی۔ مائدہ نے تیمور کو اپنی مصروفیات کے

بتایا بالکل غیر ارادی طور پر وہ چاروں ہم قدم ہو گئے تھے۔ مائدہ ہی نے انہیں اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔

"اوہ آئی ایم رئیلی سوری میبہ گڑیا! لیکن اگلا پورا ہفتہ میں بالکل بھی فری نہیں ہوں جبکہ سنڈے کو بھی بے حد مصروف رہوں گا۔" عباس نے کہا تو میبہ منہ بسورنے لگی۔ تیمور بولا۔

"ڈونٹ وری، میں سنڈے کو بالکل فری ہوں۔"

"ہم کسی ایرے غیرے کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔" میبہ نے خاصی بے مروتی سے کہا تھا۔ مائدہ نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی ورنہ ضرور سرزنش کرتی، وہ اور عباس ان دونوں سے کچھ قدم آگے چل رہے تھے۔ تیمور کو ایک کے بعد دوسرے قدم پر جھٹکا لگا۔

"اے لڑکی! کیا تم میری بے عزتی کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔" ڈپٹ کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہوں۔" وہ تمسخرانہ ہنسی۔ تیمور نے عباس اور مائدہ کو دیکھا، وہ لوگ تقریباً ایک فٹ کے فاصلے پر تھے، وہ ذرا سا کھسک کر میبہ کی ساتھ ہو لیا۔

"اے رکو۔" خاصے رعب سے کہا۔ میبہ کو ناگوار گزرا مگر رک گئی۔

"کیا ہے؟" انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔

"یہ تم تیز گام کی رفتار سے کیوں چل رہی ہو؟"

"کیونکہ مجھے کچھوے کی رفتار سے چلنا نہیں آتا۔" اس نے تیمور کو سر سے لے کر پاؤں تک گھورا۔

"تمہارا سینس آف ہیومر ہمیشہ سے اتنا برا ہے یا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔" خاصے دوستانہ انداز میں دریافت کیا پھر تیزی سے بولا۔ "بہرحال آج ہم تمہاری ہر کڑوی کسیلی بات بھی برداشت کریں گے۔"

"اس کرم نوازی کے لیے مجھ ناچیز کو ہی کیوں چنا گیا ہے۔" اس شاہانہ انداز پر وہ چڑ ہی تو گئی تھی۔

"یار! میں نے سوچا کہ ہم تو ہمیشہ جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔" مائدہ اور عباس کافی آگے جا چکے تھے۔ "تو کیوں نا اب دوستی کر لیں۔" تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا تو وہ جھٹ بولی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم سے دوستی کرنے کا۔" اسے جھلستا دیکھ کر کافی خوشی ہوئی تھی۔

"خیر شوق تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن اب تم سے دستی کرنا میری مجبوری بن گئی ہے۔"

"کیا......؟" اس کی خود کلامی میبہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"کچھ نہیں۔" مائدہ اور عباس اب واپس آتے دکھائی دے رہے تھے۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" ان کے قریب پہنچنے سے پہلے دل کا حال ضرور ہی کہنا تھا۔

"کہو" میبہ کو کچھ تجسس سا ہوا۔

''وہ دراصل......'' مائدہ اور عباس اب قریب پہنچ چکے تھے۔ ''میبہ ! میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اسے
دھیان سے سننا اور میں اس وقت مذاق بالکل بھی نہیں کر رہا۔ میں...... میں مائدہ کو پسند کرنے لگا ہوں۔''
پتا نہیں کیا ہوا تھا مگر میبہ کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دنیا تو ویسے ہی تھی بس اس نے گھر
کی جانب بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

''میبہ ! میری بات سنو۔'' تیمور نے پکارا تھا مگر وہ بھاگتی ہی چلی گئی تھی۔

✦

مائدہ نے کتاب سے نگاہ ہٹا کر اس پر ڈالی جو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی پچھلے آدھے گھنٹے سے
خود کو ہر ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ ''میبہ !'' اس نے کچھ سوچ کر پکارا۔ ''کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' خاصا روکھا جواب ملا، وہ سر جھکا کر کتاب میں گم ہو گئی۔ میبہ نے آئینے میں نظر
آتے اپنے عکس کو دیکھا پھر مائدہ کے عکس کو۔ سادہ سے بے بی پنک کلر کے کاٹن کے سوٹ میں ڈھیلی سی
چوٹی باندھے مائدہ بہت عام سی لگ رہی تھی۔

''آخر ایسا کیا ہے ان میں جو مجھ میں نہیں۔'' چڑ کر سوچا۔ ''میں تیمور کو نظر کیوں نہیں آئی۔ یہ بیچاری
عام سی تو ہیں۔ رنگت کالی، آنکھیں بھی معمولی سی اور بال...... ہاں بال خوبصورت ہیں مگر میرے بال زیادہ
گھنے اور سیاہ ہیں، ان کی طرح چوٹی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ کمپلیکشن تو زیادہ فیئر ہے۔ آنکھیں تو خیر ہیں ہی
خوبصورت پھر...... آخر کیوں؟'' وہ جھنجلا گئی۔

''کچھ بھی نہیں ہے ان میں، بالکل ہی عام سی ہیں...... اگر عام نہ ہوتی تو...... لعنت ہو تمہاری منحوس
صورت پر میبہ خاتون! یہ کس قسم کی گھٹیا باتیں سوچ رہی ہو تم...... جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تم کو اس شخص
سے ملے اور اس کی وجہ سے اپنی پیا کے متعلق کیسی باتیں سوچنا شروع کر دیں۔''

''ڈوب کر مر جاؤ میبہ طارق!'' وہ آئینے میں اپنے عکس کو غیرت دلا رہی تھی۔ مائدہ نے حیرت سے
اسے دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میبہ اس کے سامنے آ رکی۔

''پیا! ذرا میری طرف غور سے دیکھیں اور سچ سچ بتائیں کیا میں ذرا بھی خوبصورت نہیں ہوں۔''

''میبہ !'' مائدہ کتاب ایک طرف رکھ کر سیدھی ہوئی پھر ہاتھ پکڑ کر اسے قریب بٹھالیا۔

''بیٹا! آخر بات کیا ہے؟ پچھلے تین دن سے تم احمقانہ حرکتیں کر رہی ہو۔ میری جان! کوئی پریشانی
ہے تو شیئر کر لو۔'' میبہ گود میں رکھے ہاتھ مسلنے لگی۔ اپنی سوچ پر شرمندہ ہو رہی تھی۔

''بڑے اسی لیے ہوتے ہیں کہ بچوں کے پرابلمز سولو کر سکیں۔''

''صرف چھ برس بڑی ہیں آپ مجھ سے، کوئی ساٹھ برس بڑی نہیں ہیں جو ہر وقت مجھے بچہ کہتی رہتی

ہیں۔'' میبہ نے مصنوعی خفگی سے کہا، اب اس کا دھیان بھی تو ہٹانا تھا۔ کتنا خیال رکھتی ہیں یہ میرا اور میں کتنی
گھٹیا باتیں سوچ رہی تھی ان کے بارے میں، انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں ان کے بارے میں کیا سوچ
رہی تھی اور انہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ وہ الو کا پٹھا تیمور ان کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔ وہ مائدہ کی گود
میں سر رکھے خود کو کوستی رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر احمقوں کے سر پر سینگ ہوا کرتے تو یقیناً میرا سر بالوں
کی بجائے سینگوں سے بھرا ہوتا۔

✦

''تم دونوں میں کوئی عقل ہے یا نہیں، پچھلے تین ماہ سے یہاں آ کر بیٹھے ہوئے ہو نہ کوئی خیر نہ کوئی خبر،
میں پوچھتی ہوں اتنے لاپروا کیوں ہو تم دونوں؟'' عباس نے گردن اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی، محض نظر
اٹھا کر تیمور کو دیکھا، وہ بھی بالکل اسی کے انداز میں کھاتے ہوئے اپنی ماں کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

''بجیا! خفا مت ہوں، اطمینان سے پہلے کھانا کھا لیجیے، آج میں اور تیمور گھر پر ہی ہیں، سارا دن آپ
کی ڈانٹ سنیں گے، کیوں تیمور؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے تیمور کو دیکھا تو وہ سر دھننے لگا۔

''بالکل، بالکل۔'' عائشہ نے قہر زدہ نظروں سے ان دونوں کو گھورا۔

''مجھے باتوں میں مت الجھاؤ عباس! ڈیڑھ ماہ پہلے تم سیالکوٹ آئے تھے، جب میں بیمار تھی، اس کے
بعد ایک فون بھی نہ ہو سکا تم سے اور یہ میرا لاڈلا بیٹا ہے، اتنا نہ ہوا کہ آ کر بیمار ماں کو شکل ہی دکھا جائے اور
گھر کی حالت دیکھو ذرا، کوئی چیز بھی ٹھکانے پر موجود نہیں۔ عباس کی شرٹ میں نے برتنوں کی کیبنٹ سے
نکالی اور چمچے وارڈروب میں رکھے ہوئے تھے۔ گندگی حد سے زیادہ۔ لان کی صفائی کرنے کی تو شاید کسی
نے کبھی زحمت ہی نہیں کی۔ تمہیں کیا میں نے ان دونوں کے ساتھ صرف آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا باری
کے بچے۔'' توپ کا رخ وسیم باری کی جانب ہوا۔

''باری کے بچے۔'' تیمور نے اچنبھے سے سر اٹھایا۔ ''باری کے جھولے، باری کا کھانا اور ہاں کرکٹ
میں باری کی تقسیم سنی تھی، یہ بچے بھی کیا باری کے ہونے لگے ہیں۔'' اس نے عباس سے پوچھا تھا جس نے
جواباً میز کے نیچے سے زوردار ٹھوکر اس کے پاؤں کو رسید کی تھی۔ اس کی باتوں سے بجیا کا غصہ سوا نیزے پر
پہنچنے کا احتمال تھا۔

''وہ میرے بچوں کی بات کر رہی ہیں۔'' وسیم باری منمنایا۔

''میری معلومات کے مطابق تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی پھر بچے کہاں سے آ گئے۔'' حیرانی
کی انتہا تھی۔ ''بس اوٹ پٹانگ باتیں ہی آتی ہیں، مسخریاں کروا لو جو کرکی اولاد نہ ہو تو۔'' بجیا غصے میں
سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ جہاں پانی پیتے عباس کو اچھو لگا تھا وہیں وسیم باری نے اپنا سائرن جیسا قہقہہ

روکنے کے لیے کندھے پر پڑا رومال منہ میں ٹھونس لیا تھا جبکہ تیمور شدت جذبات سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''مما! میں اپنے والد کی شان میں یہ گستاخی قطعاً برداشت نہیں کر سکتا، آپ کو فوراً یہ الفاظ واپس لینے ہوں گے۔'' بالکل ماڈرن سلطان راہی والا پوز تھا، صرف لاچہ کرتے کے ساتھ گنڈاسے کی کمی تھی۔

''کیا کہا۔'' عائشہ نے زوردار دھموکا اس کے شانے پر جڑا۔ ایک ہی جھٹکے میں سارا کلف اتر گیا تھا۔ عباس بجیا کو ایکسکیوزز دینے لگا۔ حقیقتاً ان دونوں نے بڑی لاپروائی برتی تھی۔ بجیا اول تو سننا ہی نہیں چاہتی تھیں پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

''بہت عیش کر لیے تم نے اور بہت دن رہ لیے چھڑے چھانٹ۔ بس اب میں تمہاری شادی کر دوں گی۔'' تیمور کا دھیان فوراً میبہ کی طرف گیا تھا جسے آج صبح ہی کئی دنوں بعد دیکھا تھا تو خود کو روک نہیں پایا تھا۔

''کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟'' بڑے دھڑلے سے جا کر پوچھا۔ وہ چنبیلی کی کلیاں چن رہی تھی۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے، میں جہاں بھی تھی۔'' وہی ہمیشہ کاٹ کھانے والا انداز۔ تیمور کو دلی طمانیت ہوئی، اسے اس کے اصل روپ میں دیکھ کر۔ دھیرے سے مسکرایا اور نرمی سے بولا۔

''کبھی نرمی سے بھی بات کر لیا کرو، آخر ہر وقت مرچیں کیوں چبائے رہتی ہو۔''

''میں مرچیں چباؤں یا تمباکو، یہ کم سے کم تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔'' تڑخ کر جواب ملا۔ تیمور کچھ پل اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میبہ ...... خفا ہو مجھ سے؟''

''میں ہر ایرے غیرے سے خفا نہیں ہوتی۔''

''خدا کا شکر ہے کہ میں ایروں غیروں کے زمرے سے تو نکلا۔'' وہ چڑانے والے انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا پھر ہنس کر سنجیدہ ہوا۔

''سنو میبہ! میں، مائدہ......''

''سنو مسٹر تیمور عارف!'' وہ کلیاں پھینک کر بڑے کڑے تیوروں سے اس کی جانب گھومی۔ ''میں صرف آج کہہ رہی ہوں پھر نہیں کہوں گی، اپنے خیالات کا رخ بدل لو تو بہتر ہوگا، اگر تم نے پپا کو ہم سے چھیننے کی کوشش کی تو میں تمہارا خون پی لوں گی۔ کچا چبا جاؤں گی تمہیں۔''

''وحشی تو تم شکل سے ہی لگتی ہو، آج باتوں سے بھی ثابت ہو گیا۔'' تیمور کے تحیر میں ناگواری بھی تھی۔

''اگر تم کچھ دیر اور میرے سامنے رہے تو عمل سے بھی ثابت ہو جائے گا۔'' اس نے دانت کچکچائے تھے۔ ''بہر حال یہ طے شدہ بات ہے کہ میں پپا کو تمہیں چھیننے نہیں دوں گی۔''

''چھینیں گے کیوں؟ ہم تو انہیں ڈنکے کی چوٹ پر اپنے گھر لائیں گے، کیوں وسیم ونڈر!'' کانٹے سے املیٹ کھاتے ہوئے اس نے اب میبہ کی بات کا جواب دیا تھا، ساتھ ہی وسیم سے تائید چاہی تھی، اس بے چارے کی جانے بلا گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا جی؟''

''کچھ نہیں جی...... مما! میں کہہ رہا تھا شادی میں جب تک بینڈ نہ بجے شادی کا مزہ ہی نہیں آتا۔''

''ہوں...... تیمور!'' عائشہ نے حیرت سے سر اٹھایا۔ ''بچے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، یہ عبداللہ بھائی کے چالیسویں میں بینڈ باجا کہاں سے آ گیا۔'' انہوں نے اپنے دور پار کے کزن کا نام لیا، تب تیمور کو اپنی حماقت کا احساس ہوا، نجانے گفتگو کون سے موڑ پر تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان کے قریب آیا۔

''اماں! عبداللہ بھائی کو رہنے دیں، ان کا چالیسواں اگلے سال کروالیں گے، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ پچھلے ماہ میں پورے چوبیس برس کا ہو چکا ہوں اور ساڑھے چھ ماہ بعد یہ اپنا عباس پورے اکتیس کا ہو جائے گا۔'' سارا زور پورے پر تھا۔ ''میری تو پھر بھی خیر ہے مگر یہ میرا ماما بیچارا بڈھا ہوتا جا رہا ہے۔ میرے بارے میں نہیں تو کچھ اسی کے بارے میں سوچ لیں۔ آخر کو اس کے دل میں بھی تو کچھ ارمان ہیں...... کتنا دل چاہتا ہوگا اس کا اپنے بھانجے کو دولہا کے روپ میں دیکھنے کا...... ہے نا مامے۔'' اور مامے صاحب لب بھینچے بس مسکراہٹ روک رہے تھے۔ عائشہ نے کمر کرسی کی بیک سے ٹکا کر بازو باندھ لیے۔

''کون ہے وہ؟'' ماں تو آخر اسی کی تھیں، اتنی لمبی چوڑی تمہید سے مدعا تو اخذ کر ہی لیا تھا۔ تیمور سر کھجانے لگا، دل ہی دل میں ماں کی عقلمندی کی داد دے رہا تھا۔

''لڑکی ہے۔'' عائشہ نے گھورا تو جھٹ بولا۔ ''آئی مین وہ بہت اچھی ہے ماں!''

''جی ہاں، اس کی اچھائی کا اندازہ آپ اسی بات سے لگا لیں کہ جب وہ ہمارے گھر آتی ہے تو تیمور کو ہر طرف روشنی ہی روشنی نظر آنے لگتی ہے، یعنی اجالا اور اس سے گفتگو کر کے تو اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ محاورے والے نہیں اصلی والے۔''

''عب...... عباس!'' تیمور نے دانت کچکچائے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مار ڈالنے کی دھمکی دی مگر اسے تو بدلے چکانے کا موقع ملا تھا۔

''تیمور آپ کو پتا ہے بجیا! ایک روز تو یہ اس کے لیے ریڈ روز بھی خرید لایا تھا۔''

''تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔'' عائشہ نے خاصی ''توصیفی'' نگاہوں سے اپنا ہونہار سپوت کو دیکھا تھا جو احتجاجاً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ممی کب آپ میری بھی سنیں گی یا نہیں۔'' پھر بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"اماں! آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی، یقین کریں اماں...... مائدہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" عباس نے ٹھٹک کر تیمور کو دیکھا جس کا چہرہ دبے دبے جوش سے تمتما رہا تھا۔

"مائدہ!" اس کے ہونٹوں نے بلا آواز جنبش کی تھی۔ "اگر تیمور مائدہ میں انٹرسٹڈ ہے تو میبہ کے لیے اس کی بے تابی کیا معنی رکھتی تھی۔" وہ سوچ رہا تھا۔

+

صبح یونیورسٹی وہ اب مائدہ کے ساتھ ہی جاتی تھی، یعنی ڈراپ کرنے کی ذمہ داری مائدہ کی تھی جبکہ واپسی میں لوکل وین کام آتی تھی۔ اب بھی وہ سینڈوچ کھاتے ہوئے عجلت میں گیٹ بند کر کے مڑی تھی کہ ساتھ والے گیٹ سے ایک سوبر سی خاتون نکل کر ان کی طرف آئی تھیں۔

"السلام علیکم!" انہوں نے سلام میں پہل کی۔ خاصی متاثر کن شخصیت تھی۔ میبہ تو پہلی ہی نظر میں قائل ہونے کے ساتھ ساتھ گھائل ہو گئی لیکن صورت پہلے بھی کہیں دیکھ رکھی تھی۔

"تم مائدہ ہو نا۔" ان کے پوچھنے پر مائدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ معزز خاتون کی دلکش مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"جیسا تیمور نے بتایا تھا تم تو اس سے بڑھ کر ہو...... تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔" صاف لگ رہا تھا کہ یہ لفاظی نہیں، حقیقت ہے۔ ان دونوں نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"میں تیمور کی ماں ہوں۔"

"اوہ!" میبہ کے چہرے سے سارے متاثر کن اثرات پل بھر میں غائب ہوئے تھے۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہیں اس نے بہت پہلے اس گھر میں دیکھا تھا۔ مائدہ اب مسکراتے ہوئے ان سے گفتگو کر رہی تھی۔

"توبہ کس قدر گھنا ہے وہ گھونچو...... ماں کو بلوا بھی لیا۔" اسے مائدہ کا انہیں گھر آنے کی دعوت دینا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"تیمور مائدہ کی بہت تعریف کر رہا تھا کہ میری سہیلی بہت اچھی ہے مگر اس نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس گھر میں ایک اور لڑکی رہتی ہے جو بے حد پیاری ہے۔" وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

"جی ہاں اس جہاں میں اچھے لوگوں سے جلنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔" جل کر مگر بظاہر ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دیں۔ "ویسے میں میبہ ہوں۔"

"ارے ہاں یاد آیا، وہ بتا رہا تھا کہ مائدہ کے گھر میں امیبا نام کی ایک نک چڑھی، بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی رہتی ہے۔" (اونہہ...... جیسا بیٹا ویسی ماں) وہ مسکرا کر اس کا سر تھپتھپانے لگیں۔ "لیکن تم تو بہت پیاری اور کیوٹ بچی ہو۔ یقیناً تیمور کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"ابھی میں دو تین روز تک یہیں ہوں، تم لوگ ضرور آنا ہماری طرف۔"

"جی ضرور...... آپ بھی ضرور آیئے گا۔" وہ بڑے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔

"ہوں، جلد ہی آؤں گی ان شاء اللہ۔" میبہ کو ان کی مسکراہٹ بے حد پراسرار لگی۔ چھٹی حس چیخنے لگی۔

"پپ...... پیا میری کلاس شروع ہو گئی ہوگی جلدی چلیں۔" وہ جھٹ پٹ کار میں بیٹھ گئی۔ مائدہ کو بھی بیٹھتے ہی بنی۔ پھر اس رویے پر اچھی خاصی جھاڑ سنی جس کا اس پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا تھا، البتہ یونیورسٹی میں سارا دن خراب گزرا۔ عبید اکرم جیسے سخت پروفیسر کی کلاس میں بھی وہ مسلسل تیمور کی ماں کو بھگانے کے ایک سو ایک طریقوں پر غور کرتی رہی۔ نتیجتاً پوری عزت و آبرو کے ساتھ پروفیسر عبید کے "اقوال زریں" سنتے ہوئے کلاس سے باہر جانا پڑا۔ آخری دو کلاسز اس نے خود بنک کیں اور گھر آ گئی۔ گھر پہنچتے ہی جو ایک خاص قسم کی تھکاوٹ ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، حالانکہ معمول سے جلدی واپس آ گئی تھی، برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اسے عجیب سے سکوت کا احساس ہوا۔

"جیراں! بی بی کہاں ہیں۔" اسے وہ لاؤنج میں ہی نظر آ گئی۔

"بیٹھک میں۔" جیراں کا مصروفیت بھرا جواب موصول ہوا اور وہ اگر تھکی ہوئی نہ ہوتی تو ضرور اس کی کلاس لیتی۔ ہزار بار بیٹھک کہنے سے منع کیا تھا مگر وہ جیراں ہی کیا جو دو ہزار دو مرتبہ بتائے بغیر سمجھ جائے۔

"کوئی آیا ہوا ہے کیا؟" سینڈلز سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے بس ایک "گھوری" ہی اسے عنایت کی گئی۔ جیراں نے جو بتایا وہ اس کے حواس میں "گھوٹنا" پھیرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بھاگتی ہوئے ڈرائنگ روم تک گئی مگر اسے دروازے میں ہی ٹھٹھک کر رکنا پڑا تھا۔

وہ کیا چیز تھی جس نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا تھا؟

وہ کیا بات تھی جس میں اس کے احساسات کیا تھا؟

اور وہ کیا تھا جس نے اسے اگلے ہی پل جھنجھوڑا تھا؟

اندر سے آتی عائشہ کی آواز، وہ بڑی وضاحت سے سن رہی تھی۔ ہر لفظ اپنے مفہوم سمیت اس پر واضح ہو رہا تھا پھر خاموشی چھا گئی۔ پن ڈراپ سائیلنس شاید اسی کو کہا جاتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن سن رہی تھی، پھر جیسے صدیوں بعد بی بی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"مائدہ! میری بیٹی نہیں ہے......" باقی کے ٹوٹے پھوٹے شرمندگی و آزردگی بھرے جملے سے وہ واقف تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے عائشہ کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا اور ان کے چہرے پر موجود تاثرات میں سب سے نمایاں ناامیدی ہی تھی۔ اس کا سر ہولے سے تھپتھپا کر وہ باہر نکل گئی تھیں۔ اصولاً اسے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے انہیں باہر تک چھوڑنے جانا چاہیے تھا مگر وہ نہ جا سکی تھی۔ اندر بی بی خاموشی سے گلاس وال کے اس طرف نظر آتے سبزے کو دیکھ رہی تھیں۔

"بی بی! اس نے پکارا۔ بی بی نے سر اٹھایا۔
"مجھے کمرے میں چھوڑ آؤ میبہ!" ہارا ہوا کھلاڑی کیسا ہوتا ہے، بی بی جیسا۔ وہ خاموشی سے اس کی
وہیل چیئر کے پیچھے آن رکی تھی۔

+

درختوں کے بیچ گھری نہر کا کنارا اسے بہت خوبصورت لگتا تھا مگر وہ کبھی بھی مائدہ کے بغیر یہاں نہ آئی تھی، بس کبھی کبھار موڈ ہوتا تو اپنے کمرے کی کھڑکی سے نہر کے ساتھ ساتھ چلتے صاف ستھرے روڈ کا نظارہ کر لیتی تھی۔ اس کھڑکی کا یہی ایک مصرف اس کی نظر میں بہتر تھا اور آج وہ تنہا اس روڈ پر قدم رکھے ہوئے املتاس اور سنبل کے پیڑوں کو دیکھ رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کھڑکی سے یہاں بیٹھے "تیمور عارف" کو دیکھ چکی تھی۔ کچھ پل اس کی پشت کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آگے بڑھی۔ روڈ اور نہر کا درمیانی حصہ خشک پتوں اور سوکھی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے قدموں تلے پتے چرچرائے۔ تیمور کے نیم دراز وجود میں خفیف سی حرکت ہوئی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

"تم!" وہ حیرت سے اسے دیکھتا، جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ میبہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیا میں یہاں نہیں آ سکتی۔" انداز بے حد سادہ تھا۔ تیمور نے کندھے اچکا کر پہلی پوزیشن اختیار کی۔ میبہ نے چند پل خاموشی کی نذر کیے۔ تیمور کی بے اعتنائی کچھ بے معنی تو نہ تھی۔ شام کے کھو جانے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ابتدائی گرمیوں کے اس تیسرے پہر میں کوئل کی کوک بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

"کیسے ہو تم؟" اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹھیک ہوں۔" خاصی لاپرواہی سے جواب دے کر وہ وسلنگ کرنے لگا تھا، ساتھ ساتھ دایاں پاؤں بڑے ترنگ میں حرکت کر رہا تھا۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

"جانا کہاں ہے میرے پاس ہی رہتی ہیں۔" وسلنگ یکدم تھمی تھی مگر پاؤں کی حرکت جاری تھی۔

"تمہاری ناراضی ختم ہو گئی؟" گردن موڑ کر اسے دیکھا جو دو زانوؤں کے گرد بازو لپیٹے، گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ سوال سن کر چہرے پر خجل سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"میری تم سے کوئی ناراضی نہیں ہے۔" چہرے پر آئی لٹ کان کے پیچھے کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ تیمور نے چند پل اسے دیکھنے میں صرف کیے۔ (اور یہ چند پل بہت گہرے تھے)

"تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ مائدہ تمہاری بہن نہیں ہے۔" اس نے ایک پتھر زور سے پانی میں اچھالا

بلا توقف ہی پانی لرزنے کی آواز، چند چھینٹے اچھلے...... رقص کرتی لہریں دور تک گئی تھیں۔

"تم نے بھی تو نہیں بتایا کہ تم پپا کو عباس بھائی کے لیے پسند کرتے ہو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا مگر تم بدکی ہوئی گھوڑی کی طرح بھاگ گئی تھیں۔" پانی کی سطح اب ساکت تھی۔

"تم نے کہا تھا کہ تم پپا کو پسند کرنے لگے ہو" میبہ نے جلدی سے کہا۔

"تو کیا میں نے یہ کہا تھا کہ میں مائدہ کو اپنے لیے پسند کرنے لگا ہوں۔" وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور اب بہت شکوانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میبہ کا سر جھک گیا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی۔

"پسند کی کبھی بھی کوئی ایک نظر نہیں ہوتی میبہ خاتون! ضروری نہیں ہے کہ پسند کا صرف ایک ہی حوالہ ہو۔ ہم اپنی ماں کو پسند کرتے ہیں، اپنی بہن کو پسند کرتے ہیں اور بھی بہت سے لوگ ہیں جنہیں ہم فطرتاً پسند کرتے ہیں مگر کسی تیسرے فرد کو پسند کر لینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اس سے محض ایک ہی رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ میں عباس سے بے حد محبت کرتا ہوں، ہمارے درمیان صرف ماموں بھانجے کا رشتہ نہیں ہے بلکہ ہم بہت اچھے دوست بھی ہیں...... تو کیا میں مائدہ کو اپنی بھاوج کی حیثیت سے پسند نہیں کر سکتا تھا، کیا میں اسے اپنی مامی کے روپ میں دیکھنے کی تمنا نہیں کر سکتا۔" میبہ کا سر جھکتے جھکتے گھٹنوں سے لگ چکا تھا۔

"میں سمجھی تھی کہ......"

"تم اور تمہاری سمجھ دونوں ہی فضول ہیں۔" وہ بولا۔ "حالانکہ میں تمہاری شکل دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم میری بات کا کچھ اور ہی مفہوم سمجھ رہی ہو۔"

"تم میری غلط فہمی دور کر سکتے تھے۔" اس نے شکوہ کیا۔ خدا جانے یہ اپنائیت کہاں سے آئی تھی، تیمور تیزی سے بولا۔

"کیوں...... کیوں دور کرتا میں تمہاری غلط فہمی، جب میں تمہاری شکل دیکھ کر سب کچھ جان لیتا ہوں تو تم کیوں نہیں؟"

"جن سے محبت کی جاتی ہے ان کا چہرہ دیکھ کر ہی ہر بات جان لی جاتی ہے۔" میبہ کے کانوں میں اپنا ہی شکوہ گونجا تھا، وہ تحیر سے تیمور کو دیکھنے لگی جو چہرہ موڑے بہت خفگی سے بیٹھا تھا۔ عجیب خوش کن سا احساس تھا جو اس کے گرد دھمال ڈال رہا تھا۔

"ویسے بھی وضاحت تب دی جاتی ہے جب محبت میں کھوٹ ہو پھر میں کیوں تمہیں وضاحتیں دیتا جبکہ میری محبت سچی ہے۔" وہ ابھی بھی نروٹھے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "محبت" کتنی دلفریب ہوتی ہے مگر "تمہاری" اس سے بھی زیادہ دلفریب و دلکش۔ اس کی پلکیں عجب سے احساس سے جھکی تھیں، دھڑکن میں شور سا اٹھا تھا۔

"اب خوامخواہ شرمانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم شرماتے ہوئے عام حالات سے کہیں زیادہ بدصورت لگو گی۔" میبہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ آگ لگے محبت کو، جہنم میں جائے ہر احساس، دل میں اب بھی شور سا تھا مگر ویسا ہی جیسا روڈ پر بھاگتی ٹریفک کا ہوتا ہے۔

"ایسی ہی بدصورت لگتی ہوں تو کر لیتے کسی خوبصورت سے محبت۔"

"میرے اختیار میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر ہائے یہ دغاباز دل۔" خاصی بے بس اور مایوسی بھری آواز تھی۔ میبہ کو ہنسی آ گئی جسے رخ موڑ کر چھپایا۔ تیمور بھی محظوظ ہو کر ہنسنے لگا۔ نجانے کیا ہے مگر جب محبت دو دلوں کے اندر تاج محل تعمیر کرتی ہے تو قدرت ایک پل کو مسکاتی ضرور ہے، تبھی ہوا کھنکتی ہے، تبھی کلیاں چٹکتی ہیں، ان دونوں کے گرد سنبل کے بہت سے سرخ پھول ہوا کے زور سے زمین کو بوسہ دینے آئے تھے۔

"پیا میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ تقریباً پانچ سال پہلے حالات آج سے بہت مختلف تھے۔ ہماری اور شجاعت ماموں کی فیملی کے درمیان کوئی تناؤ نہ تھا۔ بابا کے انتقال کے بعد اسجد بھائی کا دھیان اپنی اسٹڈیز کی طرف سے بالکل ہی ہٹ گیا تھا پھر جن دنوں پیا ماسٹرز کر رہی تھیں ان ہی دنوں اسجد بھائی نے بی بی سے اپنی شادی کی بات کی تھی۔ بی بی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ شجاعت ماموں بھی راضی تھے۔ دوسری طرف پیا اور اسجد بھائی کی کافی انڈراسٹینڈنگ بھی تھی۔ مختصر سے معاملات طے پانے کے بعد دونوں کا نکاح ہو گیا اور رخصتی پیا کی اسٹڈیز مکمل ہو جانے کے بعد تک ملتوی کر دی گئی۔ ایسا اسجد بھائی کے کہنے پر ہوا تھا پھر......" وہ خاموش ہو گئی۔ تیمور اسے بہت دھیان سے سن رہا تھا۔

"پھر؟"

"پھر۔" اس کی نگاہوں میں وہ پل گھوم گئے جب اسجد بھائی چلے گئے تھے انہیں تنہا چھوڑ کر۔

"پھر اسجد بھائی ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔" اس کی آنکھ سے ایک قطرہ ٹپک کر خشک پتوں میں گم ہوا تھا۔ "نجانے وہ کہاں چلے گئے تھے، یہ بات ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا مگر یہ بات ہمیں کچھ عرصہ بعد پتا چلی کہ وہ ماموں سے جہیز کے نام پر ایک کثیر رقم بٹور کر گئے ہیں۔ یہ بات ماموں نے ہمیں بہت غصے میں بتائی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ انہیں رقم کا غم نہیں ستا رہا تھا بلکہ وہ ان کی بیٹی کا مقدر تھا، وہ خواب تھے جن کی کرچیاں بکھری تھیں۔ ان کے چلے جانے کے تقریباً تین یا چار ماہ بعد بی بی کی ٹانگیں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو گئی تھیں اور پتا ہے تیمور! ایسے میں کس نے ہمارا ساتھ دیا؟ پیا نے...... ماموں ہم سے ہر رابطہ ختم کر چکے تھے، ایسے میں پیا نے ہی ہمارے اخراجات کا بار اٹھایا، حالانکہ ماموں ان سے خفا ہو گئے تھے پورے دو سال ماموں جی نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی اور......" وہ پھر خاموش ہو گئی کیونکہ اس سے مزید بولا ہی نہیں گیا تھا۔ بہت سا رو لینے کے بعد اس نے دوپٹے سے چہرہ خشک کیا۔ تیمور نہر کے دوسری طرف درختوں کی قطاروں میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔ شام گہری ہو چلی تھی۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔" میبہ نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ "آئی مین مائدہ کے بارے میں۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو تیمور! میں سمجھی نہیں۔"

"واٹ ڈو یو تھنک میبہ! جو لوگ اپنی زندگی دوسروں کے لیے تیاگ دیتے ہیں، کیا وہ خواب نہیں دیکھتے، کیا ان کے دلوں میں ارمان نہیں ہوتے، کیا ان کے تکان زدہ وجود کسی کے کندھے پر سر رکھ کر سکون حاصل کرنے کے خواہاں نہیں ہوتے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ میبہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"نہیں میبہ! آنکھوں کو خواب دیکھنے سے روکا نہیں جا سکتا، دلوں میں پنپنے والے ارمانوں پر پہرہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہ جو ایک خواہش ہے نا کسی کے کندھے پر سر رکھنے کی، یہ تب تک پوری نہیں ہوتی جب تک غم بہانہ دیا جائے، جب تک غم کو سمیٹ لینے کا یقین نہ ہو۔ کبھی کبھی مضبوط نظر آنے والے لوگ مضبوط نہیں ہوتے میبہ! اپنے گرد چڑھایا جانے والا خول انہیں ہر دم اس میں مقید رہنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"تم تو یوں بول رہے ہو جیسے بہت تجربہ ہو۔" اس نے مصنوعی سے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ یہ ہر دم اوٹ پٹانگ باتیں کرنے والا تیمور تو قطعاً نہیں لگ رہا تھا، وہ اس کی بات سے جیسے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا تھا۔

"اب ہر کوئی تمہاری طرح احمق نہیں ہوتا کہ تجربے سے ہی عقل حاصل کرے۔ خیر یہ بتاؤ مائدہ کو کب تک خود تک محدود رکھنے کا ارادہ ہے؟"

"ایں، کیا مطلب۔" پھر خود ہی بولی۔ "میں نے تو ایسا کبھی بھی نہیں چاہا کہ وہ مجھ تک محدود رہیں۔" اس کا انداز سراسر تردید کرنے والا تھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو تم نے اب تک اس کے بارے میں کچھ سوچا کیوں نہیں؟ آخر کب تک وہ اسجد کا انتظار کرے گی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے کبھی ایسا خیال آیا ہی نہیں بلکہ...... بلکہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں۔" وہ جیسے اپنی عقل پر افسوس کر رہی تھی۔

"تو اب سوچو میبہ خاتون!" وہ ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا۔ "کہ مائدہ اور عباس کی جوڑی کیسی لگے گی۔" اس کا مبہم لہجہ میبہ کو چونکا گیا تھا، وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ سوچ کو ایک نیا رخ ملا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" دو پسندیدہ ہستیوں کا ملاپ۔ "پیا اور عباس بھائی...... عباس بھائی اور پیا...... ہاں۔" وہ تالی بجا کر ہنس پڑی تھی۔ اب ہر طرف طمانیت ہی طمانیت تھی۔

"حیرت ہے، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔"

"کیونکہ تمہیں عقلمندانہ خیال کم ہی آتے ہیں۔" تیمور اپنی جون میں لوٹ آیا تھا، وہ بےساختہ
ہنس پڑی اور روڈ پر ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے وہ فیوچر کی شاندار پلاننگ کر رہے تھے مگر
فیوچر ان دونوں کا نہیں بلکہ "عباس اور مائدہ" کا تھا جبکہ دور کھڑکی بند کرتی مائدہ کے ہاتھ ٹھٹک کر رک گئے
حیرت اتنی تھی کہ وہ فوراً بھی نظریں نہ ہٹا سکی۔

"ہوں تو یہ بات ہے تم بھی بالکل ہی نکمی ہو مائدہ حسین..... ایک ذرا سی بات بھی سمجھ نہ سکیں تم
تجربہ خام ہے، ایک ذرا سے بچوں نے کتنی آرام سے آنکھوں میں دھول جھونک دی۔"

✦

رات کے پچھلے پہر بی بی کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا، ان کا ضعیف وجود کچھ ایسا بھاری بھرکم نہ تھا مگر مائدہ
اور میبہ دونوں کے بازوؤں میں ہی اس بوجھ کو سہارنے کی سکت نہ تھی۔ بہرحال جیسے بھی تھا وہ بی بی کو گاڑی میں
ڈال چکی تھیں۔

"پپا میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" میبہ کو تو خود ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی پھڑک کر مر جائے گی۔

"تم گھر پر ہی رہو میبہ! انشاء اللہ بی بی کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وہ اسے امید تھما آئی تھی مگر اب آئی سی یو
کے باہر کھڑی وہ خود بھی ناواقف تھی کہ آنے والے وقت میں کیا ہو سکتا ہے۔ خوف نے اس کے بدن میں
سنسنی سی بھر دی تھی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی اور آنکھ میں سرخ ڈوروں سمیت بے بسی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا اگلے
چوبیس گھنٹے اہم ہیں اور ابھی تو ہر پل صدی کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ وہ شیشے کی دوسری جانب لیٹی بی بی کو دیکھ
رہی تھی جن کے اندر مصنوعی نالیوں کے ذریعے قطرہ قطرہ زندگی اتر رہی تھی۔ کہیں سنا تھا ماں کے لیے اپنے
بیٹے بہت اہم ہوتے ہیں تو یقیناً بیٹے کی ایک جھلک بی بی کو نئی زندگی دے سکتی تھی۔

"میں کچھ نہیں، میری ذات کچھ نہیں..... مگر..... مگر ماں تو سب کچھ ہے نا..... اسے تو تمہاری
ضرورت ہے اسجد..... پلیز لوٹ آؤ میرے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے..... اپنی جنم دینے والی کے لیے۔"
اس نے بہت دل سے اسے پکارا تھا اور کچھ پکاریں بہت دور تک جاتی ہیں۔ دلوں سے نکلی ہوئی دعائیں
عرش ہلا دینے کی سکت رکھتی ہیں مگر ابھی اس کی نوبت نہ آئی تھی۔

"مائدہ!" اسے کسی نے پکارا تھا اور وہ ایسی خوش فہم نہ تھی پھر بھی پلٹی۔ سامنے تیمور تھا، پیچھے عباس اور
میبہ۔

"پپا!" وہ اس سے لپٹ گئی اور اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے خود میں سمیٹ
کر دعا کرنے اور اچھے وقت کی امید دلا سکے۔ میبہ کسی انہونے احساس کے تحت اس سے الگ ہوئی تھی اور
اسے برستی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ مائدہ تو نہ تھی جسے میبہ جانتی تھی۔ تھکا ہوا چہرہ، ہر احساس

سے بے حد بنجر اور سوکھی۔

"پپا..... کیا ہوا ہے..... پپا!" اس کا دل دھڑ دھڑا رہا تھا۔ "پپ..... پپا..... بتائیں نا کیا ہوا ہے
بی بی کو..... کیا ہوا ہے..... بتائیں نا۔" وہ اسے کندھوں سے پکڑے جھنجھوڑ رہی تھی، چیخ رہی تھی، رو رہی تھی مگر مائدہ
ساکت تھی، عباس نے میبہ کو نرمی سے الگ کیا، وہ مائدہ کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا
تھا، اس نے گردن موڑ کر آئی سی یو کی جانب دیکھا، میبہ تیزی سے شیشے کی طرف گئی تھی بلکہ عباس اور تیمور
بھی۔ وہ سست روی سے چلتی ہاسپٹل کے ٹیرس پر آ گئی، بادلوں سے ڈھکا تاریک رات کا آسمان کچھ اور
تاریک ہو چکا تھا۔

عجب قدرت ہے، جب سر پر بادل ہوں تو بارش نہیں ملتی، دھوپ ہو تو سایہ نہیں ملتا۔ وہ دیوار سے لگی
زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ نہیں ٹلتا، بس آنکھوں سے اوجھل ہو کر
قابو کر لیتا ہے۔ اس نے بھی آنکھیں موند لیں۔ بازو چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔

"تو میرا رب..... تو میرا پروردگار..... دے دے مجھے میری بی بی کی زندگی دے دے۔" وہ رو رہی
تھی، سسک رہی تھی، نازک سا سمٹا سمٹایا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔ مستجابی کا وقت کون سا ہوتا ہے؟ کون
جانے۔

رب اپنے بندے کی آنکھوں سے برستے مینہ کے تھمنے کا سامان کب کر دیتا ہے؟ کسے خبر۔ کبھی کبھی بنا
بادل کے بارش برسا کر بنجر روحوں کو سیراب کر دیتا ہے اور کبھی کبھی کڑی دھوپ میں سائے کا سامان کر دیتا
ہے۔ وہ اپنے رب کو پکار رہی تھی اور آسمان سے بادل چھٹ چکے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خوشیوں کے
ستارے سر پر چمک رہے ہوتے ہیں اور بندے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ صبح کا ستارا اس کے سر پر مسکرا رہا تھا اور
وہ روتی ہی جا رہی تھی اور اپنے رب کو پکارتی ہی جا رہی تھی، تبھی کسی نے اسے پکارا تھا، اس نے سر اٹھایا،
بالکل سامنے عباس مصطفیٰ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"اٹھیے مائدہ! بی بی کو ہوش آ گیا ہے۔" اور وہ ملگجے سے اجالے میں اس شخص کو بے یقینی سے دیکھے
گئی۔ عباس نے اسے یوں گم صم دیکھا تو دونوں ہاتھ تھام کر کھڑا کرنا چاہا، تب وہ اس سے بھی زیادہ تیزی
سے عباس کا ہاتھ تھام گئی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نا۔" عجیب بے قراری سے پوچھا گیا۔ عباس دھیمے سے مسکرا دیا۔ مائدہ اپنے گال
رگڑتی ہوئی تیزی سے اٹھی تھی اور اندر کی طرف بھاگی تھی۔

✦

اور عباس مصطفیٰ کو خبر بھی نہ ہوئی مگر وہ ڈوب گیا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے مائدہ کو اب تک اس نظر سے نہ دیکھا تھا، کچھ میبہ کی بہن کی حیثیت
ہمسائیگی کا پاس...... کچھ ایسا شریف بھی نہ تھا، اپنے زمانے میں چھوٹے موٹے افیئرز تو اس نے
ہی تھے پھر رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کا ادراک، ذاتی حلقہ احباب اور صنف نازک کے درمیان ملنے والی
معمولی اہمیت نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔ ڈیشنگ اور رُوڈ جیسے القابات تو وہ اب تک سنتا تھا اور
ویسے گزر جاتا تھا۔ چند قدم تک ساتھ چلنے والی لڑکی کا انتخاب بھی وہ بہت دیکھ بھال کر کرنے کا عادی
ساری زندگی کسی کو ہم قدم بنانے کا اس نے اب تک نہ سوچا تھا۔ اپنی مردانہ خصلت کے ہاتھوں مجبور
ہوئے اس نے پہلی ہی سرسری سی نگاہ میں مائدہ حسین کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا مگر ایک تو یہ کہ وہ کوئی
''پہنچی ہوئی'' چیز نہ تھی، دوسرا اس قسم کے معاملات میں اس کی ''انا'' ہمیشہ ''ایوریسٹ'' پر رہتی تھی، اس
اب بھی یقین تھا کہ اس قسم کا کوئی رسپانس مائدہ کی طرف سے ملا ہوتا تو وہ ضرور اب تک دو تین ڈیٹس
ہوتا مگر بہر حال بعد کے دنوں میں اس نے کبھی بھی کوئی غلط بات نہ سوچی تھی پھر جب تیمور نے اس
مائدہ کے لیے کہا تھا تو وہ ضرور راضی ہو گیا تھا کہ زندگی کسی کے ساتھ تو گزارنی ہی تھی پھر تیمور معترف تھا
کو بھی وہ پسند آئی تھی مگر بعد میں سب ختم ہو گیا۔ اس نے اس بات کو کچھ خاص اہمیت نہ دی تھی اور نہ
آنے والے دنوں میں دینے کا ارادہ تھا مگر اب کی بار بھی کچھ اتھل پتھل ہو گیا تھا، جب اس نے مائدہ کو
تھا نوخیز صبح میں وہ عام سی لڑکی، عام سے حلیے میں یکدم بہت خاص کام کر گئی تھی۔ پانی سے لبریز وہ
آنکھیں...... عباس مصطفیٰ کو ایک پل ہی لگا تھا اپنا آپ ہارنے میں۔ اب تک اس کا سامنا خاص لڑکی
سے ہوتا آیا تھا، یہ پہلی عام لڑکی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ

''عام لوگوں سے بچنے میں ہی عافیت ہے۔'' اس نے گردن کو ذرا سا موڑ کر دیکھا، درمیان کے
بینچ چھوڑ کر وہ سر دیوار سے ٹکائے چھت کو گھور رہی تھی، اس نے نگاہ موڑ لی، جو چیز آپ کی ہے اور نہ آپ
ہو سکتی ہے اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنے سے فائدہ۔ اسے یکدم خود پر غصہ آیا تھا کیونکہ وہ اس لڑکی کی طرف
سے دھیان ہٹا نہ پا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس شخص پر بھی غصہ آیا تھا جو اس لڑکی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''تیمور! میں گھر جا رہا ہوں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شاور لینے کا ارادہ ہے کچھ
سوؤں گا بھی...... آں کچھ چاہیے ہو تو بتا دیجیے، میں واپسی پر لیتا آؤں گا۔'' اسے یہ نہیں کہنا تو مگر نہ جانے
کیوں کہہ دیا۔

✦

پورے تین ہفتے ہاسپٹل میں گزار کر گھر واپس آئی تھیں تو ایسا لگ رہا تھا در و دیوار بھی مسکرا رہے
ہوں اور مسکرا تو رہے تھے، در و دیوار نہیں بلکہ تیمور اور میبہ...... انہیں ان کی کاوش ہی ایسا کرنے پر مجبور کر رہی

تین ہفتوں میں عباس اور مائدہ نے آپ سے تم تک کا سفر اگرچہ طے نہیں کیا تھا مگر
بہت نہ سہی مگر ان
خیر جو بھی کیا تھا (اب انہیں کیا خبر کہ عباس مصطفیٰ نے خود کو اس رستے کا راہی ہونے سے کتنا
تو بہر حال ہو ہی گیا تھا
روکا تھا) اتنے عرصہ بہن کو نا کردہ جرم کی سزا دینے پر شرمندہ شرمندہ اپنے ساتھ
نجات لاہور آئے تھے،
چلنے پر کافی زور دیا تھا اور پھر نا کام ہی واپس لوٹ گئے تھے۔ اس دن وہ کالج سے واپس آئی تو بی بی
سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیمور موجود تھا اور غیر معمولی طور پر قہقہوں کی یہ آواز بی بی کی
...

صرف تمہاری وجہ سے بی بی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے۔ کاش تیمور! تم مجھے پہلے مل گئے
واپسی پر وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تو بڑی شکر گزاری کے سے انداز میں بولی۔
''یعنی میں نہ ہوا میلی جراب ہو گیا جو مل گیا تھا۔'' وہ ہنس دیا۔ اسے کچھ خیال آیا تو پوچھ لیا۔
''عباس خیریت سے ہے، کافی دنوں سے میں نے دیکھا نہیں اسے۔''
''عباس تو خیریت سے ہی ہے، البتہ تمہاری خیریت مجھے کچھ مشکوک لگ رہی ہے۔ یہ یکدم میرے
دوست کو دیکھنے کا خیال کیسے آ گیا۔''
''پاگلوں جیسی باتیں مت کرو تیمور! میں تو یوں ہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ جھینپ سی گئی۔
''اب تمہیں سہیلی بنایا ہے ماننا تو پڑے گا ہی، خیر عباس کی کچھ طبیعت گڑبڑ ہے، بس اسی لیے۔''
''تو...... تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''
''بتا دیتا تو تم کیا کر لیتیں۔''
''اور کچھ نہیں تو کم سے کم عیادت ضرور ہی کر لیتی۔ آدھی بیماری تو یوں ہی ختم ہو جاتی ہے۔''
''جی ہاں، جبکہ عیادت کرنے والا بلکہ والی بھی آپ جیسی ہو۔'' وہ کہہ کر چلا گیا، شام میں وہ ان کی
طرف جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بی بی کی بیماری میں جتنا ان دونوں نے ساتھ دیا تھا، اب اس طرح سے
جانا تو اس کا فرض بنتی ہی تھی مگر پھر فون پر ہی خیریت معلوم کر لی۔ باتوں سے باتیں نکلیں اور وقت
...... چلا پھر ایک روز وہ بی بی کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا، کافی دیر بی بی کے پاس بیٹھا
...... فرمائشیں کر کے کافی بھی پی اور اس کے جانے کے بعد وہ واپس کمرے میں آ کر
...... کرنے لگی۔
''...... کیا ہوا ہے؟''
''...... چلا گیا۔'' بی بی کے پوچھنے پر مصروف سا جواب دیا۔
''بہت اچھا لڑکا ہے عباس! ہے نا۔'' وہ بس مسکرا دی۔ بی بی اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جب وہ
...... قریب آئی تو وہ دھیرے سے بولیں۔

''اور بہت چاہتا بھی ہے تمہیں، ہے نا۔'' اسے لگا تھا کہیں بجلی کڑکی ہے۔ کیا بی بی اس پر اعتماد کر رہی
تھیں؟

''کیا...... کیا اس نے آپ سے خود کہا ہے؟'' ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

''اوہوں اندازہ ہے میرا۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بی بی۔'' خدا جانے اس نے کس کو جھٹلایا تھا۔ بی بی کو یاد ہن میں چمکتی
مصطفیٰ کی آنکھوں کو۔ بی بی ہنس دیں نرمی سے۔

''یہ جو میرے سر پر سفید بال ہیں نا مائدہ یہ تجربے کی دھوپ میں سفید ہوئے ہیں۔ عباس کی آنکھوں
میں جو تحریر ہے نا میں اسے کئی دنوں سے پڑھ رہی ہوں۔'' انہوں نے توقف کیا پھر اس کا متوحش چہرہ دیکھ
اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''تم میری بیٹی نہیں ہو مگر یقین کرو مجھے تم میہہ سے بڑھ کر عزیز ہو۔
یہاں ہوتا تو بات دوسری تھی پھر میں تمہیں کہیں بھی نہ جانے دیتی مگر...... مائدہ! جب خوشیاں دروازے
کھڑی ہوں نا تو کسی اور کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ عباس بھی ان ہی خوشیوں کا حصہ ہے
انہوں نے کہہ کر آنکھیں موند لیں تو وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گئی۔

''میں نے تو اپنا آپ سنبھالنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی بی بی! کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر
لیے نہیں دیکھا کیونکہ میں نفس سے خوف زدہ تھی، میں تو بس شیطان کو ہی مات دیتی رہی۔ اب...... اب
وہ ہی میرے بارے میں کچھ اور سوچنے لگا تو...... اس میں میرا کیا قصور۔'' گھر کی پچھلی جانب صحن خالی
آلوچے کے پتے بھی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سارا سفر اکارت جانے کا وقت آ گیا
غلطی سی غلطی یہ ہوئی کہ میہہ نے بات کرنے کے لیے غلط وقت چنا۔ وہ پہلے ہی الجھی ہوئی تھی۔ سنے
بھڑک اٹھی۔

''خدا کے لیے میہہ! مجھے اس گاؤں کا رستہ مت دکھاؤ جہاں مجھے جانا ہی نہیں ہے۔''

''آخر برائی کیا ہے عباس بھائی میں؟''

''کوئی برائی نہیں ہے، وہ بلاشبہ ایک اچھا انسان ہے۔''

''جب اچھا انسان ہے تو......''

''تم کیا چاہتی ہو میہہ! میں گناہ کروں، ایک نکاح پر دوسرا نکاح پڑھوالوں۔'' وہ حد درجہ زچ ہو گئی۔

''گناہ کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی میں، فتویٰ بھی تو لیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے ایسی عورت کو شادی کی
اجازت دی ہے جو......'' مائدہ اسے حیرانی سے تکنے گئی۔ یہ لڑکی کب اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ اسے راہ
دکھانے لگے۔

''تم نے وہ حکایت تو سن رکھی ہوگی نا میہہ! کہ ایک شخص نے پتھر سامنے رکھ کر ساری رات ایک پاؤں

کے سہارے چلہ کاٹا اور دعا کی کہ اے میرے رب! اس پتھر کو سونا بنا دے، ساری رات گزر جانے کے بعد
بھی جب پتھر سونا نہ بنا تو وہ شخص تنگ آ کر کہنے لگا کہ اے میرے خدا! اس پتھر کو سونا نہیں بنانا تو لوہا ہی بنا
دے اور وہی وقت قبولیت کا تھا، پتھر سونا نہیں بن سکا مگر لوہا ضرور بن گیا...... سنو میہہ! میں بھی پچھلے پانچ
سالوں سے ایک پاؤں کے سہارے چلہ کاٹ رہی ہوں، اپنے نفس کی حفاظت کرنا چلہ کاٹنا ہی تو ہے۔ تم خود
چاہتی ہو کہ میں نے ہار کر لوہا بننے کی دعا کر لی اور وہی وقت قبولیت کا ہوا تو میں کیا کروں گی۔''

''اسجد بھائی واپس نہیں آئیں گے پیا! آپ کیوں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی خراب کر رہی ہیں۔''

''وہ آئے گا، تم دیکھنا میہہ! وہ ضرور آئے گا۔ میرے لیے نہ سہی تو تمہارے لیے اور تمہارے لیے نہیں
تو اپنی ماں کے لیے......''

''یہ آپ کی خام خیالی ہے پیا!'' وہ طنز سے ہنسی تھی۔ ''اگر انہیں واپس ہی آنا ہوتا تو وہ جاتے ہی
کیوں؟ تب انہیں بہن کا خیال نہیں آیا ماں پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی تو پھر اب......'' اس نے مڑ کر دیکھا مائدہ
صحن میں وہاں نہیں تھی۔

+

بابا کہتے تھے وہ نہیں آئے گا، بی بی کہتی تھیں آگے جانے والے پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو پتھر کے ہو
جاتے ہیں اور اسجد طارق کو ہمیشہ پتھروں سے نفرت رہی ہے اور اب میہہ بھی یہی کہہ رہی تھی مگر اسے یقین تھا
کہ وہ لوٹ آئے گا تبھی تو پانچ سال اس کے انتظار میں گزار دیے تھے مگر ضروری تو نہیں کہ جو زبان پر ہو وہی
دل میں بھی ہو۔ اس کی امید تو تبھی ٹوٹ گئی تھی جب اسجد طارق فرانس روانہ ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ
کہاں ہے، سوائے مائدہ کے۔ جانے سے قبل وہ اس کے پاس آیا تھا۔

''مجھے پابندیاں اچھی نہیں لگتیں اور میں کسی کو پابند رکھنے کا قائل بھی نہیں ہوں، تم جب بھی آزادی
حاصل کرنا چاہو، مجھے لکھ دینا۔ مائدہ! آئی پرامس میں تمہاری خواہش پوری کرنے میں ایک پل بھی نہیں
لگاؤں گا...... مجھے ابھی بہت آگے جانا ہے اور یہی رشتے میری راہ میں ایک رکاوٹ ہیں مگر اب نہیں......''
وہ کہہ گیا تھا اور دوسرے معنوں میں کشتی دے کر پتوار ہمراہ لے گیا تھا اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ میری خواہش تو
تم تھے اسجد طارق اور کبھی میں بھی تو تمہاری خواہش تھی پھر یکایک کیا ہوا، یہی بتا جاؤ کہ جو رستے تمہاری راہ
کی رکاوٹ تھے ان ہی کو آسمان تک پہنچنے کی سیڑھی کیوں بنایا اور اب کئی سالوں سے وہ بیچ بھنور میں ڈول

+

اور وہ واقعی ڈرتی تھی تبھی اپنا راستہ بدل گئی، اگرچہ پہلے بھی سامنا کم ہوتا تھا مگر اب تو وہ سرے سے دعا سے بھی کترانے لگی مگر مشکل ہو جاتا ہے جب سوچوں کا رخ بدلنے کی سعی مسلسل کی جائے تو سوچیں وہیں اٹک جاتی ہیں اور وہ جو سمجھ رہی تھی کہ رستہ بدلنے سے ہر چیز درست ہو جائے گی، خود ہی سب کچھ غلط کر بیٹھی۔ وہ عباس مصطفیٰ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ہر پل نادانستہ اسے سوچنے لگی اور جب کچھ سوجھا تو خائف ہو کر رونے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔" جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے وہ خدا سے پوچھ رہی تھی، جب میبہ اندر آئی۔

"تیمور کا برتھ ڈے ہے اور اس نے ہمیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔"

"تم چلی جاؤ، میرا موڈ نہیں ہے۔" جائے نماز کو تہ کر کے وہ کھڑی ہوئی۔ میبہ نے خاموشی سے اسے دیکھا پھر بڑھ کر اس کے کندھے تھام لیے۔

"مجھے لگتا ہے آپ عباس بھائی سے محبت کرنے لگی ہیں، ان کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہیں۔"

"بکواس مت کرو میبہ!" اس نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ "یہاں محبت کہاں سے ٹپک پڑی۔"

"اگر میری بات غلط ہے تو کیوں چھپتی پھر رہی ہیں، کل ہی تیمور مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"میبہ! تم کبھی کبھی بالکل ہی دماغ خراب کر کے رکھ دیتی ہو، میں بھلا کیوں چھپوں گی۔ تم جانتی ہو کالج میں کتنا کام ہے ان دنوں، بی اے کے ایگزامز ہو رہے ہیں اور......ٹھیک ہے میں چلوں گی۔"

اسے رد کرنے کی خاطر تیار ہو گئی۔ میبہ نے خوشی سے چیخ ماری پھر فٹافٹ تیمور کا نمبر ڈائل کیا۔

"پپا آئیں گی......ارے نہیں......ہاں بھئی......اچھا تم ارینج کر لو۔" پھر اس کی طرف پلٹی۔ "پپا! آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔" مائدہ نے بڑھ کر ریسیور لے لیا۔

"کیسی ہو سہیلی؟"

"زندہ ہوں اور ویسی کی ویسی ہوں۔"

"یعنی نک چڑھی اور بدمزاج۔"

"ارے میں مائدہ بول رہی ہوں، میبہ نہیں۔"

"جانتا ہوں۔ اس کی سریلی آواز کو تو میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا ہوں۔"

"ا......اچھا۔" اس نے میبہ کو خاصے معنی خیز انداز میں دیکھا تو وہ اس سے چیک کر باتیں سننے لگی۔

"ہوں یہی بات ہے، باقی باتیں تم بھی سوچ لو......یار! اب تو میں اپنا ذاتی بزنس بھی اسٹیبلش کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک......تو پھر میں ڈبل ٹریٹ لوں گی۔"

"ارے میں تمہیں کئی بار ٹریٹ دینے کو تیار ہوں، فی الحال تم سالگرہ میں تو آؤ۔"

"اتنے بڑے ہو کر سالگرہ مناتے ہو شرم نہیں آتی۔"

"بالکل نہیں۔" وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھا، پہاڑ کے نیچے کیسے آتا۔ صحیح وقت پر آنے کی تاکید کر کے اس نے بند کر دیا۔

من آنگن میں شہر بسا ہے
شہر میں اک دریا بہتا ہے
دریا کی لہروں میں رہتے
رستوں میں ان دیکھے سپنے کھلے ہوئے ہیں
خواب، دھنک، خوشبو اور چہرے ملے ہوئے ہیں
تیز ہوا میں دیپ سمے کے جلے ہوئے ہیں
لیکن شہر کے دروازے پر
بے خوابی کے دکھ سکھ اوڑھے
جانے کس کی آس میں آنکھیں
نیندوں کا پہرہ دیتی ہیں

کبھی کبھی زندگی میں کڑے امتحان بھی دینے پڑتے ہیں جو بظاہر بہت آسان مگر بے حد سخت ہوتے ہیں، وہ بھی ایک ایسا ہی امتحان دینے جا رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے، آخر میں اتنا گھبرا کیوں رہی ہوں۔" اس نے خود کو گھر کا اور گہرا سانس بھر کر چوٹی کے بل مکمل کر کے بینڈ چڑھایا۔ شیشے میں اپنا جائزہ لیا پھر کچھ سوچ کر براؤن شیڈ کی لپ اسٹک بھی لگالی۔ تیاری ابھی بھی منہ چڑا رہی تھی، آخر ایئر رنگز بھی پہن لیے۔ اپنی طرف سے اس نے بہت نارمل سی تیاری کی تھی، بالکل ویسی ہی جیسی ہر روز کالج جاتے ہوئے کرتی تھی۔ میبہ کو چلنے کے لیے کہا تو وہ فوراً کمرے سے نکل آئی اور مائدہ کو لگا تھا کہ اس نے تنقیدی سی نگاہ اس پر ڈالی ہے۔ میبہ نے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر تیمور تو خیر کبھی بھی لگی لپٹی نہ رکھتا تھا، بڑے پرجوش انداز میں استقبال کیا گیا مگر جوں ہی اس پر نگاہ پڑی نہایت ناگوار شکل بنا کر بولا۔

"تم نے تمہیں اپنی سالگرہ پر انوائٹ کیا تھا، رسم چہلم میں نہیں۔"

"شکل تو خیر تمہاری بری ہے مگر کم سے کم باتیں تو اچھی کر لیا کرو۔" یہ جواب میبہ کی طرف سے آیا تھا۔ مائدہ دزدیدہ نظروں سے لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی جو بالکل خالی تھا۔

”تمہاری بات مجھے اتنی بری لگی ہے کہ جلتے کوئلے سے تمہارا منہ داغ دینے کو جی چاہ رہا ہے مگر مستقبل قریب میں تم میری نصف بہتر ہو سکتی ہو، اب جلے منہ والی بیوی مجھ جیسے ہینڈسم بندے کے ساتھ کچھ اچھی نہیں لگے گی، لہٰذا میں نے تمہیں معاف کیا۔“ خاصی بے نیازی سے کہا گیا تھا۔

”اس عظیم مہربانی پر کنیز شکریہ بجا لاتی ہے لیکن اگر آپ کی فضول بکواس ختم ہو گئی ہو تو ہم اندر جائیں۔“

”ارے ہاں۔“ اس نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا، تبھی کسی کونے سے عباس برآمد ہوا تھا۔ کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے وہ غالباً کہیں جانے کو تیار تھا، انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر خوشگواریت سے بولا۔

”اگرچہ کافی گھسا پٹا شعر ہے مگر کیا کریں کہ اردو ادب میں حسب حال یہی ہے کیونکہ مجھے یاد بھی یہی ہے۔“

”رہنے دو میرے ماموں جان! تم شعر بھی نثر کی طرح پڑھتے ہو۔“ تیمور کے کہنے پر وہ ہنس دیا پھر ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم دونوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔“ جملہ مکمل ہونے تک تیمور نے بہت معنی خیز انداز میں کھنکار کر گلا صاف کیا تھا پھر سر کھجانے لگا تھا، انداز میں حد درجہ شرارت اور لبوں پر دبی دبی مسکان تھی۔ کچھ ایسے ہی تاثرات میہ کے تھے۔ ان کے اس انداز پر مائدہ پل بھر کو پزل ہوئی پھر اپنی ازلی خود اعتمادی سے عباس سے مخاطب ہوئی۔

”آپ کہیں جا رہے ہیں عباس؟“ خود کو لاتعلق تو ظاہر کرنا ہی تھا۔

”ہاں، ایکچوئلی ایک دوست کے یہاں.....“

”لیکن ہم تو آپ کے ساتھ ڈنر کرنے آئے تھے۔“ میہ نے جلدی سے کہا تو تیمور تائید کر کے بولا۔

”میری سالگرہ تھی نا تو میں نے انہیں انوائٹ کیا ہے۔“

”تمہاری سالگرہ.....“ عباس حیران ہوا۔ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ سالگرہ کیا ہوئی جو چار ماہ پہلے تم نے منائی مگر پوچھ نہیں سکا۔

”او کے میں فراز سے ایکسکیوز کر لیتا ہوں۔“ وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ مائدہ اپنی دعا پوری نہ ہونے پر چڑ گئی جبکہ تیمور اور میہ نے ایک دوسرے کو وکٹری کا اشارہ کیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد لاؤنج میں ہی ڈیرہ جما۔ تیمور میہ کی گفٹ کی ہوئی شرٹ پر بڑے بڑے کمنٹس پاس کر رہا تھا۔

”دیکھو لینی ہے تو لو ورنہ واپس کر دو۔“ میہ چڑ گئی تو وہ اسے دیکھتے ہوئے ہنس دیا۔

”محترمہ! جو چیز ہم ایک بار لے لیتے ہیں اسے واپس نہیں کیا کرتے۔“ میہ سٹپٹا کر عباس سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد تیمور نے ہی تجویز دی تھی۔

”کیوں نا آج تم لوگوں کو عباس کی پینٹنگز دکھائی جائیں۔“

”نہیں تیمور! اب ہم لوگ جاتے ہیں، بی بی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ مائدہ کو جانے کی جلدی تھی۔

”بالکل نہیں، کافی پلوائے بغیر تو ناممکن ہے۔“ وہ انہیں لیے اسٹوڈیو میں آ گیا جو ٹیرس سے منسلک تھا، دائیں طرف گلاس وال تھی، ستاروں بھرا آسمان پھر سارا ٹیرس نرم ہوا سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر عباس کی بنائی ہوئی پینٹنگز دیکھتی رہی۔ میہ تو باقاعدہ تبصرہ فرما رہی تھی۔ اس نے ان تینوں کو مشغول دیکھا تو دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ہوا میں رات کی رانی اپنی تمام تر جولانیوں سمیت موجود تھی۔

عباس نے اسے گرل کے پاس کھڑے دیکھا، سر کی پشت پر ہاتھ رکھے وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں میں وہ اس کا گریز واضح طور پر محسوس کر چکا تھا۔ چہرے پر سجائی خود ساختہ سختی و سنجیدگی بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ اس نے دو مگ کافی کے اٹھائے اور باہر آ گیا۔ تیمور اور میہ نجانے کس موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ عباس کو لگا وہ دنیا کا ”چغد اعظم“ ہے مگر دل کی آواز سے نظریں چرانا آسان نہیں ہوتا۔ وہ قریب آ کر رک گیا۔ مائدہ کو کسی کی موجودگی کے احساس نے چونکایا، گردن موڑ کر دیکھا۔

”تم شاید بور ہو رہی ہو۔“ عباس نے کافی کا مگ اس کی جانب بڑھایا، وہ خفیف سا مسکرائی۔

”نہیں تو۔“ عباس نے لب بھینچ کر مسکراہٹ چھپائی، اس لڑکی کو یا تو جھوٹ بولنا ہی نہیں آتا یا وہ ہی پہچان لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

وہ ہاتھ مسلنے لگی، دل الگ دھڑ دھڑ کر رہا تھا، گلاس وال کے دوسری طرف میہ اور تیمور ابھی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھے، وہ متذبذب سی تھی۔ یہاں ٹھہرنے اور چلے جانے کے بیچ اٹکی ہوئی۔

”اتنا گھبرا کیوں رہی ہو مائدہ! میں کوئی بھوت تو نہیں ہوں۔“ تبھی عباس نے بہت سادگی سے کہا۔

”جی نہیں میں بھلا کیوں گھبراؤں گی۔“ وہ سٹپٹا سی گئی۔ عباس گرل پر کہنیاں رکھے شہر کی روشنیاں دیکھ رہا تھا پھر یوں ہی نظر گھما کر اسے دیکھا۔ کافی پیتے ہوئے عجیب سی بے کلی ہر انداز سے ہویدا تھی، وہ مسکرائے بنا نہیں رہ سکا۔

”ہم لوگ چلتے ہیں اب..... کافی دیر ہو رہی ہے اور کھانا بہت اچھا تھا۔“ وہ کافی ختم کر کے تیزی سے [illegible] رہی تھی اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ کتنی ہونق لگ رہی ہے۔ عباس فقط خاموشی سے اسے تکے گیا۔ اب وہ خائف سی ہو کر پلٹ گئی تھی مگر عباس مصطفیٰ اس کے سامنے تھا۔

”تمہیں ایک بات بتاؤں مائدہ!“ اس سا ”ویل مینرڈ“ بندہ بغیر اجازت کے تو کوئی بات کر ہی نہ سکتا تھا، لیکن دل پر کس کا بس چلتا ہے، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ۔

”پتھروں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پتھر کو تو آپ ایک ٹھوکر سے ہٹا سکتی ہو مگر انسان کو نہیں

اور میں پتھر نہیں ہوں۔" ایک گہری دلفریب مسکراہٹ ان لمحوں کی نذر کر کے وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے بے اختیار پلٹی، عباس مصطفیٰ سینے پر بازو باندھے کھڑا تھا اور نگاہیں اس پر تھیں۔ سنجیدہ سے چہرے پر بکھرا تبسم فتح کے احساس سے لبریز تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی تھی۔

✦

کبھی مصروفیت کی تیز آندھی
کبھی حالات کے جھکڑ
کبھی کھائے ہوئے سارے فریبوں کی جھلستی یاد کی لو
اور کبھی اپنی گزشتہ بے وفائی کے ندامت خیز منظر
کبھی خوں کی حرارت، جسم کی حدت، خیالوں کی تمازت کو
خیال و خواب کرتی
سال و سن کی برف باری
کبھی کچھ تلملاتی خواہشوں کا رقص وحشت
مجھے مجبور کرتے ہیں
کہ میں اندر کی جانب کھلنے والے سارے دروازے مقفل کر کے
خود کو صورت حالات میں محصور کر لوں
مفاد و مصلحت کو ذات کا منشور کر لوں
زمانے کی شرائط جو بھی ہیں منظور کر لوں
مجھے بھی وقت کے فرمان سے انکار تو شاید نہیں لیکن
محبت کا دریچہ بند ہونے میں نہیں آتا

کھڑکی کے کھلے پٹ سے تر و تازہ ہوا کا جھونکا جس پل اس کے چہرے کو چھو کر کمرے کی خاموشی میں بکھرا، وہ کھل کر مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے میری زندگی ہے، میں جس کے ساتھ چاہے گزاروں...... جس طرح سے مرضی گزاروں مگر اب مجھے اسجد طارق کا مزید انتظار نہیں کرنا۔" فیصلہ ہو چکا تھا اور اب وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ وہیں کھڑی آسودہ سانس لیتی رہی۔ فیصلہ کرنا اگرچہ مشکل ہوتا ہے مگر جب ہو جاتا ہے تو اس طمانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بالوں میں برش پھیرا پھر ڈھیلی سی چوٹی باندھ کر

اور بی بی لونگ روم میں تھیں۔

"میبہ اور بی بی! آؤ گھومنے چلیں۔" اس نے حیراں کا اسکیچ بناتی میبہ سے پوچھا۔ میبہ نے قدرے حیرت سے دیکھا، کیونکہ اس قسم کا ردعمل بی بی کا تھا۔ اس قسم کی فرمائشیں عام طور سے میبہ کیا کرتی تھی اور مائدہ ہمیشہ کے کہنے پر راضی ہو جاتی تھی۔

"میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی۔" میبہ کو پھر جھٹکا لگا۔ بی بی نے بھی ایسی بات پہلی بار کہی تھی۔ جب وہ لوگ تیار تھے تو وہ کیوں انکار کرتی اور وہ ان کی زندگی کی ایک بہترین شام تھی۔ کالونی کا نہر کا کنارہ۔ جہاں رک کر انہوں نے خوب ہی قہقہے لگائے تھے۔ مائدہ خوش تھی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی بی بی کو اس کے چہرے پر بکھری مسکان نئی نئی سی لگ رہی تھی جس میں خود ساختگی نہیں بلکہ بے ساختگی آج تو اس کی آنکھیں بھی اس کے ساتھ ہی مسکرا رہی تھیں۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر انہوں نے تالیاں بجا کر گانے گائے تھے۔ بی بی نے انہیں اپنے دور کا مشہور گانا سنایا تھا پھر پتھر مار کر آم توڑے گئے اور اس کا سفر اسی خوشگواریت میں ہوا تھا۔

عباس مصطفیٰ نے ٹیرس کی گرل پر کہنیاں ٹکائے کافی کی چسکیاں بھرتے ہوئے کسی قدر حیرانگی سے تینوں کو دیکھا تھا پھر خفیف سا مسکرا دیا تھا۔ "ہنستی مسکراتی زندگیاں۔"

اسی پل میبہ نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر مائدہ کو بتا کر بی بی کو ادھر متوجہ کیا تھا۔ عباس نے وہیں سے ہاتھ ہلا کر انہیں وش کیا، اگرچہ اس کا ارادہ ان کے پاس جانے کا نہیں تھا مگر میبہ کے بلانے پر چلا گیا۔

باآواز بلند سلام کرتے ہوئے اس نے وہیل چیئر پر بیٹھی بی بی کے آگے سر جھکا دیا۔

"جیتے رہو۔" شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے دعا دی۔ وقت چاہے کتنا بھی آگے نکل جائے مگر سر پر پیار لینے میں الگ ہی مزہ ہے پھر اس نے تو یوں بھی بچپن میں ماں باپ کے پرشفقت ہاتھوں کا لمس محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے ماں جنم دیتے ہی چلی گئی، پھر باپ بھی...... بجیا اس سے کم و بیش اٹھارہ سال بڑی تھیں۔ بابا کو شاید اپنی موت نزدیک نظر آ رہی تھی تبھی ان کی شادی کم عمری میں کر دی۔ عارف لالہ نے اسے بالکل باپ کا سا پیار دیا تھا اور اس بات کا اسے احساس تھا جو بہت کم عمری میں ہی ہو گیا تھا۔ جوں جوں عمر کی سیڑھیاں چڑھتا گیا، یہ بوجھ کم سے کم تر کرنے کی تمنا نے اسے ہر مقام پر کامیاب کیا تھا۔ مائدہ نے نہر کی بابت پوچھا تو وہ بولا۔

"سہانا ہے۔"

"بے وقت۔" میبہ کو ہی اعتراض ہوا تھا۔

"ہر بندہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔" یہ بی بی نے کہا تھا اور پتا نہیں کیوں مائدہ مسکرائی تھی۔

"تم کافی دن سے گھر نہیں آئے عباس! حالانکہ میں نے تمہارا انتظار کیا تھا۔"

"سوری بی بی! لیکن آج کل آفس میں کام بہت ہے۔" عباس نے کہا۔ "لیکن آپ کبھی میرے گھر
نہیں آئیں، لہٰذا آج آپ میرے گھر چلیے ...... ریگلی میں بہت اچھی کافی بناتا ہوں۔" اس نے
نظروں سے ان کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا پھر وہیل چیئر کے ہینڈلز تھام کر قدم بڑھانے کو تھا کہ
انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، مسکرا کر بولیں۔

"میں کافی نہیں پیتی۔ وہ جلی ہوئی روٹی جیسی چیز مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔"

"بی بی! آپ چلیے تو جو کہیں گی وہ بنا کر کھلاؤں گا۔ بلیومی، میں بہت اچھی کوکنگ کرتا ہوں، تبھی تو بجیا
مجھے سگھڑ کہتی ہیں۔" انداز متبسم وشریر تھا۔

"پھر تو آپ کی بیوی بہت خوش رہے گی۔" میبہ نے پیشین گوئی کی۔ اس نے بے اختیار مائدہ کو دیکھا
جو جوتے سے زمین کرید رہی تھی۔ ایسا کیا تھا وہاں جس نے اسے چونکایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں حیران
ہوتا۔ بی بی کی جانب متوجہ ہوا جو کہہ رہی تھیں۔

"میں آؤں گی مگر ابھی نہیں اور سنو، تم اپنی بجیا کو لے کر ضرور آنا۔"

"جی ضرور۔"

"اوکے عباس بھائی! ہم چلتے ہیں۔ ابھی مجھے اور پپا کو مارکیٹ بھی جانا ہے۔" میبہ اسے خدا حافظ
کر بی بی کی وہیل چیئر دھکیلنے لگی۔ اصولاً تو مائدہ کو بھی جانا چاہیے تھا مگر وہ وہیں کھڑی انہیں جاتا دیکھ رہی
اور اسے حیران کر رہی تھی۔

"ایک بات بتاؤں عباس!" وہ بھی اس ہی کے جیسی ویل مینرڈ بندی تھی، سو اجازت لیے بغیر بات
کیسے کرتی۔ "پتھر بہت معصوم ہوتے ہیں، ایک ٹھوکر سے راستے سے ہٹائے جاسکتے ہیں مگر انسان تو ایڑی
چوٹی کا زور لگا دینے سے بھی نہیں ہٹتے۔ آں ...... ڈھیٹ جو ہوئے۔" ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ خاموش
ہوئی اور پلٹ گئی۔ عباس مصطفیٰ نے اسے تب تک دیکھا تھا جب تک وہ سی گرین گیٹ کے پیچھے گم نہیں ہو
تھی۔ اس کے کہے ہوئے جملے کا مفہوم کچھ اور بھی ہو سکتا تھا مگر بعض "مفہوم" واضح کرنے کے لیے لفظوں
کی ضرورت نہیں پڑتی اور بعض معاملات صرف مسکراہٹوں کے ذریعے طے پا جاتے ہیں۔ مائدہ حسن کی
مسکراہٹ نے اس سے وہ کہا تھا جو اس کے لفظوں نے نہیں کہا تھا۔ اس نے بے اختیار "یاہو" کا نعرہ لگایا
جھینپ کر ادھر ادھر دیکھا۔ شکر ہے یہ حرکت کرتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

"سچ کہا ہے جس نے بھی کہا ہے، دل واقعی دماغ کو بے وقوف بنا دیتا ہے۔" بھنگڑے ڈالتے دل کو
ذرا مشکل سے ہی سنبھال پایا تھا۔

✦

وہ گیٹ کھول رہی تھی، جب بلیک کرولا سامنے سے گزری پھر ریورس ہو کر اس تک آئی۔ "کالج جا
رہی ہو۔" عباس نے کار سے نکلتے ہوئے پوچھا، اس نے مثبت جواب دیا تو بولا "آؤ میں ڈراپ کر دیتا
ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"میرے پاس میری کار ہے۔" عباس نے خاصی ناگواری سے گیٹ کے اندر کھڑی منہ چڑاتی سفید
مہران کو دیکھا۔

"خاصی کھٹارا ہو چکی ہے۔" بالکل رقیب لگی تھی۔

"کھٹارا ہے، ناکارہ تو نہیں۔" اس نے اپنی ہنسی روکی پھر ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی۔

"ویسے بی بی ٹھیک کہتی ہیں۔"

"کیا؟" وہ متجسس ہوا۔

"یہی کہ آپ کرتا شلوار میں بہت اچھے لگتے ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا کہ بی بی واقعی ایسا کہتی
تھیں۔ عباس نے اس کی بات کو کافی انجوائے کیا تھا، ساتھ ہی بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"کیا صرف بی بی ایسا کہتی ہیں۔" تبسم وشرارت بھرا لہجہ حد درجہ معنی خیز تھا۔

"نہیں، میبہ بھی ایسا ہی کہتی ہے اور۔" وہ کار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ "اور میں ان دونوں
سے سو فیصد متفق ہوں۔" اس نے وہی کہا تھا جو عباس سننا چاہ رہا تھا، اس کا قہقہہ زبردست تھا۔

"حسین لڑکیاں اس وقت اور بھی حسین لگنے لگتی ہیں جب وہ سچ بولتی ہیں۔"

"میں چلتی ہوں ...... دیر ہو رہی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا مگر عباس حد درجہ سنجیدگی سے بولا۔

"اور اس وقت زہر لگتی ہیں جب گھبرا کر بھاگ جاتی ہیں۔" اب مائدہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا اور شاید
پہلی، یقیناً عباس نے پہلی بار اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ وہ سٹپٹا کر ادھر
ادھر دیکھنے لگی۔ اس بے ساختہ قہقہے کو بریک بھی بے ساختہ ہی لگا تھا۔

"تمہاری ہنسی بے حد خوبصورت ہے مائدہ!" وہ کہے بنا نہیں رہ سکا پھر اسے انگلیاں مروڑتے دیکھ کر
بولا "میں تمہیں لنچ پر لے جا رہا ہوں، چلو گی۔" عجیب دھونس جماتا سا انداز تھا۔

"یہ تم بتا رہے ہو یا پوچھ رہے ہو؟"

"بتا کر پوچھ رہا ہوں۔"

"آں ...... سوچوں گی۔" کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھی، تب وہ پیچھے سے پکار کر بولا۔

"تم سوچنے میں پہلے ہی کافی ٹائم لے چکی ہو۔" معنی خیزی سی تھی۔

"جی بالکل کیونکہ عقل سے کیا گیا فیصلہ ہی دیرپا ہوتا ہے۔" وہ کیوں پیچھے رہتی، وہ ہنس دیا۔

"اچھا سنو، میں اور تیمور چند روز کے لیے سیالکوٹ جا رہے ہیں اور واپسی پر بجیا بھی ہمارے ساتھ

ہوں گی۔" اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے خبر تھی کہ بجیا ان کے ساتھ کیوں آئیں گی۔ زندگی کا ایک اور خوشگوار دن تھا، عجب سی سرشاری تھی، کتنا خوش کن احساس ہوتا ہے نا کہ کوئی آپ کی راہ دیکھ رہا ہے، آپ کو چاہ رہا ہے، بس وہ بھی اسی احساس کے زیر اثر تھی۔ اتنا عرصہ کسی کے انتظار میں گزار کر اب کوئی اس کا منتظر تھا، بس اب "اسجد طارق" کو چند لفظ ہی لکھنے تھے مگر قسمت کبھی کبھی عجیب کھیل کھیلتی ہے، اس کے ساتھ بھی کھیل کھیلا جا چکا تھا، اب جبکہ وہ دوسری کشتی میں سوار ہونے لگی تھی تو پتوار خود چل کر اس کے پاس آ گئے تھے۔ اسجد طارق کو ایک لفظ بھی لکھنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

وہ ساکت کھڑی اسجد کو بی بی کے بیڈ پر براجمان دیکھ رہی تھی، اس پل تو اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ اس کے چہرے پر کون سا تاثر ٹھہرا ہے۔ تحیر کا، تکلیف کا یا خوشی کا۔

"دیکھو مائدہ! میرا اسجد آ گیا، تم ٹھیک کہتی تھیں مائدہ! یہ لوٹ آیا ہے۔"

بی بی دایاں بازو پھیلائے اسے پرجوش انداز میں بتا رہی تھیں۔ مائدہ کی پتھر آنکھوں میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ بی بی کا بازو اسجد کے کندھوں پر یوں رکھا ہوا تھا گویا وہ خود بھی یقین کرنا چاہ رہی تھیں اسے چھو کر...... آنکھوں میں چمکتے ڈھیروں ڈھیر آنسو، جوش سے مسکراتے لب اور ممتا سے لبریز چہرہ۔ مائدہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر جھول گیا تبھی اسجد طارق بی بی کا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر اٹھا اور مسکراتا ہوا اس کے عین سامنے آن رکا۔

"کیسی ہو مائدہ؟" کوئی شرمندگی نہیں، کوئی پچھتاوا نہیں، ان آنکھوں میں ایک جہان آباد تھا اور مائدہ حسین اپنے بے حس و حرکت وجود سمیت ان آنکھوں کی گہرائیوں میں کھڑی تھی۔

+

بی بی نے کہا وہ نہیں آئے گا، شجاعت حسین نے کہا وہ نہیں آئے گا، میہ نے کہا وہ نہیں آئے گا مگر۔۔۔ مگر اس نے کہا وہ آئے گا اور وہ سچ مچ آ گیا۔ "کیوں، کب، کیسے؟" قسم کے سوال ہی بے معنی تھے، بس وہ لوٹ آیا تھا اور سب کے لیے یہی کافی تھا۔ کہتے ہیں صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اسجد طارق وہ بھولا تھا جس کی شام پانچ برسوں میں ہوئی تھی اور اس طرح جا کر لوٹ آنے والوں کے پاس بہت سی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ مجبوری کی، بے بسی کی...... اپنی معصومیت کی ہر دلیل ان کی زنبیل میں ہر دم موجود رہتی ہے...... امیسی کے چکر میں پھنس گئے، کسی ناکردہ جرم کی سزا کے طور پر جیل میں رہے، روپوں کی کمی نے واپسی سے روکا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسجد طارق نے کسی ایسے بہانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، اس نے سب کے بیچ بیٹھ کر میرلین نامی لڑکی سے شادی اور پھر طلاق کا اعتراف کیا تھا اور وہ جو کچھ حاصل کرنے گیا تھا وہ حاصل کر کے ہی لوٹا تھا، یعنی بہت ڈھیر ساری دولت اور اس ملک کی نیشنلٹی۔ اس

...بات کو کھلی اور بے معنی تھی۔

"تمہیں چھوڑ دینے کے بعد میں خود بھی خوش نہیں رہ پایا، یقین کرو ان پانچ برسوں میں ہر قدم پر تمہیں چھوڑ دینے کا مجھے دکھ ہوا ہے، کئی بار چاہا کہ تم سے کانٹیکٹ کروں مگر شرمندگی ہر بار آڑے آتی رہی۔" اس [illegible] گمن میں تھی، جب وہ اس کے پاس آن رکا پھر معافی تلافی ہوئی، اپنی غلطی پر پشیمانی، ماں بہن کو شکر گزاری کے جذبات کا اظہار، اتنا عرصہ اس کا انتظار اتنی ستقامت سے کرنے پر تعریفیں جتلا دینے پر "حسن جہاں سوز" کی شان میں قصیدے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی بات پر ایمان لانا ہی نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے یقین آ ہی نہ رہا تھا مگر وہ بی بی اور میہ کے چہرے پر بکھری خوشی سے کوشش کے باوجود نظریں نہیں چرا پائی تھی۔ بالکل اتفاقی طور پر مما اور پاپا آئے تھے۔ وہ اسجد کی واپسی سے قطعی ناواقف تھے، اسجد نے ان سے معافی مانگ لی تھی اور رقم بھی لوٹا دی تھی۔ پتا نہیں انہوں نے معاف کیا تھا یا نہیں۔ بہرحال کتنی ہی دیر پاپا خاموشی سے اسے تکتے گئے تھے پھر اس کا سر تھپتھپا کر بولے تھے۔

"جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔" وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے اور پھر محض دو ہفتوں بعد اسجد طارق اس کے سامنے پھر سے سوالی بنا کھڑا تھا۔

"مجبور نہیں کروں گا میں تمہیں، بس اتنا کہوں گا کہ تم ہی میرا اول ہو اور تم ہی میرا آخر...... میں نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوا مگر مائدہ! آئی ریئلی لو یو...... ایسا لگتا ہے اب زندگی تمہارے بغیر بے معنی اور پھیکی ہے، ایک قدم بھی میں تمہارے بغیر نہیں چل سکوں گا۔ تمہیں اب بھی حق حاصل ہے، چاہو تو ہاتھ تھام لو ورنہ۔" اور اس ورنہ کے آگے کوئی دھونس یا زبردستی نہیں تھی، بس التجا ہی تھی۔

تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

چاہے جانے کی تمنا اسے یہاں تک لے آئی، گھر میں رونے کے لیے کونا کھدرا نہیں ملا تو سارا غم نہر میں بہا دیا۔

"میں اس اذیت کو نہیں بھول سکتی اسجد طارق! جو ان پانچ برسوں میں، میں نے برداشت کی ہے مگر پھر بھی میں تمہارا ساتھ دوں گی کیونکہ بی بی اور میہ کے چہروں پر موجود خوشی اور امید کی کرنوں کو میں نہیں نوچ سکتی کہ یہ سارے رشتے تو میرا مان ہیں، راہ کی رکاوٹ نہیں۔" افق پر پھیلتی سیاہی میں اس نے ایک مرتبہ پھر

فیصلہ کرلیا تھا، صرف یہی نہیں اپنا ہر ارمان، ہر خواب، ہر آرزو وہ اسی نہر کے پانی میں بہا آئی تھی...
فیصلہ تھا "اپنی زندگی کو اپنی مرضی" سے گزارنے کا وہ کہیں کھو گیا تھا یا اس نے دانستہ گنوا دیا تھا کہ...
بی اور مبیہ سے بڑھ کر اسے کوئی بھی عزیز نہ رہا تھا۔

+

وہ آخری بار کالج جا رہی تھی، اپنا ریزگنیشن دینے اور گیٹ پر کھڑے عباس کو دیکھ کر دل بھاگ...
کو چاہ رہا تھا۔

"کیسی ہو۔" وہی ہمیشہ کی سی دلفریب مسکراہٹ، مائدہ نے بڑی دقت سے سر ہلایا مگر نظر اٹھا کر...
آنکھوں میں جلتی قندیلوں کو بجھا دینے کے واسطے۔ عباس نے یکدم گردن موڑ کر دیکھا۔ وہی ہمیشہ...
سا حلیہ، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ اور وہی عام مگر بہت خاص سراپا۔

"کب آیا اسجد؟" اور اب کی بار مائدہ کا سر جھٹکے سے اٹھا تھا، اتنا غیر متوقع سوال تھا اور اتنا...
...... مائدہ کو اپنے سینے میں کہیں سانس کے اٹک جانے کا احساس ہوا تھا۔

"تمہیں مبیہ نے بتایا ہے۔" قیاس کو سوال میں ڈھالا گیا۔

"نہیں۔"

"تو پھر...... کس نے بتایا۔" اس کی آنکھوں میں استفہام سمٹ آیا اور تب فقط تب ہی عباس
نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں فقط استفہام ہی نہیں، استعجاب بھی تھا۔ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"تمہاری آنکھوں نے۔" عجیب بے بسی تھی۔ مائدہ کے اندر کوئی چیخ ابھری۔

"ک...... کب عباس...... تم نے کب میری آنکھوں کے رنگوں سے واقفیت حاصل کی؟"

"پتا نہیں کب مگر سب کچھ خود بہ خود ہی ہوتا چلا گیا۔" خاموش لبوں نے سرگوشی کی تھی جو کم...
نہیں سن پائی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پائی تھی اور عباس بتانا چاہتا تھا مگر بتا نہیں پایا تھا...
کبھی بھی اس کی آنکھوں کو پڑھ کر سمجھنا نہیں چاہا تھا مگر وہی نا کہ سب کچھ خود سے شروع ہو کر خود...
ہو گیا تھا۔

"میں چلتی ہوں عباس! ابھی تو اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" وہ کار بھگا لے گئی اور اگر...
ایسا نہ کیا ہوتا تو یقیناً ہار جاتی۔ ذہن میں مبیہ کے لفظ گھوم رہے تھے۔ "اب مجھے یقین ہو گیا ہے...
صرف میری ہی بھابی ہیں۔" صبح جب اسجد نے اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ لے کر ہونٹوں سے...
تبھی مبیہ نے کہا تھا۔ وہ تب خاموش رہی تھی مگر اسجد کا قہقہہ کافی دیر تک گونجتا رہا تھا۔

تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر

کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر
بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں
کسی دن اول کی لوح منتظر پر
اچانک رات اترے گی
میری بے نور آنکھوں کے خزانے میں چھپے
ہر خواب کی تکمیل کر دے گی
مجھے بھی خواب میں تبدیل کر دے گی
ایک ایسا خواب جس کے دامن صد چاک میں
کوئی روشن، مبارک دن نہیں ہوگا

وہ دور کر خود کو احساس نہیں دلانا چاہتی تھی کہ عباس مصطفیٰ اس کے لیے اہمیت رکھتا ہے اور جس نے اس
کے کار بڑھا دینے کے چند لمحوں بعد بڑی بے بسی اور غصے سے ہاتھ میں پکڑا پتھر دور فضا میں کسی ان دیکھے
ہدف کو دے مارا تھا۔ تیزی سے بھاگتی نسان جھٹکے سے رکی تھی اور اس نے نہایت تھک کر کر پشت سے ٹکا
کر آنکھیں موند لی تھیں۔ آنکھوں میں چھائی دھند کو بارش بننے میں لمحہ بھی نہیں لگا تھا اور اب وہ دھند اس کی
پلکوں پر لکیر چھوڑ رہی تھی۔ "آئی ایم سوری عباس...... پلیز مجھے معاف کر دینا۔" بند شیشوں میں اس کی روتی
ہچکی ابھر کر بکھری تھی۔ کسی بھی حقیقت سے نگاہ چرانا آسان نہیں ہوتا اور یہ حقیقت ہی تھی کہ عباس مصطفیٰ اس
کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

+

سارا سمندر خاموش تھا، کہیں کوئی بے چین لہر نہیں تھی، کہیں کوئی اضطراب نہیں تھا، بس ایک الجھی ہوئی
سی خاموشی تھی، مہیب سا سکوت تھا اور عین اس کی نگاہوں کے سامنے سورج آدھے سے زیادہ پانی
میں ڈوب چکا تھا۔ آج کراچی میں اس کی سترہویں شام تھی جو رات میں ڈوب رہی تھی۔ گھر میں اس کی
شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں، اگرچہ اس کی کچھ ایسی ضرورت نہیں تھی مگر دنیا والوں کو بھی تو بتانا تھا کہ
لمبے عرصے کے انتظار میں ہماری بیٹی نے اتنا عرصہ گزارا وہ لوٹ آیا ہے، اسے پورے عزت و مان کے ساتھ
لے جانے کے لیے۔ پاپا نے خاموشی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے ذہن میں بھی وہی

سوال کلبلا رہا ہے۔ کیا اسجد طارق اسے عزت دے سکے گا؟ وہ شخص جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا، کیا اب اسے وہی مان دے سکے گا جو اس کا حق ہے۔ ہر بار جب بھی وہ پاپا کے سامنے جاتی تو وہ اسے دیکھے جاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں پھر عباس مصطفیٰ تھا جس سے اس نے کوئی عہدو پیمان نہیں کیے تھے، ان دونوں کا ساتھ بھی بے حد مختصر تھا مگر پھر بھی کہیں کوئی خلش تھی، کوئی کسک جو اسے ہر روز نئے سرے سے اپنے حصار میں لے لیتی تھی۔ بی بی نے کہا تھا۔

''تم میری بیٹی نہیں ہو مگر یقین کرو مجھے میبہ سے بڑھ کر عزیز ہو۔ اسجد یہاں ہوتا تو بات دوسری تھی، پھر میں تمہیں کہیں بھی نہ جانے دیتی مگر مائدہ! جب خوشیاں دروازے پر کھڑی ہوں تو کسی اور کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ عباس بھی ان ہی خوشیوں کا حصہ ہے۔'' اب ہر چیز پس منظر میں کھو گئی تھی۔ پس منظر صرف اسجد طارق تھا اور بی بی کی خوشی۔ اسجد لوٹ آیا تھا تو پھر وہ کون سی خوشیوں کے لیے دروازے کھولتی۔ گھر آئی تو بی بی کی کال اس کی منتظر تھی۔

''بس بہت دن رہ لیا وہاں، اب لوٹ آؤ۔'' چھوٹتے ہی انہوں نے حکم دیا تھا۔ وہ بھلا کیا کہتی، خاموشی سے ریسیور پاپا کو تھما دیا۔ وہ بی بی سے کچھ خاص بات کرنا چاہ رہے تھے۔

''آپا! میں چاہ رہا تھا کہ رخصتی کی ڈیٹ طے کر لی جائے۔'' اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے پاپا کو کہتے سنا تھا اور کمرے میں پہنچنے تک اس کی آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔ ''کاش عباس مصطفیٰ تم میری زندگی میں آئے ہی نہ ہوتے۔'' اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ایسی تمنا کیوں کر رہی ہے۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ وہ اسجد کی منتظر تھی تو اب یہ بے کلی کیوں ہے۔ نجانے وہ کتنی دیر روتی رہی تھی پھر کتنے ہی چھینٹے منہ پر مارے مگر یہ پانی بھی سکون دینے سے قاصر تھا۔ مائرہ نے اسے کھانا کھانے کے لیے پکارا مگر اس نے انکار کر دیا پھر ساری رات گزر گئی۔ صبح کو اس نے چائے کے ایک کپ سے پیٹ بھر لیا۔ عجب خالی الذہنی سی کیفیت میں بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، محض سوچ کا رخ بدلنے کی غرض سے یوں ہی کوئی سی ڈی پلے کر دی تھی۔ فل والیوم میں جانے کون سا سنگر اپنا گلا پھاڑ رہا تھا جب دروازہ چرچرایا پھر کھٹ سے پلیئر آف ہوا۔ اتنا سکون چھایا تھا اور باہر کے سکون نے اندر ہلچل مچا دی تھی۔

''پیا!'' وہ ایک دم اٹھ بیٹھی، بند دروازے کے عین سامنے میبہ کھڑی تھی۔

''تم کب آئیں۔'' وہ اس کو گلے لگانا چاہتی تھی مگر میبہ نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور مائدہ کے باقی لفظ منہ میں ہی اٹک گئے۔

''کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو...... ہیں کیا آپ...... آخر...... آخر کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا۔'' مائدہ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

''کک...... کیا کیا ہے میں نے؟''

''ہاں، آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں۔'' وہ تمسخر سے ہنسی۔

''میبہ! کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم...... کیا بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں رہی۔''

''میں یہاں چھوٹوں یا بڑوں پر بحث کرنے نہیں آئی، صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ آپ اسجد بھائی کا ہاتھ کیوں جھٹک رہی ہیں؟'' اس کے تیور بڑے جارحانہ تھے۔

''میبہ!'' وہ بمشکل کہہ پائی۔

''کیا آپ بھول گئی ہیں پیا! کہ وہ آپ کو ٹھکرا کر چلے گئے تھے۔ کیا آپ کی کوئی عزت نفس باقی نہیں ہے۔ ذرا خود سوچیے اگر اسجد بھائی آپ کی جگہ ہوتے تو کیا وہ پھر سے آپ کا ہاتھ تھام لیتے، نہیں قطعاً نہیں۔'' مائدہ بھلا کیا کہتی دھپ سے بیڈ پر گر گئی۔ آنکھیں پھر سے بھر گئی تھیں۔

''میں نے تو صرف تمہاری اور بی بی کی وجہ سے......''

''میری اور بی بی کی وجہ سے۔'' میبہ جیسے تھک کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

''میں نے سچ ہی کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے اور آج پتا چل گیا کہ بی بی سے بھی نہیں ہے۔''

''یوں مت کہو میبہ!'' وہ روتی ہی جا رہی تھی۔

''اگر محبت ہوتی تو آپ ہمارے چہروں سے دل کا حال جان لیتیں، بالکل ویسے ہی جیسے ہم آپ کے دل کا حال جان گئے تھے۔'' مائدہ نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپانا چاہا مگر میبہ نے اس کی کلائیاں تھام لیں۔

''اسجد بھائی نے دولت کی خاطر اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ دیا۔ آپ نے ان کی ماں بہن کے لیے اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو......'' مائدہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کے ہر انداز میں تاسف ہی تاسف تھا۔

''تو کیا میں اور بی بی آپ کی خاطر اسجد بھائی کو نہیں چھوڑ سکتے؟'' وہ پوچھ رہی تھی اور مائدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، تب میبہ نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

''جو خوشی آپ کو عباس بھائی دے سکتے ہیں، وہ اسجد بھائی کبھی بھی نہ دے پاتے اور...... اور ہمیں کوئی دکھ نہیں ہے انہیں چھوڑ دینے کا۔ دولت ان کے لیے ہم سے زیادہ اہم ہے تو رہیں اسی کے ساتھ، ہمیں ان کی یا ان کی دولت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں اور بی بی صرف آپ سے محبت کرتے ہیں پیا! صرف آپ سے۔'' میبہ کی سسکیاں سارے کمرے میں گونج رہی تھیں، تب مائدہ نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیے۔ اب وہ دونوں رو رہی تھیں، حتیٰ کہ بادل چھٹ گئے اور آسمان صاف ہو گیا۔ ''آنسوؤں کا باقی اسٹاک سنبھال کر رکھیں ابھی تو عباس بھائی کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے بھی رونا ہے۔'' وہ مسکراتے

ہوئے الگ ہوئی اور شرارت سے کہا۔ مائدہ بھی مسکرا دی پھر چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اسجد کہاں ہے؟"

"وہیں لاہور میں ہی ہیں اور بی بی نے ان سے کہہ دیا ہے۔ چاہے تو واپس جا کر کسی میم کی بجائے شیرلین سے شادی کر لیں پر ہم اپنی مائدہ کو اس کے ساتھ نہیں بھیجیں گے اور اب آپ کمرے سے باہر نکلیں عائشہ آنٹی بھی آئی ہیں آپ کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے۔"

"کیا......" وہ دنگ رہ گئی تو میبہ زور سے ہنس دی۔

"جی جناب! سارے معاملات طے کرنے کے لیے ہی تو کل بی بی نے فون کیا تھا۔ شجاعت ماموں تو فوراً ہی مان گئے، اب اگر آپ بھی......"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اس نے بے اختیار ہی تیزی سے کہا پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ میبہ نے اسے پھر ساتھ لپٹا لیا۔

"مجھے پتا تھا۔" پھر کھڑی ہوتے ہوئی بولی۔ "اب اپنا بہترین سوٹ پہنیں، بال وال بنائیں اور باہر آ جائیں۔ آخر کو نند کا سامنا کرنا ہے۔" اس کا اشارہ عائشہ کی جانب تھا، وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔" میبہ سر ہلا کر باہر کی طرف بڑھی پھر رک کر پلٹی۔

"گھونچو مل بھی آیا ہے، وہ آپ سے برائیڈل ڈریس کا کلر پوچھے گا۔ پلیز میرون ہی کہیے گا۔" یہ اس کا پسندیدہ کلر تھا۔ مائدہ نے سعادت مندی سے سر ہلایا، وہ دروازے کی طرف جا کر پھر لوٹ آئی۔

"وہ آپ کے پاس میرون کاٹن کا سوٹ ہے نا...... سندھی کڑھائی والا...... ابھی وہی پہن لیں۔"

"اچھا...... اور کچھ۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ میبہ خجل سی ہو کر پلٹ گئی۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" مائدہ ہنسنے لگی۔ "ارے ایک بات تو بتائی ہی نہیں۔" اسے دروازے تک جا کر پھر کچھ یاد آیا۔

"اب کیا ہے؟"

"ہنستی رہا کریں پیا! بہت اچھی لگتی ہیں۔" اور اب کی بار وہ واقعی باہر نکل گئی۔ مائدہ بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ خوشیاں ابھی بھی اس کی منتظر تھیں اور وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی، تبھی وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔ میرون سوٹ بھی تو نکالنا تھا۔

ڈھل نہ جائے

"اس بارش کو بھی آج ہی برسنا تھا۔"

اس نے کوئی تیسری بار کھڑکی کے بلائنڈز ہٹا کر دیکھا تھا۔ ایک تواتر سے برستی بوندوں کی سرمئی چادر آسمان سے زمین تک تنی ہوئی تھی جس کے عقب سے خوبانی کے درختوں کا ہرا رنگ جھانک رہا تھا میلا میلا گدلا گدلا سا...... اسے لگا آسمان نے زمین سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے اور اسے اس رشتے سے چڑ تھی۔ آسمان تو پانی برسا کر اطمینان سے ہو جاتا جبکہ زمین پانی سے لت پت...... وہ اکتا کر بند مٹھی شیشے پر مارنے لگا۔ "تکان بیزاریت اور نیند......" ان تینوں چیزوں نے اس کے گرد ایک واضح حصار باندھ رکھا تھا۔

اس کے ہاتھ کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو ڈوری ہاتھ سے نکلتی چلی گئی بلائنڈز کے برابر ہونے کی خفیف آواز کمرے کی خاموشی میں مدغم ہوئی تھی وہ کچھ پل ریوالونگ چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے ادھر ادھر گھماتا رہا پھر ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں وہیں ٹک گیا۔

آج کا سارا دن ہی بے تحاشا مصروف گیا تھا۔ صبح جب ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی بلکہ مساجد میں اذان بھی ابھی بلند نہیں ہوئی تھی تب ڈاکٹر رضوی نے اسے فون کر کے ہاسپٹل آنے کا کہا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا کنوینس کے ذریعے ہاسپٹل پہنچا تھا کیونکہ اس کی کار تو ریپئرنگ کے سلسلے میں پچھلے ایک روز سے ورکشاپ کی زینت بنی ہوئی تھی۔

ہاسپٹل میں بڑا افراتفری کا سا عالم تھا۔ مری کے قریب برف باری دیکھنے آئے ہوئے بچوں کی بس کا حادثہ ہوا تھا۔ اگرچہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی زخمیوں کی تعداد خاصی تھی۔ ڈاکٹر رضوی کی نائٹ شفٹ تھی اور چونکہ ڈاکٹر صائم شہر سے باہر گئے ہوئے تھے تبھی انہوں نے اسے ایمرجنسی کال کی تھی۔ ہاسپٹل میں ان تینوں کے علاوہ چار مزید ڈاکٹرز موجود تھے جو پاکستان کے مختلف میڈیکل کالجز سے تھوڑے تھوڑے عرصے کے فرق سے پاس آؤٹ ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر شجاعت اور ڈاکٹر ثمن کی تو ڈاکٹر

رضوی کے ساتھ ہی نائیٹ ڈیوٹی تھی مگر اس کے باوجود ڈاکٹر رضوی نے اسے بلوالیا تھا گو کہ اس کا تجربہ ڈاکٹر رضوی سے زیادہ نہیں تھا مگر پچھلے سات آٹھ سال سے اس فیلڈ میں ہونے کی بناء پر اس کا نام خاصا معتبر تھا۔ پھر ایک کے بعد ایک زخمی کو ہینڈل کرتے خاصا وقت نکل گیا۔ ہاسپٹل کی ساری عمارت کراہوں اور سسکتی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ کچھ بچے واقعی تکلیف سے رو رہے تھے باقیوں کو خوف آہ وزاری کرنے پر مجبور کیے دے رہا تھا۔

شام کے چار بج جانے کے باوجود سارا اسٹاف خاصا مستعد اور چاک وچوبند تھا کیونکہ بہر حال ایک تو معاملے کی نوعیت سنگین تھی پھر اسود کی موجودگی میں یوں بھی سب مستعد رہتے تھے کہ بہر حال وہ اس ہاسپٹل کے مالک کا بیٹا تھا اور ان سے کئی گنا زیادہ سخت مزاج تھا۔ ذرا سی لاپرواہی یا بے احتیاطی اس کی طبع پر خاصی گراں گزرتی تھی کام کے معاملے میں وہ کسی قسم کی مروت یا لحاظ کا قائل نہ تھا۔

اور ابراہیم احمد آج کل کسی میڈیکل کنونشن کے سلسلے میں بیجنگ گئے ہوئے تھے تو ان کی غیر موجودگی میں وہی بگ باس تھا۔

اس حادثے کی وجہ سے سارے میں تھرتھری مچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز، نرسز اور وارڈ بوائز تک سب نے بھاگتے دوڑتے ناشتا، لنچ نمٹایا تھا جبکہ کچھ تو اب تک چائے کافی پر ہی قناعت کیے ہوئے تھے اور انہی میں ڈاکٹر رضوی بھی شامل تھے۔ کچھ مریضوں کو گھر روانہ کیا گیا جو شدید زخمی تھے انہیں ایڈمٹ کر لینے کے بعد اسود نے ڈاکٹر رضوی سے بھی گھر جا کر آرام کرنے کے لیے کہا۔ پچھلی پوری رات اور اب دن کے دوپہر تک بھی وہ مسلسل کام کر رہے تھے اسوہ کو وہ خاصے مضمحل لگے تھے۔

''ڈونٹ وری انکل! آپ چلے جایئے گھر...... یہاں کوئی ایمرجنسی ہوئی تو میں ہینڈل کرلوں گا۔'' انہیں معترض دیکھ کر اس نے زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ ڈاکٹر رضوی اس کے پاپا کے بہت اچھے دوست تھے اور اس ہاسپٹل کے معیار کو بلند کرنے میں ان کی بھی اتنی ہی کڑی محنت شامل تھی جتنی کہ ابراہیم احمد کی۔ اسود نے کارڈیالوجی میں اسپیشلائزیشن انہی کے کہنے پر کی تھی۔

''تمہیں تو آدھی رات کو جگایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ اچھا یوں کرتے ہیں کہ ہم وقت تقسیم کر لیتے ہیں میں سات بجے تک واپس آجاؤں گا پھر تم گھر چلے جانا۔'' انہوں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر اور کندھے ہلا دیے۔ یقیناً وہ زیادہ ہی تکان محسوس کر رہے تھے تبھی اتنی جلدی راضی ہو گئے تھے۔ پھر جس وقت وہ گئے تھے موسم اس قدر ابر آلود نہیں تھا بس آسمان کے کنارے پر ہلکا سرمئی سا دھواں چھایا ہوا تھا پھر کب یہ دھند لکا کالے سفید بادلوں میں ڈھل کر مینہ برسانے لگا پتا ہی نہ چلا۔ رات ڈھلنے سے پہلے تاریکی چھا گئی جبکہ ہاسپٹل کے پچھلی جانب موجود خوبانیوں کا باغ سیاہی اور پانی کی چادر کے عقب میں گم ہو گیا اور اسے بارش سے سخت چڑ تھی۔

وہ کچھ دیر اسٹیتھو سکوپ سے کھیلتا رہا کچھ بلڈ پی آپریشن سے بھی دل بہلایا۔ پھر پیون کو اسٹرونگ سی کافی لانے کا کہہ کر وہ پیپر ویٹ گھمانے لگا۔ کافی آنے تک وہ اس کام سے بھی بیزار ہو چکا تھا۔ نرم سی گرم جوش بستر کی گود میں اپنے بستر کی خواہش کچھ اور شدت سے ابھر رہی تھی۔

اس نے کافی کے دو بڑے سپ لیے اور دونوں انگلیاں ملا کر پیشانی مسلتے ہوئے کسی قدر نیند کو بھگانے کی کوشش کی لیکن سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا پلکیں خود بخود آپس میں لپٹے جا رہی تھیں۔ اور ابھی تو وہ غالباً پوری طرح سے غافل بھی نہ ہو پایا تھا جب ایک نسوانی آواز نے اس کے اعصاب جھنجھوڑا۔ اس کے حواس زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہوئے تھے۔

''سر آپ ابھی تک گئے نہیں؟''

اس نے بڑے غیر محسوس سے انداز میں اپنی نشست درست کرتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر علینہ حیرانی اور قدرے تشویش سے اس کی جانب استفہامی انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کو کوئی کام تھا؟'' اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اسود نے پوچھا۔ علینہ اندر تک بدمزہ ہوئی۔ ''اس شخص کی شکل اور پرسنیلٹی کتنی اچھی ہے ذرا مسکرا کر تھوڑی نرمی سے بات کر لیا کرے تو بھلا کون سی قیامت ٹوٹ پڑے۔''

اس شاندار پرسنیلٹی والے بگ باس کو دیکھتے ہوئے علینہ نے بدمزگی سے سوچا تھا۔

''ڈاکٹر علینہ۔'' اسود نے اس کی خاموشی کو تحیر سے نوٹ کرتے ہوئے اسے پکارا۔

''سر وہ آپ کے آفس سے میں ڈاکٹر رضوی کو فون کرنے آئی تھی۔ دراصل بارش کی وجہ سے باقی ٹیلی فون کنکشن میں کچھ ڈسٹربنس سی ہے۔''

''اتنی بارش میں تو ڈاکٹر رضوی شاید نہ آسکیں۔'' اپنی نیند سے لبالب بھری آنکھوں کو ذرا سا مسلتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔

''لیکن بارش تو اب خاصی ہلکی ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر رضوی کا آنا بہت ضروری ہے سر! ایکچوئلی ایک ایمرجنسی کیس ہے۔ کوئی ہزبینڈ اینڈ وائف ہیں لڑکی کو تو نسبتاً معمولی چوٹیں آئی ہیں البتہ آدمی کی حالت خاصی تشویشناک ہے۔''

علینہ نے خاصی تفصیل سے بتایا اور یہ تو ہر سال ہی ہوتا تھا کہ ان دنوں میں حادثات کی شرح معمول سے بڑھ جاتی تھی۔

اسود نے چند لمحے سوچا اور کافی کا آخری سپ حلق میں اتارتا کھڑا ہو گیا۔

''آپ چلیے میں دیکھتا ہوں۔''

اس آدمی کی حالت واقعی خاصی خراب تھی۔

اس کے سر سے بے تحاشا خون رس رہا تھا۔ دائیں ٹانگ کا گھٹنا بھی شدید زخمی تھا۔ اس کے علاوہ اندرونی چوٹیں شدید تھیں اور انہی اندرونی زخموں کی وجہ سے اس کی حالت مزید خراب ہوتی جا رہی تھی کہ جب تک اسے آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا ڈاکٹر رضوی بھی آ گئے۔ وہ انہیں تفصیلات بتا کر جب باہر نکل رہا تھا۔ کوریڈور کے دوسری طرف کھڑی اس شخص کی بیوی بڑی بیتابی سے ان دونوں کی طرف آئی تھی۔

اسود نے نظر اٹھائی اور پھر جیسے نظر نے پلٹنے سے انکار کر دیا۔

اس چہرے کو وہ بخوبی پہچان سکتا تھا۔

ذہانت سے چمکتی آنکھوں میں پہلے تحیر بغیر پتوار کی کشتی کی طرح ڈولا تھا مگر دوسرے ہی پل کشتی غائب ہوئی۔ وہاں صرف سمندر رہ گیا جس کی سطح پر غصے اور سرد مہری کی لہریں زور زور سے سر پٹخ رہی تھیں۔

اسود نے اس کے چہرے پر بھی پہلے حیرانی اور پھر بے بسی کو ابھرتے دیکھا تھا۔ اسے اس کے بھیگے بالوں، بھیگے لباس، روئی ہوئی آنکھوں، بینڈیج شدہ متفکر چہرے، حیرانی اور بے بسی پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ اس کی پیشانی پر کئی بل نمودار ہوئے تھے جبکہ خود کو کچھ بھی کہنے سے روکنے کے لیے اس نے جبڑے بھینچ لیے تھے۔

اگلے ہی لمحے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کیبن میں آ گیا تھا۔

اسے اپنا آپ بھڑ بھڑ جلتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک الاؤ آتش دان میں جل رہا تھا جبکہ ایک الاؤ اس کے اندر سلگنے لگا تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک رگ پھڑک رہی تھی غصے کی حالت میں اس کی یہ رگ ہمیشہ نمایاں ہوتی تھی۔

وہ آتش دان کے الاؤ سے اٹھتی لال لال چنگاریوں کو دیکھ رہا تھا جب عقب میں دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"سر جس پیشنٹ کو ابھی لایا گیا ہے اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے ہاسپٹل کے بلڈ بینک میں اس بلڈ گروپ کا سیمپل موجود نہیں ہے ڈاکٹر رضوی کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ......"

"ڈاکٹر رضوی سے کہو میں نے ڈیڑھ ماہ پہلے ہی بلڈ ڈونیٹ کیا ہے۔ اس لیے ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔"

اس نے بڑی بے حسی سے جھوٹ بولا اسے بلڈ ڈونیٹ کیے کم و بیش چار ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر......

آنے والا اس کا جواب سن کر واپس چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آن رکا۔ ڈوری کھینچی۔ ایک آواز کے ساتھ بلائنڈز زاویہ پر کو سمٹ گئے۔ باہر کی تاریکی اور اندر کی دودھیا روشنی کے درمیان گلاس وال حائل تھی۔ ہوا میں تندی آ چکی تھی۔ بارش پھر سے برسنا شروع ہو چکی تھی۔ غضبناک ہوا کے ساتھ بارش کے قطرے پتھروں کی طرح گلاس وال سے ٹکراتے اور بنا اسے نقصان پہنچائے نامحسوس سی لکیر چھوڑ کر نیچے ڈھلکتے

اس کی پیشانی پر کئی لکیریں تھیں۔ دل میں خفگی جبکہ کنپٹی کی رگ نمایاں تھی اور نگاہیں دور اس تاریکی میں کسی غیر متعین محور پر ٹکی تھیں، اس کے اردگرد نیند جاگ رہی تھی۔

جبکہ نیم گرم کاریڈور میں وہ آئی سی یو کے شیشے کے پاس کھڑی تھی پھر اس نے گردن موڑ کر اس سمت دیکھا جہاں اس نے اسود کو جاتے دیکھا تھا۔

"کیا زندگی کے اس مقام پر اسود ابراہیم سے ملاقات ہونا ضروری تھی۔"

اس نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اس نے آنسو روکنے کی تگ و دو کرتے ہوئے respirator کے ذریعے سانس لیتے وجود کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے آنسو ٹوٹے ہوئے بند والی ندی کے تیز بہاؤ کی طرح بہہ نکلے تھے۔

✦

آسمان کا رنگ بدل چکا تھا۔ رات بھر بارش برسا کر بادل ہلکے پھلکے سے ہو گئے تھے۔ البتہ سرمئی رنگ کی بھینی سی چادر اب بھی سورج کی کرنوں کو زمین تک آنے کا رستہ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دیکھا لان کے وسیع و عریض احاطے میں گھاس پر کہرا جما ہوا تھا۔ اس ہاسپٹل کی بلڈنگ چار اطراف میں بنی ہوئی تھی۔ جو فن تعمیر کا بہترین نمونہ پیش کرتے اس ہاسپٹل پر مکمل طور پر سفید پینٹ کیا گیا تھا۔ لان میں پودوں کی نمائش ترتیب و تزئین بھی شاندار تھی کونوں میں پیلے، نارنجی اور سرخ پھولوں کی لمبی لمبی ٹہنیوں کے ساتھ گملوں کے پودے لگائے گئے تھے۔ عین وسط میں چنار کا بڑا سا درخت تھا جس کے چاروں طرف سرخ و سفید للی کی کیاریاں موجود تھیں۔ کاریڈور سے لان کو متصل کرنے والی سیڑھیوں کے اطراف میں موتیا کے جھاڑ تھے۔ وہ لان کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی کاریڈور کی بے تحاشا ٹھنڈی سیڑھیوں میں بیٹھی بڑی عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔

داؤد حسن کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ اب خطرے سے باہر تھا مگر بیہوشی کی حالت میں تھا۔

ساری رات اس نے آئی سی یو کے باہر خدا سے منتیں مانتے گزاری تھی۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں بھی خدا کو اتنا نہیں پکارا تھا جتنا کہ اس ایک رات میں پکارا تھا۔ اس نے ساری زندگی اتنی دعائیں نہیں کی تھیں جتنی اس رات کی تھیں۔

وہ ٹراؤزر اور جیکٹ میں ملبوس لڑکی خدا سے شکرانے کے نوافل ادا کرنے کا عہد کرتی رہی تھی مگر شرط تھی بس ایک شرط..... داؤد حسن کی زندگی۔

''اگر داؤد حسن کو کچھ ہو گیا تو......؟''

''سب اسے موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔''

''وہ کیسے سب کو یقین دلائے گی کہ اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔''

''یہ تو بس...... یہ تو بس ایک حادثہ تھا۔ مگر شاید وہ کسی کو بھی یقین نہ دلا پائے۔''

یہ سوال، یہ اندیشے بڑی بڑی کالی چمگادڑوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتے رہے...... اسے ڈراتے رہے تھے۔

پھر نجانے اس کی دعائیں مستجاب ہوئی تھیں یا داؤد حسن اپنے کھاتے میں زندگی کے کچھ مزید سال لکھوا کر لایا تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ ''موت کا فرشتہ'' ان دونوں کے سرہانے آ کر پلٹ گیا ہے۔

وہ مصیبت کے ٹلنے پر بھی رونے لگی ایک نظر داؤد حسن کے پٹیوں میں لپٹے چہرے کو دیکھ کر پلٹی تو نرس نے اس سے کہا۔

''آپ یہاں ہیٹر کے پاس آ جائیں۔'' اور وہ ہیٹر کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ شاید نرس اس کے وہ بھیگے کپڑے دیکھ چکی تھی جن کی اسے پروا نہیں تھی۔ ہیٹر کی تپش میں کچھ بدن میں حرارت اتری تو معطل حواس چونکنے لگے۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی سات سے کچھ پہلے کا ہی وقت تھا اسے پہلا خیال مہوش کا ہی آیا تھا وہ خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

ریسیپشن پر موجود کرخت چہرے والی ریسپشنسٹ سے اجازت لے کر اس نے کال ملائی۔ پہلی ہی بیل پر فون بڑی عجلت میں اٹھایا گیا تھا۔

''مہوش...... میں فارحہ......'' بڑی گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔

''فری! تم...... تم ہو کہاں؟ جانتی ہو، ہم سب کتنے پریشان ہیں۔'' مہوش کی بے حد پریشان آواز سنتے ہی اس کے سینے سے سسکیاں برآمد ہوئی تھیں۔ جنہیں روکنے کے لیے اس نے بڑی مضبوطی سے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ البتہ آنسو بڑی روانی سے بہہ نکلے تھے۔

''اوہ میرے خدا...... تم...... تم رو رہی ہو نا فری۔'' اس نے جیسے اندازہ لگایا جبکہ فارحہ کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگی تھی۔

''رونا تو بند کرو احمق لڑکی...... مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟'' اس کی آواز میں سراسیمگی تھی۔

''فارحہ...... فری پلیز رونا بند کرو...... اس طرح تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا...... اچھا یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو؟''

''ہاسپٹل میں۔''

''واٹ...... ہاسپٹل؟'' فارحہ کی آواز مشکل سے نکلی تھی جبکہ مہوش کی آواز بند ہی ہو گئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نا فری۔'' کچھ دیر بعد اس نے متفکر سے لہجے میں پوچھا۔ جواب میں فارحہ ساری بات بتانے لگی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی تھی...... وہ تو پوری احتیاط سے ڈرائیو کر رہی تھی ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیئرنگ کو قابو کیے ہوئے تھے...... پھر نجانے کہاں سے ایک بڑا سا ٹرک کار کے درمیان آ گیا اور...... گاڑی ایک درخت سے جا ٹکرائی......

اس کے آنسو ڈیسک پر گر رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سر پر رکھے سسک رہی تھی۔ پھر اس نے گال پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

''سچ مہوش...... میں نے جان بوجھ کر داؤد حسن کے ساتھ ایسا نہیں کیا وہ......''

''داؤد حسن...... وہ اب کیسا ہے؟''

''تھینک گاڈ۔'' فارحہ کا تسلی آمیز جواب سن کر اس نے بے اختیار کہا تھا۔

''اچھا تم ہو کہاں...... میرا مطلب مجھے ہاسپٹل کا نام بتاؤ؟''

''ہاسپٹل کا نام......'' اس نے متلاشی نظروں سے ریسیپشن کے عقب میں اس کرخت چہرے والی ریسپشنسٹ کو دیکھا۔ نجانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ''مہوش! ہاسپٹل کا نام تو مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے بے چارگی سے کہا اور اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی ایک مضبوط ہاتھ نے اس سے ریسیور لے لیا تھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا مگر حیرت یکدم ختم ہو گئی۔

دراز قد، مضبوط جسم، سیاہ شرٹ اور سیاہ ہی جینز، وائٹ اوور آل، گلے میں اسٹیتھو سکوپ اور ریم لیس فریم کا چشمہ...... وہ تفصیل سے ہاسپٹل کا نام، مقام سمجھا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر وہی ازلی تدبر سجا تھا۔ ظاہری شخصیت میں تو صرف اس فریم کی تبدیلی آئی تھی پہلے وہ براؤن فریم والا چشمہ استعمال کرتا تھا۔ یہ تبدیلی اتنی بڑی نہیں تھی مگر کچھ تو تھا...... کچھ ایسا جو بہت زیادہ تبدیل ہوا تھا۔

اسود نے بات مکمل کر کے ریسیور اسے تھمایا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے فارحہ پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ فارحہ وہاں دیکھے گئی پھر جیسے چونک کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

مہوش اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

''ممی اور ہارون بس ابھی پہنچ رہے ہیں تمہیں بالکل بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اور پھر وہ واقعی فکرمند نہیں ہوئی۔ لیکن وہ خود کو حد درجہ بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اور یہ واقعی ضروری بھی تھا کہ زندگی کے اس مقام پر وہ ایک بار پھر اسود ابراہیم کا سامنا کرتی مگر یہ نہایت غیر ضروری بات، زندگی کا بے حد ضروری لمحہ بن کر خود بخود اس کے سامنے آن رکی تھی۔ جس کا نہ صرف اسے سامنا کرنا تھا بلکہ پورے حوصلے کے ساتھ مقابلہ بھی کرنا تھا۔

چنار کے بلند پھننگنے سے اتر کر سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے اردگرد بکھر گیا تھا۔ اس نے ٹھٹھرتے پوروں کے ساتھ ناک کو ہولے سے مسلا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر چہرے پر آئے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسنے لگی اس کے پاس فی الوقت ربر بینڈ یا کیچر وغیرہ جیسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اپنے بالوں کو قید کر سکتی۔ بارش کے پانی اور سرد ہواؤں کے پے در پے تھپیڑوں کی وجہ سے اس کے بال خاصے روکھے ہو رہے تھے اور حالت ابتر ہو رہی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی جب اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا پھر کھنکھارنے کی آواز پر اس نے سر اٹھایا مگر پھر جھکا لیا۔

اسود اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا اور ہاتھ میں پکڑی ڈش میں سے ایک مگ اٹھا کر ڈش اس کی طرف بڑھا دی تھی جسے اس نے بنا کسی تردد کے تھام لیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کئی کاش سر ابھارنے لگے تھے جن میں ''کاش اسود، رات کی طرح اجنبی ہی رہتا۔'' اول الذکر تھا۔

وہ رات کا منظر نہیں بھلا پائی تھی۔ اتنی اجنبیت و سرد مہری تو اس سے پہلی ملاقات میں بھی نہ تھی مگر پھر اس نے بڑے دکھ سے خود کو تسلی دے دی تھی کہ اسے تو فارحہ افتخار کا نام بھی یاد نہیں ہوگا۔

اور ٹھیک ہی تو ہے ایسے لوگ بھلا کب یاد رکھتے ہیں کہ کس کا کیا نام تھا کس سے کس وقت کیا کہا تھا اور یہ تو سامنے والے کی سمجھ بوجھ پر منحصر تھا کہ وہ اس ''کس'' اور ''کیا'' سے کیا مطلب اخذ کرتے ہیں۔

''کیسی ہو فارحہ؟'' (اوہ) اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا پھر خود ہی بولا۔ ''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو پائے گی اور وہ بھی اس سچویشن میں...... خیر تمہیں پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے وہ اب خطرے سے بالکل باہر ہے۔''

فارحہ کل رات اس کی اجنبیت دیکھ کر حیران ہوئی تھی جبکہ اب...... اجنبیت کا تو جیسے کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس کی آواز، اس کے انداز اس کی آنکھوں میں وہی اپنا پن جھلک رہا تھا۔ فارحہ کو یونہی گمان سا گزرا کہ شاید ان کے درمیان یہ ساڑھے پانچ سال آئے بنا ہی گزر گئے تھے۔

''اور یہ میں تمہارے کھانے کے لیے لایا ہوں صرف دیکھنے کے لیے نہیں۔''

وہ کچھ ڈپٹ کر ڈش کی طرف اشارہ کر کے بولا تھا جس میں ٹرانسپیرنٹ پیکٹ میں لپٹا ایک سینڈوچ ایک بسکٹ کا ہاف رول اور کافی کا مگ رکھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سینڈوچ کھانے لگی۔

''مجھے لگ رہا ہے عنقریب تمہارے لیے بھی مجھے اس ہاسپٹل میں ایک بیڈ مخصوص کرنا پڑے گا۔ ذرا آئینے میں شکل دیکھو اپنی۔ کبھی انڈے کی زردی دیکھی ہے؟ بلیو می بالکل ویسی ہی رنگت ہو رہی ہے تمہاری ...... اچھا ایک بات بتاؤ فارحہ! تم کھانا وانا بھی کھاتی ہو یا صرف سونگھ کر گزارہ کر لیتی ہو؟''

وہ بڑی سنجیدگی سے استفسار کر رہا تھا مگر اس کے لہجے میں رچا تبسم اور اسے چڑانے والی مخصوص اپنائیت اور خلوص کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ پہلے بھی یونہی بات کیا کرتا تھا۔ وہ اب بھی [illegible] کر رہا تھا۔ گویا یہ کل بھی اس کی فطرت کا خاصہ تھا اور آج بھی......

''[illegible] اس عرصے میں...... تم نے کبھی مجھے یاد کیا؟''

[illegible] پوری رغبت سے سینڈوچ کھاتے ہوئے اس نے یہ سوال کر کے خود کو ہی حیران کر دیا تھا۔ [illegible] شرمندہ بھی ہوئی تھی شاید اسی لیے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی مگر سماعت دل و جان [illegible] جواب سننے کی منتظر تھی حالانکہ اسے اسود کا حال احوال دریافت کرنا چاہیے تھا۔

''سچ بتاؤ ناں فارحہ؟''

فارحہ نے نوالہ چبانا روک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل من پسند جواب سننے کے لیے بے تاب تھا۔ اسود [illegible] کہنیاں ٹکائے نچلا لب دانتوں تلے دبائے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں [illegible] لی کو دیکھ رہی تھیں جبکہ فارحہ کی نگاہیں اسے......

''میں نے تمہیں کبھی یاد نہیں کیا۔ انفیکٹ زندگی اتنی ہیکٹک ہو گئی تھی بلکہ ہے کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ [illegible] یاد کرتے۔'' اس کی مسکراہٹ میں کسی قدر شرمندگی بھی تھی۔ وہ جھینپے ہوئے لیکن صاف گو انداز [illegible] بول رہا تھا۔ فارحہ کے سینے سے ایک قیدی سانس آزاد ہوئی تھی۔ اس کے لبوں نے اپنے خوش فہم دل [illegible] اڑائی تھی۔ اس نے اگلا نوالہ لیتے ہوئے خود کو کمپوز کیا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہی تھی۔

''یہ جو اکیسویں صدی ہے نا! اس نے انسان کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا فرصت تو سمجھو غائب ہی ہو گئی [illegible] زندگیوں سے۔''

''کم آن اسود! اب کم سے کم اس بے چاری سی مسکین سی اکیسویں صدی کو تو الزام مت دو ساری دنیا [illegible] کام کر رہی ہے۔ اپنی لاپرواہی سے جو کام نہیں ہو پاتے اسے اکیسویں صدی کے زمرے میں ڈال کر [illegible] الذمہ ہو جاتی ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اسی اکیسویں صدی میں سے فرصت کے لمحے نکال کر دوستوں کو یاد [illegible] لیتے ہیں بس تم نہیں کر پائے تو اور بات ہے۔'' اس نے آرام سے اسود پر چوٹ کی تھی۔

''اچھا تو وہ بہت سے......'' وہ رکا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس عرصے میں تم نے کئی بار مجھے یاد [illegible]''

''[illegible] تو نہیں البتہ یاد ضرور کیا تھا۔'' اس نے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

''تو اس میں نہ تمہارا کمال ہے اور نہ ہی اکیسویں صدی کا۔ اصل میں میری شخصیت ہی ایسی ہے کہ [illegible] چاہ کر بھی مجھے بھول نہیں پاتے۔'' فارحہ کا منہ کھلا رہ گیا اسود کا انداز تو ایسا نہیں تھا کہ جس سے یہ [illegible] جتا رہا ہے مگر اگلے ہی پل اس کے اعصاب کچھ جھنجھنا سے گئے تھے۔

[illegible] اس نے ایک ترچھی سی نظر اسود پر ڈالی۔

"تم آج بھی اتنے ہی خوش فہم ہو جتنا کہ پہلے تھے۔" وہ اپنی پرانی ٹون میں بولی۔

"اور تم آج بھی گرامر میں اتنی ہی غلطیاں کرتی ہو جتنی کہ پہلے کرتی تھیں۔" فارحہ کے طنز کے جواب میں اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا وہ تیزی سے نظر کا زاویہ بدل کر کافی کے بڑے بڑے سپ لینے لگی۔

"بہر حال درست فقرہ کچھ یوں ہوتا کہ اسود تم آج بھی اتنے ہی خود آگاہ ہو جتنا کہ پہلے تھے۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"میرے فقرے کی درستی کا اندازہ تم اپنے اسی بیان سے لگا سکتے ہو۔"

اسود ہنسنے لگا تھا وہ بھی مسکرادی پھر جب وہ ہاف رول کھول رہی تھی۔ اس نے اسود کو اپنی جیبیں ٹٹولتے دیکھا تھا پھر جو چیز اس نے برآمد کی اسے دیکھ کر فارحہ کو دھچکا لگا تھا۔

وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ فارحہ نے ناگواری سے اسے کش لگاتے دیکھا۔

"تم تو چائے کافی تک کو نشہ کہا کرتے تھے۔" وہ ہاتھ سے دھواں اڑا رہی تھی۔

"اب بھی کہتا ہوں۔"

"تو یہ کیا ہے؟"

"یہ سگریٹ ہے۔" اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان سگریٹ پکڑ کر گویا اطلاع بہم پہنچائی۔ ساتھ ہی اسے یوں دیکھا گویا اس کے شناخت نہ کرنے پر متعجب ہو۔

"مجھے بھی نظر آتا ہے مگر اسود مت پیا کرو نری لعنت ہے یہ۔"

"ایک ڈاکٹر کو مت سمجھاؤ۔"

"ڈاکٹر خود نہ سمجھے تو پھر بھی......" اس نے ناگواری سے سگریٹ اس کے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا۔ بے اختیاری میں وہ استحقاق جتا گئی تھی اور آنے والے لمحے میں یہ استحقاق اسے خاصا مہنگا پڑا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ سگریٹ بجھاتی اس کی کلائی اسود کے مضبوط ہاتھ میں قید ہو گئی تھی۔

"میری بیوی کی طرح بی ہیو مت کرو فارحہ۔" اس نے سگریٹ لے کر اس کی کلائی زور سے پرے دھکیل دی۔

"میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی دوسرے کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔" اس کا لہجہ بے حد درشت اور سرد تھا۔

فارحہ سن سی رہ گئی۔ دوسرے پل سبکی کے شدید ترین احساس نے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"آئی ایم سوری! مجھے اس طرح سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تمہیں ایکسکیوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے دراصل میں ہی......" وہ کہہ نہیں پایا کہ اس کی طبیعت

ـال کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ وہ بات بے بات بھڑک اٹھتا ہے۔" "آئی ایم سوری فارحہ!" بہر حال اس

ـلہ۔ "دراصل ایمن بھی مجھے ٹوکتی رہتی ہے تو مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"ایمن؟"

ـہ مسکرانے لگا تھا۔ "میری بیوی۔"

"اوہ۔" فارحہ کے لبوں سے سسکی نما آواز نکلی تھی۔ اس نے رخ پھیر لیا۔ لب کاٹتے ہوئے آنکھیں ـرے جھپک کر نمی چھپانے کی سعی کی تھی۔

یہ کوئی انہونی بات تو نہ تھی یا اسود پہلا شخص تو نہیں تھا جس نے شادی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ہونا ہی تھا مگر فارحہ کے دل کو جیسے کسی نے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو کب کی تم نے شادی؟" اس نے خوشگواری سے پوچھا مصنوعی خوشگواری

"لاسٹ منتھ پورے چار سال ہو گئے۔ ہماری ایک بیٹی بھی ہے ڈھائی سال کی ثمن۔" اس نے اپنی ـذکر بڑے پیار سے کیا تھا۔

"پھر تو ڈبل مبارک اور ڈبل ہی ٹریٹ کا بندوبست بھی کر لو۔"

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان بہت کچھ خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی فیلنگز چھپانا سیکھ گئی تھی ـے اس چیز پر ملکہ حاصل ہو چکا تھا ورنہ یہی اسود ابراہیم اس کے چہرے کو کھلی کتاب سے تشبیہ دیا کرتا

وہ مسکرا رہی تھی کھل کر اور اسود بھی مثبت سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بیٹھا تھا۔

"تم بے مروت ہو۔ یہ تو مجھے معلوم تھا مگر اس قدر بے مروت ہو گے یہ اندازہ قطعاً نہیں تھا۔ کم سے کم ـادی کے کسی ایک آدھ فنکشن پر ہی انوائیٹ کر لیتے۔ مانا کہ تمہیں کبھی بھی دوستوں کی پروا نہیں رہی مگر ـگی کے اس اہم موڑ پر انسان کو اپنے دوستوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔"

"بہت خوب۔" اسود نے بھنویں اچکا کر طنزیہ نگاہ سے اسے دیکھا اور خفگی سے بولا۔ "شکوہ تو یوں کیا جا ـا ہے جیسے جاتے ہوئے تم مجھے اپنا پورا ایڈریس دے گئی تھیں۔ ایڈریس تو در کنار تمہیں تو خدا حافظ کہنے کی ـوفیق بھی نہ ہوئی۔ میں تو کئی دن اسی کنفیوژن میں رہا کہ اصل میں تمہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا اور چلو ـقول تمہارے پیدائشی بے مروت ہوں مگر تمہاری مروت نے تو مجھے بے حد امپریس کر دیا ہے فارحہ!"

"اچھا وہ کیسے؟" اس نے متبسم لہجے میں دلچسپی سے پوچھا۔

"اپنی شادی کے تینوں فنکشنز میں انوائیٹ کر کے۔" وہ جل کر بولا جبکہ فارحہ کے لبوں سے مسکراہٹ گم

ہوئی تھی۔ اس قدر ٹھنڈ میں بھی اس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔

''تمہارے پاس تو میرے کانٹیکٹ نمبرز موجود تھے بلا نہیں سکتی تھیں......''

''وہ دراصل سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں کسی کو بھی نہیں بلا پائی۔''

گردن موڑ کر اس نے نظریں موتیا کے پودے پر ٹکا دیں۔ پتے ہوا سے لرز رہے تھے جبکہ اپنی آواز کی لرزش کو اس نے خود ہی محسوس کیا تھا۔

''اس بات پر تمہیں معاف کیا لیکن ٹریٹ بہر حال ڈیو ہے تم پر۔ داؤد حسن صحت یاب ہو جائیں تو پھر ہی میں تم سے ٹریٹ وصول کروں گا۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ فارحہ نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ البتہ اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اپنی ہی سوچ میں مگن وہ اس ماحول سے کچھ دیر کے لیے کٹ گئی تھی۔ بادلوں کی مہین چادر میں چھید کیے سورج کی سنہری کرنیں لان میں ٹپکنے لگی تھیں۔

اسود کے زور سے پکارنے پر وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

اسود اسے دیکھتا رہا پھر دھیمے سے بولا۔

''داؤد کے بارے میں سوچ رہی ہو؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس کا سر ہولے سے تھپتھپا کر بولا۔

''میں نے کہا نا کہ وہ ٹھیک ہے بس ابھی ٹرینکولائزرز کے زیر اثر ہے اور یہ بھی صرف اس لیے کہ تکلیف کا اثر نہ لے پائے۔'' فارحہ نے سر جھکا کر اس کی تسلی بھری باتیں سنی تھیں پھر اس کے ایکسیڈنٹ سے متعلق استفسار کرنے پر وہ تفصیل بتانے لگی کہ کیسے اس کا ہاتھ پھسل گیا...... گاڑی درخت سے ٹکرائی اور......

''میرا تو صرف سر ہی اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تھا لیکن داؤد کی طرف کا دروازہ کھل گیا اور وہ کھائی میں گر گئے۔ شکر ہے کہ کھائی زیادہ گہری نہیں تھی۔ وہاں سڑک پر موجود لوگوں کی مدد سے میں نے داؤد کو کار میں ڈالا اور یہاں لے آئی۔''

وہ کچھ پل خاموش رہا پھر گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''ہاسپٹل کے ساتھ ہی فی میل ڈاکٹرز اور نرسز کے لیے ایک ہاسٹل ہے تم کچھ دیر وہاں آرام کر لو۔''

''نہیں شکریہ! میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔'' اس نے سبھاؤ سے منع کر دیا۔ اسود کو وارڈ کے راؤنڈ کے لیے جانا تھا۔ فارحہ وہیں بیٹھی رہی اسے اپنے دل میں بڑا خالی پن محسوس ہوا تھا۔

بھرم قائم رکھنے کے لیے کچھ جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

بادلوں کے چھدرے پن میں اضافہ ہو گیا تھا اور دھوپ تیزی سے ہر طرف قبضہ جما رہی تھی اور وہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی۔

اصل میں ہوا کیا تھا؟

+

ثنا اسے بی ۳۶ لے جانے کا وعدہ کر کے حفیظ سینٹر لائی تھی اس کے لیپ ٹاپ میں وائرس آ گیا تھا وہ تنہا جانے میں ہچکچا رہی تھی۔ چاہے سو منتوں کے بعد ہی مگر فارحہ اس کے ساتھ آنے پر راضی ہو گئی تھی۔ وائرس ریموو کروانے اور چند دیگر کاموں میں انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔ پھر جب وہ باہر نکلیں تو آسمان کروٹ لے کر رنگ بدل چکا تھا۔

''ایسے اچھے موسم میں ہاسٹل کے کمرے میں جا کر جل مرنا حماقت ہی ہو گی۔'' ثنا نے دھیمے سروں میں کہا۔ ہوا سے مچلتے اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''میرا اس سڑک پر جلنے مرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' ثنا نے بس پل بھر کو سوچا پھر اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے آگے چلنے لگی۔

''اب کہاں۔'' اس کے استفسار پر ثنا نے کندھے اچکا دیے۔

''جہاں قسمت لے چلے۔''

''میری طرف سے تم قسمت کے ساتھ جاؤ یا بد قسمت کے ساتھ بس اتنا یاد رکھو کہ میں اب ڈبل کی بجائے ٹرپل آئس کریم کھاؤں گی۔''

''منظور۔'' ثنا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور قریبی شاپنگ سنٹر میں گھس گئی۔ گھسی تو دونوں اتفاقاً تھیں مگر اندر جا کر ثنا کو اپنی بہنیں یاد آ گئیں جبکہ فارحہ کو تحریم...... چند روز میں اس کی منگنی کی تقریب متوقع تھی اور وہ اس کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ لینا چاہ رہی تھی مگر بہت تلاش کے بعد بھی وہ تحریم کی پسند کے مطابق کچھ فائنلائز نہ کر سکی تو ثنا کے پاس آ گئی وہ کاؤنٹر پر کھڑی ایک کرسٹل کا شوپیس پیک کروا رہی تھی۔

''کچھ پسند آیا۔''

''نہ۔'' اس نے بری سی شکل بنا کر جواب دیا۔

''یہاں کچھ اور اچھی گفٹ شاپس بھی ہیں وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' ثنا نے کہا۔

''مجھے کچھ کارڈز بھی لینے ہیں اور وفا کے لیے چاکلیٹس بھی۔'' اس نے اپنی بہن کا نام لیا۔

''تم یہ گفٹ پیک کرواؤ میں تب تک یہ کام نمٹا لیتی ہوں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے لیکن تم ٹرپل آئس کریم میں ایک اور کا اضافہ کر لو۔''

ثنا نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''مرو تم پیٹ ہے یا کنواں۔''

"جو بھی سمجھو پر میں کھاؤں گی ضرور۔"

"ہاں میری گالیاں۔" وہ منہ کے زاویے بگاڑتی چلی گئی۔ فارحہ مطمئن سی گفٹ پیک کروانے لگی۔ شاید دکان دار نے ان کی ابتدائی گفتگو سنی تھی۔ تبھی پیکنگ مکمل کر کے اسے کئی گفٹ دکھانے لگا گر اس کا ارادہ بدل چکا تھا۔ وہ اب ڈیکوریشن پیس سے زیادہ تحریم کے لیے لیدر کا پرس خریدنے میں دلچسپی رکھتی تھی مگر دکان دار اسے نت نئی چیزیں دکھا کر گویا لالچ دے رہا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی قابل دید بلکہ قابل سماعت و قابل ستائش تھی جس رفتار سے زبان چل رہی تھی اسی رفتار سے کاؤنٹر پر مختلف چیزوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ وہ فارحہ کو کچھ نہ کچھ فروخت کرنے پر بضد تھا۔ مجبوراً اس نے مٹی کی بنی ہوئی ننھی سی بھینس پسند کر لی۔ اس پر دکان دار نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ بہت سی خوب صورت چیزوں کو رد کر کے اس نے خریدا بھی تو کیا یہ بھینس۔

"آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔" اس نے دانت نکال کر پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔ فارحہ بمشکل ہنسی روک پائی۔ بہرحال قیمت پر زبردست بحث ہوئی پھر درمیانہ راستہ اختیار کر کے آدھی کی بجائے تین فیصد قیمت ادا کر کے جب وہ باہر نکلی تو ثنا بی بی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھیں۔ اس نے سب طرف دیکھا شاپنگ سنٹر کے اوپر والے حصے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے وہ تحریم اور اپنی خریدی ہوئی بھینس کے متعلق سوچ رہی تھی، تحریم تحفہ لے کر کیسا محسوس کرے گی۔

ممکن ہے کہ مٹی کا کھلونا ہی میرے سر پر دے مارے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا پھر نجانے غلطی کس کی تھی مگر تصادم زوردار تھا اور شکر ہے کہ ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم ہی رکھا تھا ورنہ جو دو تین سیڑھیاں عبور کی ہوتیں تو اس ٹکر کے نتیجے میں منہ کے بل گرنا لازمی امر تھا۔ بچت تو بہرحال اب بھی نہیں ہوئی تھی وہ سنبھلنے کے چکر میں پوری قوت سے دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔

"آنکھیں نہیں ہیں؟" ناک کی پھننگ پر ہاتھ رکھے وہ کراہی تھی۔ ہاتھ سے شاپنگ بیگ پھسل گیا تھا دونوں گفٹ پیک یہاں وہاں لڑھک گئے۔

"ہیں...... آنکھیں نہیں ہیں۔" اس نے مقابل کی پریشان سی آواز سنی مگر پروا صرف اپنی اکلوتی ناک کی کی تھی۔

"دیکھیے...... سوری۔" وہ بوکھلایا...... "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بنیے میں اس حادثے کے لیے شرمندہ ہوں مگر آپ کو بھی ایسی کنڈیشن میں تنہا باہر نہیں نکلنا چاہیے اور بلیک گلاسز اور وائیٹ اسٹک بھی ضرور ساتھ رکھنی چاہیے۔"

اس نے تحیر سے قدرے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا، گہری سیاہ آنکھوں میں فقط ایک رنگ نمایاں تھا، ترحم کا، وہ چونکی پھر سمجھی اور جھنجھلا گئی۔

...آپ کی آنکھوں کی بات کر رہی تھی۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"جناب! میں آپ کی..."

"کیا۔" جناب کے چہرے پر پہلے حیرانی چمکی اور دوسرے ہی پل لبوں کے کونے پھیل گئے وہ خفت... [illegible]

...مزا رہا تھا۔

"گویا آپ طنز کر رہی تھیں۔" اس سوال پر وہ جی جان سے جل ہی تو گئی۔

"جی نہیں ٹینس کھیل رہی تھی۔"

"بہت خوب۔" اس نے داد دیتی نظروں سے فارحہ کو دیکھا۔

"لیکن محترمہ! ٹینس کھیلنے کے لیے یہ کچھ ایسی مناسب جگہ تو نہیں ہے۔ اب دیکھئے نا ابھی ابھی آپ ٹکرا گئیں پھر کسی اور سے......"

"میں ٹکرا گئی یعنی کہ میں......" اچنبھے کی سی کیفیت میں فارحہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔ پھر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ "مجھے مزید مشورے دینے کی بجائے اگر آپ آنکھوں کا استعمال کر لیں تو یقیناً اگلی بار کوئی معصوم انسان آپ کی ٹکر کھانے سے بچ جائے گا اور اس کا نقصان بھی نہیں ہوگا۔" اب کی بار وہ بڑی بے قراری سے زمین پر لڑھکے گفٹ کی طرف بڑھی تھی۔

"نقصان تو ہو چکا، اور وہ بھی واقعی ایک معصوم انسان کا۔"

دوسرا پیک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ تاسف سے گویا ہوا تھا۔ فارحہ نے ثنا کی تلاش میں گردن گھمائی پھر ناامید ہو کر پیک جھپٹ لیا۔

"آنکھیں کھول کر چلتے تو کبھی یہ نقصان نہ ہوتا۔"

"مزے کی بات تو یہی ہے کہ میں آنکھیں کھول کر چل رہا تھا اور اس کے باوجود نقصان ہو گیا۔"

فارحہ نے اس بے تکی سی بات پر ایک اور گھوری اس کی نذر کی پھر اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ اور شرارت سے بھری آنکھوں سے مزید بدمزہ ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ثنا کا پیک کروایا ہوا کرسٹل پیس یقیناً ریزہ ریزہ ہوا تھا کیونکہ آواز بڑی واضح تھی۔

"ثنا تو میری کھچڑی بنا دے گی۔" وہ روہانسی سی ہو گئی تھی ثنا کے ردعمل کے بارے میں سوچ کر۔

"تم اس سے پہلے ہی ثنا کو بتا دوں گا کہ آپ کی کھچڑی بڑی بدذائقہ سی ہوگی۔"

"آپ میرے ساتھ کیوں چل رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں اپنے پیروں کے ساتھ چل رہا ہوں۔" مطلع کیا گیا۔

"آپ پہلے تو نیچے جا رہے تھے؟" اس نے طنز سے کہا مگر دوسری طرف اثر ندارد۔

"اب اوپر جا رہا ہوں۔"

"یہ تو میری غلطی تھی جس نے آپ کو باآسانی جانے دیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا اور آپ نے اسے بھی اتنی

ہی زور سے ٹکر ماری ہوتی تو آپ بنا کسی تردد کے اوپر پہنچ چکے ہوتے۔" وہ تنک گئی۔
"کوئی ہوتا تو کیا میں ٹکراتا۔" اس نے شاید خود کلامی کی تھی نجانے اسے سنانا مقصود تھا یا نہیں بہرحال
فارحہ نے سن لیا تھا اور دل تو چاہا تھا کہ اس کا سر ہی پھاڑ ڈالے۔
"یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے مجھے جان بوجھ کر ٹکر ماری تھی۔" اس کے تیور کڑے تھے۔
"میں تسلیم تو نہیں کرتا البتہ آفرین ضرور کہتا ہوں آپ کی ذہانت پر۔ بات کو گھما پھرا کر وہیں لے آئی
ہیں اور اپنے موقف پر بھی ڈٹی ہوئی ہیں۔ بائی دا وے آپ کرتی کیا ہیں؟" خاصے دوستانہ انداز میں
دریافت کیا۔
"آپ سے مطلب؟" وہ اوپر پہنچ کر سیڑھیوں کے ایک طرف کھڑے تھے۔
"آپ سے مطلب تو آپ ہی جانیں میں تو صرف ایک مشورہ دے رہا ہوں جو بھی کر رہی ہیں اسے
فی الفور ترک کر کے لاء کی فیلڈ اپنا لیں۔ انشاء اللہ ایک دن اس فیلڈ میں بہت نام پیدا کریں گی۔ بے گناہ
سے بے گناہ شخص بھی ہاتھ جوڑ کر آپ کے سامنے اقبال جرم کر لے گا۔"
"اپنے یہ بے تکے مشورے سنبھال کر رکھیں۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن آپ کے ہی کام آئیں گے فی
الحال میرا نقصان پورا کیجیے۔ اچھے خاصے کرسٹل کا کباڑا کیا ہے نکالیے چار سو بہتر روپے۔"
"دیکھا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گی۔" وہ اپنے اندازے
کے سو فیصدی درستگی پر خاصا مسرور نظر آیا تھا۔ فارحہ نے بنا کچھ کہے ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔
"چار سو بہتر روپے۔" انداز دو ٹوک تھا مخاطب نے سینے پر بازو باندھتے ہوئے اسے نظروں کے
حصار میں مقید کیا تھا۔
"آپ کو لگتا ہے کہ چار سو بہتر روپے میں اصل نقصان پورا ہو جائے گا؟"
"بالکل۔" فارحہ پر یقین تھی۔
"اچھا۔" اس نے پل بھر کو سوچا پھر جینز کی جیب سے والٹ نکال کر مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ پر رکھ
دی۔
"مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اصل نقصان اس رقم سے پورا نہیں ہوگا۔" وہ اس قدر پر یقین تھا
کہ پل بھر کو فارحہ کا یقین بھی ڈگمگا گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے رقم کو دیکھا پھر اسے...... مگر وہ منظر سے
غائب ہو چکا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا سیڑھیوں سے متصل ریلنگ
سے نیچے بھی جھانکا۔
"ایویں بول رہا تھا چغد...... نقصان بھلا کیوں پورا نہ ہوگا۔ تین سو بہتر کا تو آئے گا نیا ڈیکوریشن پیس
اور باقی سو روپے کی ہم آئس کریم اور گول گپے کھا لیں گے۔" اس نے پورا پورا حساب لگا کر لا پروائی سے سر

بھاگی بھی ثنا آ گئی۔
"کہاں مر گئی تھیں۔" وہ اس پر الٹ پڑی۔

✦

ان کی دوسری ملاقات ایک بک فیئر میں ہوئی تھی۔
اور اس بار اسے کسی قسم کا لالچ دے کر نہیں لایا گیا تھا۔ کتابوں میں اس کی دلچسپی اتنی تو بہرحال تھی کہ
فارغ اوقات میں وہ کسی اچھی کتاب کے مطالعے کو ترجیح دیتی۔
ایک مشہور اشاعتی ادارے کے اسٹال پر print media کے ریسرچ سے متعلق ایک کتاب نظر
آنے پر وہ بہت ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی۔ اس مصنف کی یہ کتاب بے حد مشہور تھی اور ابتدائی کتابوں میں سے
تھی اسی بنا پر بہت تلاش کے بعد بھی نہیں مل سکی تھی اور دیکھا جاتا تو اس بک فیئر میں آنے کی زیادہ وجہ یہی
کتاب تھی۔ وہ کتاب خرید کر بڑی خوشی خوشی ثنا اور ثوبیہ کو بتانے جا رہی تھی۔
اپنی ایکسائٹمنٹ میں اسے آگے موجود دو سیڑھیاں دکھائی نہیں دی تھیں۔ وہ عین زمین پر ہوتی جو ایک
مضبوط ہاتھ نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔ اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے اور کچھ شرمندگی کے احساس سے
مغلوب ہوتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔
"یقیناً آج بھی آپ ٹینس کھیل رہی ہوں گی۔"
آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت سموئے ہوئے وہ متبسم سے لہجے و انداز میں پوچھ رہا تھا۔ فارحہ کو لمحہ
بھی نہیں لگا اسے پہچاننے میں۔ پھر اس نے حوالہ بھی تو ایسا دیا تھا۔ دو دن پہلے کا وہ واقعہ اس کی آنکھوں میں
مجسم ہوئے بنا ہی دم توڑ گیا۔ خفت تو اپنے یوں لڑکھڑا جانے پر ہوئی تھی جھنجلا اس کی بات پر گئی۔
"جی نہیں آج میں باسکٹ بال کھیل رہی ہوں۔"
اس نے بڑی خوشگواریت سے ہونٹوں کے کنارے یہاں سے وہاں تک پھیلاتے ہوئے جواب دیا
لہجہ اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ وہ بمشکل اپنا قہقہہ روک پایا۔
"امیزنگ...... آئی ایم ہائیلی امپریسڈ۔" فی الحال اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا پھر اس نے نظر اٹھا کر
ستائشی نظروں سے فارحہ کو دیکھا تھا۔
"خدا جب دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے۔ یہ محاورہ میں نے آج تک صرف سنا تھا۔ مگر محاورے کی
تاثیر دیکھنے کا موقع بس آج ہی ملا ہے۔ اب دیکھیے نا خدا نے آپ کو اس قدر ٹیلنٹ دے دیا ہے کہاں
لوگ ٹینس کورٹ میں جا کر ہی کھیلتے ہیں جبکہ آپ کسی بھی شاپنگ سنٹر میں اپنا شوق باآسانی پورا کر لیتی
ہیں ٹینس تو اور اب باسکٹ بال بھی۔" اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں انداز کچھ اور جبکہ الفاظ ان سب سے

بھی کچھ اور فارحہ نے پیچ و تاب کھاتے دل کو مشکل سے سنبھالا تھا۔

''ماشاءاللہ بھی کہہ لیں۔'' بڑے مصنوعی سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے ٹوکا پھر وضاحت کی

''دراصل مجھے نظر ذرا جلدی لگ جاتی ہے۔''

اور اب کی بار وہ اپنا بے ساختہ اور بے قابو قہقہہ روک نہیں پایا تھا۔ فارحہ کے چہرے سے مصنوعی مسکراہٹ بھی اڑنچھو ہو گئی۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر اسٹال کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی اس سے دو قدم کے فاصلے پر آن رکا۔ یہاں سے وہاں تک انگریزی کلاسیکل ادب کی بھرمار تھی۔ وہ صرف خود کو لاپروا ظاہر کرنے کے لیے ایک ناول دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں ثنا اور ثوبیہ کو خوب ہی گالیوں سے نواز رہی تھی جو عین ضرورت کے وقت میں غائب تھیں۔

''آپ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے؟'' وہ اسی سے مخاطب تھا۔

''جی بہت۔'' نا چاہتے ہوئے بھی اس نے اختصار سے بہرحال جواب دے ہی دیا۔

''لیکن اردو لٹریچر کا اسٹال تو وہاں ہے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

فارحہ کے سر پر لگی تلوؤں میں بجھی یا شاید تلوؤں میں لگی اور سر پر بجھی دراصل غصے کی شدت میں اسے خود بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔

''مجھے اردو اور انگلش دونوں طرح کے لٹریچر میں دلچسپی ہے۔'' اس نے ہر لفظ تقریباً چبا ہی ڈالا تھا مگر اس پر تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

''رئیلی؟ پھر تو آپ نے وہ کتاب ضرور پڑھی ہوگی؟''

''کون سی؟'' اس نے بھی بے ساختگی میں پوچھ لیا پھر اپنے دعوے کو دلیل سے ثابت بھی تو کرنا تھا۔

''ممتاز مفتی' ان لو۔'' وہ استفسارانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فارحہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''آپ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں نا۔''

''میں قدرت کے کاموں میں دخل دے کر بھلا اپنی عاقبت کیوں بگاڑوں۔'' وہ بولا۔ فارحہ نے خفا سی ہو کر رخ بدلا۔ پتا نہیں کیوں بار بار بے دھیانی میں اس کے سوالوں کے جواب دیے جا رہی تھی۔

''اچھا کم سے کم کلیات ورڈزورتھ کے بارے میں تو اظہار رائے کیجیے یا پھر کیٹس کی رباعیات کے متعلق ہی کچھ کہہ دیں۔''

''اس معاملے میں تو آپ بازی لے گئے۔'' وہ مسکرا کر حساب چکانے میدان میں اتری تھی۔ ''میں تو ابھی تک یہ معرکۃ الآرا کتابیں نہیں پڑھ سکی مگر مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کا مطالعہ کافی وسیع ہے...... ویسے پھر تو آپ نے وہ کتاب بھی پڑھی ہوگی؟'' وہ بالکل اس کے سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

''کون سی؟'' اس نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا تو وہ اطمینان سے بولی۔

''میری سینڈل اس کا سر۔'' اس کی طنزیہ نظریں اسے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ بدمزہ ہونے کی بجائے بولا۔

''واہ...... جب عنوان اس قدر خوب صورت ہے تو اصل مواد کتنا خوب صورت ہوگا۔'' وہ غالباً ذہن کا استعمال کر رہا تھا۔

''بہت سے بھی زیادہ ہی خوب صورت ہے۔'' وہ جل کر بولی۔ ''ویسے آپ ضرور پڑھیے گا کیونکہ اس میں آپ جیسے لوگوں کے لیے ہی خاصی سبق آموز داستانیں موجود ہیں۔'' وہ جانے لگی تو وہ تیزی سے اس کے سامنے آ گیا۔

''غصہ ضرور کیجیے مگر غصے میں اپنا نقصان تو مت کیجیے۔''

مسکراتے لب مسکراتی آنکھیں مسکراتا لہجہ۔

''مطلب۔'' وہ تنک کر بولی تو اس نے خاکی رنگ کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ اپنی کتاب اسی اسٹال پر چھوڑے جا رہی تھیں۔'' فارحہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کتاب جھپٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی اور یہاں اس وقت...... اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی تقدیر میں یہ تیز قدم اٹھانا اور اسی تیزی کی وجہ سے منہ کے بل گرنا لکھا جا چکا ہے اور جو تقدیر میں لکھا گیا بھلا اسے کون مٹا سکتا ہے۔

✦

''یہ اسود ہے...... اسود ابراہیم۔'' تحریم کے نہایت پرجوش انداز میں بتانے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ تحریم اسے اتنی خوشی خوشی اس شخص سے متعارف کروانے جا رہی ہے تو وہ کبھی بھی اس کے ساتھ نہ آتی۔ کوئی اس وقت اس سے پوچھتا کہ ''اسود ابراہیم'' نامی اس شخص کو دیکھ کر کیسا محسوس کر رہی ہے تو وہ اپنے احساسات کے لیے صرف ایک لفظ منتخب کرتی۔ مایوسی اور پھر اس کی تشریح میں وہ لمبا چوڑا بنا توقف کیے بولتی ہی چلی جاتی مگر دوسرے ہی پل اس پر منکشف ہوا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی بولنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ وہ جی بھر کر بددل ہوئی تھی۔

''اور یہ میری بہت پیاری سی کزن اور فرینڈ فارحہ۔'' تحریم نے بڑے پیار سے اس کے کندھوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا اور جہاں وہ اس کے ''پیاری سی'' پر اس قدر زور دینے پر بری طرح شرمندہ ہوئی تھی وہیں اس کے چہرے پر بے ساختہ سی مسکراہٹ کو ابھرتے اور پھر معدوم ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر

جھنجلا گئی تھی۔

"نائس ٹو میٹ یو۔" وہ ایک فارمل سی مسکراہٹ چہرے پر پھیلائے کہہ رہا تھا۔

"لیکن مجھے بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔" اس نے سوچا، کہا نہیں اور کہہ بھی دیتی اگر جو حسین اور تحریم یہاں موجود نہ ہوتے۔ وہ ایسی ہی صاف گو تھی بلکہ تحریم تو اسے "تم بدتمیزی کی حد تک صاف گو ہو" کہا کرتی تھی اور وہ بنا برا منائے اس کے اس کمنٹ پر سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھی۔ اسے کوئی بات چاہے اچھی ہو یا بری دل میں رکھنا قطعاً پسند نہیں تھا۔

اور اس وقت سامنے کھڑے شخص کے لیے اس کے دل میں صرف برا ہی برا تھا۔ اسے دیکھ کر بلاوجہ ہی اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ اب بھی وہ جھنجلاہٹ اور غصے کے مارے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے اس فارمل سے گھسے پٹے جملے کے جواب میں کوئی ردعمل ظاہر کرتی حسین کی بات نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔

"مجھے تو ایک ہی شکایت ہے آپ سے فارحہ! آپ کل تک کہاں تھیں۔" وہ مخاطب اس سے تھا جبکہ آج کی تقریب کے حوالے سے چڑا تحریم کو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان دونوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی تھی۔

تحریم بجائے چڑنے کے اطمینان سے بولی تھی۔

"دراصل فارحہ کے ساتھ ہمیشہ ایک محافظ فرشتہ موجود رہتا ہے۔ اتفاق سے میرا محافظ فرشتہ چھٹی پر گیا ہوا تھا اور اسی دن میری ملاقات تم سے ہوگئی۔" اس کے اس قدر سنجیدگی سے کہنے پر فارحہ کو ہنسی آ گئی تھی جبکہ حسین کہہ رہا تھا۔

"اچھا! میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میرا محافظ فرشتہ چھٹی پر تھا۔"

"اب کم سے کم آپ ہمیں یہ سوچنے پر تو مجبور مت کریں کہ تحریم کا انتخاب غلط ہے۔"

اس نے فوراً تحریم کی سائیڈ لی تو وہ فخر سے گردن اکڑا کر حسین کو دیکھنے لگی۔ جس نے بے ساختہ سا قہقہہ لگایا تھا اور اس کے بعد گویا وہاں تو ایک سلسلہ ہی چل نکلا تھا۔ وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے پر فقرے اچھالنے لگے تھے۔

اسود نے اس دوران کچھ بھی نہیں کہا تھا اور فارحہ نے اس پر ایک کے بعد دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی مگر اس کے باوجود وہ اس کے دل جلانے والے تاثرات سے آگاہ تھی۔ اس بات پر وہ مزید کھولنے لگی تھی اور کوئی ایسا بہانہ تلاش کر رہی تھی جس کی بدولت یہاں سے ہٹ سکے اور پھر اسے یہ موقع مل بھی گیا۔ صبیحہ آنٹی اسے بلا رہی تھیں وہ ایکسکیوز کرتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

صبیحہ آنٹی کے کہنے پر وہ تحریم کے کمرے سے حسین کے گھر والوں کو دیے جانے والے تحائف لینے جا

ہوئے نہ چاہنے کے باوجود اسی کے بارے میں سوچتی جا رہی تھی۔ نجانے ان کی ہر
نی اور جانے انداز میں کیوں ہوتی تھی۔ وہ تحریم سے اسود ابراہیم کے بارے میں کئی باتیں
ت ایسے ہی ڈرامائی سے
ی۔ کوئی خونی رشتہ تو بہرحال نہیں تھا البتہ دونوں خاندانوں کے باہمی تعلقات خاصے خوشگوار تھے۔
ے والد اور تحریم کے پاپا کسی زمانے میں کالج فرینڈز ہوا کرتے تھے پھر اگرچہ دونوں کی فیلڈز الگ ہو
اسود کے فادر میڈیکل سے وابستہ ہوئے جبکہ طارق انکل نے بزنس کو تختہ مشق بنایا۔ یہ دوستی کے
م اگلی نسل میں بھی منتقل ہوئے تھے اور یہ سب معلومات اسے تحریم سے ملی تھیں۔ صبیحہ آنٹی اس کی ممّا کی
زن تھیں۔ جب فارحہ اور تحریم چھوٹی تھیں تو یہ لوگ بھی سیالکوٹ میں ہی مقیم تھے۔ پھر دونوں گھروں
درمیانی دیواریں آپس میں متصل تھیں۔ اس لیے ان دونوں کی دوستی بھی گہری تھی۔ ابتدائی اسکولنگ بھی
ہوئی تھی پھر جوں جوں عمریں بڑھتی گئیں اس دوستی میں بھی پختگی آتی گئی۔ وہ دونوں ففتھ کلاس میں
ٹ ہوئی تھیں جب طارق انکل نے لاہور منتقل ہونے کا سوچا بلکہ نہ صرف سوچا بلکہ ان دونوں کے
اج کو خاطر میں لائے بنا ہی اس سوچ پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس کے بعد بھی ان کی دوستی بدستور قائم رہی
۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو طویل طویل ٹیلی فون کالز کرتیں۔ لمبے لمبے خطوط لکھتیں۔ پھر چھٹیوں میں
ہ لاہور آنے اور تحریم سیالکوٹ جانے کو ترجیح دیتی تھی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کی
ات بدلیں وہیں سوچیں بھی بدلتی چلی گئیں۔

تحریم کی زندگی میں حسین الیاس وہ پہلا شخص تھا جس کا ذکر اس کی گفتگو میں بکثرت ہوتا تھا اور اسود
ہیم وہ دوسرا شخص تھا جس کا ذکر اس کی باتوں میں متواتر ہونے لگا تھا۔ وہ اس کی بہت سی خوبیوں سے
تھی۔ اس کی وجاہت، ذہانت اور شرافت کی وہ اتنی معترف تھی کہ خود فارحہ بھی کشش و پنج کا شکار ہوگئی تھی
ایک روز اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اس کے متعلق استفسار کر ڈالا۔

تحریم اس کے اندیشے کا سن کر بڑی بے ساختگی سے ہنسنے لگی تھی اور پھر کئی لمحوں تک پیٹ پر ہاتھ رکھے
ی رہی تھی۔ یہاں تک فارحہ کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا۔

"تری! کم سے کم مجھے تمہاری عقل سے اس بات کی امید نہیں تھی۔" وہ سانس برابر کر رہی تھی۔

"اسود مجھے بہن کہتا ہے ایڈیٹ۔" وہ اس لقب پر برا مان گئی۔

"اسود تمہیں بہن کہتا ہے مگر تم نے تو کبھی اسے بھائی نہیں کہا نا۔"

"تری...... تم۔" اس کے چڑے ہوئے انداز پر وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔

"اتنا شک تو کبھی حسین نے بھی نہیں کیا۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تم اسود سے ملو گی تو تم خود ہی اس کی خوبیوں کی معترف ہو جاؤ گی اور تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں
بے جا کی تعریفیں نہیں کرتی۔ وہ ہے ہی تعریفوں کے لائق میں نے تو سوچا تھا کہ اسود اور حسین کو ملواؤں گی

مگران کی ملاقات جم خانہ میں ہوگئی اور مزے کی بات یہ ہے کہ بڑی اچھی دوستی بھی ہوگئی۔ اب تمہیں شاید یہ بات بھی عجیب لگے مگر ہے حقیقت کہ میرے علاوہ حسین بھی اس کا معترف ہے۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟" اس نے پوچھا تھا۔

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔ تم اس سے ملو گی تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"اچھا! تمہارا وہ ٹام کروز کیا ماتھے پر اپنی خصوصیات لکھوا کر گھومتا ہے۔ جو مجھے ملتے ہی پتا چل جائے گا۔" اس نے چڑانے والے انداز میں کہا تھا اور اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً تحریم کو اسود کے حوالے سے چھیڑنے سے باز نہیں آتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے ہی حسین بھائی کے کان بھرنے پڑیں گے یعنی کہ حد ہے۔ میں حسین بھائی کی جگہ ہوتی اور میری مستقبل قریب کی بیوی اس طرح سے کسی کی تعریفیں کر رہی ہوتی وہ بھی میرے سامنے تو پتا ہے میں کیا کرتی؟ میں فوراً سے پہلے تمہیں قتل کر دیتی تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری....."

وہ کم سے کم ایک بار تو اسود ابراہیم سے ملنا چاہتی تھی۔ تحریم نے اس کا ذکر کر کر کے اس کے اندر تجسس اور اشتیاق پیدا کر دیا تھا اور تحریم ہر ایک کی تعریف کرنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ بہت کم لوگوں کی تعریف کرتی تھی اور ایسے لوگ واقعی قابل تعریف ہوتے تھے۔ فارحہ کو یقین تھا کہ اسود ابراہیم تحریم کی باتوں سے کچھ کم نہیں ہوگا اسے تحریم کی باتوں پر پورا یقین تھا مگر اس بار..... اس بار اسے حد سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی کم سے کم اسے تو یہ بندہ کہیں سے بھی قابل تعریف نہیں لگا تھا۔

صبیحہ آنٹی کو ان کا مطلوبہ سامان فراہم کرنے کے بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس لان میں آگئی تھی جہاں فی الحال محفل عروج پر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے منگنی کی تقریب کی بجائے چھوٹے پیمانے پر کسی کا دعوت ولیمہ ہے۔ طارق انکل، صبیحہ آنٹی اور ان کے بچے خاصے سوشل واقع ہوئے تھے پھر سمدھیانہ بھی ان ہی کے جیسا تھا اور فارحہ چونکہ اسی شہر میں تھی اس لیے وہی شریک ہوئی تھی۔ نہ بھی ہوتی تو اس نے اس تقریب میں ضرور شریک ہونا تھا۔ وہاں سیالکوٹ میں مما، ڈیڈی اور مہوش کی اپنی مصروفیات تھیں۔ مہوش ایم اے انگلش فائنل ایئر میں تھی مما ایک لوکل رفاہی تنظیم کی ہیڈ تھیں جبکہ ڈیڈی اپنی ماربل اور گلاس انڈسٹری کی مصروفیات میں گم۔

اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے قدرے تاریک گوشے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی میز لان کے مصنوعی جھرنے سے کچھ فاصلے پر تھی۔ سرمئی پتھروں کے نیچے سے نکلتی روشنی بہتے ہوئے شفاف پانی سے منعکس ہو رہی تھی۔ ہوا میں رچی موتیا کی دھیمی دھیمی سی مہک کو اپنے اندر اتارتے ہوئے میز پر کہنیاں ٹکا کر ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے وہ وہاں دیکھنے لگی جہاں سب لوگ تھے۔ بڑے لوگ تو کچھ الگ تھلگ ہو گئے تھے جبکہ ساری ینگ جنریشن نے عین وسط میں قبضہ جمایا تھا اور گرد پڑی کرسیوں کو ایک بڑے سے دائرے

کی شکل میں ترتیب دے دیا گیا تھا پھر جنہیں نشست نہ مل سکی وہ بے تکلفی سے گھاس پر براجمان ہو گئے۔

فارحہ ان لوگوں سے خاصا دور تھی اور حسرت بھری نگاہوں سے لیمپ پوسٹ کی دودھیا روشنی میں ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا اس کا سب کے ساتھ شریک ہونے کا۔ دائرے سے اٹھتے قہقہے کہتے تھے کہ کوئی دلچسپ موضوع زیر بحث ہے اس کا دل ہمک ہمک کر وہاں جانے کی ضد کر رہا تھا۔

"یہ اسود ابراہیم آخر اپنے گھر کیوں نہیں جاتا۔" اس نے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے سوچا۔ ایک ہی واحد وجہ اسے ان سب کے ساتھ شریک ہونے سے روک رہی تھی۔ وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے تحریم پر بھی تعجب ہو رہا تھا وہ کیسے اس کی ذہانت، وجاہت اور شرافت کے گن گایا کرتی تھی اور اب ذہانت ایک طرف، وجاہت دوسری طرف جبکہ شرافت کا کہیں عمل دخل ہی نہ تھا۔ بلاوجہ جو شخص لڑکیوں کا پیچھا کر سکتا ہے کیا اسے شریف کہنا شرافت ہے۔

اسے کل جی پی او کے سامنے والی سیڑھیوں میں ہونے والی ملاقات یاد آ گئی۔ وہ مہوش کو مس یو کا کارڈ پوسٹ کر کے باہر نکلی تھی جب اسے وہ دکھائی دیا اور ابھی تو وہ حیرت سے پھیلی آنکھوں کے رقبے کو بھی کم نہیں کر پائی تھی جب وہ خوشگوار سی حیرانی چہرے پر سجائے اس کے سامنے آن رکا تھا۔

"آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہماری ملاقات سیڑھیوں میں ہی کیوں ہوتی ہے؟" اس کے دوستانہ سے استفسار پر وہ چند لمحے اسے کڑی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی پھر سانس بھر کر سنجیدگی سے بولی تھی۔

"اللہ ایسی نادر سوچیں آپ کو ہی مبارک کرے البتہ میں نے ایک بات ضرور سوچی ہے۔"

"کیا۔" اس نے پر اشتیاق انداز میں دریافت کیا۔

"یہی کہ آپ لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے آپ کو شرم بھی نہیں آتی۔"

اس کا انداز صاف کاٹ کھانے والا تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

"لڑکیوں کا پیچھا اور میں۔" اس کے چہرے پر اچنبھے کی سی کیفیات رقم تھیں۔ پھر وہ سیدھا ہوا اور سنجیدگی سے بولا۔

"آپ نے مجھے کس کس لڑکی کا پیچھا کرتے دیکھا ہے۔" فارحہ کو اس کے انداز میں ناگواری سی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہ نظر انداز کر گئی۔

"کس کس کو دفع کریں میں تو صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ آپ میرا پیچھا کرتے ہیں اور جہاں میں جاتی ہوں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔" اس کا انداز ابھی بھی جارحانہ تھا۔

"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں اس وقت بھی آپ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔"

"بالکل۔" اس کے پوچھنے پر فارحہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بے ساختگی سے بولا۔

"احمق ہیں آپ..... بھلا میں آپ کا تعاقب کیوں کروں گا۔"

"یہ تو آپ ہی زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔ مجھے تو صرف اتنا ہی پتا ہے کہ آپ لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں کوئی خوب صورت لڑکی دیکھی چل دیے اس کے پیچھے۔"

"خوب صورت......" اس کا قہقہہ زبردست تھا۔ اس کے طویل فقرے میں سے صرف یہی لفظ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ فارحہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ پرس ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے گویا اس نے اپنے اشتعال کو قابو کیا تھا۔

"بات سنئے مس خوب صورت......" اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اس نے پکارا تھا۔ اس کے رکنے پر سنجیدگی سے بولا۔

"یہ غلط فہمی اپنے ذہن سے نکال دیجئے کہ میں آپ کا پیچھا کرتا ہوں۔ اول تو بہت مصروف انسان ہوں میں تفریحاً بھی ایسا فضول کام کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ دوسرا یہ کہ مجھے ایسی فضول و بے تکی حرکت کرنے کی ضرورت ہے بھی کیا؟ جبکہ آپ خود ہی ہر اس جگہ موجود ہوتی ہیں جہاں میں جاتا ہوں۔"

"واٹ۔" وہ تقریباً کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جان بوجھ کر ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہوں۔"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔" اس نے کندھے اچکائے اور دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ فارحہ کو بے حد اشتعال نے گھیر لیا۔ اس شخص کا ہر انداز چیخ چیخ کر فارحہ کی بات کی تائید کر رہا تھا۔

"خاصی احمقانہ سی بات ہے بھلا کبھی سنا ہے آپ نے کہ کوئی لڑکی خود لڑکے کے آگے آگئی ہو ہمیشہ لڑکے ہی لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔" وہ بضد تھی۔

"ضروری نہیں بہت سارے کیسز میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

"جی نہیں ایسا نہیں ہوتا۔"

"آپ کو نہیں لگتا کہ آپ شاؤنزم کا مظاہرہ کر رہی ہیں؟"

فارحہ کو یہ تجزیہ خاصا معقول سا لگا۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں؟" خود اس کا اپنا انداز طنزیہ سا ہو گیا تھا وہ اطمینان سے بولی۔

"شروعات تو آپ نے ہی کی تھیں۔"

"خاصا گھسا پٹا لطیفہ ہے۔"

"مجھے نئے لطیفے بھی آتے ہیں کبھی ہم فرصت سے مل بیٹھے تو ضرور سناؤں گا۔"

"انشاءاللہ حسرت ہی رہے گی۔" وہ منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

پچھلی ملاقاتوں میں بھی یہی ہوا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولتی گئی تھی اور ہر دفعہ طویل گفتگو طول پکڑ لیتی تھی اور تو اور بات ختم بھی ایسے موڑ پر ہوتی تھی جہاں اسے کوئی معقول جملہ نہ ملتا تھا جہاں وہ اس کی

گرفت کر سکے۔

اسے اس تنہا گوشے میں بیٹھے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ اتنا وقت گزر چکا تھا کہ وہ منہ کے برے برے زاویے بناتی اور حسرت سے ان لوگوں کو دیکھتی بھی تھک گئی تھی۔ زیادہ غصہ تو تحریم پر آنے لگا تھا جو آج اسے بھلا فراموش کیے بیٹھی تھی۔ "کیا اتنے لوگوں کے درمیان تحریم کو ایک بار بھی میری کمی محسوس نہیں ہوئی ہو گی؟"

اس نے بدگمانی سے سوچا تھا۔ کیا تھا اگر جو ایک بار وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان سب کے درمیان لے جاتی پھر تو وہ صرف تحریم کا دل رکھنے کی خاطر اسود ابراہیم کے جملوں کا سامنا بھی کر لیتی۔ مگر تحریم صاحبہ کا دل تو آج مکمل طور پر رکھا جا چکا تھا ابھی ابھی حسین نے حاضرین کے سامنے کوئی نظم سنائی تھی اور اس نے یہ نظم تحریم کے نام کی تھی۔ اتنی دور سے تحریم کے چہرے کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ضرور دیکھا تھا۔ وہاں سب لوگ تحریم کو ہوٹ کر رہے تھے۔ فارحہ وہاں ہوتی تو ضرور اس کے یوں بلش کرنے پر اسے چڑاتی مگر وہ وہاں نہیں تھی سو یہاں بیٹھی مروا اور رات کی رانی کی مہک سانسوں میں اتارتی، مصنوعی آبشار کا شور سنتی وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

ایک لحہ کو تو یہ خیال بھی آیا تھا کہ آخر اسود ابراہیم کو اس قدر اہمیت دینے کا مقصد ہے کیا؟ فارحہ کو اسے ایک عام سے شخص کی طرح ٹریٹ کرتے ہوئے اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ محض اس کی وجہ سے ایک اچھا فنکشن اپنے لیے بور بنا لے۔ مگر اچھا فنکشن بور بن چکا تھا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی جب وہاں دائرے سے تالیوں کا شور بلند ہوا تھا۔ وہ ادھر متوجہ ہوئی چند لمحوں کے توقف سے وائلن کی نہایت مدھری آواز ہوا کی گود میں سوار ہو کر اس تک پہنچی تھی۔ کسی نے بڑھ کر سارے لیمپ پوسٹ بجھا دیے لان کی خنکی پر محض چاند کی دودھیا چاندی کی چادر تنی رہ گئی تھی۔

رات کی رانی کے ساتھ ساتھ فضا میں اٹھکیلیاں کرتی یہ دلفریب دھن...... اگلے کئی لمحوں تک وہاں موجود ہر شخص پر گویا سحر پھونکا گیا تھا۔ وہ بھی پلکیں موندے ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے بڑے جذب سے سن رہی تھی۔ اسی مبہوت سی کیفیت میں اس نے ایک بار پھر تالیوں کی پرجوش آواز سنی تھی فضا کا سحر ایک چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ ہوا میں بکھرے سر سٹپٹا کر وائلن کے تاروں میں روپوش ہو گئے۔

وہ چونکی ذرا سا اچک کر اس سحر پھونکنے والے کو دیکھنے کی سعی بھی کی تھی تبھی اس کے چہرے کے عین سامنے کسی نے چٹکی بجائی۔

"ہیلو...... سو رہی ہیں یا رو رہی ہیں۔" وہ سٹپٹا کر پیچھے ہٹی پھر جھنجلا کر رخ بدلا وہ بڑی سنجیدگی سے استفہامیہ نظریں اس پر ٹکائے کھڑا تھا۔

"اتنے شور میں تو کوئی احمق ہی سو سکتا ہے۔" ناگواری سی ناگواری تھی۔

"اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔" سامنے والی کرسی گھسیٹ کر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے برجستگی سے کہا۔

فارحہ نے اس کے بیٹھنے کو ناگواری سے دیکھا تھا۔ محض اس شخص کی وجہ سے وہ یہاں چھپ کر بیٹھی تھی سب سے کٹ کر بیٹھی تھی جبکہ وہ لاپروائی سے ادھر ادھر گردن گھماتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"میں سمجھا تھا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں مگر آپ کے تاثرات کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے پہلے ہی پہچان گئی تھیں۔"

"آپ بھولنے والی چیز تو نہیں ہیں۔" غصہ دباتی وہ بڑے ضبط سے بولی تھی جواباً اسود نے اسے ادادیتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"درست...... دراصل میری پرسنیلٹی ہے ہی اتنی شاندار کہ لوگ مجھے چاہ کر بھی بھول نہیں پاتے۔" فارحہ کے طنز کے جواب میں اس نے اس قدر خوشگواریت سے کہا تھا کہ وہ جل کر خاک ہی تو ہو گئی۔

"خاصے خوش فہم ہیں آپ۔"

"خاصے خودآگاہ ہیں آپ...... یوں کہا ہوتا تو فقرہ زیادہ اچھا لگتا۔"

"خاصے ڈھیٹ بھی ہیں آپ۔ میرا خیال ہے کہ یہ فقرہ تو آپ کو ضرور ہی اچھا لگے گا۔"

"اب آپ کی بات سے اختلاف کر کے میں بیل سے یہ تو نہیں کہہ سکتا نا کہ آؤ اور مجھے مارو۔"

"آپ مجھے بیل کہہ رہے ہیں۔" اس نے صدمے کی سی کیفیت میں دریافت کیا تھا۔

"تو اس میں اتنا بھڑکنے کی کیا بات ہے۔ ابھی ابھی آپ نے بھی تو مجھے ڈھیٹ کہا تھا اور مجھے تو بالکل بھی غصہ نہیں آیا۔"

"وہ اس لیے کہ آپ بہت گریٹ ہیں۔ کوئی بات چاہے درست ہو یا غلط دوسرے کا دل رکھنے کے لیے فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں شیرینی میں لپیٹ کر طنز کیا تھا۔ ہونٹ مسکراتے ہوئے جبکہ لب و لہجہ چباتا ہوا۔

اسود نے اپنی بے ساختہ امڈتی ہنسی کو بمشکل لبوں تلے قید کیا تھا بلکہ یہ بھی ایک کوشش ہی تھی اس کی آنکھوں میں ہنسی کا رنگ نمایاں تھا۔

"آپ کو پتا ہے آپ کی ناک اتنی پھینی کیوں ہے؟" میز پر دونوں بازو باندھتے ہوئے اس نے متبسم سا استفسار کیا تھا۔ اس بات پر جہاں فارحہ جھ[illegible]ی تھی وہیں قریب آتی تحریم کو بھی تحیر نے گھیر لیا تھا۔

"بوجھ کی وجہ سے۔" فارحہ کو خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

"دراصل آپ کی ناک پر ہر وقت غصے کا بوجھ اس قدر رہتا ہے کہ بیچاری ناک تھک کر بیٹھ گئی ہے۔"

منطق بیان کرتے ہوئے اس نے اطمینان سے کمر پشت سے ٹکالی تھی۔ فارحہ دانت کچکچا کر رہ گئی جلتی پر تیل کا کام تحریم کی ہنسی نے کیا تھا۔

"ممی لاجک ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ممی نہیں بلکہ سراسر غلط بات ہے یہ۔" فارحہ نے تیزی سے اسے ٹوکا تھا۔ تحریم نے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا تھا فارحہ کا جارحانہ انداز اس کے لیے نیا اور انوکھا تھا۔ وہ پہلی بار اسود سے ملی تھی اور پھر بھی اس طرح سے بات کر رہی تھی۔

"مجھے غصہ نہیں آتا بلکہ آپ کی حرکتیں مجھے غصہ دلا دیتی ہیں۔"

"ایسی کون سی حرکتیں کی ہیں میں نے؟"

"میرا پیچھا تو کیا آپ نے۔" اس کا لہجہ و انداز نہایت ٹھوس تھا۔ تحریم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسود نے فارحہ کا پیچھا کب کیا یہ تو وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ اسود کو خوب اچھی طرح سے جانتی تھی اور اس سے اس بات کی توقع تقریباً عبث ہی تھی۔

"آج بھی آپ یہاں پہلے سے موجود تھیں انفیکٹ مجھے معلوم ہوتا کہ آج یہاں آپ سے ملاقات ہو جائے گی تو میں تھوڑا جلدی ہی آ جاتا۔"

"اور مجھے معلوم ہوتا کہ آج یہاں آپ سے ملاقات ہو گی تو میں کبھی نہ آتی۔"

اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا تحریم کے خیال میں اس بات پر تو اسود کو برا ماننا ہی چاہیے تھا مگر وہ ہنس رہا تھا۔ تحریم کو یہاں بیٹھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ دونوں ہی وہ دونوں نہیں لگ رہی تھے جنہیں وہ اب تک جانتی تھی۔ اسود کی آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر کھیلتا تبسم بے حد نمایاں تھا۔ وہ کسی بھی غیر سے اس قدر جلدی فری نہیں ہوتا تھا۔

دوسری جانب فارحہ منہ کے برے برے زاویے بنا رہی تھی۔ اس کے انداز میں خفگی و ناراضی ہی تھی۔

"چلو اس ملاقات کا ایک فائدہ تو ہوا مجھے ان کی اس اضافی خوبی کے متعلق پتا چل گیا...... بے حد صاف گو ہیں یہ۔" وہ بڑی سنجیدگی سے تحریم سے کہتے ہوئے اسے سراہ رہا تھا اور اس سے قبل کہ فارحہ کچھ کہتی تحریم نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی تعجب کا باعث تھی کہ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات نہیں ہے۔

"کیا تم دونوں میں سے کوئی مجھے یہ بتانا پسند کرے گا کہ یہاں ہو کیا رہا ہے؟" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"میں تمہاری فرینڈ کی تعریف کر رہا تھا مگر یہ برا مان گئیں۔"

"واٹ...... وہ تعریف تھی۔" فارحہ نے اسے کچا چبا جانے والے انداز میں گھورا۔ "آپ مجھے بیل،

مینڈک مکھی سے ملاتے رہیں اور میں ان باتوں کو تعریف کی طرح وصول کرتی رہوں......؟"

"ویل...... میں نے تو آپ کی تھوڑی سی تعریف کی تھی۔"

"دیکھیے مجھے لگتا ہے کہ آپ دونوں کے درمیان کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے اور اس مس انڈرسٹینڈنگ کو صرف مل جل کر ہی سلجھایا جا سکتا ہے۔" تحریم نے منصفانہ رویہ اختیار کیا۔

"تم دونوں مجھے بتاؤ کہ اصل میں ہوا کیا ہے؟"

"کچھ خاص نہیں بس اس دن شاپنگ سنٹر میں......"

"نہیں میں بتاتی ہوں۔" فارحہ نے ساری بات تمام تر جزئیات کے ساتھ بتانی شروع کی مگر ابھی بک فیئر تک ہی پہنچی تھی کہ تحریم کو اس کے پاپا نے بلا لیا اسے ناچار اٹھنا پڑا۔

"میں ابھی واپس آ رہی ہوں خدا کے لیے دوبارہ جھگڑا مت شروع کر دینا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں تم یہیں بیٹھو۔" وہ چلی گئی فارحہ مصلحتاً بیٹھی رہی اور رخ بھی بدل لیا مگر اس سب کے باوجود اسے اپنے چہرے پر پھیلے خفا خفا سے انداز کو ختم کرنے میں دقت ہوئی تھی۔

"اچھا ایک بات تو بتائیں۔ آپ کو کتابوں سے واقعی دلچسپی ہے یا اس دن صرف خود کو لا پروا ظاہر کرنے کے لیے اس اسٹال پر رک گئی تھیں۔" کچھ دیر بعد اسود نے پھر اسے مخاطب کیا تھا۔

"مجھے آپ جیسے کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ لہجہ قدرے دھیما اور کم جارحانہ تھا البتہ خفا خفا سی لگ رہی تھی۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں کیا کام کرتا ہوں۔" اس نے پھر پوچھا تو وہ اطمینان سے بولی۔

"میرا تو خیال ہے کہ آپ کوئی بھی کام نہیں کرتے سوائے......"

"سوائے خوب صورت لڑکیوں کا پیچھا کرنے کے......" اسود نے اس کا جملہ مکمل کر دیا تھا۔ فارحہ نے ایک ترچھی سنجیدہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت لیے اسے تک رہا تھا۔

"بالکل۔" وہ کچھ اور کہنے والی تھی مگر کہا یہ...... جواباً وہ محظوظ ہوتا مسکرایا تھا۔

"محترمہ! ڈاکٹر ہوں میں۔"

"شکل سے تو نہیں لگتے۔" بہرحال حساب چکانے کا موقع اسے بھی میسر آ ہی گیا تھا۔

"شکل سے کیا لگتا ہوں۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا تو وہ اک شان بے نیازی سے بولی۔

"یہ مت پوچھیے کیونکہ جھوٹ میں بولتی نہیں اور سچ بتاؤں گی تو آپ برا مان جائیں گے۔"

"اسے کہتے ہیں مزاج شناسی...... ابھی تو ہماری چوتھی ہی ملاقات ہے اور آپ کو پتا بھی چل گیا کہ کون سی بات مجھے بری لگ سکتی ہے...... سوچتا ہوں دو ایک ملاقاتیں اور......"

"خدا نہ کرے۔" فارحہ نے دہل کر اس کی بات قطع کی تھی۔ "اور اسے مزاج شناسی نہیں بلکہ عمومی رویہ کہتے ہیں۔ سچ بات ہر ایک کو بری لگتی ہے۔"

"اچھا۔" اس نے تعجب سے کہا۔ "شاید اسی لیے میرے بنل کہنے پر آپ اس قدر خفا ہو گئی تھیں۔" وہ رخ کر چلی تھی۔

"یہ......" اور اس سے آگے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ تبھی بڑے اشتعال سے سامنے والی کرسی کو ٹھوکر ماری اٹھی تھی اور دوسرے ہی پل پاؤں کی انگلیوں کی پوروں کو لگنے والی ضرب سے لب بھینچ لیے تھے۔ ساتھ ہی آنکھیں بھی...... آنکھیں کھولیں تو اسود بند ہونٹوں پر مٹھی جمائے مسکراہٹ دباتا بڑی دلچسپی سے اسے تک رہا تھا۔ وہ بڑے ضبط سے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے اس دل جلانے والے انداز کو نظر انداز کر کے گزر جانا چاہتی تھی مگر......

"آپ ایک انتہائی بدتمیز انسان ہیں۔ نہ تو لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کو شرم آتی ہے اور نہ ایک انسان کو تکلیف میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے شرم آتی ہے۔" وہ قدم اٹھاتے اٹھاتے رکی تھی اور پلٹ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔

"میں دعا کروں گی کہ آپ بھی ایسے ہی کرسی سے ٹھوکر کھائیں۔ تب میں بھی آپ کو دیکھ کر یونہی مسکراؤں گی جیسے آپ مسکرا رہے ہیں...... بالکل ایک لنگور کی طرح۔"

اور اسود کے بے ساختہ قہقہے نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

✦

کلائی میں ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں چڑھانے کے بعد اس نے آئینے میں خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی تھی اور کانوں میں بندے پہنتی تحریم کے سامنے جا رکی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس کے پوچھنے پر بیڈ پر نیم دراز تحریم نے کتاب بند کر کے آنکھوں پر ٹکا بلکہ ناک پر پھسلتا نظر کا چشمہ درست کرتے ہوئے سر تا پا اسے دیکھا تھا۔

"ہوں...... تم اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "لیکن اتنا تیار ہونے کے بعد اچھا لگنا بھی کوئی اچھا لگنا ہوا۔ بھئی انسان کو میری طرح ہونا چاہیے یعنی سادگی میں بھی اچھا لگے۔ اب یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا کہ آپ ڈھیروں ڈھیر میک اپ تھوپ لیں اور پھر پوچھیں کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اور فارحہ تحریم کے اس انداز کو بخوبی سمجھتی تھی تبھی امڈتی ہوئی مسکراہٹ لبوں تلے بھینچ کر اپنا پرس کھنگالنے لگی۔

"ہاں! تم اچھی لگتی ہو بشرطیکہ تمہیں آنکھیں بند کر کے دیکھا جائے تو......"

تحریم نے قریب پڑا تکیہ اسے کھینچ مارا تھا۔

''جھوٹوں کا عالمی مقابلہ اگر کبھی منعقد ہوا تو پہلا انعام تم ہی کو ملے گا۔''

''مجھ سے پہلے حسین بھائی اس انعام کے حقدار ہوں گے میں نے اکثر انہیں تمہاری تعریف کرتے سنا ہے۔''

''تم انتہائی فضول لڑکی ہو فارحہ کی بچی۔'' اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ فارحہ بھی مسکرانے لگی۔

''ٹھہرو میں دین محمد سے کہتی ہوں وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔'' چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے تحریم نے کہا تھا۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکلی تھیں۔ وہ دو دن قبل یہاں آئی تھی۔ فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس ان لوگوں کے لیے ویلکم پارٹی کے انتظامات کر رہے تھے اسی سلسلے میں دو دن کلاسز آ رہی تھیں فارحہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں آ گئی تھی اور اب دو دن یہاں گزار کر وہ سیدھی اس تقریب میں شریک ہونے جا رہی تھی۔

دین محمد اس گھر کا پرانا ملازم اور خاصا باتونی سا پٹھان تھا۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ بیک وقت ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دے لیتا تھا اور چونکہ وہ فارحہ کو بخوبی جانتا تھا اس لیے اس وقت اپنے مخصوص لہجے میں اسے اپنے پوتے کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ فارحہ حسب ضرورت گفتگو میں کوئی ٹکڑا لگا دیتی جس سے اس کی تسلی ہو جاتی۔

سگنل پر گاڑی رکی تھی یونہی لاشعوری طور پر گردن گھماتے ہوئے اس کی نظر فٹ پاتھ کے کنارے بے یار و مددگار پڑے اس بچے پر جا رکی تھی جس کے اردگرد خون بکھرا پڑا تھا۔ پیدل چلتے لوگ اسے تاسف سے دیکھتے تھے اور پھر بڑی لاتعلقی سے گزر جاتے تھے کوئی بھی رک کر اس بچے کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شہر کے اس کمرشل ایریا میں ایک سے بڑھ کر ایک بے حس انسان موجود تھا۔ وہ اس بچے کے ایک ہاتھ کو امداد کی درخواست کے لیے بڑی مشکل سے اٹھتا اور پھر نقاہت کے مارے گرتا دیکھ کر کانپ سی گئی تھی۔

''ایک اور ایکسیڈنٹ۔'' اس نے دین محمد کا تاسف بھرا جملہ سنا تھا سگنل کھل چکا تھا۔

''ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے دین محمد۔'' اسے گاڑی بڑھاتا دیکھ کر فارحہ نے کہا تھا مگر دین محمد کا لہجہ بڑا لاپروا سا تھا۔

''چھوڑو بی بی! ایسا ایکسیڈنٹ تو روز ہی ہوتے ہیں۔''

''کیا مطلب روز ہوتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں خود بخود درشتی سی آ گئی۔ اپنے دل میں اس زخمی بچے کے لیے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے وہ اس فنکشن کو مکمل طور پر بھول گئی تھی جس کے لیے وہ کتنی دن سے پر جوش تھی۔

''روز ایکسیڈنٹ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم اس کی مدد ہی نہ کریں۔ آپ گاڑی اس بچے تک لے چلیے ہم اسے ہاسپٹل لے چلتے ہیں۔''

''پر بی بی......'' دین محمد نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ تیزی سے تنبیہی انداز میں اس کی بات کاٹ گئی دین محمد نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس بچے کو قریب سے دیکھ کر وہ مزید دہل گئی تھی۔ وہ اس کی توقعات سے زیادہ زخمی تھا۔ دین محمد نے لہو میں بھر کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔

فارحہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی جب تک دین محمد نے گاڑی قریبی ہاسپٹل کے پارکنگ میں روکی وہ گردن موڑے اس بچے کے سیٹ سے لٹکے ہاتھ سے پانی کی طرح ٹپکتے خون کو دیکھتی رہی تھی جو فٹ میٹ میں جذب ہو رہا تھا۔ اس بچے کی عمر زیادہ سے زیادہ سات آٹھ سال رہی ہو گی دین محمد نے پھر سے اسے گود میں اٹھا کر ہاسپٹل کی عمارت کی جانب دوڑ لگائی تھی۔ کار لاک کرتے ہوئے فارحہ نے اپنی ٹانگوں میں بڑی کپکپاہٹ محسوس کی تھی۔ اس بچے کے حوالے سے اس کی کیفیات بڑی عجیب تھیں۔

پھر اسے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا؟ ایمرجنسی وارڈ کے کاریڈور میں اپنے اردگرد چلتے پھرتے لوگوں کو وہ متحرک سایوں کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہاں ایک شور تھا اور وہ مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کی اکھڑتی سانسوں کی تکلیف وہ خود محسوس کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے اپنی آنکھوں میں نمی سی محسوس کی کاجل پھیلنے لگا تھا تبھی اس نے ایک آواز سنی تھی۔ بے حس و سرد سی آواز۔

''جب تک پولیس نہیں آ جاتی ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ ایف آئی آر درج کروائیں اس کے بعد ہی ہم بچے کو ٹریٹمنٹ دے سکیں گے۔''

''اور اس سب کے دوران اگر اس بچے کو کچھ ہو گیا تو......؟'' اس کے لہجے میں ایک خدشہ سا گونجا تھا جیسے خواب سے چونک کر اس نے اس سرد مہر کی جانب دیکھا مگر وہ اپنی بات مکمل کر کے اس کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ بڑی بے ساختگی سے اس کے تعاقب میں بھاگی تھی۔

سامنے سے آتے اس شخص نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ اس کا سجا سنورا روپ اور یوں خود سے بے نیاز بھاگنے کا انداز مکمل طور پر تشویش کا باعث تھا۔ وہ اس کے قریب سے گزرنے کو تھی جب اس نے اس کے سامنے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

''کیا ہوا ہے فارحہ!'' اس کے حیرت میں جتلا سوال نے گویا اسے ہوش دلایا تھا۔

اس مانوس آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت حواس میں نہیں تھی۔ نگاہوں کے سامنے اس ننھے بچے کا بے بس وجود سسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے اس شخص کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔

اسے اپنی جانب اتنی اجنبیت سے دیکھتا پا کر وہ مزید گھبرا گیا تھا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

''پلیز فارحہ! ٹیل میں...... ہوا کیا ہے۔'' وہ تشویش میں مبتلا تھا اور تب وہ اسے پہچان گئی تھی کاجل بکھری آنکھوں میں پہچان نے انگڑائی لی تھی۔

''اسود...... وہ...... وہاں۔'' سراسیمگی میں بس وہ یہی کہہ سکی تھی۔ مگر دوسرے ہی پل وہ بڑے ہتھی انداز میں اس کا ہاتھ تھام گئی تھی۔

''وہ بہت زخمی ہے اسود...... تم...... تم پلیز اسے بچالو۔''

''کون بہت زخمی ہے...... تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہ...... طلحہ......'' اس کی زبان میں لکنت آ گئی تھی اور آنکھوں سے آبشار بہنے لگا تھا۔

''کون طلحہ؟'' اس نے اسود کو سنا تھا پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے گال پونچھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجتاً کلائی میں پڑی چوڑیاں پوری شدت سے کھنک اٹھی تھیں۔

اسے اس کھنک سے وحشت ہوئی۔ اسے اپنی کلائی میں پڑے ان رنگوں سے وحشت ہوئی۔ ان چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں توڑ دینے کی خواہش کو اپنی تمام تر شدتوں سے محسوس کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں خود کو باور کروا رہی تھی وہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ جس کو اس نے سڑک کے کنارے تڑپتے دیکھا ہے وہ ''وہ'' نہیں ہے وہ ''طلحہ'' نہیں ہے۔

اپنی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو بمشکل اعتدال پر لاتے ہوئے وہ اسے ساری بات بتانے لگی تھی اور آخر میں اس نے بڑی التجا سے اسے کہا تھا کہ وہ اسے بچالے۔

''انشاء اللہ اس بچے کو کچھ نہیں ہوگا فارحہ! میں ابھی یہاں کسی سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے متلاشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

''نہیں تم اسے دیکھو۔'' وہ بضد تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ قطعی طور پر بھول گئی تھی۔ کہ کل تک وہ اس شخص کو ڈاکٹر ماننے سے انکاری تھی۔

اس کے ہاتھ میں بس امید کا جگنو تھا اور وہ اس جگنو کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

''لیکن فارحہ...... میرا تعلق اس ہاسپٹل سے نہیں ہے۔ میں تو یہاں ایک سرجن سے ملنے آیا ہوں۔ میں کیسے......'' وہ تذبذب میں مبتلا تھا فارحہ نے اس کی بات سرعت سے قطع کر دی۔

''تم صرف اسے ایک بار دیکھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے تھے۔

''چلو میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔''

فارحہ نے اسے بہت تشکرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے گال کو رگڑا تھا اور اس سے قبل کہ وہ اس کی ہمراہی میں قدم بڑھاتی ایک آواز نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ ڈاکٹر عبداللہ

اسود سے مخاطب تھا۔

''آپ میرے آفس میں آئیے اسود، ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر لیتے ہیں۔''

''آپ کے اطمینان میں اس بچے کی جان چلی جائے گی۔'' فارحہ نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی

''اور ہمیں آپ سے کوئی بات نہیں کرنی...... تم چلو میرے ساتھ اسود۔'' وہ اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسود نے اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے متانت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ہمیں ڈاکٹر عبداللہ کی بات سننی چاہیے فارحہ! وہ اس ہاسپٹل میں سرجن ہیں۔''

فارحہ کو طوعاً و کرہاً اس کی بات ماننی پڑی۔ حالانکہ دل میں شدت سے خواہش ابھر رہی تھی کہ وہ اس شخص کو مار ڈالے۔

''میں اس مریض کا چیک اپ کر چکا ہوں۔ اگر چہ تفصیلی چیک اپ نہیں کیا، کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب تم بخوبی جانتے ہو۔ ایکسیڈنٹ کا کیس ہے پولیس کا انوالو کیے بنا کچھ بھی کرنا بہت رسکی ہوگا ہمارے لیے۔ بہت تفصیلی معائنہ نہ کرنے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم سے کم بھی وہ بچہ ڈیڑھ گھنٹے سے زخمی ہے۔ خون بہت بہہ چکا ہے اینڈ آئی ایم شیور کہ اس کی بیک بون پر بھی کم سے کم تین میجر injuries ہیں۔ ہمیں اس بچے کو ٹریٹمنٹ دینے میں کوئی تعرض نہیں ہے لیکن اگر ہماری ٹریٹمنٹ کے بعد وہ نہیں بچ پاتا تو سب سے پہلے گردن ہماری ہی پھنسے گی۔''

''آپ میری توقع سے بھی زیادہ بے حس ہیں ڈاکٹر۔'' فارحہ بس یہی کہہ سکی تھی۔

''ڈاکٹر عبداللہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فارحہ! پولیس کو انوالو کیے بنا کچھ بھی کرنا نہایت رسکی ہوگا بلکہ لواحقین بڑے آرام سے ڈاکٹر پر الزام تراشی شروع کر دیتے ہیں۔ پولیس آ جائے تو......''

''پولیس کے آنے تک وہ مر جائے گا۔'' بے اختیار وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ کاریڈور میں چلتے لوگ رک کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ اور اسود نے نہایت شرمندگی سے اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سیریس ہے۔ وہ حد سے زیادہ زخمی ہے تم انتظار کرنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ مجھ سے یہ مت کہو اسود کہ میں پولیس کا انتظار کروں مجھ سے یہ کہو کہ میں اس کی موت کا انتظار کروں اسے سسکتے ہوئے تڑپتے ہوئے دیکھوں اور ......''

''بابا......'' دین محمد کی آواز پر وہ یک لخت خاموش ہو گئی تھی۔ تیز تیز بولنے اور چیخنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ گردن میں پہنے نیکلس سے اوپر رگیں ابھری ہوئی تھیں وہ رک گئی تھی۔ وہ ٹھٹک گئی تھی۔

اسے لگا اگر اس نے سانس لیا تو انہونی ہو جائے گی۔

"وہ پیشنٹ جوان کے ساتھ آیا تھا۔" اس نے کسی کو کہتے سنا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"ہی از نو مور سر (وہ ختم ہو چکا ہے)" بے تاثر لب و لہجہ اور طوفان مچاتے لفظ اسے لگا تھا وہ گر جائے گی مگر وہ یونہی کھڑی اپنے پیروں کو دیکھتی رہی تھی۔ اس کے اندر کرب ٹھاٹھیں مار رہا تھا جبکہ باہر سے وہ ساکت تھی۔

"طلحہ اب نہیں ہے۔"

"وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے فری۔"

کوئی اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا تھا۔ اس کا دل چاہا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لے مگر وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ کاریڈور کے کونے پر کوئی عورت با آواز بلند رو رہی تھی۔ شاید اس کا بھی کوئی بہت قریبی اسے چھوڑ گیا تھا۔

"شاید اس عورت کا طلحہ بھی اسے چھوڑ گیا ہے۔" اس نے سوچا تھا تبھی اس کی اس گم سم سی کیفیت پر گھبرا کر اسود نے اسے پکار لیا تھا۔

فارحہ نے اس کا بے اختیار سہارا دینے کے لیے بڑھا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"مبارک...... بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو۔" اس نے ایک کاٹ دار سی نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ ایک کے ماتھے پر M.B.B.S کا ٹیگ چسپاں تھا اور دوسرے کا سفید اوور آل اور ہاتھ میں پکڑا اسٹیتھوسکوپ اس بات کی نشاندہی کرتے تھے۔

"پولیس نہیں آئی۔ اس بچے کو ٹریٹمنٹ نہیں ملی۔ وہ مر گیا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ آپ دونوں کو تو اب بہت خوشی ہو رہی ہو گی نا...... اب آپ لوگوں کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

اسود کو اس کی ذہنی حالت پر شک سا گزرا تھا۔ اتنی بدتہذیبی سے اپنا ہاتھ جھٹک دینے کے باوجود وہ اسے سہارا دینے بڑھا تھا مگر فارحہ کو ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ بھول گئی کہ اس وقت وہ کہاں کھڑی ہے اس کے اردگرد کتنے لوگ کھڑے ہیں۔ وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی تھی۔ وہ ان دونوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"تم سب ایک سے بڑھ کر ایک بے حس ہو۔ مسیحائی کے نام پر انسانیت کو لوٹنے والے گھٹیا ہو...... سب کے سب گھٹیا ہو۔"

"فارحہ۔" اسود نے قدرے سختی سی اسے ٹوکا تھا اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کے برعکس اسے ڈاکٹر عبداللہ سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے سینئرز میں سے تھے۔

تم میرے ساتھ چلو فارحہ۔"

"مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔" وہ سابقہ انداز میں چلائی تھی۔

"اور تم...... تم تو میری سوچ سے بڑھ کر برے نکلے ہو اسود ابراہیم! میں نے سوچا تھا کہ تم صرف مجھے نے کے لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔ اسی لیے میرا پیچھا کرتے ہو۔ مجھے گرتا دیکھ کر ہنستے ہو مگر یہ تو عام سی باتیں تھیں۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ تم اس قدر برے انسان بھی ہو سکتے ہو۔ تحریم کہتی تھی کہ اچھا ہے۔ میں نے مان لیا کہ اسود اچھا ہے لیکن تحریم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک آوارہ بھی ہے۔ ں کا پیچھا کر کے تو دلی سکون حاصل کر سکتا ہے جبکہ کسی مرتے ہوئے انسان کی مدد کرنا اس کی فطرت نامل نہیں ہے۔" اور اس کے بعد وہ بولتی ہی چلی گئی تھی پہلے اس کے پروفیشن اور پھر اس کی ذات کے ہایت سخت اور نامناسب الفاظ استعمال کرتی ہی چلی گئی۔ یہ دیکھے بنا کہ اسود ابراہیم کے چہرے کے ت کس قدر تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔

"کیپ یور ماؤتھ شٹ مس فارحہ۔" اسود کی آواز اس کی طرح بلند نہیں تھی مگر غراہٹ اتنی واضح تھی کہ موش ہو گئی۔

"تم کون ہوتی ہو یہ کہنے والی کہ میں اچھا ڈاکٹر نہیں ہوں اور یہ کہ میں اپنے پروفیشن سے مخلص نہیں میرے دل کی جگہ پتھر فٹ ہے جس میں رحم کا کوئی نام ہی نہیں اور یہ کہ میں بے حس ہوں۔ اچھا ہوں بے حس تو پھر؟" وہ بڑی کڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا فارحہ کو پہلی بار اپنی پوزیشن آکورڈ لگی نے روئی ہوئی آنکھوں سے پہلی بار اپنے گرد جمع لوگوں کو دیکھا تھا۔

"تم جب سے یہاں کھڑی ہو جو تمہارے دل میں آ رہا ہے بولتی جا رہی ہو۔ میں نے سوچا کہ تمہیں پہنچا ہے۔ اس لیے تم یوں جذباتی ہو رہی ہو مگر یہ معلوم نہیں تھا مجھے کہ تمہاری ذہنی حالت پہلے سے ہی ب ہے۔ دو بار تم سے ہنس کر بات کر لی۔ تمہاری باتوں کا جواب دے دیا یا دو سے زیادہ اتفاقی ملاقاتیں ملا تو تم نے سمجھ لیا کہ میں تمہارا تعاقب کرتا ہوں واہ کیا خوش فہمی ہے۔" وہ استہزائیہ بولا تھا۔

"محترمہ فارحہ صاحبہ! نکل آئیے اس احمقانہ بات کے چکر سے۔ جن چند اتفاقی ملاقاتوں کو میں نے اہمیت ہی نہیں دی ان سے تم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھر رہا ہوں اور یہ کہ میں ہی آوارہ اور لفنگا جو ہر لڑکی کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے اور تم نے کتنے آرام سے یہ کہہ دیا کہ میں اچھا نہیں ہوں...... نہیں فارحہ بی بی! میں اچھا ہوں۔ بہت اچھا انسان ہوں کم سے کم تمہاری طرح تو نہیں جو صرف خود کو بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول دے کہ اس بچے کو زخمی حالت میں سڑک کے کنارے اٹھایا ہے جبکہ بچے کا ایکسیڈنٹ خود اپنی گاڑی سے کیا ہو۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر۔ کیا یہ کہتے ہوئے ڈاکٹرز اس بچے کے قاتل ہیں تمہیں ذرا بھی شرمندگی نہیں ہو رہی؟...... چلو خیر اب تمہیں بھی امیر ماں

باپ کی امیر اولاد کو شرمندہ ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ روڈز تو تمہاری ملکیت ہی ہوئے نا...... چاہے ایک کی بجائے دس بچوں کو ٹکریں مارو۔ قاتل تو پھر بھی ہم ڈاکٹرز ہی رہیں گے جو پیشنٹ کو بروقت ٹریٹمنٹ نہیں دیتے۔'' فارحہ کا سر اس الزام پر جھکتا چلا گیا۔ پھر فارحہ سے مزید وہاں نہیں رکا گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔

دین محمد کو اس نے ہاسٹل تک خود کو ڈراپ کرنے کی ہدایت کرکے باہر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ دکانوں کے باہر کہیں کہیں نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ آسمان کے کنارے سیاہ ہونے لگے تھے۔ اپنے کرب سے بوجھل دل کو تسلیاں دیتے اس نے خود سے ایک آخری اعتراف کیا تھا۔ وہ کل تک اس شخص کو ناپسند کرتی آئی تھی اور آج...... آج وہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔

✦

''طلحہ کون ہے؟''

اس سوال پر اس نے گردن نہیں اٹھائی تھی بلکہ گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ شرمندہ نہیں تھی وہ غمگین تھی۔ وہ روئی بھی نہیں تھی مگر اس نے کرب کو اپنے دل کی حدود تک پھیلتا محسوس کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسود ابراہیم بڑی سنجیدگی سے اپنے سوال کا جواب جاننے کا منتظر ہے۔

تحریم کے علم میں اپنے اور اسود کے جھگڑے کی بات لائے بغیر اس نے اس ہاسپٹل کا ایڈریس معلوم کیا تھا جہاں اسود جاب کرتا تھا اور اسی شام بنا کسی پس و پیش کے وہ اس سے ملنے پہنچ گئی تھی۔ پچھلے دو دن کی مسلسل خود احتسابی کے بعد اس قسم کے کسی کام کی ضرورت نہیں تھی۔

''ڈاکٹر اسود تو اس وقت وارڈ کے راؤنڈ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ آپ ان کے روم میں انتظار کر لیجیے۔ کاریڈور میں فرسٹ روم انہی کا ہے۔'' وہ سر ہلا کر ریسپشنسٹ کی ہدایات کے مطابق مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی۔ اسے انتظار کرتے بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے تھے جس وقت اسود روم میں داخل ہوا وہ دروازے کے سامنے والی دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھتے ہوئے وہ جملے ترتیب دے رہی تھی جو اس نے اسود کے سامنے ادا کرنے تھے۔ وہ یہاں بنا کسی گھبراہٹ کے آئی تھی مگر یہاں آکر بے حد گھبراہٹ کا شکار ہوگئی تھی۔ وہ آہٹ پر پلٹی تھی اور اسود کو دیکھ کر تمام تر جملے اور الفاظ اڑنچھو ہوگئے تھے۔

اسود اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا مگر اس کے چہرے پر ابھرنے والا یہ تاثر بس پل بھر کو رکا تھا۔ اس کے بعد وہاں سنجیدگی و درشتگی آ گئی تھی۔

''کیوں تشریف لائی ہیں آپ یہاں؟ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں آوارہ ہوں لفنگا ہوں مسز کے پیچھے لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہوں اور جو لڑکیوں کا پیچھا کرسکتا ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے، سب کچھ۔''

بیٹھا ہوا ہوئی چیئر کے قریب جا کر ہاتھ میں پکڑا اسٹیتھوسکوپ رکھتے ہوئے اس نے جس طرح سے فارحہ کو دیکھا تھا اور جس طرح سے اپنے آخری دو لفظوں پر زور دیا تھا وہ اسے مزید شرمندہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

''میں آپ سے ایکسکیوز کرنے آئی ہوں اسود۔'' سارے ترتیب وار لفظ کہیں کھو گئے اس کے لبوں پر صرف یہی آسکا وہ وہیں کھڑی اپنے ہاتھ مسلنے لگی تھی۔

''اچھا جی...... مہربانی جلدی جلدی ایکسکیوز کیجیے اور یہاں سے تشریف لے جائیے آپ کو تو پتا ہے کہ کتنا برا انسان ہوں میں۔ پھر آپ تنہا ہیں اور خوب صورت بھی کچھ نقصان ہوگیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتی رہ جائیں گی۔''

بنا اس کی طرف دیکھے انتہائی لاتعلقی سے کہتا وہ فائل کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ فارحہ نے اپنا شرمندگی سے جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے خفا ہیں۔ ٹھیک ہے میں آپ کی ناراضی ڈیزرو کرتی ہوں مگر...... مگر آئی ایم سوری! پلیز مجھے معاف کردیں میں نے بہت مس بی ہیو کیا تھا آپ کے ساتھ۔''

وہ وہیں کھڑی سوچ سوچ کر شرمندہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔ اسود نے فائل سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ہوگیا ایکسکیوز؟...... اب جائیے۔'' اس نے واپس نظریں فائل پر گاڑ دیں۔ فارحہ مزید خجل ہوگئی وہ ہاتھ ملتی سامنے والی کرسی تک آن رکی تھی۔

''میں شرمندہ ہوں اسود!'' وہ رو دینے کو تھی مگر اسود کو اس پر ترس نہیں آیا تھا۔

''او ریئلی...... میں تو سمجھا تھا کہ آپ صرف دوسروں کو شرمندہ کرنا جانتی ہیں۔'' اس نے بے حد طنزیہ نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ اس کا لب و لہجہ انتہائی جلا بھنا ہوا تھا۔ وہ خود کو اسود کے اس رویے کے لیے گھر سے ہی تیار کرکے لائی تھی مگر اس وقت اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسود کا مزید ایک طنزیہ جملہ اسے رلا دے گا۔

''آج آپ جو بھی کہیں گے میں سن لوں گی کیونکہ غلطی بہرحال میری ہی تھی۔ اسی لیے میں آپ سے ایکسکیوز کر رہی ہوں۔ میں نے بہت غلط الفاظ استعمال کیے تھے آپ کے لیے۔''

''وہ الفاظ اتنے نامناسب بلکہ غلط تھے آپ کو مجھ سے ایکسکیوز کرتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔'' اس کا انداز اب طنزیہ نہیں تھا مگر سنجیدگی و درشتی ہنوز برقرار تھی۔

''مجھے بہت شرم آرہی ہے ابھی بھی اور اگر شرم نہ آرہی ہوتی تو میں دو روز پہلے ہی آپ سے ایکسکیوز کرلیتی۔''

اسود نے جھٹکے سے فائل بند کر دی تھی اور میز پر کہنی کا سہارا لے کر دو انگلیوں سے پیشانی مسلنے لگا تھا۔ فارحہ کو اس کی خاموشی غنیمت لگی وہ جلدی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ جتنا چاہے مجھے برا بھلا کہہ لیں جتنا چاہیں ڈانٹ لیں مگر مجھے معاف کر دیں۔"

اس کے اس قدر التجائیہ انداز میں کہنے کے باوجود بھی اسود کے چہرے کے کھنچاؤ میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

"آپ میری پوزیشن کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس روز میں نے جو کچھ بھی کہا وہ غیر ارادی طور پر کہا تھا آپ ایک ڈاکٹر ہیں اسود! کسی انسان کو تڑپتے دیکھنا اور پھر اس کی موت کی خبر سننا آپ کے لیے معمول کی بات ہو سکتی ہے مگر میرے لیے یہ ایک معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے اس بچے کی آنکھوں میں زندگی کے لیے حسرت دیکھی تھی۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر رحم کی بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ زندگی کی خواہش کیا ہوتی ہے؟ زندگی کی چاہ کسے کہتے ہیں؟ یہ سب باتیں میں نے بس اسی پل میں جانی تھیں۔ وہ بچہ کس قدر چھوٹا تھا ابھی تو اس نے دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا، دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنا تھا لیکن چند لوگوں کی غلطی کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا ٹھیک ہے شاید اللہ نے اسے اتنی ہی زندگی دی تھی۔" اس نے دکھ اور مایوسی سے کہا تھا۔ "مگر میں کیا کرتی مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی بات آ سکی تھی کہ آپ لوگوں کی وجہ سے...... پھر مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ طلحہ ہے...... بس اس لیے میں......" دکھ کی کیفیت میں بولتی وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ اپنی بات کا ردعمل جاننے کے لیے اس نے اسود کی جانب دیکھا تھا۔ اس کا انداز ہنوز برقرار تھا البتہ پیشانی سے ہاتھ ہٹائے وہ ترچھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظر ملتے ہی اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

فارحہ کو مایوسی سی ہوئی۔ اسود کے چہرے پر خفگی تھی نہ درشتی، طنز نہ اجنبیت اس کا چہرہ قطعی طور پر سپاٹ تھا فارحہ کوئی اندازہ نہ لگا سکی تو مایوس سی ہو گئی۔

"آپ مجھے معاف نہیں کرنا چاہتے؟" اٹھنے سے قبل اس نے آس و نراش کی کیفیت میں ایک آخری سوال کیا تھا اور اب کی بار اسود نے اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ سیدھا کر کے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔

"طلحہ کون ہے؟"

فارحہ کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ اپنی بات میں اس کا حوالہ دے چکی تھی۔ وہ جواب کا سوچ رہی تھی نڈھال سی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے گردن نہیں اٹھائی تھی بلکہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی تھی۔

"طلحہ ہے نہیں۔" اس نے بوجھل سی آواز میں توقف کیا "وہ تھا۔"

"مطلب۔"

"بھائی تھا وہ میرا...... جڑواں بھائی۔" اس نے آنسوؤں کے گولے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔

"سات سال کی عمر میں وہ بھی ایک ایسے ہی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ ہم دونوں آئس کریم کھانے جا رہے تھے...... روڈ کراس کرتے ہوئے...... پتا نہیں کہاں سے ایک بائیک اور......" اس کا سانس اٹکنے لگا تھا۔ آنسوؤں کے جس ریلے کو وہ روکنے کی سعی کر رہی تھی وہ موقع ملتے ہی بہہ نکلا تھا اور وہ جو ہاسٹل سے نکلنے کے بعد یہاں آتے تک دل میں مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ رونا نہیں ہے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے بے ساختہ رو دی تھی۔ آنسو روک لینا آنسو چھپا لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اور وہ تو اپنے ہر جذبے کے معاملے میں ابھی ناپختہ تھی۔ خوش ہوتی تو کتنی دیر تک ہنستی رہتی غصہ آتا تو بے دریغ اس کا اظہار کر دیتی پھر غم تو بڑوں بڑوں کو رلا دیتا ہے۔

"میرا بھائی میری آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ میں واپس گھر نہیں جا سکتی تھی اور وہاں کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس بچے کو تڑپتا دیکھ کر میں سمجھی کہ وہ طلحہ ہے اور وہ طلحہ ہی تھا میرا بھائی نہ سہی تو کسی اور کا...... میں پھر سے سات سالہ فارحہ بن گئی تھی جس کی چیختی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔ میں ایک اور طلحہ کو مرتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر......" وہ پھر سے رونے لگی تھی کافی دیر بعد اس نے چہرہ اپنی انگلیوں سے رگڑ کر صاف کرنا چاہا۔ اس کا سارا چہرہ بھیگ چکا تھا تبھی اسود نے اس کے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی تھی۔

"ایم سوری! مجھے تم سے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔" اس کی جانب ٹشو پیپر بڑھاتے ہوئے اس نے شرمندگی سے کہا تھا۔ فارحہ نے جلدی سے ٹشو پیپر پکڑ لیا۔

"اگر آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھتے تو میرے اس دن کے رویے کو بھی نہ سمجھ پاتے اور پھر آپ یہی سوچتے کہ میں کس قدر بدتمیز لڑکی ہوں۔"

"نہیں یہ تو خیر میں پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ تم کتنی بدتمیز ہو۔" فارحہ نے بال کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ ہلکے پھلکے سے انداز میں کہہ رہا تھا وہ پھیکی سی مسکراہٹ مسکرا دی۔ اسے اسود کی یہ بات آج بری نہیں لگی تھی بلکہ آج اسے اسود کی کوئی بات بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔

"میں آپ سے ایکسکیوز کر رہی ہوں۔"

"ایکسکیوز تو مجھے بھی تم سے کرنا چاہیے میں نے بھی تو تمہیں کافی برا بھلا کہا تھا۔" وہ رائے لینے والے انداز میں اس کی جانب دیکھ کر بولا تھا۔ فارحہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ آپ کا حق بنتا تھا کسی نے اتنا سب کچھ مجھے کہا ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتی۔"

اسود کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تمہیں پتا ہے فارحہ! تمہارا مسئلہ کیا ہے۔" ٹشو پیپرز کا ڈبہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے دریافت کیا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی کچھ نمی باقی تھی فارحہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

"تم حد سے زیادہ جذباتی ہو۔"

"ہاں ہوں...... میں بہت زیادہ جذباتی ہوں مگر اپنی اس جذباتیت کو میں ختم نہیں کر سکتی۔ یہ میری فطرت کا حصہ ہے۔" اس نے بغیر کسی شرمندگی کے اپنی اس کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے وہ قطعی طور پر بھول گئی تھی کہ دو روز قبل تک وہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں بے حد نفرت محسوس کر رہی تھی۔

اسود نے کچھ بھی کہنے اور اس کی بات پر تبصرہ کرنے کی بجائے انٹرکام اٹھا لیا تھا۔

"تم کیا لوگی چائے، کافی یا کچھ اور منگواؤں تمہارے لیے۔" فارحہ نے بے حد حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز بڑا ہی دوستانہ تھا۔ وہ اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے فارحہ یہاں کچھ کھانے پینے کی غرض سے ہی آئی ہے۔"

"میں تو سافٹ ڈرنک لوں گا دراصل چائے یا کافی مجھے پسند نہیں ہے...... او کے میں تمہارے لیے بھی سافٹ ڈرنک منگوا لیتا ہوں۔" اسے خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا اور اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بٹن پش کرنے کو تھا کہ فارحہ نے ٹوک دیا۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا؟" اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا تھا جواباً اسود نے ریسیور کان سے ہٹا کر اسے خفگی سے گھورا۔

"اب کیا معافی، معافی کی گردان کر کے تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو۔"

"نہیں یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" وہ یکدم گڑبڑا سی گئی۔

"پھر کیا مطلب تھا۔" اس کا انداز ہنوز تھا۔

"آپ کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے تو میری شرمندگی بھی ختم ہو جائے گی۔"

"میرے کہہ دینے سے تمہاری شرمندگی ختم ہو جائے گی۔" اسود نے ریسیور ہاتھ میں تھامے کرسی کی بیک سے کمر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔ فارحہ نے اثبات میں گردن ہلا دی تو وہ بڑی بے ساختگی سے بولا۔

"کر دیا ہے میں نے تمہیں معاف...... اب کہو تو اسٹامپ پیپر پر بھی لکھ دوں تاکہ تمہاری تسلی بھی ہو جائے۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ دل سے ایک بھاری بوجھ سرکا تو لبوں پر مسکراہٹ خود بخود بکھر گئی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ اسود بھی مسکرا رہا تھا۔

پھر اس نے یکدم ہاتھ میں پکڑا ریسیور لہرایا تھا۔

"اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں سافٹ ڈرنک کا آرڈر دے دوں۔" وہ متبسم و شریر سا استفسار کر رہا تھا فارحہ مسکرا کر نفی میں گردن ہلاتی کھڑی ہو گئی۔

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔"

اسود نے چند لمحے کچھ سوچا تھا پھر ریسیور رکھ دیا تھا۔

"کیسے جاؤ گی تم؟ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا تھا۔

"میرے پاس میری گاڑی ہے۔" اسود نے سر ہلا دیا وہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے معاف کر کے آپ نے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے۔ اس بچے کی موت کا غم ایک طرف مگر آپ سے اور ڈاکٹر عبداللہ سے اس قدر بدتمیزی کرنے کے بعد میں بہت گلٹی فیل کر رہی تھی...... مجھے معاف کرنے کے لیے شکریہ اسود۔" اس نے بہت تشکرانہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا جبکہ وہ لاپرواہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"اور میرے ساتھ یہاں تک آنے کے لیے بھی شکریہ۔" اس نے پھر کہا تو گویا وہ جھنجھلا گیا۔

"تمہیں جتنے شکریہ ادا کرنے ہیں وہ سب ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری زبان کو بار بار زحمت کرنی پڑے۔" فارحہ اس کے کٹیلے انداز پر یکدم مسکرا دی۔

"خیر اب آپ اتنے بھی اچھے کام نہیں کرتے کہ میں بار بار شکریہ ادا کرتی رہوں۔" وہ صاف اسے چڑا رہی تھی۔ "لیکن بہرحال اس سافٹ ڈرنک کے لیے شکریہ جس کی آفر ابھی آپ نے کی تھی۔" ایک ہاتھ کار کے کھلے دروازے پر رکھے دوسرے ہاتھ کا شیڈ سا آنکھوں پر رکھے وہ اسے شرارت سے دیکھ رہی تھی تیزی سے غروب کی طرف پیش قدمی کرتے سورج کی چمکیلی نارنجی زرد کرنیں املتاس کے چھدرے پتوں سے نکل نکل کر اس کے وجود کا احاطہ کر رہی تھیں۔

"اور آپ کا اس آفر کو رد کر دینے کا شکریہ۔" وہ بولا تھا۔ "ویسے میرا خیال ہے اگر تم اس آفر کو قبول کر لیتیں تو ہماری یہ ملاقات ایک اچھی دوستی کی شروعات ہو سکتی تھیں۔"

پینٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر بازو سینے پر باندھتے ہوئے وہ تائید طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نجانے ہوا چلی تھی یا کسی پنچھی نے اڑان بھری تھی بہرحال املتاس کے پتوں میں ہلچل مچی تھی۔ پتے ہٹے تو چمکیلی کرنیں اس کی آنکھوں میں گھستی چلی گئیں۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔

بند پلکوں کے سامنے گہرے سیاہ بھنورے جیسی آنکھیں امید کے دیے کی مانند روشن ہو گئی تھیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں سامنے اسود ابراہیم ویسے ہی دیے اپنی آنکھوں میں جلائے اسے دیکھ رہا تھا۔

فارحہ نے سر جھٹکتے ہوئے اس احمقانہ بات سے پیچھا چھڑوایا اور پرس سے نکال کر سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا لیے۔

''سافٹ ڈرنک کی آفر قبول نہ کرنے کے باوجود میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہماری یہ ملاقات ایک اچھی دوستی کی شروعات ہے۔'' اسود خیر سگالی کے انداز سے مسکرا دیا۔ دیے کی لو پوری شدت سے چمکی تھی مگر فارحہ کو اپنے دماغ کا فتور لگا۔ سو ایک بار پھر سر جھٹک دیا اسود کو خدا حافظ کہہ کر وہ کار میں بیٹھ گئی۔

اسود واپس جانے کی بجائے وہیں کھڑا اس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد کھڑکی سے منہ نکالا تھا۔

''اور وہ سافٹ ڈرنک ڈیو رہا۔'' مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ وہ اسے خبردار کر رہی تھی۔ وہ اس کی بات پر کھل کر مسکراتا ایک ہاتھ سینے پر رکھے ذرا سا جھکا تھا۔

''اٹس مائی پلیژر میم۔''

فارحہ نے ہنستے ہوئی گاڑی بیک کی تھی۔

✦

یکے بعد دیگرے ہونے والی ان ملاقاتوں کے بعد ان کی اگلی ملاقات خاصے توقف سے ہوئی تھی اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں کم سے کم وہ اسود کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

پروفیسر ذکریا کی کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اپنے فرینڈز کے ساتھ ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں میں بیٹھی آتے جاتے لوگوں پر ثنا کے بے ساختہ تبصروں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یونہی لاشعوری طور پر گردن گھماتے ہوئے اس کی نظر نے جس شخص کو دیکھا اس پر اسے اسود ابراہیم کا گمان گزرا تھا اس نے تصدیق کی غرض سے دوبارہ دیکھا مگر اب اس کی پشت فارحہ کی جانب تھی۔

''اسود! یہاں کیوں آئے گا جرنلزم ڈپارٹمنٹ میں بھلا اس کا کیا کام۔'' وہ ابھی سر بھی جھٹک نہ پائی تھی کہ حجاب کی بات نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

چند منٹوں بعد جب وہ کسی بات پر بے ساختگی سے قہقہہ لگا رہی تھی تب کسی نے اسے پکارا تھا۔ اس آواز کو وہ بخوبی پہچان سکتی تھی۔ اپنی کچھ دیر پہلے والی حیرانی کو نظر انداز کرتی وہ کھڑی ہو کر اس کی جانب آئی تھی اسود کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی اور چونکہ وہ اس سے ناواقف تھی تبھی تمام تر توجہ اسود پر مرکوز رہی۔

''آپ یہاں کیسے؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تو جواب دینے کی بجائے اپنے ساتھ کھڑی لڑکی سی اس کا تعارف کروانے لگا تھا۔ الوینہ ابتہاج اسود کی کزن تھی اور ذکریا یونیورسٹی سے مائیگریٹ ہو کر آئی تھی اور بقول اسود چونکہ وہ یہاں کسی سے بھی واقف نہیں تھی اس لیے تنہا ڈپارٹمنٹ آتے

ہوئے گھبرا رہی تھی۔ اسود اسے یہاں ڈراپ کرنے آیا تھا اور اس کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے اسے ڈپارٹمنٹ کے اندر تک چھوڑنے آ گیا تھا۔

''جھوٹ بولنے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے اسود! میں نے تو تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے بلکہ تم نے خود ہی گھبراہٹ گھبراہٹ کے نعرے لگانے شروع کر دیے تھے۔ اب مان لو کہ تمہارا اپنا دل میرے ساتھ یہاں تک آنے کو چاہ رہا تھا۔''

الوینہ کے جارحانہ انداز میں کہنے پر اسود ہنسنے لگا تھا۔ الوینہ بھی مسکرا رہی تھی بس فارحہ ہی نہیں مسکرا سکی۔ اسے ان دونوں کے درمیان ایک مانوس سا رشتہ محسوس ہوا تھا اور نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی نظریں الوینہ کے گالوں پر بھٹک رہی تھی جن میں ہنسنے کے باعث دو گڑھے بے حد نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ خوب صورت تھی مگر مسکراتے ہوئی آنکھوں میں شرارت سموئے بہت خوب صورت لگنے لگی تھی۔ فارحہ کو اپنا آپ ان دونوں کے درمیان بڑا غیر ضروری سا لگا۔ ابھی وہ اپنی اس نامانوس سی کیفیت پر قابو ہی پا رہی تھی کہ اسود نے پھر اسے مخاطب کر لیا۔

''دراصل اس ڈپارٹمنٹ میں میں تمہیں ہی جانتا تھا۔ سوچا کیوں نا الوینہ کو تم سے ملوا دوں۔ آئی ہوپ اس کی گھبراہٹ اور اجنبیت ختم کرنے میں تم اس کی کچھ مدد کرو گی۔'' وہ دیکھ اسے رہا تھا جبکہ چڑا الوینہ کو رہا تھا۔

''شیور وائے ناٹ۔'' اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے یہ ذمہ داری قبول کر لی مگر ساتھ ہی اس کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک سوال ابھرا تھا۔ اس نے کبھی اسود کو اپنے ڈپارٹمنٹ کے متعلق نہیں بتایا تھا کبھی اتنی تفصیلی گفتگو کا موقع ہی نہیں آیا۔

''اچھا تو پھر میں چلتا ہوں تمہیں واپسی پر ڈرائیور پک کرے گا۔'' وہ الوینہ سے کہہ کر فارحہ سے مخاطب ہوا تھا۔

''اس کا خیال رکھنا کہیں گم وم ہو گئی تو ساری ذمہ داری تمہاری ہی ہو گی۔'' وہ چڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''اس نے تو مجھے بالکل ہی بچی سمجھ لیا ہے۔'' مسکراتے ہوئے وہ فارحہ کی جانب مڑی تھی اور خوش دلی سے مسکرا دی تھی۔

''تعارف تو ہمارا ہو چکا اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میں پہلے تمہیں اپنی فرینڈز سے ملواتی ہوں۔'' الوینہ جب بے تکلف ہو رہی تھی تو اسے بھی زیادہ آپ جناب کرنا مناسب نہیں لگا۔ حجاب وغیرہ تو نجانے کہاں غائب ہوئی تھیں۔ وہ اسے لیے کینٹین میں آ

گئی اور الوینہ کو وہ اپنے بارے میں کیا بتاتی۔ الوینہ نے اسے ایسا کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا وہ جلدی بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی۔ سننے سے زیادہ بولنے سے شغف رکھتی تھی یہی دونوں "خصوصیات" فارحہ کی شخصیت کا حصہ تھیں مگر اسے پہلی بار اپنی دوسری خصوصیت کے مضر اثرات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہی تو ہو گئی۔ یقیناً جب وہ مسلسل بولتی ہو گی تو سامنے والے کے دل میں ویسی ہی فیلنگز ہوتی ہوں گی جیسی کہ اس وقت اس کے دل میں تھیں۔ اسے الوینہ سے الجھن سی ہونے لگی وہ اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ مجبوراً اسے صرف سننا پڑا اچھی خاصی بدمزہ ہو گئی تھی وہ مگر ایسا بھی کچھ دیر کے لیے ہوا ذرا دیر سے ہی مگر وہ الوینہ کی باتوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی گفتگو خاصی دلچسپ تھی۔

"پہلے میرا ارادہ بھی ہاسٹل میں رہنے کا تھا مگر کاشفہ آنٹی مجھے اپنے یہاں رہنے کے لیے کہہ رہی تھیں پھر اسود نے بھی فورس کیا تو میں مان گئی۔ چند ایک روز میں میرے گھر والے بھی آ جائیں گے تو میں اپنے گھر شفٹ ہو جاؤں گی۔ ویسے تم اسود کو کب سے جانتی ہو؟"

بہت تفصیل سے بتانے کے بعد اس نے پوچھا تو کوک کا سپ لیتے ہوئے وہ اپنی اور اسود کی پہلی ملاقات یاد کر کے مسکرا دی۔

"زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا......"

اسی وقت ثنا' قانتا اور حجاب آ گئیں تو سوال خود بخود نظر انداز ہو گیا۔ وہ اسے ان سب سے متعارف کروانے لگی تھی۔

+

تحریم کی سالگرہ تھی۔ حسین اس موقع کو بہت اچھے طریقے سے سیلبریٹ کرنا چاہتا تھا اسی سلسلے میں اس نے ڈنر کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ تحریم نے فون پر اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔

"میں کیا کروں گی تم لوگوں کے ساتھ جا کر؟" تحریم کے مسلسل اصرار پر اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"ہم کھانا کھانے باہر جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ جا کر کھانا ہی کھاؤ گی۔"

"تحریم پلیز نا۔" اسے سمجھ نہ آیا کہ تحریم کو کیسے انکار کرے۔ "یار! مجھے کباب میں ہڈی بنا کر لے جانا ضروری ہے کیا؟"

"شٹ اپ فری! مجھے پتا تھا کہ تم یہی بات کرو گی۔" اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"بہت خوب! جب پتا تھا تو دعوت کیوں دی تھی۔" وہ جیسے محظوظ ہوتی ہوئی بولی تھی۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا بس اسی لیے۔" وہ جل کر گویا ہوئی فارحہ نے ہنسنا شروع کر دیا۔

"میں تو اس لیے انکار کر رہی تھی کہ حسین بھائی کو برا لگے گا۔"

"کیوں؟"

"انہوں نے ڈنر کا پروگرام اس لیے رکھا ہو گا تا کہ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار سکیں۔"

"تم اور تمہاری عقل کی پرواز۔" تحریم اکتا ہی تو گئی تھی۔

"حسین نے مجھ سے خود تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے کہا ہے پھر اسود بھی تو ہو گا۔"

"گویا اس کباب میں تنہا میں ہڈی نہیں ہوں گی۔" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے ٹکڑا لگایا تھا اور یہی بات جب اس نے حسین اور اسود کے سامنے کہی تھی تو اسود جھینپ کر ہنسا تھا جبکہ حسین کا قہقہہ زبردست تھا۔

اور چونکہ ڈنر حسین کی طرف سے تھا اس لیے وہ انہیں اپنی پسند سے آواری لے آیا تھا۔ چار افراد کے لیے ٹیبل پہلے سے ریزور تھا۔

"یار اسود! تمہیں نہیں لگتا ہمیں بھی بریانی آرڈر کرنی چاہیے تھی؟" ویٹر کے کھانا سرو کر کے جانے کے بعد یکدم حسین نے کچھ سوچتے ہوئے سے انداز میں اسود سے پوچھا تھا۔

اسود نے حیرانی سے سر اٹھا کر حسین کو دیکھا وہ بخوبی واقف تھا کہ اسے بریانی سے کبھی بھی اتنی رغبت نہیں رہی۔ مگر چند لمحوں کے توقف سے حسین کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے اسے ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ ساتھ والی میز پر موجود جوڑے کے سامنے رکھی بریانی کی ڈش دیکھتے ہوئے وہ بڑی بے ساختگی سے مسکرایا تھا۔ ساتھ ہی تحریم پر بھی ایک نگاہ ڈالی تھی۔ وہ بڑی شد و مد سے فارحہ کو اپنے نئے سندھی اور بلوچی کڑھائی والے کپڑوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"میری دور کی نظر ذرا کمزور ہے حسین...... اس لیے بریانی کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ البتہ اتنا مجھے یقین ہے کہ یہ بریانی تھوڑی spicy ہے تم یوں کرو یہ اسپیکٹیز ٹرائی کرو اس کا ٹیسٹ بریانی سے بھی زیادہ اچھا ہے۔" اسٹکس کی مدد سے اسپیکٹیز کھاتے ہوئے اس نے بھی حسین کے سے انداز میں ذو معنی بات کی۔ ساتھ ہی اسپیکٹیز کی ڈش اس کی طرف بڑھا دی۔ حسین نے اپنی پلیٹ میں اسپیکٹیز نکالتے ہوئے حسرت بھری نگاہ ساتھ والی میز پر ڈالی تھی۔

"اسپیکٹیز کی تو خیر کیا بات ہے۔ لیکن بریانی......"

"بریانی کو بھول جاؤ بیٹا! اسپیکٹیز کو تمہاری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔" اس نے چڑانے والے انداز میں کہا اور اس تمام گفتگو کے دوران فارحہ پہلی بار چونکی تھی۔ اس نے ان دونوں کی تقلید میں اس طرف دیکھا تو جہاں بات کرتے ہوئے وہ دونوں وقتاً فوقتاً دیکھ رہے تھے۔

"نہیں بھول سکتا میں بریانی کو۔" حسین نے بیچارگی سے کہا۔ "دیکھ نہیں رہے اس کی آؤٹ لک ہی کتنی اچھی ہے۔" فارحہ نے اس میز پر موجود بریانی کی ڈش کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے وہاں بیٹھی

سرخ لباس اور مناسب سے میک اپ میں اس لڑکی کو پھر یکدم مشکوک سے انداز میں اسود اور پھر حسین
دیکھا تھا۔

''آپ لوگ بریانی کی تعریف کر رہے ہیں؟'' اس کا انداز استعجابیہ سا تھا۔ اسود نے تو بے ساختہ
مسکراہٹ کو چھپانے کی بجائے خود بھی سوالیہ نظریں حسین پر گاڑ دیں۔

''اور نہیں تو کیا...... ہم لوگ بریانی کی ہی تعریف کر رہے ہیں تم خود دیکھ لو دور سے دیکھ کر ہی
ہو جاتا ہے کہ بریانی کتنی اچھی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا کہ فارحہ شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔

''ہاں فری! یہ لوگ بریانی کی تعریف ہی کر رہے ہیں۔'' تحریم نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا تھا۔
نہایت وثوق سے کہہ رہی تھی۔

''مجھے بھی دور سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ بریانی کتنی اچھی ہے لیکن ایک بات ہے مجھے تو اس
قورمہ زیادہ پسند آیا ہے۔ ذرا دیکھنا تو فری! ہمارا بروسٹ اس ڈارک براؤن قورمے کے آگے کتنا
لگ رہا ہے۔'' اس کا انداز حسین سے کچھ مختلف نہ تھا۔ وہ بیچارگی سے کہہ رہی تھی اور افسوس سے ساتھ
میز پر بیٹھے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی جو ان لوگوں کی باتوں سے بے نیاز اپنی ساتھی سے مصروف گفتگو
حسین نے تحریم کی بات پر محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا تھا۔ اسود اور فارحہ نے اس کا ساتھ دیا تھا جبکہ تحریم
برابر کر کے اطمینان سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گئی تھی۔

انہوں نے کھانا اسی خوشگوار ماحول میں کھایا تھا۔ کھانے کے بعد حسین اور تحریم کافی پینا چاہتے
اسود نے انکار کر دیا۔ فارحہ کو بھی کوئی ایسی خواہش نہیں تھی کیونکہ اگر ابھی کافی پی لیتی تو ساری رات جاگ
گزارنی پڑتی اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

''اس ہوٹل کے ہال میں کیلی گرافی کی بڑی اچھی نمائش لگی ہے میں کافی دن سے سوچ رہا تھا
آنے کا مگر فرصت نہیں مل سکی اب آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔'' اپنی نشست
کھڑے ہوتے ہوئے اسود نے کہا پھر یکدم ہی اسے ابھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔

''تم یہاں بیٹھ کر کیا کرو گی جب تک یہ لوگ کافی پیتے ہیں ہم دونوں اگزیبیشن دیکھ آتے ہیں''
اس نے اتنا اچانک فارحہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ جو انکار کرنے کا سوچ رہی تھی خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی
وہ حسین اور تحریم کو کچھ وقت دینا چاہتی تھی اور اسے ایسا لگا تھا کہ اسود نے بھی اس سے کچھ مختلف نہ
تبھی بنا کسی تعرض کے اس کے ساتھ آ گئی تھی۔

''تو آپ کو کیلی گرافی میں بہت انٹرسٹ ہے؟'' مختلف نمونوں کو سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے
نے بڑے شرارتی سے انداز میں دریافت کیا تھا۔

''الکل نہیں۔'' اسو[illegible] انداز میں کہا۔ ''میں تو ان لو برڈز کے درمیان خود کو [illegible]

تھا۔''
بھی۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں لبوں پر ہاتھ رکھے بے ساختگی سے ہنسنے لگی تھی۔

''پھر اب کیا کیا جائے؟'' اسود نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم نے مجھے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔'' اس کے ہم قدم ہوتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ میرے بارے میں؟'' جواباً فارحہ نے کہا تو وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا تھا۔

''اپنے بارے میں بتانا مناسب سمجھو۔'' فارحہ اس کی بات پر ایک بار پھر ہنس دی تھی۔

اس روز حسین اور تحریم کو تنہائی فراہم کرنے کی غرض سے ان دونوں نے آپس میں بہت سی باتیں
کیں۔ وہ ایک دوسرے کی پسند و ناپسند جان چکے تھے اور یہ ان کی پہلی طویل نشست تھی۔

اس کے بعد تو گویا وقت نے روشنی کا دامن تھام لیا تھا۔ اتنی تندی و تیزی تو کبھی بھی وقت کے مزاج
میں نہ تھی۔ ایک موسم سے دوسرے موسم تک کا سفر...... ہوا کے رخ بدلنے کا سفر...... خوشبو کے بکھر کر
پھیلنے کا سفر...... ایک خواہش سے دوسری خواہش کے جنم لینے تک کا سفر...... خواب کا سفر......
اس کو یہ سب بس ایک خواب ہی لگا تھا۔ خواب ایسے ہی تو ہوتے ہیں آنکھیں بند کرو تو سب اچھا
لگیں آنکھیں کھل جائیں تو......

وہ اب اکثر ڈیپارٹمنٹ آنے لگا تھا۔ وہ الوینہ سے ملنے آتا تھا مگر اس سے بھی بڑے تپاک سے ملتا
شادی میں اسود ابراہیم کو مزید قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ زندگی کی ترجیحات کیا ہیں جیون کا
لازم کس عزم سے زیادہ بلند ہے۔ پسند کیا ہے ناپسند کیا ہے۔ وہ اسود ابراہیم کے بارے میں بہت
کچھ جان گئی اتنا کچھ کہ ایک روز وہ خود بھی چونک گئی اور تبھی اسی اسود ابراہیم کے لیے اپنے دل میں پیدا
عجب کیفیات کا ادراک ہوا۔

پہلے اپنی غلط فہمی پر ہنستی رہی پھر کچھ دن تحیر میں گزرے۔ اگلے چند روز اس نے سر جھٹک کر ان
سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا اور پھر...... پھر وہ جھنجلا گئی اور اسی جھنجلاہٹ میں اس نے خود سے اپنی
سب سے بڑا اعتراف کر لیا۔

وہ الوینہ سے ملنے ڈیپارٹمنٹ آتا تھا۔ وہ اس کی منتظر رہنے لگی حالانکہ یہ بات اس کے لیے حیرانی
اور جھنجلاہٹ کا باعث بھی مگر ان دونوں کیفیات میں کتنا لطف تھا یہ بھی وہی جانتی تھی۔

انہی دنوں میں سے ایک دن تھا جب تالاب کے ساکت پانی میں پتھر گر گیا۔

الوینہ ملتان گئی ہوئی تھی۔ اسود اس کی غیر موجودگی میں آیا۔

''الوینہ تو ملتان گئی ہوئی ہے۔'' فارحہ نے اسے بتایا تو وہ کچھ دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد
چلا گیا۔ چند روز بعد جب اس نے الوینہ کو اسود کی آمد کے متعلق بتایا تو وہ گویا تحیر سے بولی۔

"اچھا......لیکن اسود تو جانتا تھا کہ میں ملتان گئی ہوئی ہوں۔"

"شاید بھول گیا ہوگا۔" اس نے خود ہی کہہ دیا مگر فارحہ چونک گئی تھی اور حقیقتاً ساکت پانی میں پتھر گرا تھا۔

وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ "اگر اسود اس بات سے باخبر تھا کہ الوینہ ملتان گئی ہوئی ہے تو پھر وہ ڈپارٹمنٹ کیوں آیا تھا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

اور جب اس نے الوینہ کی عدم موجودگی کے متعلق اسے بتایا تھا تو وہ حیران ہوا تھا اور نہ ہی مایوسی نے اسے گھیرا تھا۔ "کیوں؟ ایسا کیوں ہوا تھا؟"

کیا وہ الوینہ سے ملنے نہیں آیا تھا؟ حالانکہ اس نے خود کہا تھا کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا کیوں نہ الوینہ سے ملتا جاؤں۔ وہ سوچتی گئی اور خود سے سوال بھی کرتی گئی اور سوال در سوال کے اس سلسلے نے بہت سی گنجیاں کھول دی تھیں۔ وہ خود بخود مسکرانے لگی چند روز بعد اسود پھر ڈپارٹمنٹ آیا اس وقت الوینہ یونیورسٹی میں لائبریری گئی ہوئی تھی۔

"آج بھی آپ الوینہ سے ملنے آئے ہوں گے۔" اسود کو اپنے سامنے پاکر وہ شرارت سے کہے بنا نہیں رہ سکی تھی۔ اسے خبر تھی کہ اسود اس کے متبسم انداز پر کس قدر حیران ہوا ہے۔

"نہیں...... آج تو میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" اب حیران ہونے کی باری فارحہ کی تھی۔

"تحریم کی ای میل آئی تھی میں اسی کا میسج تمہیں دینے آیا تھا۔"

اور اس کے بعد یہ دیکھے بغیر کہ سامنے والا شخص اس کے یوں بے ساختہ ہنسنے پر حیرانی و تشویش میں مبتلا ہو رہا ہے وہ ہنستی چلی گئی تھی اور وہ جو ایک گمان تھا کہ اسود اس سے ملنے آتا ہے یقین میں بدلتا چلا گیا اسے لگا کہ الوینہ تو بس ان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہی ہے۔ اسود جب بھی آتا اپنے آنے کی وجہ الوینہ کو قرار دیتا اور وہ ایک یقین بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس کی بات تسلیم کر لیتی۔

وہ اپنے اس نئے جذبے کو کسی کے ساتھ شیئر کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ "کسی" تحریم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا تھا جبکہ تحریم اور حسین شادی کے بعد مستقل لندن مقیم ہوگئے تھے اور چونکہ فارحہ کے پاس ہاسٹل میں کمپیوٹر نہیں تھا اس لیے اسود کو موصول ہونے والی ای میلز میں وہ فارحہ کے لیے بھی کوئی نہ کوئی پیغام دے دیتی جنہیں اسود جوں کا توں اس تک پہنچا دیتا تو پھر جب رابطے بڑھے تو تعلق بھی بڑھتا چلا گیا۔ اس کی پسندیدگی محبت کی منازل عبور کرنے لگی تھی۔

✦

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو کوئی چوتھی بار بہت دھیان سے دیکھا تھا جس کے اوپر

Happy Valentine's Day اور اندر اسود ابراہیم کا نام بہت نمایاں تھا۔

شک کی گنجائش تو اب جیسے بچی ہی نہیں تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے سرخ گلابوں کے خوب صورت سے مہک اپنے اندر منتقل کر کے وہ بڑے آسودہ انداز میں میٹرس پر لیٹ گئی تھی۔

اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ چودہ فروری اس کے لیے ہمیشہ بہت عام سا دن رہا تھا کبھی بھی اس دن کو اہمیت نہ دی تھی مگر آج اسود ابراہیم کی جانب سے پھول اور کارڈ وصول کر کے وہ قدر حیران ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ خوش تھی بلکہ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ چودہ فروری یکایک اس کے لیے خاص دن بن گیا تھا اور آج کے دن اسے تحریم کی کمی بڑے شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

جب وہ اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت خوشی سے لطف اندوز ہو رہی تھی تو اس کی عزیز ترین سہیلی اس سے دور تھی۔ وہ اسے بے حد مس کر رہی تھی اور اسی طرح تحریم اور اسود کو یاد کرتے ہوئے وہ سوگئی تھی۔ صبح ہلکی سی حرارت محسوس ہو رہی تھی اسی لیے وہ ڈپارٹمنٹ بھی نہ جا پائی تھی۔ ہاسٹل میں اسے کوریئر کے ذریعے پھول بھجوائے گئے تھے۔

وہ اسی سرشاری کیفیت میں سوگئی اور جب بیدار ہوئی تب بھی اسی قدر سرشاری محسوس ہو رہی تھی۔ ثنا نے پھول بھی دیکھے تھے اور کارڈ بھی...... وہ کافی دیر تک حیرانی کا اظہار کرتی رہی تھی۔

"کتنے گھنے ہو تم دونوں۔ کئی بار یہ حضرت ڈپارٹمنٹ آئے اور...... ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوسکی۔"

اور دراصل افسوس تھا اس بات کا اس کے بعد وہ کافی دیر تک منہ پھلا کر اپنی مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی رہی تھی فارحہ کو اسے منانے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا وہ جلد ہی راضی ہوگئی تھی اور کچھ ہی دیر کے بعد وہ دونوں نہر کے ساتھ ساتھ چہل قدمی فرما رہی تھیں۔ آسمان کا رنگ وہی تھا...... موسم کے تیور میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی...... نہر کے گدلے پانی پر درختوں کے چھدرے پتوں سے ٹپکتی سنہری کرنیں بھی ویسی تھیں۔ فضا میں ویسی ہی مہک تھی جو یہاں سے گزرتے ہوئے عام دنوں میں محسوس ہوتی تھی۔ بدلا تو اس کے دل کا موسم تھا جو سب سے الگ سب سے جدا محسوس ہوتا تھا۔ وہ خوش تھی اور چاہتی تھی کہ ہر راہ چلتے کو اپنی خوشی سے آگاہ کرے۔

واپس ہاسٹل پہنچیں تو الوینہ بڑی بے تکلفی سے ثنا کے بستر پر لیٹی ان دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

"پچھلے ایک گھنٹے سے میں احمقوں کی طرح تم دونوں کا انتظار کر رہی ہوں۔" اٹھتے ہوئے وہ شکوہ کر رہی تھی۔ ثنا نے جواب دینا ضروری سمجھا۔

"تو صرف یوں کہو نا کہ گھنٹہ بھر سے ہمارا انتظار کر رہی ہو باقی کی بات ہم خود ہی سمجھ جاتے۔"

اور وہ ان دونوں کو چھوڑ کر خود چائے بنانے چلی گئی الوینہ اکثر ہاسٹل آجایا کرتی تھی آج بھی وہ ایک … کے سلسلے میں ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔

وہ واپس آئی تو ان لوگوں نے کتابیں کھولیں ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ثنا کے گھر سے فون آ گیا وہ چائے وہیں چھوڑ افراتفری کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم آج ڈپارٹمنٹ کیوں نہیں آئیں؟'' ثنا کے جانے کے بعد الوینہ نے پوچھا۔ وہ ایک کتاب سے کچھ اہم پوائنٹس نقل کر رہی تھی جبکہ الوینہ ایک دوسری کتاب کے مفصل جائزے میں بھی مگن تھی فارحہ نے نہ آنے کی وجہ بتائی تو وہ چائے کا ایک بڑا سا سپ لیتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولی۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ صبح اسود بھی ڈپارٹمنٹ آیا تھا تمہارے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔''

''اچھا'' فارحہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے اپنے لہجے کو حتی المقدور سرسری رکھا تھا۔ مبادا کہ الوینہ چونک جائے۔ ساتھ ہی اس کی نگاہوں نے کونے والے میز پر رکھے پھولوں کا جائزہ لیا تھا۔

''پتا ہے فارحہ! اسود نے مجھے بہت پیارا سا گولڈ کا نیکلس گفٹ کیا ہے۔ تم میرے گھر آؤ گی تب میں تمہیں دکھاؤں گی۔ دراصل وہ نیکلس میں ابھی پہننا نہیں چاہتی شادی کے بعد ہی پہنوں گی بلکہ وہ نیکلس ہی کیوں تم میرے گھر آؤ گی تو میں تمہیں وہ سارے گفٹس دکھاؤں گی جو اسود مجھے مختلف اہم موقعوں پر دیتا رہا ہے۔ پتا ہے صبح ہی صبح پہلے اس نے مجھے فون پر مبارک باد دی اور تبھی ڈنر ساتھ کرنے کا وعدہ بھی لے لیا مگر پھر گیارہ بجے کے قریب ڈپارٹمنٹ چلا آیا تا کہ مجھے میرا وعدہ یاد دلا دے۔''

''بہت دوستی ہے تم دونوں کی، اور مبارک کس خوشی میں دی اس نے تمہیں، کہیں سالگرہ تو نہیں ہے آج تمہاری؟ اگر ایسی بات ہے تو اچھی سی ٹریٹ تیار کر رکھو۔'' اس کی بات بہت دلچسپی سے سنتے ہوئے فارحہ نے کہا تھا جبکہ الوینہ نے اس کی بات سن کر ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی ننھے بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

''دوستی...... دوستی میں کوئی کسی کے لیے اتنا نہیں کرتا جتنا کہ اسود میرے لیے کرتا ہے اور جہاں تک سالگرہ کی بات ہے تو چودہ فروری کو ہر لڑکے اور لڑکی کی سالگرہ ہوتی ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھی نہیں الوینہ۔'' اس نے بہت نارمل انداز میں دریافت کیا تھا۔ بلاشبہ الوینہ کی پہلی بات اسے چونکا گئی تھی۔ الوینہ نے کتاب ایک طرف رکھی تھی اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''ارے میری پیاری سی فرینڈ! اتنی بڑی ہو گئی ہو مگر تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چودہ فروری کو کیا ہوتا ہے؟ ...... اسود مجھے ویلنٹائن ڈے وش کرنے آیا تھا۔ برتھ ڈے وش کرنے نہیں آیا تھا۔ پچھلے چار سالوں سے یہی کرتا آ رہا ہے تو اب کیسے بھول جاتا بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں بھولتا میری ہر چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اسے یاد رہتی ہے۔'' وہ خوشی خوشی اسے بتا رہی تھی۔

''اور جہاں تک ٹریٹ کی بات ہے وہ تو میں تمہیں ضرور دوں گی مگر تھوڑا سا انتظار کر لو بس کچھ ہی دنوں

بعد میری اور اسود کی شادی کی ڈیٹ فکس ہونے والی ہے تو پھر......''

وہ اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی اور یہ دیکھے بنا کہ فارحہ کے چہرے کے رنگ کتنی تیزی سے بدل رہے ہیں، وہ نت نئے انکشافات کرتی ہی جا رہی تھی۔ چار سال پہلے ان دونوں کی منگنی اسود کے اصرار پر ہوئی تھی اور عنقریب ان کی شادی متوقع تھی۔ الوینہ کے گھر والوں کا مستقل لاہور شفٹ ہونا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

''اسود میرے لیے بہت پوزیسو رہا ہے شروع سے تم نے بھی نوٹ کی ہو گی یہ بات کہ کس طرح وہ مجھ سے ملنے ڈپارٹمنٹ آیا کرتا تھا ہفتے میں دو چکر تو لازمی تھے اس کے ہی از سو کیوٹ...... بالکل دیوانہ ہے وہ میرا۔'' وہ اس کی دیوانگی پر جیسے ہنسی تھی اور فارحہ کی حالت تو یوں تھی گویا کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔

''تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا اس بارے میں۔'' اس کے لبوں سے مردہ سی آواز نکلی تھی۔

''تم نہیں جانتی تھیں اس بارے میں؟'' الوینہ نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا اور فارحہ کو سمجھنے کے لیے چہرہ شناسی کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مگر الوینہ اس وقت صرف اپنے اور اسود کے ٹھوس تعلق کو پورے جذب سے پرت در پرت اس کے سامنے کھولتی جا رہی تھی۔

''مجھے لگا تم اور اسود کافی گہرے دوست ہو تو اس نے تمہیں ضرور بتایا ہو گا۔''

الوینہ بہت عام سے انداز میں اپنی حیرانی کا اظہار کر رہی تھی جبکہ گلدان میں رکھے وہ سرخ گلاب اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ اچنبھے کی سی کیفیت میں پھولوں پر نظر ٹکائے الوینہ کو سن رہی تھی جو بہت یقین سے کہہ رہی تھی۔

''اسود میرا اہم دنیا کا وہ واحد شخص ہے جس کے متعلق میں پورے دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کی زندگی میں، میں سب سے اہم ہوں۔ رئیلی فارحہ...... بہت چاہتا ہے اسود مجھے۔''

+

وہ بستر پر اوندھی لیٹی چادر پر انگلی سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی کمرے میں داخل ہوتی ثنا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر خاموشی سے الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا دیا چائے تیار ہونے تک وہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہی تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ثنا نے پوچھا۔ بال سمیٹتے ہوئے اس نے مثبت انداز میں سر ہلا دیا۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کی طبیعت گری گری سی تھی۔ اتنے ہی دنوں سے آج وہ ڈپارٹمنٹ جا پائی تھی مگر وہاں بھی عجیب سی بے کلی نے گھیرے رکھا تو سر درد کا کہہ کر جلدی واپس چلی آ گئی تھی۔

اپنے پرس میں یہاں وہاں ہاتھ مار کر اس نے سر اٹھایا۔

"ثنا تمہارے پاس کوئی پین کلر ہوگی؟"

اپنے لیے مگ میں چائے نکالتی ثنا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر بے اختیار ہی اسے ٹوک بیٹھی۔

"جب درد ہے ہی نہیں تو پھر بلاوجہ پین کلرز استعمال کرنے کا فائدہ۔"

فارحہ نے بنا کچھ کہے پرس ایک طرف رکھا اور مگ منہ سے لگا لیا۔ ثنا چائے اور بسکٹ کا ڈبہ لیے اسی کے بستر پر آ بیٹھی۔ فارحہ نے دو تین سپ اندر انڈیلے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ الماری کے اوپری کیبن سے سفری بیگ نکال کر باہر رکھا پھر ایک ایک کر کے مختلف سوٹ ترتیب سے رکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ دیگر ضرورت کی چیزیں بھی بستر پر ڈھیر کرتی گئی۔ ثنا نے اس کے اس عمل کو قدرے تحیر سے دیکھا تھا وہ اپنے آپ میں الجھی بیگ بھرتی جا رہی تھی۔

"کہیں جا رہی ہو فارحہ؟"

"ہاں سیالکوٹ جا رہی ہوں۔" اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ "میں سب گھر والوں کو بہت مس کر رہی ہوں۔ طبیعت بھی شاید اسی لیے بوجھل رہتی ہے۔ کچھ دن سب کے ساتھ گزاروں گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔"

چائے میں بھگویا بسکٹ منہ تک لے جاتے ہوئے ثنا نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کے الفاظ میں سچائی کا عنصر تلاش کر رہی تھی اس دن جب وہ فون سن کر واپس کمرے میں آئی تھی تو اس نے بہت کچھ سن لیا تھا۔ الوینہ کے جانے کے بعد فارحہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور وہ سب باتیں جو سات دن قبل اس کے لیے حیران کن تھیں اب افسوس کا باعث بن گئی تھیں۔ ان سات دنوں میں اس نے فارحہ جیسی زندہ دل پر جوش اور ہر دم متحرک رہنے والی لڑکی کو بہت مضمحل دیکھا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بھی کہتی جب بھی ثنا اس کا درد سمجھ سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ جانے سے پہلے تمہیں اسود سے بات کر لینی چاہیے۔" ثنا کے اتنا کہنے پر بیگ پر جھکی فارحہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا بات کرنی چاہیے مجھے اسود سے؟"

فارحہ کی استفہامیہ نظریں خود پر محسوس کرنے کے باوجود ثنا نے کئی پل خاموشی کی نذر کر دیے پھر جیسے سوچتے ہوئے دھیمی سی آواز میں گویا ہوئی۔

"کیا پتا الوینہ نے جھوٹ بولا ہو۔"

کچھ کہنے کی غرض سے کھلے اس کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ بڑی بے بسی سے اپنے لبوں کو بند کرتے ہوئے انتہائی دقت سے اس نے خود کو مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔

"تم نجانے کیا سمجھ رہی ہو ثنا! یقین کرو میں الوینہ یا اسود کی وجہ سے نہیں جا رہی بلکہ میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے جا رہی ہوں...... بلیوی یار! میں ان لوگوں کو بہت مس کر رہی ہوں۔"

"مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔ تم اپنے گھر والوں کی وجہ سے ہی جا رہی ہو گی۔" ثنا نے قریب آ کر ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے پتا ہے کہ اسود کے اس اقدام نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے اور اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے سامنے بیٹھ کر بات کر لو ممکن ہے الوینہ نے جھوٹ......"

"وہ جھوٹ کیوں بولے گی ثنا؟" اس نے بے اختیار اس کی بات قطع کی تھی۔

"یقیناً ان دونوں کے درمیان کوئی کمٹ منٹ ہوگی ورنہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ الوینہ نے یونہی اسود سے منسوب کر لیا اور کیا ہم لوگوں نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ واقعی کیسے اس کی خاطر ڈپارٹمنٹ آیا کرتا تھا۔" اس کی آواز اٹکنے لگی تھی مگر وہ بڑے ضبط سے بولتی گئی۔

"اسود میرا دوست تھا اور میں اسے ایک اچھا انسان بھی سمجھتی تھی اس کے علاوہ میری اس کے ساتھ کوئی وابستگی نہیں تھی مگر افسوس کہ اس نے مجھے تعریف کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ویلنٹائن ڈے پر اس نے پھول بھجوائے تو بہرحال میں اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ضرور ہو گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے مجھے اصلیت کا پتا چل گیا اور بس بات ختم...... اسود ابراہیم سے تعلق بس یہیں تک تھا کچھ روز اپنے گھر والوں کے ساتھ رہوں گی تو سب بھول جاؤں گی...... آئی پرامس جب میں واپس آؤں گی تو تمہیں پہلے والی فارحہ نور بن کر ہی ملوں گی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کا دل کتنا بے چین تھا کاش کوئی اس سے پوچھتا۔

وہ ثنا کی جانب بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ پاؤں بستر سے لٹکائے سر جھکائے پاؤں کے ناخن سے زمین کرید رہی تھی۔ اس کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا کہ اسے فارحہ کی بات پر یقین آیا ہے یا نہیں۔

"کتنے نقاب چڑھا رکھے ہیں لوگوں نے اپنے چہروں پر۔ چہرہ دیکھ کر کوئی کیا جانے کہ اندر سے دل کتنے سیاہ ہیں۔" وہ تاسف سے گویا تھی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے کبھی اس سے تفصیلی بات چیت نہیں کی...... بس ایک آدھ بار کی سلام دعا۔" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ شخص ایسا ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بھی...... مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ وہ شخص ایسا ہو سکتا ہے مجھے تو اس کی آنکھوں میں ہمیشہ سچ نظر آتا تھا۔ ان آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دکھائی دیتی تھی اور یہ دونوں باتیں ہی غلط نکلیں۔

میں اس کے التفات کو اپنی مرضی کا رنگ دیتی چلی گئی پتا نہیں سب لڑکیاں ہی ایسی ہوتی ہیں یا صرف میں ہی احمق نکلی۔ تیاریاں کرتے ہوئے وہ مسلسل خود سے مخاطب رہی تھی پھر جب روانگی سے قبل وہ ثنا کو میس آف کروانے اور ڈپارٹمنٹ میں لیو اپلیکیشن سے متعلق ہدایات دے رہی تھی تو ثنا اپنے خدشے کا اظہار کیے بنا نہیں رہ سکی۔ اس کی بات سن کر وہ مسکرا دی تھی اور ثنا کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔

"اسود ابراہیم میرے لیے اتنا اہم بھی نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر اپنا کیریئر تباہ کر لوں..... تم یقین رکھو میں واپس ضرور آؤں گی۔" وہ ثنا سے گلے مل کر کمرے سے باہر نکل گئی مگر اس تمام عرصے میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کمرے کی دہلیز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ہاتھ میں پکڑا اسٹری بیگ اس نے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے دائیں طرف میز پر پڑے گلدان کو دیکھا تھا سرخ گلابوں کا رنگ اڑ چکا تھا۔

"ثنا ان پھولوں کو کوڑے دان میں پھینک دینا۔" وہ دہلیز عبور کر گئی تھی مگر اس کی آواز کا کرب وہیں کہیں رہ گیا تھا۔ ثنا کے پاس۔

+

بارش کے بعد آسمان خاصا نکھر چکا تھا۔ ہوا میں روانی اور مردا کی مہک تھی۔ ذرا دیر سے جھونکا لہراتا تو دریچے سے لپٹی بیل پر کے قطرے ٹپاٹپ برستے۔ ایک ایسا ہی قطرہ اس کی پیشانی پر آ ٹھہرا تو وہ چونک سی گئی۔

نیچے لان میں گھاس سے زیادہ بارش کا پانی رکا ہوا تھا۔ سامنے سڑک پر سفیدے کے درختوں کی قطاریں تھیں تیز ہوا شاخوں سے ٹکراتی تو پتے تالیاں بجانے لگتے۔ ہوا کی سرسراہٹیں وہ یہاں تک سن رہی تھی۔

اس نے پیشانی سے قطرہ پونچھا اور سینے پر بازو باندھتے ہوئے نیلے آکاش کی گہرائیاں تلاشنے لگی کتنا وقت بیت چکا کتنا وقت بیت رہا تھا کتنے آرام و وثوق سے اس نے ثنا سے کہہ دیا تھا کہ جب واپس آئے گی تو پہلے والی فارحہ بن کر اس سے ملے گی اور ثنا تو ثنا ایک طویل عرصہ ہوا وہ خود بھی اس پرانی والی فارحہ تنویر سے نہیں مل پائی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس فارحہ تنویر کو قطعی طور پر بھول ہی گئی تھی جس کے عزائم بہت بلند تھے جو زندگی میں بہت آگے جانا چاہتی تھی کچھ کر دکھانے اپنا نام منوا لینے کی خواہش جسے ہر دم متحرک رکھتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لائی تھی البتہ زندگی کے ہر پل سے خوشیاں کشید کرنا اس کا من پسند کام تھا۔ باتیں تو عام سی تھیں مگر یہی عام باتیں کچھ لوگوں کے لیے بہت خاص بن جاتی ہیں۔

"تم بہت بدل گئی ہو۔" اسے یہ کامپلیمنٹ اکثر ملنے لگا تو وہ بجائے حیران ہونے کے خود ہی مسکرا کر سر تسلیم خم کر دیتی۔

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی کسی ایک شخص کے لیے اتنا اہم ہو جائے کہ اس کی زندگی کا ہر عزم ہر خواب ثانوی حیثیت اختیار کر جائے۔ اس کی آپ بیتی نہ ہوتی تو یقینی طور پر وہ اس بات پر سختی سے سر ہلا دیتی مگر ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ حماقت ہی سہی مگر بہر حال وہ اس حماقت کی مرتکب ہو رہی تھی۔

ثنا کے کئی فون آئے وہ اسے واپس آنے اور از سر نو پڑھائی شروع کرنے پر زور دیتی فارحہ ہنس کر ٹال دی۔

"یار اب پڑھنے میں دل نہیں لگتا گھر والوں سے دور رہنا بھی اب مشکل لگتا ہے جہاں تک "اسود بنام" کا معاملہ ہے تو میں تو اسے بھول بھی گئی تم پتا نہیں کس مسئلے میں الجھی ہو۔ اسود نے الوینہ سے شادی کی ہے یا کسی اور سے مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی پروا ہے اور اسی لیے میں عنقریب شادی بھی کر رہی ہوں کچھ روز میں منگنی کا باقاعدہ فنکشن بھی ہو جائے گا تو میں تمہیں تصویریں بھجواؤں گی۔"

اس نے بڑے آرام سے جھوٹ بول دیا وہ ثنا کو یہ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس میں الوینہ اور اسود کو ایک ساتھ دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے اگر ایسا ہوا تو وہ جذبات کی رو میں بہتی وقت کے کسی کمزور لمحے کی زد میں آ جائے گی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی۔ کسی کمزور لمحے کی زد میں آ کر وہ اسود ابراہیم کو اس کی جیت پر خوش ہونے کا موقع کیوں فراہم کرتی۔ اس کے سینے پر سجے میڈلز میں ایک اور اضافہ کیوں کرتی وہ......؟

اور وہ جو اس نے کہا تھا کہ اسود ابراہیم اس کے لیے اہم نہیں ہے تو یہ غلط تھا۔ اسود ابراہیم اس کے لیے اہم نہ ہوتا تو کیا وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑتی اپنا کیریئر برباد کرتی؟

اسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تو گردن موڑ کر دیکھا۔ مہوش کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"رات بھر سے جاگ رہی ہو سو جاؤ کچھ دیر میں فریش ہو جاؤ گی۔" اس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہارون بھائی سو گئے کیا؟" اس کا کہا نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں تو...... ابھی تو چائے پی رہے ہیں کچھ دیر میں آفس جائیں گے......"

"آفس جاتے ہوئے وہ مجھے ہاسپٹل ڈراپ کر دیں گے؟" اس کا انداز استفہامیہ تھا۔ مہوش نے الجھ کر اسے دیکھا "ہاسپٹل جا کر تم اب کیا کرو گی؟"

فارحہ نے گردن موڑ کر نظریں سفیدے کے سرسراتے جھنڈ پر ٹکا دیں۔

"کچھ کام ہے۔" اس کے مختصر سے جواب پر بیڈ شیٹ کی سلوٹیں درست کرتی مہوش مزید الجھ گئی پھر سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس شخص کے گھر والوں سے رابطہ ہو جائے تو ہارون سب کچھ خود ہی

ہینڈل کرلیں گے تم......"

"میرا جانا ضروری ہے مہوش...... بہت ضرروری۔" اس کا لب و لہجہ دوٹوک تھا۔ مہوش چند لمحے اپنی بہن کی اس عجیب سی کیفیت کا کوئی مناسب نام تلاش کرتی رہی پھر مایوس ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

+

اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ سر اٹھا کر دیکھا کمرہ نمبر ۱۲۔ کمرے کے باہر وہ اتنی ہی دیر رکا جتنی دیر میں گلے سے لٹکا اسٹیتھوسکوپ اس کے ہاتھ میں قید ہوا۔ ملگجے سے اندھیرے نے اس کی آنکھوں سے مانوس ہونے میں کچھ وقت صرف کیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیڈ کے ایک طرف آرکا۔

کتنے ہی پل یونہی گزر گئے۔ وہ بجائے اس کا چیک اپ کرنے کے مسلسل اس کی صورت تکے جا رہا تھا۔

کل اس نے فارحہ تنویر کو اس شخص کے لیے روتے دیکھا تھا۔ اس کی کلائی میں لگی ڈرپ کی سوئی کو شہادت کی انگلی سے چھوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

"اگر میں یہ سوئی نکال دوں تو......؟" کوئی کمینہ اس کو ترغیب دے رہا تھا۔ نظر سرک کر داؤد حسن کے چہرے تک چلی گئی۔ بند ہونٹوں پر خاموش التجائیں اس کا دامن تھامنے کو ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔

وہ کھڑا رہا، سوچتا رہا مگر یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گا تبھی عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا نیوی بلیو کھدر کی شلوار قمیص، ہم رنگ دوپٹہ، آنکھوں کی سرخی سے جھلکتی ادھوری نیند کی شکایت اور گندمی رنگت میں گھلی اداسی...... بڑی سرعت سے اس نے اپنی انگلیاں داؤد حسن کی کلائی سے الگ کرلیں۔

"میں راؤنڈ سے واپس آیا تو ان کا خیال آ گیا سوچا کیوں نہ جاتے جاتے ایک نظر دیکھتا جاؤں۔" فارحہ کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی دیکھتے ہوئے اس نے تسلی بھری وضاحت دی تو وہ پرسکون سی نظر داؤد حسن پر ڈال کر بیرونی کھڑکی کی جانب بڑھ گئی۔

اسود نے اسے اپنے قریب سے گزر کر کھڑکی کے پاس جاتے دیکھا۔ کل کے برعکس خاصی بہتر حالت میں تھی وہ۔ سلیقے سے برش کیے بال شانوں پر پڑے تھے مگر اس کی آنکھوں کے گرد سوزش خاصی نمایاں تھی وہ پرحزن دکھائی دیتی تھی۔

اس نے داؤد حسن کے ہوش و خرد سے بیگانہ وجود کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھا پھر دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ فارحہ کی آواز کمرے کی خاموشی میں گونجی۔

"میں اس شخص کی کنڈیشن کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

اسود قدرتے حیرت سے پلٹا۔ گلدان سے وہ کل کے باسی پھول نکال چکی تھی اور اب للی کی ٹہنیوں کو

...کرتے ہوئے ذرا سا رخ اس کی جانب موڑے استفہامیہ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"اس شخص۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ کتنے ہی پل چپکے سے گزر گئے فارحہ اس کی بڑبڑاہٹ سے ناواقف ...سوال کے جواب کی منتظر اسے دیکھ رہی تھی شیشے کی کھڑکی پر پڑے بھاری پردے کی درز سے دھوپ کی ...ی سی لکیر براہ راست اس کے چہرے پر پڑنے لگی تھی۔ گندمی رنگت دمکنے لگی جیسے گندم کی نوخیز بالیاں ...وپ کی تپش سے دمکنے لگتی ہیں۔

"تم اپنے شوہر کو اس شخص کہہ کر مخاطب کرتی ہو؟...... اسٹرینج...... کتنا غیریت بھرا انداز لگتا ہے جیسے ...نسان کسی غیر کی بات کر رہا ہو...... انہیں عجیب نہیں لگتا؟"

وہ اپنی حیرانی کا اظہار کر رہا تھا حقیقتاً اسے یہ بات بڑی عجیب سی لگی تھی۔

"جب انہیں ہوش آ جائے گا تو یہ سوال تم خود ہی پوچھ لینا۔" پھول گلدان میں سجا کر وہ سنجیدگی سے ...س کی طرف پلٹی۔

"کیا تم مجھے داؤد کی کنڈیشن کے بارے میں بتا سکتے ہو؟" بظاہر اس کی حیرانی کو قطعی خاطر میں نہ ...اتے ہوئے وہ بڑے اعتماد سے اس سے مخاطب تھی اگرچہ دل سٹپٹایا تھا۔

"اور یہ کہ داؤد کتنے عرصے میں ریکور کرلیں گے؟"

اسود نے کچھ کہنے کی غرض سے منہ کھولا پھر بنا کچھ کہے بند کرلیا۔ کتنے ہی ثانیے اسے حیران نظروں سے اسے دیکھنے میں گزرے پھر گردن گھما کر داؤد حسن کو دیکھا۔

"یہ کیس اب ڈاکٹر صائم ہینڈل کر رہے ہیں۔"

اس کے لہجے میں رکھائی تھی۔ فارحہ نے اسے بڑی بے اعتنائی سے دروازے کی سمت بڑھتے دیکھا مگر دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے وہ پل بھر کو رکا تھا۔

"میں تمہیں ڈاکٹر صائم سے ملوا دیتا ہوں تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے ان سے پوچھ لینا...... فارغ ہو کر میرے کیبن میں آ جاؤ! ابھی ڈاکٹر صائم وہیں ہوں گے۔"

فارحہ کو وہ خود سے الجھا ہوا لگا خود سے بھی خفا اس سے بھی ناراض۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں تمہیں کیا سمجھوں اسود ابراہیم! نجانے کونسا روپ سچا ہے تمہارا۔ وہ جو مجھے دیکھ کر سرد مہر ہو گیا تھا یا وہ جو میرے پاس بیٹھ کر اچھے دوستوں کی طرح مجھے تسلیاں دے رہا تھا یا وہ روپ زیادہ حقیقی ہے جس کے لہجے میں مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے صرف رکھائی ہوتی ہے یا وہ جو خفگی بھرے لہجے میں بھی اپنائیت میرے ارد گرد چھوڑ گیا ہے۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ادھورے پراجیکٹ کو مکمل کرنے کی ایک اور کوشش ہو۔"

بند دروازے سے ٹکرا کر نگاہ داؤد حسن پر جا ٹھہری۔

"اور ایک یہ شخص ہے جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں مگر لگتا ہے کہ ایک تعلق ہے بہت گہرا، بہت مضبوط۔ شکریہ تو تمہارا میں ادا نہیں کرسکوں گی مگر احسان مند ساری زندگی رہوں گی کہ بہرحال تم نے مجھے ذلت سے بچایا ہے۔"

پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتی وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔

ساڑھے پانچ سال...... اس کی زندگی کا سب سے بے کیف حصہ...... ہاسٹل چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد وہ میڈرڈ (اسپین) چلی گئی۔ دل کا حال چھپانے کو بہانے تو کئی تھے پھر یہاں پاپا کے کئی رشتہ دار مقیم تھے سو کسی نے اعتراض نہیں کیا اور اگر کوئی اعتراض کرتا بھی تو کیا۔ اس سرزمین سے منہ موڑ کر کہیں تو جانا ہی تھا کہ اس سرزمین نے اسے کسک بھینٹ کی تھی اور کسک کبھی آنکھوں کی سرزمین پر سیلاب نہیں لاتی مگر دل کی دنیا کو اجاڑ اور خالی پن ضرور عطا کر دیتی ہے۔

کبھی تحریم کی گفتگو میں اسود ابراہیم کا ذکر آتا تو وہ بات بدل دیتی۔ وہ اپنا غم اس سے بھی شیئر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیز میں ملازمت کی۔ مختلف زبانیں سیکھیں پھر متعلقہ ادب کا مطالعہ بھی کرلیا بس اگر نہیں پڑھ پائی تو وہ ممتاز مفتی ان لو اور کلیات رابرٹ فراسٹ جیسا شاہکار ادب تھا۔

پھر انہی دنوں مما کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تو وہ اس کی شادی کے لیے فکرمند رہنے لگیں اور اس بار اس نے مجبوراً ان کی بات مان لی اور پاکستان واپس آ گئی۔ شادی کے لیے رضامند بہرحال وہ اب بھی نہیں تھی۔ پھر ایک ایسے ہی دن میں جب وہ مہوش کے پاس چند روز قیام کی غرض سے آئی ہوئی تھی مہوش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ جھنجھلا کر کار کی چابی لیے گھر سے باہر نکل آئی۔ موسم کے تیور اس وقت بھی متغیر تھے آسمان کے کناروں سے اٹھتا ہوا غبار تیزی سے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ بپھری ہوا درختوں کی شاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر نئے سر چھیڑ رہی تھی۔

وہ اندھادھند گاڑی دوڑانے لگی۔ اضطراب تو گویا خون کیساتھ گردش میں تھا۔

وہ مہوش کو کیسے سمجھاتی کہ جب مکین کوئی اور ہو جبکہ گھر کے دروازے پر نیم پلیٹ کسی اور کے نام کی سجا دی جائے تو یہ بڑا نامناسب لگتا ہے۔ پھر کوئی ایک تو دوغلا کہلاتا ہی ہے اور وہ یہ نامناسب زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

اس کے دل میں کوئی اور تھا جسے چاہ کر بھی وہ باہر نہیں نکال پائی تھی اور اب خود پہ کسی اور کی نیم پلیٹ لگا کر وہ دوہری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

کچھ تو سوچوں میں تندی و تلخی تھی کچھ خون کی گردش میں اضطراب۔ بارش کی اوٹ میں کھڑا وہ شخص دکھائی ہی نہیں دیا۔ ذرا سی غفلت اور وہ شخص موت کے دہانے پر جا پہنچا۔

+

اور اس حادثے سے بڑا حادثہ تو اسود ابراہیم کا پھر سے سامنا تھا۔ وہ شخص جس کا سامنا وہ زندگی میں کبھی دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھی محض اس خوف کی بنا پر کہ کہیں کسی کمزور لمحے کی قید میں وہ اپنا دل اس کے سامنے کھول کر نہ رکھ دے پھر وہ اس پر ہنسے گا اور کہے گا کہ تم احمق ہو فارحہ تنویر جس پل میں تم اپنا آپ مجھ سے ہار گئیں وہ پل تو میری زندگی میں اپنا عکس چھوڑے بنا ہی گزر گیا تھا اور ایک تم ہو جو اس پل کا جوگ سینے سے لگائے پچھلے ساڑھے پانچ سال سے کسی بھٹکی روح کی مانند گھوم رہی ہو۔"

وہ اس شخص کا سامنا کرنے سے اسی لیے گھبراتی تھی کہ کہیں اس کی تمسخرانہ نگاہیں فارحہ کے بدن میں چھید نہ ڈال دیں اور وہی شخص چہرے پر ایک نرم سا تاثر لیے اس کے سامنے بیٹھا بے حد محبت سے اپنی بیوی اور بیٹی کا ذکر کر رہا تھا۔

ڈاکٹر صائم سے داؤد حسن کے متعلق سب کچھ معلوم کر کے وہ اٹھنے لگی تو اسود نے روک دیا۔

"جا کہاں رہی ہو؟ بیٹھو تمہیں بہت اچھی سی چائے پلواتا ہوں۔"

ڈاکٹر صائم اس وقت جا چکے تھے۔ اسود کا انداز بے حد دوستانہ تھا۔ وہ بیٹھی رہی مبادا کہ وہ اس کے رُکنے سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرے پھر یہ بھی تو خدشہ تھا کہ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اس نے جو دروغ گوئی کی ہے اس کا پول نہ کھل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جھوٹ اس نے ارادتاً نہیں بولا تھا۔ یہ تو کل افراتفری میں کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ اسود کو اثبات میں جواب دیتی گئی اور اگر وہ داؤد حسن کو اس کا شریک حیات سمجھ رہا تھا تو اس میں مضائقہ کیا تھا۔ ایک طرح سے اس کا بھرم قائم رہا اور اب خدشہ دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

اس کا دل بے اختیار سر پیٹ لینے کو چاہا وہ متضاد کیفیات و خدشات کا شکار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسود ثمن کی کسی شرارت کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں بہت مس کر رہا ہوں۔ اسے آئی وش ایمن اور ثمن یہاں ہوتیں تو تم سے بھی ان کی ملاقات ہو جاتی۔"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" اس کی گفتگو میں اپنی دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"بہاولپور، ایمن کے پیرنٹس وہیں رہتے ہیں نا۔"

"ایمن۔" وہ چونک سی گئی۔ "لیکن اسود! تم تو الوینہ سے شادی کرنے والے تھے نا؟"

اس نے کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ جواباً اسود نے جیسی نظروں سے اسے دیکھا وہ اسے بوکھلا دینے کے لیے کافی تھیں پھر وہ یکدم مسکرانے لگا، اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی۔

"نہیں فارحہ! میں کبھی الوینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی اور نگاہیں فارحہ پر ٹکی تھیں۔

چائے کا مگ لبوں تک لے جاتا اس کا ہاتھ درمیان میں ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن......" وہ بڑی مشکل سے بولنے کے قابل ہو پائی۔

"الوینہ نے مجھے خود بتایا تھا کہ تم۔"

"کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اسود نے سرعت سے اس کی بات قطع کی۔

"جھوٹ بولا تھا الوینہ نے تم سے کیونکہ وہ خود مجھ میں انٹرسٹڈ تھی۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں نے کبھی اس میں انٹرسٹ نہیں لیا۔ وہ میرے لیے بس ایک عام سی کزن تھی اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔" وہ بولتے بولتے کھڑکی کے پاس جا رکا تھا۔

"اپنی ساری زندگی میں میں نے جس لڑکی میں انٹرسٹ لیا وہ تم تھیں۔ اچھی لگی تھیں تم مجھے۔ میں نے سوچا تھا کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے مگر پھر تم چلی گئیں تو میں نے ایمن سے شادی کر لی......" وہ آرام سے اتنی بڑی بات کہہ گیا گویا یہ معمولی بات ہو مگر فارحہ کے لیے یہ ایک دھچکا تھا۔ کھڑکی سے آتی روشنی یکدم تاریکی میں بدل گئی تھی۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"ایمن سے میرا شادی کا فیصلہ نہایت مناسب تھا وہ جتنی اچھی بیوی ہے اس سے کہیں اچھی دوست ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید اتنا مطمئن تو میں تم سے شادی کر کے بھی نہ رہ پاتا جتنا کہ اب ہوں۔"

اس نے گردن موڑ کر ایک مختصر سی نگاہ فارحہ تنویر پر ڈالی۔ وہ گردن جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سوچ سے وہ ناواقف تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلا شکست و ریخت کا سایہ وہ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے پرسکون ہو کر گردن موڑ لی۔

"تم مجھ میں انٹرسٹڈ تھے...... اچھا؟ حیرت ہے مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ جبھی تو جب الوینہ نے مجھے بتایا کہ تم اور وہ انگیجڈ ہو تو مجھے برا نہیں لگا بلکہ تمہارے پھول بھجوانے کو بھی میں مذاق ہی سمجھی تھی۔ دوستوں میں ایسا مذاق چلتا ہی ہے۔"

اسود لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ لیے اس کی جانب پلٹا اور میز پر ہتھیلیوں کا بوجھ ڈال کر ذرا سا جھکا۔

"بہت خوب...... تمہیں برا نہیں لگا...... بہت گریٹ ہو تم۔ کتنی بڑی باتیں اتنے حوصلے سے برداشت کر لیتی ہو...... آپ کو ایک بات بتاؤں مسز فارحہ! اگر میری کسی فرینڈ نے میرے ساتھ ایسا مذاق کیا ہوتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا۔"

براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ سارے الفاظ دانتوں تلے چبا گیا۔ جتنے اس کے لفظ سخت تھے اس سے کہیں زیادہ لہجہ۔ آنکھوں سے سختی و درشتی جھانک رہی تھی۔ فارحہ کا دل کسی نے مٹھی میں مسل ڈالا۔

"تمہیں یاد ہے اسود! ایک دفعہ میں نے بھی تمہیں ایسی ہی بات کہی تھی تب تم نے مجھے جذباتی کہا تھا۔" سر اٹھائے اس کی آنکھوں میں جھانکتی وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔

"کسی کی فیلنگز کو مذاق کا نام دے دیا جائے اور پھر یہ توقع کی جائے کہ وہ جذباتی نہیں ہو گا نہایت احمقانہ سی سوچ ہے۔" وہ جیسے جھکا تھا ویسے ہی سیدھا بھی ہو گیا۔

"پورے ڈیڑھ برس میں منتظر رہا کہ شاید تم لوٹ آؤ اور تم میری فیلنگز کو مذاق سمجھ رہی ہو۔" وہ درشت ہونے لگا بدگمان تو پہلے ہی تھا۔

(ڈیڑھ برس اور مجھے دیکھو کتنے عرصے سے بنا کسی امید کے منتظر ہوں۔ یہ بھی یاد نہیں بس اتنا پتا ہے کہ ہماری تقدیروں نے بڑا عجیب سا مذاق کیا ہے ہمارے ساتھ)

اس نے اسود کو جھنجلائے ہوئے انداز میں سگریٹ سلگاتے دیکھا اور انگلیوں کی پوروں کی مدد سے آنکھوں کے کناروں میں چمکتی نمی چھپا گئی۔

"اب پرانی باتوں کو یاد کر کے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ تم ایک مطمئن زندگی گزار رہے ہو۔ میں بھی خوشحال ہوں۔ یوں سمجھو کہ ہم دونوں اسی مقام پر ہیں جہاں ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ ایمن سے تمہارا شادی کا فیصلہ نہایت مناسب تھا۔ یوں بھی میں تو شروع سے ہی داؤد سے کمیٹڈ رہی ہوں۔ تمہارے بارے میں تو میں نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا۔ تم میرے لیے صرف ایک دوست تھے۔" اس نے پل بھر کے لیے توقف کر کے اسود کو دیکھا۔

"میں ایک مطمئن زندگی گزار رہا ہوں تم بھی خوشحال ہو......" اس نے پل بھر کا توقف کیا پھر لاپروائی سے بولا۔

"اچھا تم کہتی ہو تو میں مان لیتا ہوں۔"

فارحہ کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس کا انداز اس کے قطعی طور پر برعکس تھا۔

"تم میری بات پر یقین کیوں نہیں کر رہے۔"

اسود نے خود ساختہ سی حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کر تو رہا ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو اسود۔" وہ مزید چڑ کر بولی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"تمہارے چہرے پر لکھا ہے۔"

"کیا لکھا ہے؟"

"یہی کہ تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خود کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی ہو۔"

اس نے اطمینان سے فارحہ کا اطمینان غارت کیا۔

"نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔" وہ بوکھلا سی گئی اور اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن نہایت برا لگا تھا۔

"اب تم جھوٹ مت بولو فارحہ!" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس کے سامنے آ بیٹھا "کیونکہ تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔"

"کیا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے؟" اس کی بے بسی بالآخر اشتعال کی حدود کو چھونے لگی تھی۔

"یہی کہ تم اپنے صحیح مقام پر ہو اور یہ بھی کہ تم داؤد حسن سے کمیٹڈ تھیں اور مجھے صرف دوست سمجھتی تھیں۔" وہ بے حد پر یقین تھا۔

"ہاں یہی سچ ہے میں داؤد سے ہی کمیٹڈ رہی ہوں۔" اس نے ہر لفظ پر زور دیا اور تب وہ پہلی بار بھڑکا۔

"اس کا مطلب تم نے مجھے وقت گزاری کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا......" وہ بے حد پر اشتعال ہو گیا تھا۔

"اسود میں......" اس نے کہنا چاہا مگر اسود نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔

"پلیز فارحہ! اب اپنے حق میں دلائل دے کر مجھے قائل کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں اب تک یہی سمجھتا رہا کہ تم محض الوینہ کی باتوں سے بدظن ہو کر...... مگر مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اصل میں تم خود ہی دھوکے باز تھیں۔"

"کیا دھوکا دیا ہے میں نے تمہیں......" وہ ہکا بکا اس کی شکل تک رہی تھی۔

"میرے جذبات سے کھیلتی رہی ہو تم۔ کیا یہ دھوکا نہیں ہے؟" وہ دبی دبی سی آواز میں چیخا تھا۔

اور فارحہ بے دم سی ہو کر گر گئی۔ اسود ابراہیم کے الفاظ اس کے منہ پر یکے بعد دیگرے تھپڑ مار رہے تھے اور ہر تھپڑ کے ساتھ اس کا حوصلہ مزید پست ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگا وہ دوبارہ کبھی نہیں بول سکے گی جبکہ اسود بول رہا تھا اور بولتے ہوئے اسے قطعاً احساس نہ تھا کہ اس کے لہجے کی تلخی و ترشی کسی کی روح کو چھید رہی ہے۔ کسی کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہے اور کسی کے دل میں موجود حسرت زدہ محبت بنا پلکیں جھپکائے اسے تک رہی ہے۔

پھر اشتعال کی جگہ رنج نے لے لی اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اسے دغاباز اور خود غرض کہہ کر خاموش ہو گیا اور وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی سوچتی چلی گئی کہ اس نے کب اسود کو تفریح کا ذریعہ بنایا؟

سارا کیبن افسردگی سے بھر گیا۔ یہاں وہاں بدگمانی کے ڈھیر تلے گہری خاموشی چھائی رہی۔ وہ دیر تک سر جھکائے اس طویل عرصے کا پل پل چھانتی رہی پھر آنکھوں میں سرخ ڈورے سے اترنے لگے جب دل کی حدود عبور کرنے لگی تو آنکھوں میں بادل سمٹ آئے۔ تب وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر جانے سے ایک بھی قدم بڑھانے سے پہلے وہ اس کی جانب پلٹی جو اپنے دل کا سارا تنفر اس کو دان کر کے اب بیٹھا پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔

"قصور تمہارا ہے نہ ہی میرا۔ بلکہ قصور تو اس سیاہ پل کا ہے اسود ابراہیم! جو ہم دونوں کے بیچ آیا اور آ خل ہو گیا...... اور مشکل یہ ہے کہ ہم چاہ کر بھی اس سیاہ پل کو اپنی زندگیوں سے نکال نہیں سکتے۔"

اس کی آنکھ سے ایک ننھا سا موتی گال پر لکیر چھوڑ کر میز کی سطح پر ٹھہر گیا اس کے لہجے میں شکوہ تھا نہ شکایت بلکہ آواز میں دکھ تھا اور ایک جانا پہچانا سا کرب۔

اس نے اپنے پرس پر گرفت مضبوط کی اور مینہ برساتی آنکھوں کے ساتھ اپنا بکھرا وجود سمیٹتی باہر نکل گئی جبکہ وہ...... میز کی سطح پر پیپر ویٹ جمائے ذرا دیر کے لئے چونکا۔ نگاہ اٹھائی تو بند دروازہ منہ چڑا رہا تھا کی چکنی سطح پر پڑا وہ "قطرہ" سچے موتی کی مانند چمک رہا تھا۔

ایک دروازہ بند ہوا تھا مگر یادوں کی تیز آندھی میں کئی دروازے کھلنے بند ہونے لگے تھے۔

+

اور ایک شام ڈھلنے کے قریب ہے۔ زردی دھوپ میں نارنجی رنگ تو کب کے گھل مل چکے درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے ہیں ابھی ایک سرمئی سا دھندلکا ساری کائنات پر قابض ہو جائے گا پھر قدرت کا ماہر ہاتھ اس کینوس پر سیاہی بھرا اسٹروک لگائیں گے پھر......

آج صبح جب میں بیدار ہوا تو ہمیشہ کی طرح پہلی نظر کھلی کھڑکی سے باہر پھیلے وسیع آسمان پر جا رکی۔ آسمان پہ پچھلی رات کی طرح کالے کالے سفید سفید بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر ان بادلوں میں وہ شدت بھاری پن نہ تھا۔ یوں لگتا تھا بادل برس کر مطمئن ہو گئے اب انہیں جانے کی جلدی تھی اور میرا دل بے اختیار چاہا کہ یہ بادل کہیں نہ جائیں یونہی ہمیشہ آسمان کو گھیرے رہیں۔ بارش برستی رہے کبھی نہ تھمے یا برف باری شروع ہو جائے، تمام سفری راستے مسدود ہو جائیں یا کوئی بھی رکاوٹ...... ایسی رکاوٹ جو "اسے" جانے سے روک دے۔

بے اختیار میرا دل اسے دیکھنے کو چاہنے لگا تھا۔ یہ خواہش اتنی شدت سے ابھری تھی کہ میں خود کو روک نہیں پایا نتیجتاً میں عام روٹین کے برعکس وقت سے پہلے ہاسپٹل میں موجود تھا۔ مجھے اپنے عمل کی شدت پر ہنسی آنے لگی اور اس کے باوجود میں داؤد حسن کے روم میں چلا گیا پھر وہاں فارحہ بھی آ گئی تو میں نے اسے

نظر بھر کر دیکھا۔ حالانکہ یہ نگاہ اس پر ڈالنے کا حق میں نہیں رکھتا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا اور غصہ کیوں نہ آتا میری تو کوئی غلطی بھی نہیں تھی اور...... اور اس کے باوجود اتنے آرام سے وہ میری زندگی سے نکل کر کسی اور کی زندگی میں شامل ہوگئی اور اس نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ حقیقت کیا ہے؟

بہر حال حقیقت کبھی نہیں بدلتی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس گزرے عرصے میں میں اسے کبھی بھی بھول نہیں سکا۔ مجھے تو وہ شام بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد ہے جس شام میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اپنی تمام عمر گزار کر بھی میں جس شام کو اپنے حافظے سے محو نہیں کر سکوں گا وہ وہی شام ہے۔

شاپنگ سینٹر کے گلاس وال کے اس پار ہوا کے نرم جھونکوں سے شام خوشگوار ہو چلی تھی جب سیڑھیاں اترتے ہوئے میں اس سے ٹکرا گیا۔ خدا گواہ ہے کہ اس تصادم میں میری کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی البتہ غلطی ضرور ہوئی تھی مجھ سے بھی اور اس سے بھی۔ وہ چوکنا ہو کر نہیں چل رہی تھی پھر کچھ میں بھی تیزی سے سیڑھیاں عبور کر رہا تھا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے معذرت کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا مگر نجانے مجھے کیا ہوا اور میں گفتگو کو طول دیتا ہی چلا گیا اور اس غیر ارادی اور مختصر ملاقات میں وہ میرے حافظے میں نقش ہو کر رہ گئی۔ ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہی...... جاتے جاتے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

ہماری اگلی تمام ملاقاتیں محض اتفاقی تھیں مگر سرسری قطعاً نہیں تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ مجھے اسے چڑا کر مزہ آتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب مسلسل اتفاقی ملاقاتوں میں وہ مجھے دکھائی دی تو میں خود اس کے سامنے پہنچ جاتا۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے خاصی دلچسپ لگی تھی۔ اگلی چند ملاقاتوں کے دوران یہ دلچسپی بڑھتی ہی گئی اور یہ دلچسپی صرف دلچسپی ہی تھی۔ اس میں محبت جیسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ ہماری آخری ملاقات میں بھی محبت کہیں نہیں تھی۔ البتہ وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو میں کسی ایسے جذبے کا قائل نہیں ہوں جو لمحوں میں تخلیق ہو جائے خودرو بیل بھی اپنی جڑیں زمین کے سینے میں مضبوطی سے پیوست کرنے کے لیے کچھ وقت لیتی ہے تب کہیں جا کر پروان چڑھتی ہے۔

ہاں تو فارحہ تنویر سے مجھے محبت نہیں تھی مگر وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ کب اور کس پل میں یہ حادثہ ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن اس پسندیدگی کا موجب ایک حادثہ ہی بنا تھا اور فارحہ نے اس حادثے کو لے کر کافی مس بی ہیو کیا تھا۔ بات صرف مجھ تک محدود رہتی تو شاید میں برداشت کر لیتا مگر وہ میرے کردار کو ہدف بناتے ہوئے میرے پروفیشن پر انگلی اٹھا رہی تھی اتنی بکواس سن کر خاموش رہنا میرے بس سے باہر تھا نتیجتاً میں نے بھی اسے خوب کھری کھری سنا ڈالیں۔

دو روز بعد اس نے ہاسپٹل آ کر مجھ سے ایکسکیوز کر لیا اور اسی روز میں کسی قدر چونک گیا۔ فارحہ نے فقط مجھ سے نہیں بلکہ ڈاکٹر عبداللہ سے بھی خاصی بدتمیزی کی تھی جبکہ معذرت وہ صرف مجھ سے کر رہی تھی۔

...صرف مجھ سے ہی تھی اور شرمندگی ہم صرف اس شخص سے محسوس کرتے ہیں جسے ہم اہم جانتے ...نہیں جانتا کہ میری عام سی بات پر بھی جل بھن جانے والی اس لڑکی کی زندگی میں میری کیا اہمیت ...ں کہ اس کی اہمیت میری زندگی میں بڑھتی چلی گئی۔ میرا دل اس سے ملنے کے لیے بیتاب رہنے ...یوں قدم خود بخود اس کے ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگے اور وہ مجھے اتنی اچھی لگنے لگی کہ میں نے اس ...کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے والدین کی جانب سے کوئی تعرض نہ تھا مگر کسی بھی باقاعدہ کارروائی ...فارحہ کی رائے جاننا ضروری سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی کیونکہ اس کے ...میں نے اتنی ہی پسندیدگی محسوس کی تھی جتنی کہ میں خود اس کے لیے رکھتا تھا مگر یہ میری غلط فہمی تھی ...بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی پسندیدگی اس حد کو عبور کر کے محبت کی وادی میں قدم رکھ چکی ہے۔

...ویلنٹائن ڈے پر اسے پھول بھجوانے کے کئی روز تک چاہنے کے باوجود میں اس سے کوئی رابطہ نہیں ...ان مصروفیات کی بنا پر اور مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ میرے ان مصروفیات بھرے شب و روز کا ...کوئی اسے مجھ سے بدگمان کر چکا ہے۔

...ینہ میری سیکنڈ کزن تھی۔ میری اس سے اچھی علیک سلیک تھی۔ جن دنوں میں میڈیکل کے فائنل ...تھا ان دنوں میری اور الوینہ کے شادی کا شور اٹھا تھا حقیقت یہ ہے کہ میری مما الوینہ کو خاصا پسند کرتی ...اسے اپنی بہو بھی بنانا چاہتی تھیں مگر میرے انکار کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میری فیوچر پلاننگ میں ...فی الوقت کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ میں بہت اچھا سرجن بننا چاہتا تھا۔ میں اپنے نام کے آگے کئی ...کا حوالہ دیکھنے کا خواہاں تھا۔ سو شادی میری نزدیک ایک جزوقتی کام تھا۔ مجھے قطعی طور پر اندازہ نہیں ...سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود الوینہ کے دل میں اس بات کے نقوش باقی ہیں۔ اس نے انکار کو ...عزتی سمجھا تھا۔ ثناء سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے کئی باتیں بتائیں۔

...ب سے پہلے تو بڑی خوشی سے فارحہ کی منگنی کی خبر دی مگر پھر ساتھ ہی جوش جذبات میں بہت کچھ کہتی ...جن میں سرفہرست یہی بات تھی کہ میں نے فارحہ کو دھوکا دیا ہے۔ یہ الزام میرے لیے دھچکے سے کم ...الوینہ نے میرے انکار کو اپنی بے عزتی گردانتے ہوئے محض انتقامی کارروائی کے طور پر فارحہ کو مجھ ...ظن کیا تھا۔ میں الوینہ سے خوب جھگڑا مگر اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے فارحہ کی غلط ...دور کرنے کا ارادہ کر لیا مگر ثناء سے اس کا ایڈریس مانگا تو وہ بہت منت سے بولی۔

...کیوں آپ اب اس کی پرسکون زندگی کو بے سکون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ روز میں اس ...کی ہو جائے گی اور انشاء اللہ وہ ایک اچھی زندگی گزارے گی اب اگر اس اسٹیج پر آپ اس کے سامنے ...آپ اس کی آنے والی زندگی برباد کر دیں گے۔ ایک بات بتاؤں آپ کو اسود صاحب! ہم لڑکیاں ...کسی سے محبت کرتی ہیں تو پورے دل سے کرتی ہیں دل کی پوری زمین ایک پل میں اس شخص کو الاٹ کر ...

فارحہ نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے مگر میں جانتی ہوں فارحہ بہت بڑی جرنلسٹ بننا چاہتی تھی مگر آپ کی خاطر اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور جو لڑکی اپنا کیریئر برباد کر سکتی ہے کیا وہ محبت نہیں کر سکتی......ایک گزارش ہے میری آپ سے، دوبارہ اس کی زندگی میں دخل مت دیجیے آپ کی بے وفائی کے ساتھ وہ پرسکون زندگی گزارے گی مگر آپ کی محبت کا ذرا سا احساس اس کی شادی شدہ زندگی کو عذاب بنا دے گا۔"

"محبت۔" میں خود بھی چونک گیا۔

"کیا مجھے اس سے محبت تھی۔" میں نے خود سے سوال کیا اور جواب میں ایک گہری اور مہیب خاموشی میرے گرد پھیل گئی۔

پھر کچھ روز میں بے قرار رہا کہ بہرحال اسے کھو دینے کا افسوس تھا رفتہ رفتہ یہ افسوس اس قدر شدید ہوا کہ اذیت بن گیا۔ اس کی موجودگی میں میں اسے پسند کرتا تھا مگر اس کے جانے کے بعد میں اس سے محبت کرنے لگا تھا......گہری محبت۔

یہ محبت بھی بڑی عجیب سی شے ہے جب نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔ مگر جب ہوتی ہے تو اپنا احساس اس شدت سے دلاتی ہے کہ انسان بے بس ہو جاتا ہے۔

میری ہر بے بسی پر غصہ و اشتعال کا غلاف چڑھنے لگا۔ دل ہی دل میں میں اس سے خفا ہو گیا۔ کاش وہ مجھ سے آ کر فقط ایک بار پوچھتی کہ سچائی کیا ہے؟

اسے اسود ابراہیم کے کردار میں اتنا جھول نظر آیا کہ کسی کی ذرا سی دروغ گوئی پر وہ بدگمان ہو گئی۔ یوں دکھ بھی تھا، غصہ بھی اور فارحہ تنویر کو کھونے کا غم کسک کی میخ بن کر میرے دل میں گڑا رہ گیا نتیجتاً میری شخصیت میں کئی تبدیلیاں بھی آئیں میں مجلسی زندگی سے دور ہوتا چلا گیا۔ میرا حلقہ احباب سمٹ کر چند لوگوں تک محدود رہ گیا میری فطرت میں اشتعال انگیزی بڑھ گئی۔ مجھے ذرا ذرا سی باتوں پر غصہ آنے لگا پھر اردگرد رہنے والوں کے اعتراضات بڑھنے لگے تو میں اپنا ساز و سامان سمیٹ کر میڈیکل کی مزید تعلیم کی غرض سے امریکہ جا بیٹھا پھر وہاں بھی کب تک رہ سکتا تھا واپس آیا تو مما میری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

میرے امریکہ میں قیام کے دوران ڈیڈی اپنا ذاتی ہاسپٹل مکمل طور پر اسٹیبلش کر چکے تھے۔ یہ ہاسپٹل ہم دونوں کا خواب تھا سو میں بھی اسی طرف لگ گیا۔ میری تمام تر توجہ ہاسپٹل پر مرکوز ہو گئی یوں زندگی ایک تسلسل سے گزرنے لگی اور تبھی......تبھی وہ پھر میری نگاہوں کے سامنے آن رکی۔ مجھے حیران ہونا چاہیے تھا۔ سو میں جی بھر کر حیران ہوا مگر دوسرا جذبہ اشتعال کا تھا۔ مجھے اس شخص سے نفرت محسوس ہو رہی تھی تبھی میں نے اسے خون دینے سے انکار کر دیا۔ صرف خون ہی نہیں بلکہ میں نے کئی بار بڑی سنجیدگی سے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا یہ شخص اس لڑکی کا شوہر تھا جس سے میں محبت کرتا تھا۔ اسے تکلیف پہنچتی تو اس کی آنکھیں نم ہوتیں یہ مر جاتا تو وہ بھی......اس سے

ہوچنا میرے لیے محال تھا۔

اگلے روز میں نے اپنے رویے کی تلافی کر ڈالی مگر فارحہ کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو مجھے اندر ہی اندر ...میں ڈال رہا تھا۔ وہ بولتی تو اس کی نگاہیں جھکی ہوتی تھیں اور بھی کئی ایسی باتیں تھیں جو مجھے شک میں ...رہی تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھے ایک فلرٹ سمجھتے ہوئے وہ اپنی فیلنگز مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ میں ہر ایک کا ...ھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا مگر فارحہ کے معاملے میں میں سو فیصد پر یقین ہوں۔ اسے شروع سے ہی ...دل کا حال چھپانا نہیں آیا تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے دل کا حال مجھ سے چھپا لیتی۔ ...بات اگر میرے ان شبہات تک محدود رہتی تو بھی ٹھیک تھا۔ مگر بات یہ ہوئی کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا ...نے کیبن میں بیٹھا اپنے دل کو ایسی باتیں سوچنے پر ٹوک رہا تھا جب فون کی بیل بجی۔

میرا دل اس وقت کوئی بھی کال ریسیو کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے آپ کو یہ بات خوب اچھی طرح ...مجھا لینے کے بعد کہ فارحہ تنویر فارحہ داؤد حسن بن کر قطعی طور پر پرائی ہو چکی ہے۔ میں نئے سرے سے ...اندر ایک خالی پن سا محسوس کرنے لگا تھا اور یہ خالی پن مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں نے ...بے دلی سے فون ریسیو کیا مگر یہ دل بڑی جلدی ایک انہونی سی مسرت سے بھر گیا۔ میں ساتھ ہی ساتھ ...رہ تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا کڑیوں سے کڑیاں مل رہی تھیں۔ واقعات سے واقعات ...نے لگے تھے۔

...صائم کے جانے کے بعد میں نے اسے روک لیا اور جان بوجھ کر ایسی باتیں شروع کر دیں جو اسے سچ ...پرا کسا تیں اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے کیبن سے چلی گئی ہے اور جانے سے پہلے اپنے اور داؤد حسن ...لق کا راز تو کیا فاش کرتی یوں ہوا ہے کہ وہ جاتے جاتے اپنی آواز کا دکھ میرے اردگرد چھوڑ گئی ہے۔

دراصل میں اور وہ......ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے کبھی وہ چوہا ...در میں بلی تو کبھی وہ بلی اور میں چوہا......ہم دونوں کو اپنا اپنا بھرم قائم رکھنا تھا سو اس نے داؤد حسن سے ...ا (مصنوعی) قائم کر لیا اور یہ جان لینے کے بعد کہ اس کی زندگی میں اب میری کوئی گنجائش نہیں، میں ...'ایمن' نام کا ایک فرضی کردار گھڑ لیا ابھی کچھ دیر قبل میرے کیبن میں جو فون آیا وہ داؤد حسن کی بیوی کا ...

"مم......ڈاکٹر اسود ابراہیم احمد آج خود کو دنیا کا سب سے بڑا چغد محسوس کر رہا ہوں۔ کتنے آرام ...مما نے ڈاکٹر علینہ کی بات کو سچ تسلیم کر لیا اور وہ فارحہ......بہرحال میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں ...اپنی ساری زندگی میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی ہے اور وہ ہے فارحہ تنویر جسے اب جلد ہی فارحہ اسود ...جاتا ہے۔

مما آج صبح تک بڑی بے بسی محسوس کر رہا تھا مگر اب بے حد خوش ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کہ اپنی خوشی کو

لفظوں میں کیسے ڈھال دوں۔ مگر ایک خلش بھی ہے میں نے اسے دکھی کر دیا اور ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا تا کہ جو سچائی میرے لبوں تک آئی ہے اسے وہ بھی تسلیم کرے۔ بہر حال مجھے کوئی شکایت نہیں ہے تقدیر نے اس خوشی کو حاصل کرنے کا موقع دیا ہے مجھے اور میں اس موقعے کو قطعاً نہیں گنواؤں گا۔

اور میرے کیبن کے باہر گلاس ونڈو سے اس پار ایک شام ڈوبنے کے قریب ہے مگر اس شام کے ڈوبنے سے پہلے مجھے اس تک پہنچنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے خفا نہیں ہے۔ وہ مجھ سے متنفر بھی نہیں ہے بلکہ وہ اس ''ایک پل'' کی تاریکی سے نالاں ہے جو ہمارے درمیان آیا اور مستقل ہو گیا۔

میں اسے اپنے ساڑھے پانچ سال کا وہ ہر پل گنواؤں گا جو میں نے اس کی یاد کے سہارے بسر کیا اسے کھو دینے پر خود کو ملامت کی۔

میں اسے اپنی ہتھیلیاں دکھاؤں گا جن کی لکیریں فقط اس کے نام سے روشن ہیں۔ پھر میں اس کی ہتھیلیاں اسے دکھاؤں گا جن پر میرے نام کا اجالا ہے اور زندگی کا کوئی بھی پل مستقل نہیں ہوتا بلکہ یادیں اسے مستقل کر دیتی ہیں۔ ہمارا ''وہ پل'' روشن تھا اور آج بھی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ پر یقین کرے گی کہ محبت بذات خود بہت بڑا یقین ہے۔''

ایک پر یقین مسکراہٹ لبوں پر سجائے میں میز سے کار کی چابی اٹھانے کو پلٹا تھا۔ جب ڈاکٹر صائم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آج کوئی خاص بات ہے کیا؟'' اپنے ہی خیالوں میں گم مجھے ان کی آمد کی خبر نہ ہو سکی تھی۔

''کہیں عید تو نہیں؟''

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تو وہ اطمینان سے بولے۔

''نہیں دراصل آج آپ مسکرا رہے ہیں نا تو میں نے سوچا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔''

ان کے اس قدر معصومیت سے کہنے پر میں جھینپ گیا۔ میری سنجیدہ طبیعت کی بنا پر انہوں نے لطیفہ بنا رکھا کہ ڈاکٹر اسود عید پر ہی مسکراتے ہیں۔

میں نے چابی اور سیل فون اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا تو پیچھے سے وہ بولے۔

''میں تو تمہارے پاس ایک کام سے آیا تھا۔ مگر تم تو جلدی میں لگتے ہو۔''

میں ان کی جانب پلٹا اور خوشگواریت سے مسکرا دیا۔

''صرف جلدی؟...... میں بہت جلدی میں ہوں صائم! وہ دیکھو کھڑکی کے باہر ایک اور شام ڈوبنے کو ہے اور اس شام کے ڈوبنے سے پہلے مجھے کسی کو سحر کی نوید دینی ہے۔''

میرے اس مبہم سے جواب پر ڈاکٹر صائم نے خاصی حیرانی سے مجھے دیکھا اور میں مسکراتا ہوا کیبن سے باہر نکل گیا۔

ت کا غن

اس نے دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنا چاہا پھر شانوں کے گرد پڑی شال کو اور مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا اور لکڑی کا منقش دروازہ دھکیل کر باہر آ گئی۔ نرم ہوا کا سرد جھونکا چہرے پر کپکپانے پر مجبور کر گیا تھا۔ ناک میں جیسے مرچیں سی گھل گئیں۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ناک رگڑ کر حرارت پہنچائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف آ گئی۔

کہر کی موٹی سی تہ لان کے آخری کونے تک پھیلی ہوئی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے گیٹ کھول کار میں بیٹھے ولید قاسم نے اسے کسی قدر حیرانگی سے دیکھا پھر جب وہ پورچ میں کار لاک کر رہا تھا تو وہ گیٹ بند کر کے اس کی طرف آ گئی۔

''تم کب آئیں؟'' اس نے پہلے خوشگوار سی حیرت کے زیر اثر پوچھا پھر گیٹ کی طرف دیکھا۔

''اور چوکیدار کہاں ہے؟''

''میں شام میں آئی تھی شعیب بھائی کے ساتھ اور چوکیدار کی بیوی بیمار ہو گئی ہے۔''

''اسی لیے تو میں بیوی کو پسند نہیں کرتا ہر دوسرے روز بیمار ہو جانے والی صنف۔''

اس کے پیچھے آتے ہوئے ولید نے افسوس سے اظہار رائے کیا تو وہ جو منقش دروازہ کھول رہی تھی رکی اور گردن موڑ کر بولی۔

''ہیں...... لیکن تم سے کس نے کہا ہے کہ چوکیدار کی بیوی کو پسند کرتے پھرو۔'' پھر سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''سدھر جاؤ ولید قاسم! یہ ادھر ادھر کی تانکا جھانکی تمہیں ضرور پٹوا کر چھوڑے گی۔''

''ارے خوامخواہ پٹیں ہمارے دشمن۔'' وہ بے نیازی سے کہتا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تو وہ بھی پیچھے چلی آئی۔

''یوں بھی ہمیں کنواریوں کی کمی ہے کیا؟ جو ہم بیویاں دیکھتے پھریں وہ بھی دوسروں کی...... توبہ

توبہ..... خدا ہمیں اس کڑے وقت سے بچائے۔ ہم تو اپنی بیوی ہی ایسی لائیں گے جسے دیکھ کر.....

"دوسرے خوش ہوں...... ہے نا۔" زیب نے فقرہ اچک کر مکمل کر دیا۔ ولید ایک پل کو اندر ہی اندر جھینپا۔ وہ بات کو کیا مفہوم دے گئی تھی۔

"بکومت...... بے جی سوگئیں؟" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہوں سوگئیں۔" وہ بولی ساتھ ہی بیڈ پر اچھالی جانے والی ٹائی کیچ کرتے ہوئے اسے خفگی سے گھورا تو وہ چڑانے والے انداز میں ہنس دیا۔

"کھانا لگادوں تمہارے لیے ولید؟" ولید نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کوٹ کی جیب سے والٹ اور موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تم کھا چکیں؟"

"ہوں، ماں جی کے ساتھ ہی کھالیا تھا۔" اس نے سرسری بتایا پھر بولی۔

"چائنیز رائس بنائے ہیں ساتھ میں......" ولید نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"اف بس کرو یار! کہیں ایسا نہ ہو میں ندیدہ بن جاؤں...... قسم سے پیٹ میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔" پھر بولا۔

"یونو...... آج میں اپنی سیکرٹری کے ساتھ ڈنر پر گیا تھا۔" شرٹ کے کف کھولتے ہوئے اس نے بہت رازداری سے بتایا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

"یہ تم اتنی بدذوق سیکرٹریز کیوں اپائنٹ کرتے ہو ولید؟"

"تاکہ میرے اچھے ذوق کی نشاندہی ہو سکے۔" ترنت جواب آیا۔

"ویسے میرے اسٹاف میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور باذوق لڑکی ہے تبھی تو سب کی سب اپنے باس پر جان چھڑکتی ہیں۔" اس نے فرضی کالر جھاڑے تو وہ مسکرا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ خوش فہمی آپ کو لے ڈوبے گی حضرت۔"

"جی نہیں حضرت کی کشتی میں سوراخ نہیں ہے۔" وہ ایک دم اس کے اور دروازے کے بیچ حائل ہو گیا۔

"کافی بنالاؤ بیٹھ کر باتیں کریں گے مجھے ابھی نیند نہیں آرہی۔"

"نیند تمہیں نہیں آرہی مگر مجھے آرہی ہے نا۔ کچن کا رستہ تمہیں معلوم ہی ہے لہٰذا اپنی مدد آپ کے تحت کام کرو۔" وہ اسے ہٹا کر جانے لگی مگر وہ پھر سامنے آگیا اور بے حد مسکین صورت بنا کر بولا۔

"اتنے دنوں سے اپنی مدد آپ ہی کر رہا تھا۔ اب آہی گئی ہو تو یہ کارِ خیر کرتی جاؤ بہت ساری دعائیں دوں گا میں تمہیں۔" اس نے باقاعدہ ہاتھوں سے اشارہ کیا تو وہ ہنس دی۔

"یہ دعائیں تم کل تک سنبھال رکھو۔ آج مجھے بہت نیند آرہی ہے۔" ولید نے اس کی سیاہ بھنورا سی ہوں کو دیکھا پھر منہ بسور کر ایک طرف ہو گیا گویا جانے کی اجازت دے دی۔ زینب اس کے اس بچوں ے انداز پر بہت بے ساختہ ہنسی تھی پھر اس کے بال منتشر کر کے باہر آگئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی لینے بیٹھ گئی تھی۔

"آج مجھے وحید بہت یاد آرہے ہیں نجانے کیوں؟ ان کی رفاقت میں گزرا ہوا وہ ایک ماہ جو میرے سالوں پر بھاری ہے مجھے لمحہ بہ لمحہ یاد آرہا ہے۔ پتا نہیں انہیں دنیا سے جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ نہوں نے ساتھ جینے کی قسم کھائی اور نہ ساتھ مرنے کا کوئی وعدہ تھمایا۔ تبھی تو شاید اکیلے ہی چلے گئے ورنہ یکسیڈنٹ میں، میں کیا کم زخمی ہوئی تھی۔ آج جب شعیب بھائی مجھے یہاں چھوڑنے آرہے تھے تو میں نہیں اپنی جاب کے متعلق بتادیا۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا بس خاموش رہے مگر میں جانتی ہوں کہ ن میرا یہ اقدام برا لگا ہے۔ ماں جی اور ولید بھی خفا ہوں گے مگر میں کیا کروں۔ آخر کب تک ان دونوں روں کے بیچ ڈولتی رہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے روپے پیسے کی ضرورت ہے، یہ ضرورت تو شعیب بھائی، ھابی، ماں جی وقتاً فوقتاً بنا کہے پوری کر دیتے ہیں مگر اب میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ کل کلاں کو ابی اگر روایتی بھابی بن بھی گئیں (خدانخواستہ) تو ماں جی تو ہیں ہی جنہوں نے پھوپھی یا ساس کی بجائے بالکل ماں کی سی محبت دی ہے پھر اگر کل کو ولید کی بیوی...... خیر آنے والا وقت تو ہر ایک کو ڈراتا ہے اور اس ہر ایک میں شامل ہوں۔ اب میں سوجاتی ہوں کیونکہ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔ کچن سے کھٹ کی آوازیں آرہی ہیں یقیناً ولید کافی بنا رہا ہوگا میرا خیال ہے اب اس کا بھی کوئی بندوبست کر ہی دینا یے۔ ویسے وہ مجھے بے حد پیارا ہے بالکل وحید کی کاربن کاپی۔ بس یہاں سنجیدگی نہیں ہے۔"

وہ کچھ اور بھی لکھنا چاہتی تھی مگر نیند کی دیوی کچھ ایسی مہربان ہوئی کہ وہ لائٹ بھی آف نہ کر سکی۔

+

"ولید! تمہیں خدا کا واسطہ ہے اب اٹھ بھی چکو۔" چوتھی بار دروازے میں سے منہ نکال کر چیخنے کی بجائے اس نے اندر آکر کمبل ہی کھینچ لیا اور یہ ترکیب ہمیشہ کی طرح کارگر رہی تھی۔

"تم ہمیشہ بدصورت ولن کی طرح انٹری دیا کرو زینب خاتون۔" نیند سے بوجھل آواز میں وہ جھنجھلا کر بولا۔

"اب کیا کیا میں نے؟" وہ مسکراہٹ دبا کر کمبل سمیٹنے لگی۔

"کیا کیا؟" وہ اٹھ بیٹھا پھر انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"ساری ہی شادی اچھی طرح سے ہوگئی۔ اب تو بس میں اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے ہی والا تھا کہ تم

ٹپک پڑیں۔"

"ہاہاہا......تم اور تمہارے خواب۔"

"کیوں کیا خرابی ہے میرے خواب میں۔" وہ لڑنے کو تیار تھا۔

"معاف کرو مجھے، کوئی خرابی نہیں ہے تمہارے خوابوں میں۔" وہ بولی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ......"

"کہ تم ناشتا تیار کر چکی ہو۔ میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آ جاؤں اور دیر کرنے کی صورت میں مجھے کچھ بھی کھانے کو نہیں ملے گا۔ یہی نا۔" ولید نے تائید طلب نظروں سے اسے دیکھا پھر جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"تم چلو میں پانچ منٹ کی بجائے چار منٹ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں۔" پھر اپنے کہنے کے مطابق وہ چار منٹ میں ہی آیا تھا تب تک وہ اور ماں جی ناشتا شروع کر چکی تھیں۔

"تم آفس کتنے بجے جاؤ گے ولید؟" ولید جو اخبار سامنے پھیلائے جلدی جلدی ہیڈ لائنز پر نظریں دوڑا رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اخبار ایک طرف ڈال کر آملیٹ والی پلیٹ اپنے آگے گھسیٹ لی۔

"جتنے بجے روز جاتا ہوں...... کیوں؟" اس نے بتا کر پوچھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" ولید نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"آفس......؟"

زینب مسکرائی ابھی وہ اسے لاہور آنے کا مقصد نہیں بتانا چاہتی تھی۔

"نہیں۔ آفس تم اکیلے ہی جانا مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

"ہوں یعنی لفٹ چاہیے۔" وہ اثبات میں مسکرا دی پھر جب وہ چائے کا آخری سپ بھی حلق میں اتار چکا تو اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا ماں جی! میں جا رہا ہوں۔"

"اور میں بھی۔" زینب بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں جی نے بہت شفقت سے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور نصیحت بطور خاص ولید کو کی تھی۔

"جی ماں جی! میں سلو ڈرائیو ہی کروں گا اور پھر یہ جانشین ہے نا آپ کی میرے ساتھ۔" اس نے زینب کی طرف اشارہ کیا تھا اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے باہر نکلے تھے۔

"کہاں ڈراپ کروں تمہیں؟" مین روڈ پر آتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"ڈی پی ایس کے سامنے۔" زینب نے حتی المقدور سرسری انداز اختیار کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ چونک گیا۔ ایک نظر اسے دیکھا پھر ونڈ اسکرین سے باہر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"ڈی پی ایس......اسکول؟" زینب نے سر ہلا کر اس کے شک پر تصدیق کی مہر لگا دی۔

"میری معلومات کے مطابق تو تم ہسٹری میں ماسٹرز کر چکی ہو پھر یہ یکایک نرسری میں ایڈمیشن لینے کا ...ل کیوں آیا تمہیں؟" اس کی شرارت کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے جاب مل گئی ہے ولید اور آج ہی سے جوائن کرنا ہے۔" اسے پتا تھا کہ یہ بات ماں جی کی طرح ...د کو بھی بری لگے گی۔ انہیں تو وہ کسی طرح راضی کر ہی چکی تھی اور اب اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر ...اف دیکھ رہی تھی۔

"تم......" اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر فوراً ہی لب بھینچ کر نظریں باہر ٹکا دیں۔ آنکھوں میں ...اف درشتی اور خفگی جیسے تاثرات نظر آ رہے تھے کار کی اسپیڈ بھی غیر معمولی حد تک بڑھا دی گئی تھی۔ زینب ...ے اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ اگرچہ اسکول میں پہلا دن تھا مگر ...نکہ اس کا ذہن ولید میں اٹکا ہوا تھا سو وہ کچھ بھی ڈھنگ سے نہ کر پائی۔

واپسی اسکول وین سے ہوئی تھی۔ ولید کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی سو وہ ماں جی کے کمرے میں آ ...ئی وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ یہ مسکراہٹ غالباً ان کی شخصیت کا حصہ تھی کیونکہ ولید کو دیکھ کر بھی ایسی ہی ...کراہت کی کرنیں ان کے ہونٹوں پر دمکتی تھیں۔

"کیسا رہا اسکول کا پہلا دن۔"

"جی بس ٹھیک رہا۔" وہ تکان زدہ سا جواب دے کر ان کے ساتھ ہی کمبل میں گھس گئی۔ ماں جی نے ...ی محبت سے اس کی پیشانی سے بال سمیٹے تھے۔

"تھک گئی ہو نا۔" وہ واقعی تھک گئی تھی مگر ان کا خیال کرتے ہوئے ہنس کر نفی میں سر ہلا دیا مگر ان کی ...لی نہیں ہوئی تھی۔

"اسی لیے تو میں تمہیں روک رہی تھی آخر ضرورت ہی کیا ہے تمہیں نوکری کی؟"

"گھر میں فارغ رہ رہ کر میں بہت بور ہو چکی ہوں ماں جی! پچھلے سال تک تو پڑھائی تھی مگر اب......" ...لید کو اندر آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"السلام علیکم ماں جی!" اس نے بڑی سنجیدگی سے آ کر ماں جی کے سامنے سر جھکایا تھا۔

"آج تم جلدی کیسے آ گئے ولید۔" اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے کسی قدر تشویش ...سے دریافت کیا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"کچھ خاص وجہ نہیں، ذرا سر میں درد تھا۔"

"تم کپڑے بدل لو تب تک میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔ اس کے بعد چائے پی کر کچھ دیر کے لیے سو ...جاؤ درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ بیٹھیے ماں جی! میں گرم کر لیتی ہوں۔" زینب نے روکنا چاہا تو وہ بولیں۔

"تم بھی تو تھکی ہوئی ہو۔" وہ باہر نکل گئیں۔ زینب جو کچھ سوچ کر رک گئی تھی پہلے بند دروازے کو دیکھا پھر اسے۔

"میں بھی تم سے بڑی ہوں کبھی مجھے بھی سلام کرلیا کرو۔" ولید نے اسے خفگی سے گھورا تو وہ جوہنسی دبائے بیٹھی تھی یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اسے ہنستے دیکھتا رہا پھر باہر جانے لگا تو وہ ایک دم اس کے سامنے آ گئی۔

"خفا ہو؟" اگرچہ معلوم تھا پھر بھی ڈور کا سرا کہیں سے تو پکڑنا ہی تھا۔ ولید نے جواب دینے کی بجائے سینے پر بازو باندھ کر اپنی گہری نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں جن میں خفگی بھی تھی تاسف بھی۔

"تم میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو ولید، میں......" اس نے توقف کیا۔

"میں گھر بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔" اس نے اپنی بے بسی کا اظہار یوں ہی مناسب سمجھا۔ ولید اسے دیکھتا رہا پھر پچھلے صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں جا رکا۔

"بوریت دور کرنے کے اور بھی سو ہزار طریقے ہیں۔" اس نے رک کر ایک ہی پل میں جیسے سارے حالات کا جائزہ لیا۔ وہ زینب کو بہت حد تک سمجھنے لگا تھا تبھی بولا۔

"بور ہو جاتی ہو تو میرے ساتھ آفس چلو۔ مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کی لڑکیاں یوں ٹکے ٹکے کی نوکریاں کرتی پھریں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"ٹکے ٹکے کی نوکریاں۔" اسے جیسے جملے کے اسی حصے پر اعتراض تھا۔ "وہ لوگ مجھے بہت اچھی پے دے رہے ہیں ولید۔"

"اچھی پے۔" اس نے دوہرایا پھر طنز سے بولا۔ "کتنی دے رہے ہیں۔ تین ہزار، چھ ہزار یا اس سے بھی کچھ زیادہ؟" زینب جھنجھلا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی بات اسے سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ ولید نے اسے الجھن میں دیکھا تو اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"ہمارا بزنس میں نے اور وحید بھائی نے مل کر شروع کیا تھا زینب! لہٰذا تمہارا حق بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ میرا......اب اگر تم جاب ہی کرنا چاہتی ہو تو آفس آ جایا کرو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تمہیں تمہاری الٹی سیدھی سوچوں سے بھی نجات مل جائے گی۔" وہ جیسے اس کی چوری پکڑتے ہوئے مسکرایا۔ زینب کی نظریں گود میں رکھے ہاتھوں سے نہیں ہٹی تھیں۔ ولید نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا پھر دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر اس کا سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

"سن رہی ہو یا نہیں؟"

"سن چکی ہوں۔" اس نے جھنجھلا کر اس کا ہاتھ جھٹکا ولید مسکرایا۔

"سمجھی بھی ہو یا......"

"سمجھ گئی ہوں۔" وہ تیزی سے بولی۔ ولید اپنے گھٹنوں پر ہتھیلیوں سے بوجھ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا کیا سمجھی ہو؟" متبسم و شریر لہجے میں اس نے دریافت کیا۔

"یہی کہ تم بہت بڑے ہوگئے ہو اور نصیحتیں کرنے لگے ہو۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بولی تھی۔ ولید ہنستا ہی چلا گیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

"ہنستی رہا کرو زینب اچھی لگتی ہو۔" وہ اپنی پیاری سی دوست کو بہت پیار سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ظاہر ہے میں اچھی ہوں تو اچھی ہی لگوں گی نا۔" وہ مسکراہٹ دبا کر اور ایک شان بے نیازی سے باہر نکل گئی۔ ولید وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر مسکرا دیا اس رات وہ اپنی ڈائری میں لکھ رہا تھا۔

"مجھے لفظوں سے کھیلنا نہیں آتا صرف اتنا کہوں گا کہ اس کی مسکان بہت خوب صورت ہے شاید اس ...ی وہ مسکرا ہی رہی تھی جب پہلی بار میرے دل نے اسے حاصل کرنے کی تمنا کی تھی۔"

✦

شام بڑی اجلی سی تھی۔ گزشتہ دنوں کے برعکس آج کہر نے اپنے پنکھ نہیں پھیلائے تھے اس کے باوجود ...ی بے حد کڑا کے دار تھی۔ ماں جی، عبدالکریم کو ساتھ لگائے گندم اور خشک میوہ جات ملا کر نشاستہ تیار کر ...یں۔ ان کے خیال میں یہ گاؤں کی خاص سوغات تھی جو انہوں نے اپنی دادی سے سیکھی تھی۔ وہ ٹی وی ...سامنے بیٹھی تھی جس پر کوئی گیتوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ ایک نظر سکرین پر ڈالتی دوسری ہاتھ میں پکڑی ...ب پر اور ساتھ ہی ساتھ مونگ پھلی سے لطف اندوز ہوا جا رہا تھا۔ ولید ابھی سو کر اٹھا تھا۔ سیڑھیاں ...نے اسے دیکھا تو وہیں اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"السلام علیکم۔" آواز میں ابھی بھی نیند کا اثر تھا۔

"وعلیکم السلام۔" زینب نے اسے دیکھا پھر وال کلاک کو۔ "یہ کوئی وقت ہے اٹھنے کا۔"

"آج سنڈے ہے۔" اس نے دیر سے اٹھنے کی اپنے تئیں معقول وجہ بتائی تو وہ مزید ڈپٹ کر بولی۔

"سنڈے ہے نہیں بلکہ تھا شام کے پانچ بج رہے ہیں اس وقت۔"

"یہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟" اس کی بات ان سنی کر کے وہ اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھنے لگا۔ ...ب نے اسے گھورا پھر کتاب جھپٹ لی۔

"تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔"

"مجھے سمجھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔" اس نے ناگواری سے ناک سکیڑ کر کہا۔

"اس کتاب کا نام ہی اس قدر خوفناک ہے کہ بندہ محبت سے ہی گھبرا جائے، اوہ گاڈ۔"

"محبت مردہ پھولوں کی سمفنی۔" "یہ کوئی نام ہے۔ ایک تو محبت پھر پھول وہ بھی مردہ اور یہ سمفنی کیا

بلا ہے؟ نجانے یہ اردو رائیٹرز کس قسم کے نام رکھتے ہیں۔ اب یہ دیکھو۔'' اس نے میز پر پڑی کتاب اٹھائی۔

''قربت مرگ میں محبت......قربت مرگ......'' یہ لفظ اس نے زیر لب دوہرایا تھا پھر سر کھجا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ قربت کیا ہوتی ہے؟''

''تمہارا سر ہوتی ہے۔'' زینب نے کتاب کھینچ لی۔

''اب خدا کے واسطے میرے سر کی شان میں قصیدے نہ پڑھنا بس جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ ذرا مارکیٹ تک جانا ہے۔''

''میں نہیں جا رہی۔'' زینب نے خفگی کے اظہار کے طور پر چہرے کے آگے کتاب کھول لی مگر ولید نے کتاب چھین لی۔

''خوامخواہ نہیں جا رہی......بس اب میں ایک لفظ نہیں سنوں گا فوراً سے پیشتر اٹھ جاؤ۔''

وہ رعب سے بولا اور اس رعب میں استحقاق تھا۔ زینب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ ولید کے دوست کی شادی تھی جس کے لیے اسے گفٹ لینا تھا تبھی چوائس کے لیے اسے لے آیا تھا۔ گفٹ خرید کر وہ اس کے ''نہ نہ'' کے باوجود مارکیٹ سے منسلک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں سوپ پلوانے لے آیا تھا۔ مینو کارڈ پر نظر دوڑانے سے پہلے ہی وہ اپنا فیوریٹ سوپ آرڈر کر کے بیٹھ گیا پھر نگاہ نجانے کہاں گئی تو ''میں ابھی آیا'' کہہ کر کچھ فاصلے پر موجود ٹیبل کی طرف چلا گیا واپسی ایک بے حد خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔

''زینب یہ فاطین ہیں۔'' ولید نے تعارف کروایا تو زینب نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا وہ لڑکی خوب صورت ہونے کے ساتھ ہی خوش اخلاق وخوش گفتار بھی تھی۔ زینب کو اندازہ ہوا کہ وہ اور ولید آپس میں کافی فرینک ہیں۔

''اچھا بھئی میں تو اب چلتی ہوں۔'' کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی زینب نے ساتھ سوپ پینے کی دعوت دی تو بولی۔

''ڈیور ابھی تو میں اپنے کزن کے ساتھ آئی ہوں ابھی بھی وہ وہاں تنہا بیٹھا مجھے گالیاں دے رہا ہو گا۔''

''اسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔'' ولید کہنے کے ساتھ ہی اٹھ کر چلا بھی گیا تھا فاطین اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ واپسی تک زینب کے ذہن میں ایک سوال کھد بد مچاتا رہا تبھی جب ولید نے گاڑی فرسٹ گیئر میں ڈالی تو بولی۔

''بہت اچھی لڑکی ہے فاطین...... ہے نا۔''

''ہم اچھے تو ہمارے فرینڈز بھی اچھے۔'' اس نے فرضی کالر جھاڑے۔ زینب نے ایک چپت اس کے نے پر رسید کی تھی تو وہ ہنسنے لگا۔

''بات سنو میری ولید! ماں جی اب تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہیں۔''

''ہاں تو ضرور کریں میں نے کب منع کیا ہے؟'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولا زینب پرجوش انداز میں اس ن گھوم گئی۔

''کوئی لڑکی ہے نظر میں؟''

''صرف ایک...... بھئی بہت ساری ہیں۔'' آنکھوں میں شرارت ہمکنے لگی تھی۔ زینب کا جوش صابن کی ی طرح بیٹھ گیا۔

''سنجیدہ ہو جاؤ ولید! ماں جی واقعی بھولانا چاہ رہی ہیں۔''

''یار میں سو فیصد سنجیدہ ہوں ماں جی حکم تو کریں میں ان کے قدموں میں آج ہی بہوؤں کا ڈھیر لگا ا۔''

''مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو...... سچ سچ بتاؤ فاطین ہے نا وہ۔''

''کیا غضب کر رہی ہو زینب! وہ صرف میری دوست ہے۔''

''دوستی ہی محبت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔'' ولید نے یک دم گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''اب کیا تکلیف ہے؟'' وہ چڑ گئی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' ولید نے نفی میں گردن ہلا کر نظریں واپس باہر ٹکا دیں۔ زینب تپ کر باہر دیکھنے لگی اور ے اظہار کے طور پر وہ باقی کا تمام راستہ خاموش رہی تھی۔ ولید خود ہی بولتا رہا۔ اس کی خاموشی پر لکتا رہا مگر وہ خاموش رہی گھر پہنچ کر وہ بغیر کچھ کہے فوراً کار سے اتر جانا چاہتی تھی مگر ولید نے پکارا تو ئی البتہ نہ کچھ کہا اور نہ پلٹی۔

وہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے زینب۔'' اسٹیئرنگ پر دونوں ہتھیلیاں جمائے ونڈ اسکرین سے باہر پورچ ر کی ان دیکھے ذرے کو کھوجتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ زینب ایک پل کو ٹھٹکی پھر اس بات کو نفتگو سے اخذ کرتے ہوئے وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئی۔

کہو۔'' چہرے پر اس وقت حد درجہ سنجیدگی تھی۔ ولید نے گردن موڑ کر اس کی صورت دیکھی پھر جھجکے ندازمیں بولا۔

تم......خفا تو نہیں ہو گی؟''

نہیں تم کہو۔''

''آں...... اچھا رہنے دو۔'' وہ اپنی جانب کا دروازہ کھول رہا تھا۔ زینب نے ایک دم اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہیں مجھے بتاؤ۔'' ساری سنجیدگی ہوا ہو گئی تھی۔ اب وہاں فقط تجسس ہی تجسس تھا۔ ولید نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''تم خفا ہو جاؤ گی زینب۔'' وہ بے بسی کے سے انداز میں اسے تنبیہہ کر رہا تھا وہ ایک دم بولی۔

''نہیں میں خفا نہیں ہوں گی تم کہو۔''

''وہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ......'' اس نے توقف کیا زینب کا تجسس انتہا کو چھونے لگا۔

''کہ تم ''ڈل'' کلر مت پہنا کرو بھوتنی لگتی ہو۔'' اپنا جملہ مکمل کرتے ہی وہ منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا تھا۔ زینب کے اعصاب ایک پل کو ڈھیلے پڑ کر تن گئے۔ اسے اس قدر احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی ذہن میں تو اس کی شادی گھوم رہی تھی لہٰذا ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر اتر گئی ولید نے روکا بھی نہیں کیونکہ وہ ہنسنے میں مصروف تھا۔

✦

چمکدار دھوپ کی حدت جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ بیرونی دیوار سے لپٹی بوگن ویلیا بھی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ دھوبن چڑیا کے ساتھ مل کر قمریوں نے ایک اودھم سا مچا رکھا تھا۔ زمردیں سبزہ نکھر کر عجب ہی چھب دکھلا رہا تھا اور ایسے میں لان کے بیچوں بیچ کین کی سفید کرسیوں پر براجمان ولید قاسم کینوؤں سے شغل فرماتے ہوئے بہت سنجیدگی سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ زینب کے ساتھ عبدالکریم کو آتا دیکھ کر اس نے موضوع بدل دیا۔ عبدالکریم غیر معمولی طور پر چپ تھا بلکہ سنجیدگی سے منہ پھلائے ہوئے تھا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' ماں جی نے پوچھا۔ وہ ٹرے ٹیبل پر پٹخنے کے سے انداز میں رکھ کر سیدھا ہوا پھر دونوں بازو کمر پر رکھ کر ایک خفگی بھری نگاہ زینب پر ڈالی۔

''یار عبدل! یہ گھوریاں بعد میں ڈال لینا پہلے یہ بتاؤ کدو کے جیسی شکل کیوں بنا رکھی ہے۔''

''آپ کو پتا ہے سر جی! یہ باجی کل جا رہی ہیں اپنے پائی جان کے گھر۔ پوچھیں ماں جی! کیوں جا رہی ہیں اتنی جلدی۔'' شکایتی سے انداز میں وہ ماں جی کی طرف گھوما۔

''میرا جانا ضروری ہے عبدل اور پورے تین دن سے میں یہیں تو ہوں۔'' زینب نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ پندرہ سولہ سال کا یہ لڑکا ماں جی نے جز وقتی کام کاج کے لیے رکھا ہوا تھا دس سال کی عمر میں وہ اس گھر میں آیا تھا اور اب تک بہت گھل مل گیا تھا۔ زینب کے سمجھانے کے باوجود وہ ہنوز خفا شکل بنائے اندر کی طرف چلا گیا تو ماں جی بولیں۔

''ایک تو پہلے ہی اتنے دنوں بعد آتی ہو پھر جانے کی بھی جلدی ہوتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے میرے ہی ہو مگر تم سنتی ہی نہیں ہو...... میرا دل نہیں لگتا زینب......''

''میرا بھی......'' کسی کے دل میں گونج ابھر کر لبوں پر خفیف سا تبسم بکھیر گئی تھی۔ زینب نے بڑے پیار ماں جی کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

''پکا وعدہ اگلی بار آؤں گی تو آپ کے پاس بہت دن رہوں گی ابھی میرا جانا ضروری ہے۔ وہاں وہاں میں تہمینہ بھابی میرے بغیر تنہا ہو جاتی ہیں اور اب کل سے بخار میں پھنک رہی ہیں تبھی شعیب بھائی مجھے فون کیا ہے۔''

''کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو۔ تنہائی بڑا عذاب ہے اور بڑھاپے میں تو ویسے بھی گھنٹے صدیاں بن جاتے یہ ولید تو سارا دن آفس میں ہوتا ہے شام میں دوستوں کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ خالی گھر مجھے تو کاٹ نے کو دوڑتا ہے۔''

''اداس مت ہوں ماں جی! آپ کہہ رہی تھیں نا کہ اب ولید کی شادی ہو جانی چاہیے تو یہ بہت ب وقت ہے اس کی شادی کے لیے۔ اس کے بعد آپ ایک درجن بچوں کی دادی بن جائیں گی ساری ختم ہو جائے گی...... کیوں ولید؟'' وہ ان کی افسردگی ختم کرنے کے خیال سے بولی تھی ساتھ ہی اسے شامل گفتگو کیا تھا۔

''ارے صرف ایک درجن ہی کیوں؟ میں تو دو درجن کا ارادہ کیے بیٹھا ہوں۔''

''شرم کرو۔ ماں کے سامنے اس قسم کی بات کرتے حیا نہیں آتی؟'' انہوں نے ڈپٹا تو وہ کرسی ان کے قریب گھسیٹ لایا۔

''ممی تو صرف آپ کی وجہ سے کہہ رہا تھا ورنہ مجھے تو آدھ درجن بھی کافی رہیں گے۔'' اس کا انداز کا شریر سا تھا۔

''تم بچوں کو ہم ماں باپ کی خوشیاں کا احساس ہوتا ہی کب ہے۔''

''ارے......'' وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا۔

''ایک وہ حیدر ہے۔ ایسا بیوی اور بیٹی، بیٹا کے ساتھ جا کر دبئی بسا کہ ماں کو ہی بھول گیا۔ اتنا نہیں ہوتا کہ سال دو سال بعد آ کر بوڑھی ماں کو صورت دکھا جائے۔ مرحوم باپ کی قبر پر دو حرف فاتحہ کے ہی پڑھ دو قصے پیچ در پیچ کھولتی ہی جا رہی تھیں۔ ابھی مزید ارادہ تھا مگر عبدل نے ان کی نند کے فون کی بابت تو وہ اندر چلی گئیں تو وہ افسردگی سے بولی۔

''دیکھا ماں جی، کتنی تنہائی محسوس کرنے لگی ہیں۔''

''ہاں دیکھا۔''

”تم واقعی شادی کرلو ولید! بہو کے آنے سے کم سے کم ماں جی کی تنہائی تو دور ہوگی۔“

”اچھا۔“ زینب نے تھوڑا الجھ کر اسے دیکھا۔

”تم واپس کب جارہی ہو۔“ اس نے پوچھا تھا۔

”کل شام کو...... شعیب بھائی آرہے ہیں لینے۔“

”ہوں۔“ وہ کچھ پل خاموش رہا پھر بولا۔

”تمہیں پتا ہے ابھی ماں جی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ہماری زینب عام لڑکیوں جیسی بالکل بھی نہیں ہے۔“

”ہیں...... بھلا اس بات کا کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم میں عام لڑکیوں والے گٹس تو سرے سے ہیں ہی نہیں...... سب لڑکیاں کتنی ہنس مکھ ہوتی ہیں۔ ہر دم ہنستی مسکراتی، شرارتیں کرتی ہوئیں جبکہ تم......“ اس نے ناگواری سے ناک سکیڑی۔

”ہر وقت ہی سڑی بسی شکل لیے گھومتی ہو۔ ہنستی بھی ہو تو یوں گویا ہنسی ادھار لے رکھی ہو جسے سینت سینت کا استعمال کرنا فرض ہو۔“ زینب خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

”خیر سڑی بسی شکل تو نہیں ہے میری اور ہنستی بھی میں خوب ہوں۔ جہاں تک عام لڑکیوں والی بات ہے تو دو مہینے بعد میں پورے چھبیس برس کی ہو جاؤں گی اور اس عمر میں لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں یعنی سنجیدہ اور سوبر۔“ اس نے آخری دو لفظوں پر زور دیا تو ولید بولا۔

”ہوں...... سنجیدہ اور سوبر......“ پھر کندھے اچکا کر بولا۔ ”ہمیں تو یوں بھی اس دادیوں والے اسٹائل میں اچھی لگتی ہو یعنی سنجیدہ اور سوبر۔“ اس نے بھی آخری دو لفظوں پر ہی زور دیا تھا۔ زینب کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔ تعریف کا یہ انداز کوئی نیا تو نہ تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے ولید کے بال منتشر کرنا چاہے تو ولید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی اپنے سامنے کھول لی اور کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ زینب نے بھی اپنی نگاہیں ہتھیلی پر جمائیں۔

”دیکھ رہا ہوں اس ہاتھ کی لکیروں میں میرا نام بھی ہے یا نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا مگر آنکھیں شرارت سے لبریز تھیں۔

”پھر مل گیا اپنا نام۔“ وہ بھی شرارت سے گویا ہوئی۔

”ہاں مل گیا۔“ ولید نے اس کا ہاتھ دونوں ہتھیلیوں میں جکڑ کر نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکا دیں اور بولا۔

”زینب...... مجھ سے شادی کرو گی۔“ ایک پل اور اس ایک پل میں آسمان پر موجود ستارے یکے بعد دیگرے ٹوٹنے لگے۔ زینب گنگ سی اس کی صورت تکنے لگی شاید وہ مذاق کر رہا ہو۔ مگر وہاں نہ مذاق تھا اور نہ

[...]رت بلکہ ایک نرم سا تاثر تھا زینب نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ اس کا خیال تھا کہ اسے یوں غصے میں دیکھ کر یقیناً وہ ہنس دے گا مگر وہ

”بکواس نہیں ہے لڑکی! پرپوز کر رہا ہوں میں تمہیں...... کہو کرو گی مجھ سے شادی۔“

”شٹ اپ ولید...... آئی سے جسٹ شٹ اپ۔“ وہ دھاڑی۔

”اگر تم مذاق کر رہے ہو تو یہ انتہائی گھٹیا مذاق ہے۔“

”مذاق......“ اس نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی عقل پر افسوس کر رہا ہو۔

”مذاق نہیں ہے یہ زینب! میں سنجیدہ ہوں۔ شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے کیونکہ تمہیں چاہنے لگا ہوں اور......“

”بس......“ زینب نے انگلی اٹھا کر روک دیا۔ ”بس ولید قاسم! اب آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ وہ [...] طیش کے لرز ہی تو گئی تھی۔

”زینب! میری......“ زینب جھٹکے سے اٹھی تھی اور پاؤں پٹختی اندر چلی گئی تھی۔ ولید نے اسے جاتے [...]ھا پھر انگلیوں سے بال سنوارتے ہوئے کمر کرسی کی پشت سے ٹکا دی تھی۔

”شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔“ وہ مسکرایا اور کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

زینب اسی شام کو چلی گئی تھی اور ولید جانتا تھا کہ وہ بہت خفا ہو کر گئی ہے۔

✦

”شکر ہے تم آ گئیں پتا ہے میں تمہیں کتنا مس کر رہی تھی۔“ اسے چائے کا مگ تھما کر تہمینہ بھابی اس کے [...]ریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”یہاں آپ مس کرتی ہیں اور وہاں ماں جی۔“ وہ چائے کا بڑا سا سپ لیتے ہوئے مسکرائی۔

”صرف ماں جی؟...... ولید بھی تو تمہیں مس کرتا ہوگا۔“ اسے لگا بھابی طنز کر رہی ہیں مگر ان کا انداز بہت عام سا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچ کو رد کرتے ہوئے بدقت پھر مسکرائی۔

”ہاں وہ بھی...... بلکہ وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ آپ کی بیماری کا بتایا تبھی آنے دیا اسٹیشن پر [...]کل وہی مجھے چھوڑنے آیا تھا۔“ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ جھوٹ کیوں بول رہی ہے۔

”بہت اچھا کیا تم نے جو آ گئیں۔ اب کچھ دن اطمینان سے ہمارے ہی پاس رہو پھر تو وہیں رہنا ہے۔“ زینب ٹھٹک گئی چائے کا گھونٹ حلق میں اٹک گیا تھا۔

”کیا مطلب...... بھابی؟“ اب کے بھابی چونکیں بالکل ہی بے اختیاری میں کہہ گئی تھیں سو فوراً بات [...]بدل دی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے زینی۔" انہوں نے تجسس پھیلانا چاہا اور زینب کے اندر خوف سا پھیل گیا۔

"کون سی خبر؟"

"آں......" بھابی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہیں۔ اس پل بہت دلفریب مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

"تم پھوپھو بننے والی ہو۔"

"سچ۔" اس نے مارے خوشی کے چیخ ماری تھی۔ نو سال کی منتوں مرادوں کے بعد یہ خبر ملی تھی۔ بھابی ہنسنے لگیں۔

"سو فیصد سچ۔" زینب ان سے لپٹ گئی۔

"بہت بہت مبارک ہو۔" بھابی خوش ہونے کے ساتھ ساتھ شرمائی ہوئی بھی تھیں۔

"کیا نام رکھیں گی؟"

"ارے ابھی تو بہت وقت ہے۔" وہ بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگی۔

"اتنی اچھی خبر اتنی دیر سے کیوں دی آپ لوگوں نے؟ کل جب شعیب بھائی کا فون ارے...... یاد آیا آپ کو تو بخار تھا نا۔"

"جھوٹ نہیں بولتے تو تم اتنی جلدی واپس کیسے آتیں۔" وہ اپنے کارنامے پر خوش ہو رہی تھیں تبھی فون کی بیل چیخ اٹھی۔ بھابی فون ریسیو کرنے چلی گئیں تو وہ چائے کے برتن دھونے لگی۔ ذہن گھوم پھر کر پھر سے ولید قاسم میں جا اٹکا تھا۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اس کی بات نے غصہ دلایا ہے یا افسوس۔

"اے کہاں ہو؟" بھابی نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ چونکی۔

"میں کب سے بول رہی ہوں مگر تم نجانے کہاں ہو۔"

"آں...... ہاں وہ اپنے بھتیجا، بھتیجی کا نام سوچنے لگی تھی۔" اس نے بات بنائی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اسے بھابی کے آنے تک کی خبر نہ ہوئی تھی۔

"کس کا فون تھا؟"

"شعیب کا۔" بھابی نے بتایا۔

"کہہ رہے تھے لنچ ٹائم میں گھر نہیں آسکیں گے کچھ ضروری کام ہے لہٰذا، ہم لوگ انتظار نہ کریں ان کا۔" بھابی نے توا چولہے پر چڑھایا تو وہ ہنڈیا کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں وقت کٹ گیا پھر جب وہ دونوں کھانا کھا رہی تھیں تو ایک بار پھر فون بجنے لگا۔

"دیکھنا ذرا کس کا ہے میں پانی لے آؤں۔" بھابی کچن میں چلی گئیں وہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک آگئی۔

"ہیلو۔"

"میں ہوں...... کیسی ہو؟" وہ خاموش رہی اگر وہ نہ بھی بتاتا تو وہ پہچان ہی لیتی "کچھ کہو گی نہیں؟" وہ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ "اچھا ڈانٹ ہی دو۔" وہ ابھی بھی خاموش رہی۔

"تم نے بہت اچھا کیا کہ ساہیوال چلی گئیں۔ اب میں جلدی آؤں گا تمہیں لینے باراتیوں کے

"وہ سلگ کر رہ گئی۔

"ضرور آنا باراتیوں کے ساتھ میرے جنازے میں شریک ہونے۔" اس نے ترخ کر فون پٹخ دیا۔

اتھاہ میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ دماغ بس ایک پل کو ماؤف ہوا تھا اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

"کس کا فون تھا۔" اسے آتا دیکھ کر بھابی نے پوچھا۔

"ولید کا۔" وہ بیٹھ گئی اسے لگا بھابی سن کر مسکرائی ہیں اور یہ وہم نہیں تھا وہ واقعی مسکرا رہی تھیں۔

"زینب! کیا خیال ہے تمہارا ولید کے بارے میں۔" بھابی کا کھوجتا ہوا انداز اس کے سینے میں انی کی پیوست ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"تمہیں ولید نے نہیں بتایا؟" انہوں نے بہت شریر سے انداز میں اپنی نند کو دیکھا تھا۔ زینب کتنی ہی بھی نہ بول سکی۔

"کیا آپ سے ولید نے خود کہا ہے۔" اسے اپنی آواز گہری کھائی میں گشت کرتی گونج سے مشابہ لگی

"نہیں اس نے تو کچھ نہیں کہا البتہ میں نے اندازہ ضرور لگایا ہے کہ تم اور وہ......"

"بس بھابی......" اس نے انہیں ٹوک دیا بھابی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"اگر ولید حماقتیں کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو ما۔" بھابی چپ سی رہ گئیں اس کے لہجے کی قطعیت نے انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

"لیکن زینب اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ وہ تمہارا کزن ہے۔"

"وہ میرا دیور ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"بہرحال میں ایسا کچھ نہیں چاہتی نہ آج اور نہ کل...... اور پلیز بھابی اس کے لیے آپ کو میرا ساتھ ہوگا۔" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا اپنے اٹل فیصلے کے باوجود کوئی بات اسے اندر ہی اندر ہولائے دے گی۔ بھابی نے اس کے چہرے پر گردش کرتے سائے کو دیکھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہاری مرضی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" اس نے سر ہلا دیا سکون نہیں ہوا وہ سوچ رہی تھی بھابی نے اندازہ لگایا ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور بھی لگائے مجھے کچھ کرنا

ہوگا۔ ولید کو اس کی حماقت کا احساس دلانا ہوگا اور یہی بات اسے واپس لاہور کھینچ لائی تھی۔

+

وہ بہت نارمل سے انداز میں اس سے ملی تھی ولید کا انداز بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ اس سے قبل ہوا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں یا باتوں میں کوئی ایسا تاثر نہ تھا جو اسے چونکاتا البتہ ایک جھجک سی در آئی تھی اس کے اپنے رویے میں جسے وہ ناپسند کرتے ہوئے بھی دور نہیں کر پائی تھی۔ جس مقصد کے لیے وہ یہاں آئی تھی اس کی پہلی کڑی یوں پوری ہوئی کہ اس نے "لائبہ" کی تصویر ماں جی کو دکھا کر اپنا خیال ظاہر کیا ماں جی کچھ پل تصویر دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"زندگی مجھے نہیں ولید کو گزارنی ہے۔ اگر یہ لڑکی اسے پسند آجاتی ہے تو میں بھلا کیوں اعتراض کروں گی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں آج ہی یہ تصویر اسے دکھا دیتی ہوں۔" اس نے خود ہی بات کرنا مناسب سمجھا دوپہر میں ماں جی کو سونے کی عادت تھی اسے یہی وقت مناسب لگا وہ اسٹڈی میں اپنے پی سی پر کچھ کام کر رہا تھا۔

"اگر تم مصروف نہیں ہو تو چند منٹ مجھے دے سکتے ہو۔"

"مصروف تو میں ہوں مگر تم کہو۔" مانیٹر سے نظریں ہٹا کر اس نے پوری کی پوری ریوالونگ چیئر اس کی طرف گھمائی تھی۔

"نہیں تم فارغ ہو جاؤ میں انتظار کر لیتی ہوں۔" ولید گردن ہلا کر واپس اپنا کام کرنے لگا۔ وہ انگلیاں مروڑتی لفظوں سے جملے ترتیب دیتی رہی۔ محض پانچ منٹ بعد ہی وہ اپنا کام ختم کر کے اس کے سامنے آ بیٹھا۔

"اب کہو۔" زینب نے تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

"کیسی ہے؟" ولید نے سرسری سے انداز میں تصویر دیکھی بڑی کیوٹ سی لڑکی تھی۔

"اچھی ہے۔" ولید نے تصویر اس کی جھولی میں ڈال دی۔ وہ لوگ اس وقت میٹرس پر بیٹھے ہوئے تھے جس کے سامنے ہی ٹی وی بھی پڑا تھا۔ ولید نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور اپنی مختصر سی رائے دے کر لاتعلق ہو گیا۔ زینب کو اس کا انداز برا لگا تھا پھر بھی بولی۔

"صرف اچھی؟"

"نہیں بہت اچھی ہے۔" ڈسکوری پر والیوم سیٹ کرتے ہوئے ولید نے کہا۔

"لائبہ نام ہے اس کا۔ اگر تمہیں یاد ہو تو اس نے ایم بی اے تمہارے ساتھ ہی کیا تھا۔ میرے ماموں

ی اکلوتی بیٹی ہے تم...... تم ایک بار دیکھو تو سہی۔" اس کی لاتعلقی اسے جھنجلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ ولید نے کرین سے نگاہ ہٹائی تصویر ہاتھ میں لی اور نہایت مصنوعی سنجیدگی سے دیکھنے لگا چند پل یونہی سرکے۔

"ہاں اچھی خوب صورت لڑکی ہے۔ مجھے یاد آ گیا ہے یہ میری کلاس فیلو نہیں تھی بلکہ دو سال جونیئر تھی ں کے اکیڈمک ریکارڈ نے کافی دھوم مچائی تھی یونیورسٹی میں۔" وہ رکا پھر بولا۔ "جوڑی اچھی رہے گی۔ ے تم نے تہمینہ بھابی سے پوچھ لیا ہے۔" زینب نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"تہمینہ بھابی کی اجازت ضروری ہے نا بھئی۔ آفٹر آل شعیب بھائی کی زوجہ محترمہ ہیں۔" لہجہ انتہائی ر ارادہ نہ سمجھی مگر جب سمجھی تو محض ایک خفگی بھری نگاہ ڈال کر رہ گئی۔

"میرے ماموں یہیں لاہور میں رہتے ہیں۔ کل میں اور ماں جی ان کے یہاں جا رہے ہیں۔" اس نے گویا تمہید باندھنا شروع کی۔

"ضرور جاؤ۔" ولید کی نظریں اسکرین سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ زینب کو سبکی کا احساس ہوا مگر ے پل وہ اٹھ کر ٹی وی آف کر چکی تھی۔ ولید نے اسے ٹی وی کے آگے دیوار کی طرح کھڑے دیکھا۔

"کیا میری بات تمہارے لیے اہمیت رکھتی ہے ولید۔"

"تم خود میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہو۔" گود میں رکھے کشن کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے ولید نے ے بہت پیار سے دیکھا تھا۔

"تو پھر میری بات مان لو ولید! لائبہ بہت اچھی لڑکی ہے تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔" وہ اجت سے بولی۔ ولید مسکراتا ہوا عین اس کے سامنے آ رکا۔

"زینب بھی بہت اچھی لڑکی ہے اور آئی ایم ڈیڈ شیور کہ جو خوشی مجھے اس کے ساتھ ملے گی وہ لائبہ اس کا ائبہ تک نہیں دے سکتی۔" زینب کو سر اٹھا کر اسے دیکھنا پڑا۔ اسے یک دم احساس ہوا کہ یہ شخص جسے وہ اب ک بچہ سمجھ رہی تھی وہ بچہ قطعاً نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا عکس اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہراساں ہو گئی۔ اس کا سر کا پھر پلکیں بھی۔

"جو تم چاہتے ہو وہ ممکن نہیں ہے ولید!" اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ وہ کسی طور چھپا نہ پائی تھی۔

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" اس کا انداز سراسر سمجھانے والا تھا۔

"آخر تم......" مارے غیض و بے بسی کے اس کی آواز کہیں اندر ہی اٹک رہی تھی۔ "آخر تم عقل سے ام کیوں نہیں لیتے۔"

"دل کے معاملات میں عقل کا بھلا کیا کام؟" مصنوعی تحیر سے آنکھیں پٹپٹا کر دریافت کیا گیا۔ بعض اوقات آپ وہ نہیں کر پاتے جو کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت وہ نہیں کر پا رہی تھی جو کہ وہ کرنا ہ ائی تھی۔

"تم وہ رشتہ کیوں بھول رہے ہو جو ہمارے بیچ ہے۔"

"میں کچھ بھی نہیں بھولا سب کچھ یاد ہے مجھے......"

"اور وحید......"

"وحید لالہ کے انتقال کو دو برس گزر چکے ہیں......" اس نے کہنا چاہا مگر پھر سے زینب نے ٹوک دیا۔

"اور اب تم چاہتے ہو کہ میں بھی مر جاؤں۔ ہے نا۔" اس کی آواز غیر معمولی طور پر تیز تھی۔

"زینب......" ولید کی نگاہوں میں تاسف سمٹ آیا تھا۔ "اسی موت سے تو بچانا چاہتا ہوں میں تمہیں، احمق لڑکی!"

"مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جس کے بعد لوگوں کی انگلیاں مجھ پر اٹھنے لگیں۔"

"بہت پرواہ ہے تمہیں لوگوں کی؟" پہلی بار اس کے لبوں پر طنز چمکا۔

"نہیں مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے مجھے صرف اپنی پرواہ ہے اور میں نے تمہارے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا۔"

"تب اب سوچ لو اچھا خاصا ہینڈسم ہوں میں، اپنا بزنس ہے کوئی بری عادت بھی نہیں ہے مجھ میں، لوگ چاند سورج سے تشبیہ دیں گے ہماری جوڑی کو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔"

"شرم نہیں آتی تمہیں اس قسم کی بکواس کرتے ہوئے۔" وہ نفرت سے پھنکاری۔

"اب تک جسے بھائی سمجھتی رہی ہوں اسے شوہر بنانے سے بہتر ہے کہ میں ڈوب کر مر جاؤں۔" ولید کے لفظ کہیں اندر ہی ڈگمگا گئے مگر پھر اس نے خود پر قابو پالیا۔

"ٹھیک ہے تم ڈوبنے کی تیاری کرو میں بہت اچھا تیراک ہوں۔" ہونٹوں کے کونے یہاں سے وہاں تک پھیل گئے۔

"خدا کے لیے میرا مذاق مت اڑاؤ ولید قاسم! آج تم ہنس رہے ہو کل کو پورا جہان ہنسے گا۔" ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے وہ گڑگڑائی تھی۔ آنکھوں میں جیسے کرچیاں بکھر گئی تھیں۔

"تمہیں صرف جہاں کی پرواہ ہے؟ میری نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ "لیکن مجھے کسی جہاں کی پروا نہیں ہے چاہے ہنسے چاہے روئے۔ مجھے صرف تمہاری پرواہ ہے مجھے تم ہی سے شادی کرنی ہے اور میں کروں گا بھی۔" اس کا دوٹوک انداز زینب کو اندر تک سلگا گیا۔

"نہیں مسٹر ولید! تمہیں صرف اپنی پرواہ ہے کتنی تعریف کریں گے نا سب لوگ تمہاری کتنا عظیم کہیں گے نا لوگ تمہیں کہ تم نے "بیوہ بھاوج" پر ترس کھا کر اس سے شادی کر لی۔" تمام تر زور "بھاوج" اور "ترس" پر تھا ولید کی فراخ پیشانی پر اس الزام سے کئی سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"میرے جذبات کے لیے اس قدر گھٹیا لفظ استعمال مت کرو زینب۔"

"ہاہ...... تمہارے جذبات۔"

"آخر تم اتنا بھڑک کیوں رہی ہو؟ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی کوئی غلط مطالبہ نہیں کیا۔ بتاؤ مجھے زینب! آخر کیا غلط ہے؟ میں تمہیں پسند کرتا ہوں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں کوئی شرعی پابندی نہیں ہے پھر آخر تم کیوں اعتراض کر رہی ہو؟" وہ رکا مگر زینب کو خاموش پا کر کچھ سوچ کر بولا۔

"ہماری شادی کے متعلق میں کل ماں جی سے بات کرنے والا ہوں۔"

"تم ماں جی سے ایسی کوئی بات نہیں کرو گے۔" زینب نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی۔ ولید اس کی طرف مڑا۔ کچھ پل اس کے چہرے کو نگاہوں کی زد میں قید رکھنے کے بعد براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں وہی کروں گا جو میرا دل کہتا ہے اور تم مجھے روک نہیں سکتیں۔" زینب کا سارا وجود آگ کی زد میں آ گیا وہ جانا چاہتی تھی مگر رک گئی۔

"تم وہی کرنا ولید قاسم! جو تمہارا دل چاہتا ہے اور میں وہ کروں گی جو میرا دل چاہتا ہے روک تم بھی مجھے نہیں سکتے اور ہاں......" وہ پلٹی۔ "یاد رکھنا ولید! میری مرضی کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" اب کی بار وہ رکی نہیں تھی۔

+

ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی فائل بھی اس نے میز پر پٹخ کر اپنا سر ان پر گرا دیا۔

عمر کیسے کٹے گی ساری
دل نہیں لگ رہا فائلوں میں

اس نے حسب منشا شعر بگاڑا ذہن الجھا ہوا تھا کبھی ایک پہلو سامنے آتا تو کبھی دوسرا۔ وہ بہت اضطراری انداز میں دائیں ٹانگ ہلا رہا تھا۔ بے چینی یونہی انسان کو مضطرب کر دیا کرتی ہے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی پھر انگلی کی پور سے اسے بجایا گیا تھا اس نے تھکے تھکے انداز میں سر اٹھایا۔

"ہائے فاطین۔"

"ہائے پرنس۔" وہ اندر آ گئی تھی پھر اس کی شکل دیکھ کر جو ہنسنا شروع کیا تو کتنی ہی دیر ہنستی ہی چلی گئی۔ ولید نے اسے ناگواری سے دیکھا اور دونوں ہتھیلیوں سے میز پر بوجھ ڈال کر آگے جھکا۔

"زہر لگ رہی ہو۔" اس نے دانت کچکچائے فاطین کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔

"کیا بنا تمہاری لو اسٹوری کا؟" وہ اپنی ہنسی پر قابو پا رہی تھی۔

"فی الحال تو فلاپ جا رہی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"طینا...... یار...... وہ مانتی ہی نہیں ہے۔"

"ریلیکس ولید...... مان جائے گی۔" وہ تسلی آمیز مسکان سجائے بولی۔ ولید بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا اٹھا اور گلاس ونڈو کے سامنے جا رکا۔

"وہ سمجھ رہی ہے میں اس کی انسلٹ کر رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ میری فیلنگز کو کیوں نہیں سمجھ رہی۔ اب...... اب مجھے کیا پتا کہ میں اس سے کب محبت کرنے لگا۔" اس کی جھنجلاہٹ و بے بسی انتہا کو چھو رہی تھی۔ فاطین نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"مان جائے گی۔"

"کب؟"

"جب وقت آئے گا۔" وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اور وقت کب آئے گا؟" وہ مڑا اور شانہ گلاس سے ٹکا کر سینے پر بازو باندھ لیے۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ سر کھجا کر رہ گئی۔

"فاطین۔" کتنی ہی دیر گلاس کے اس طرف نظر آتے نیلے آسمان پر نظریں ٹکانے کے بعد وہ بولا فاطین استعجابیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں واقعی نہیں جانتا کہ کب اس سے محبت کرنے لگا۔" اس نے کئی بار کا کہا ہوا فقرہ دہرایا تو وہ تپ گئی۔

"ہاں محبت نہ ہو گئی تماشا ہی ہو گیا۔"

"شٹ اپ! میری محبت کو تماشا مت کہو۔" وہ برا مان گیا تھا۔ "میں جانتا ہوں وہ مان جائے گی اور نہ بھی مانے تو کیا فرق پڑتا ہے شادی تو میں پھر بھی اسی سے کروں گا۔" وہ اپنی جون میں لوٹ آیا تھا فاطین نے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اگر تم کہو تو میں زینب سے بات کروں؟"

"نہیں یہ بات اسے اور بھی بری لگے گی۔" وہ دونوں ایک پل کو خاموش ہوئے۔

"اف تم تو بالکل بھی اچھے میزبان نہیں ہو ولید! کم سے کم کافی ہی پلوا دو گھنٹہ بھر سے۔ زینب نامہ کھولے بیٹھے ہو۔"

"ارے واہ! میرا "زینب نامہ" دو منٹ برداشت نہیں ہوا تم سے اور جو خود ہر وقت "احمد نامہ" کھولے رہتی ہو۔" اس نے دوبدو طعنہ دیا تو وہ ایک دم بولی۔

"طعنہ مت دو کافی کے ساتھ پزا کھلواؤ۔"

"کس خوشی میں؟"

"اپنی متوقع شادی کی خوشی اور وہ بھی زینب کے ساتھ۔"

"او کے۔" وہ فوراً راضی ہو گیا۔ "میکڈونلڈ چلتے ہیں" کہہ کر وہ فون پر سیکرٹری کو ضروری ہدایات
نے لگا پھر ریسیور رکھ کر بولا۔

"ویسے ایک بات ہے طینا۔"

"کیا؟"

"تم بھی اچھی خاصی ہو۔ حیرت ہے کہ مجھے تمہارا خیال کیوں نہیں آیا۔" متبسم و شریر لہجے میں وہ
رت کا اظہار کر رہا تھا۔ فاطین نے گھور کر دیکھا پھر مصنوعی آہ بھر کر بولی۔

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا...... اب چلو" وہ دونوں ہنستے ہوئے نکلے تھے واپس آیا تو ماں
ت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔

"کہاں تھے اب تک میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"جی ذرا فاطین کے ساتھ چلا گیا تھا۔" وہ مختصراً بتا کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"کیا تاریخ طے ہوئی ہے اس کی شادی کی؟" انہوں نے پوچھا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بھی نہیں کیونکہ اس کا منگیتر چار ماہ کے لیے پیرس چلا گیا ہے اس کی واپسی پر ہی شادی ہو گی۔"
نا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر سارا گھر چھان مارا لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ واپس ماں جی کے پاس آیا تو وہ مسکرا کر بولیں۔

"زینب، واپس لاہور چلی گئی ہے۔" وہ خجل سا ہو کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"میں یہ تو نہیں پوچھ رہا۔"

"اچھا تو پھر کیا پوچھ رہے ہو؟" ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی چھوٹے سے بچے کی چوری پکڑ رہی ہوں اور بچہ صاحب ذرا سی ڈھیل پا کر فوراً پھیل گئے تھے۔

"آپ نے شعیب بھائی سے بات کی؟" قریب پڑی پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"عقل تمہیں اب بھی نہیں آئی۔ ہزار بار کہا ہے گلاس میں ڈال کر آرام سے پیا کرو مگر مجال ہے کہ تمہارے کان پر جوں رینگ جائے۔" وہ بغیر شرمندہ ہوئے مسکراتا رہا پھر ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ماؤں کے لیے تو اتنی محبت بھی بہت ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو وہ ان کی گود میں سمٹ جایا کرتا تھا۔

"میں نے شعیب سے بات کی تھی۔" وہ انگلیاں اس کے بالوں میں پھیر رہی تھیں۔

"پھر کیا جواب دیا انہوں نے۔" اس کے لہجے میں امید کے دیے کی تھرتھراتی ہوئی لو کی سی بے چینی تھی۔

"اسے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ہم میں سے کسی کو بھی اعتراض نہیں ہے۔ بس زینب مان جائے تو......" وہ خاموش ہو گئیں تو وہ ان کا بالوں میں حرکت کرتا ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر بولا۔

"جب میں زینب کے متعلق آپ سے بات کرنے والا تھا تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ نہیں مانیں گی۔"

"کیوں؟ بھلا تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"میرا خیال تھا کہ آپ روایتی ساسوں کی طرح تن کر کھڑی ہو جائیں گی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "لیکن آپ میں تو ساسوں والے گٹس سرے سے ہیں ہی نہیں۔"

"خدا معاف کرے مجھے ایسے گٹسوں بٹسوں سے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر بولیں۔

"اور میں زینب کی ساس نہیں ماں ہوں اور مائیں اپنی اولاد کی بہتری ہی چاہتی ہیں۔ وحید کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ہی میرے دل میں تم دونوں کی شادی کا خیال آیا تھا مگر تب تم پڑھ رہے تھے۔ اس دوران دو ایک رشتے بھی آئے تھے اس کے جو کافی سے زیادہ اچھے تھے مگر میرا دل راضی نہیں ہوا۔ مرحوم بھائی بھاوج کی نشانی کو میں خود سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"آپ اتنے عرصے سے یہی کچھ سوچے بیٹھی ہیں اگر مجھے کوئی اور پسند آ جاتی تو؟ یا زینب بھی تو کسی اور کو پسند کر سکتی تھی۔"

"سبھی کچھ ممکن تھا مگر خدا بڑا کارساز ہے۔ دیکھ لو اس نے خود ہی تمہارے دل میں زینب کا خیال ڈال دیا۔" ان کی بات سن کر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ماں کی زبان سے یہ بات سن کر اسے تھوڑی سی شرم آئی تھی جسے اس نے تھپڑ مار کر بھگا دیا اور فوراً سیدھا ہو بیٹھا پھر کچھ توقف کے بعد دھیرے سے بولا۔

"وہ مان جائے گی نا ماں جی؟"

"وہ کیا اس کا باپ بھی مانے گا۔" وہ پرجوش انداز میں مسکرائیں تو وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

"لیکن اس کے باپ سے تو مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ ہنسنے لگیں۔

"میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔"

"عبدل سے کہہ دیں۔"

"اسے میں نے بازار بھیجا ہے۔" وہ کچھ سوچ کر پھر رکیں۔ "کل اتوار ہے تم فارغ ہو نا؟"

"جی۔" اس نے بتایا پھر پوچھا۔ "کیوں؟"

"نہیں یونہی پوچھ رہی تھی۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

+

وہ سو کر اٹھی تو کھڑکی سے باہر نظر آنے والا منظر موسم کی دلفریبی کی خبر دے رہا تھا۔ بادلوں کے موٹے موٹے ٹکڑوں کو ہوا نجانے کہاں اڑائے لیے جا رہی تھی۔ اس کا کمرہ گھر کے پچھلی جانب تھا۔ پچھلی دیوار والی کھڑکی سے کالونی کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ جس کے دونوں اطراف میں سفیدے اور سنبل کے درخت تھے جن کی نیم برہنہ ٹہنیاں سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خاموش اور پرسکون سڑک پر زرد و خشک پتوں کا ڈھیر تھا جو ہوا کے ذرا سے تیز جھونکے سے دور تک گھومتے چلے جاتے تھے۔ دور کہیں کوئی کوئل ایسے موسم میں بھی کوک کر زندگی کی نوا دے رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے نے درختوں کو چیخنے پر مجبور کیا تو وہ ایک دم چونکی پھر منہ دھو کر کمرے سے باہر آ گئی۔ بھابی کچن میں مصروف تھیں اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"اچھا ہوا تم جاگ گئیں اب یوں کرو یہ بریانی کا مسالہ بھون لو میں تب تک کوفتے بنا لیتی ہوں۔ کھانے میں دیر ہو گئی تو شعیب خفا ہوں گے۔"

"اتنا اہتمام کس خوشی میں ہو رہا ہے بھئی۔" اس نے چولہے پر چڑھی دیگچیوں میں جھانکا۔

"ماں جی آئی ہیں۔" وہ سرسری بتا کر کچے قیمے میں مسالے ڈالنے لگیں۔ زینب ایک پل کو چپ ہوئی پھر بولی۔

"میں ان سے مل کر آتی ہوں۔"

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔" اسے آنچ مدھم کرتا دیکھ کر وہ بولیں۔

"وہ طارق بھائی ہیں نا میری خالہ کے بیٹے ان کی بیوی ہاسپٹل میں ہے۔ ماں جی اور شعیب اسی کی عیادت کے لیے گئے ہیں۔" وہ سر ہلا کر ہنڈیا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بھابی ہاتھ سے قیمہ مسل رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر انہوں نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"زینب......" وہ رکیں پھر بولیں۔ "ماں جی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آئی ہیں۔" زینب دنگ سی رہ گئی۔

"میری مرضی کے بغیر......"

"شعیب نے ہاں کہہ دی ہے۔" بھابی نے کسی مجرم کی طرح اقبال جرم کیا۔ وہ مارے صدمے کے اسٹول پر ڈھے سی گئی۔

"یہ نہیں ہوگا...... قطعاً بھی نہیں ہوگا۔" کتنی دیر بعد وہ رندھی آواز میں بولی۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ شعیب بھائی اور ماں جی ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ولید تو احمق ہے، گدھا ہے،

بیوقوف ہے۔''

''ارے یہاں تو ہماری شان میں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔'' ولید اسی پل کچن میں داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر زینب یوں کھڑی ہوئی جیسے شیرنی اپنے دشمن کو دیکھ کر چوکنی ہوتی ہے۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم ماں جی سے کچھ نہیں کہو گے۔'' اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔

''ارے بھئی میں نے تو ماں جی سے کچھ نہیں کہا تھا بلکہ ان کا اپنا دل بریانی کھانے کو چاہ رہا تھا تبھی تو انہوں نے بھابی سے فرمائش کی۔'' وہ کمال معصومیت سے بولا۔ ساتھ ہی بھابی سے تائید بھی چاہی۔

''بکو مت ولید قاسم! اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ جو تم چاہتے ہو اول تو میں وہ ہونے ہی نہیں دوں گی لیکن اگر کچھ ایسا ہوا تو.....'' اس سے کوئی بات بن نہ سکی اس ''تو'' کے آگے تو اس نے قطعاً نہیں سوچا تھا اسے اپنے اردگرد الاؤ کے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔

''تم.....تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ.....'' وہ انگلی اٹھا کر بڑے ضبط سے بولی۔

''ورنہ.....؟'' ولید کی نگاہوں میں لطف بھری سرکشی ہچکولے کھا رہی تھی۔

''ورنہ میں تمہیں دھکے مار کر باہر نکال دوں گی۔'' ولید کے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔ وہ غصے میں دو سو واٹ کے بلب کی طرح جل رہی تھی۔ وہ اس کے عین سامنے جا رکا۔

''اچھا ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی طاقت۔'' چیلنجنگ انداز سراسر استہزائیہ تھا۔ زینب کلس کر رہ گئی۔ اس دیوار چین کو دھکا دے کر ذرا سا بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو۔'' بھابی زینب کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔ زینب نہایت غصے سے دھپ دھپ کرتی باہر نکل گئی۔ بھابی نے سر پیٹ لیا جبکہ ولید مسکرا کر بولا۔

''مجھے تو وہ ہوا ہے جو رومیو کو جولیٹ سے ہوا تھا۔''

''اور اسے وہ ہوا ہے جو امریکہ کو تمام اسلامی ممالک سے ہوا ہے۔'' بھابی نے خالی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

✦

دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ کتنی ہی دیر کھڑی رہیں۔ انہیں اپنے شوہر نامدار پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے انہیں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام کرنے کے لیے کہا تھا اور اگرچہ وہ اچھی کوہ پیما تھیں مگر زینب جیسے پہاڑ کو سر کرنا کافی کٹھن تھا۔ پھر جس قسم کے ردعمل کا اظہار اس نے ولید کے سامنے کیا تھا انہیں تو اپنی خیریت بھی مشکل نظر آ رہی تھی۔ بہر حال انہوں نے دل کڑا کیا اور اندر داخل ہو گئیں نیم تاریک کمرے میں ماؤنٹ ایورسٹ انہیں بیڈ پر دراز نظر آئی۔ وہ چھت پر نظریں گاڑے ہوئے

تھی۔

''کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے زینب؟'' گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے ٹیوب لائٹ آن کر دی۔ ایک جھماکے سے روشنی پھیلی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے تیزی سے بازو آنکھوں پر رکھ لیا پھر جب تک آنکھوں نے روشنی کو قبول کیا بھابی نہ صرف اس کے قریب بیٹھ چکی تھیں بلکہ ان کا ہاتھ بھی اس کے کندھے پر تھا۔

''موسم بہت اچھا ہو رہا ہے چلو کچھ دیر ٹیرس پر واک کرتے ہیں۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔ بھابی اس کے کھڑے ہونے کی منتظر ہی رہیں جبکہ وہ آلتی پالتی مارے جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بھابی لفظ ڈھونڈنے لگیں کچھ دیر بعد زینب کی آواز گونجی۔

''آپ نے شعیب بھائی سے کہا۔'' آنکھوں میں آس و نراش کی شمع جلائے وہ انہیں دیکھ رہی تھی بھابی کی نگاہیں جھک گئیں ابھی کچھ روز قبل ہی تو انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہ ہوگا اور اب......

''اچھا زینب! ایک بات بتاؤ۔ آخر تم ولید سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔ کیا اعتراض ہے تمہیں جبکہ تم ولید کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔''

''میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں تبھی انکار کر رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''کیا یہ اعتراض کافی نہیں ہے کہ وہ مجھ سے پورے دو برس چھوٹا ہے۔ میرے مرحوم شوہر کا بھائی ہے جو کچھ عرصہ قبل تک میرے گھٹنے پر سر رکھ دیا کرتا تھا۔ یاد ہے آپ کو وحید کے انتقال سے قبل وہ مجھے بھابی کہا کرتا تھا۔''

''یہ اتنا بڑا اعتراض تو نہیں ہے جانو! اسلام نے اس قسم کی شادی کی اجازت دی ہے پھر جب ولید تمہیں بھابی کہتا تھا تب وہ تمہیں صرف وحید کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ اب وہ بچہ تو نہیں رہا نا نوجوانی اور جوانی کے جذبات میں بہت فرق ہوتا ہے زینب۔'' انہوں نے توقف کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سن رہی ہے یا نہیں۔

''عمروں کا فرق بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ محض دو برس ہی تو بڑی ہو تم اس سے لیکن ساتھ کھڑی ہو تو چار سال چھوٹی ہی لگتی ہو۔'' وہ لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

''جس پر پڑتی ہے وہی جان سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کہ اس خفت کا سامنا آج اور کل بھی مجھی کو کرنا پڑے گا۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتیں کہ اب میرا وجود آپ کو ناگوار لگنے لگا ہے۔'' اس نے نہایت سہولت سے الزام ان کے سر لگا دیا۔

"خدا کے لیے زینب! مجھے اتنا غلط مت سمجھو۔ میں تو تمہاری بھلائی چاہتی ہوں ورنہ تم سے بڑھ کر بھلا کون عزیز ہو سکتا ہے مجھے۔" انہیں بے حد صدمہ پہنچا تھا۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ عمر کا یہ فرق......"

"ابھی عمر پر آپ بہت لیکچر دے سکتی ہیں بھابی! لیکن ایک بات بتایئے خدانخواستہ شعیب بھائی کو کچھ ہو گیا تو کیا آپ مظہر سے شادی کر لیں گی؟ وہ بھی تو آپ سے صرف ایک برس چھوٹا ہے۔" جب ساری دنیا دشمن لگنے لگے تو انسان عقل کا دامن نادانستہ طور پر چھوڑ دیتا ہے اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

"زینب!" وہ مارے غم کے حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اسی پل دروازہ دھاڑ سے کھلا اور شعیب بھائی غضب ناک چہرہ لیے اندر داخل ہوئے۔

"شرم تو نہ آئی ہو گی اتنی بڑی بات کہتے ہوئے۔ کس قدر خود غرض لڑکی ہو تم زینب! بھائی کے مرنے کی دعائیں مانگ رہی ہو۔"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اس نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔" بیچاری بھابی فوراً گھبرا اٹھیں۔

"تم چپ رہو تہمینہ! مجھے بات کرنے دو اس سے۔" انہوں نے گھورا تو وہ سہم کر چپ ہو گئیں۔

"بالکل بھابی آپ چپ ہی رہیں۔" وہ شعیب کی طرف گھومی۔ "اور آپ کیا بات کرنے آئے ہیں مجھ سے؟ خود غرض میں ہوں یا آپ؟ صاف صاف کہہ دیجئے میرا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔ کاش میں مر گئی ہوتی۔" وہ رونے لگی۔ شعیب گنگ سے اسے تکتے گئے پھر کڑے ضبط سے بولے۔

"بہتر ہو گا اب اپنی زبان سے ایک لفظ بھی مت کہنا ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا ہر حسرت پوری ہو جائے گی۔" شعلہ سا لپکا تھا۔

"شعیب پلیز۔" بھابی پھر منمنائیں مگر یہ منمناہٹ دھاڑ میں کھو گئی۔

"ہاں یہی سچ ہے کہ تم بوجھ ہو ہم پر۔ نہیں رکھنا چاہتا میں تمہیں اپنے گھر میں۔"

غصے میں وہ بھی بولتے چلے گئے۔ زینب کے اندر غصہ غم بن کر اودھم مچانے لگا۔ اسے اپنے وجود سے دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ شعیب کو اپنے لفظوں کی سختی کا احساس ہوا تو بولے۔

"ولید بہت اچھا ہے احمق لڑکی...... بہت خوش رکھے گا وہ تمہیں۔ آخر کب تک تم یونہی زندگی گزارو گی؟"

"میری زندگی کو ماریں گولی۔ جہاں آپ کا فائدہ ہے وہاں چاہے مجھے کسی گدھا گاڑی والے سے بیاہ دیں۔" اس نے گال رگڑے اور قطعیت سے بولی۔

"مگر ایک بات یاد رکھیے گا شعیب بھائی! میں بھی زینب ہوں مر جاؤں گی مگر شادی نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے عین بارات والے روز پنکھے سے لٹک جانا یا چوہے مار دوائی نگل لینا۔ مگر اتنا تم بھی یاد

جہنم میں تنہا تو ہم بھی تمہیں نہیں رہنے دیں گے۔" انہوں نے ترکی بہ ترکی دھمکی دی اور بھابی کا ہاتھ کر باہر نکل گئے۔

"یہ کیا کیا آپ نے آخر کیا ضرورت تھی اتنی سختی سے بات کرنے کی۔" وہ متفکر سے انداز میں بولیں ڈر ہو رہا تھا۔ شعیب مسکرانے لگے باہر آتے ہی ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"تم تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔" وہ متبسم و شریر لہجے میں بولے۔

✦

شام نے کب رات کا آنچل اوڑھ کر دن کے اجالے کو الوداع کہا۔ تھک ہار کر پرندے کب درختوں ٹہنیوں میں سوئے؟ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کا نظارہ کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود وہ جان ئی۔ ذات کے ایوان میں دکھ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ براجمان تھا۔ کمرے کی خاموش تنہائی میں جود گم نہیں تھی۔ وہ وحید کی رفاقت میں گزارے لمحوں میں بھٹک رہی تھی کتنا مختصر دور تھا وہ اور دور بھی ٹھٹک کر ساکت ہو گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ اس پل دل کا غبار ؤں میں ٹھہرا ہوا تھا اور وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے کندھے پر نرم جھریوں ے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے بہت زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔ پھر دباؤ بڑھا اور اس کا رخ موڑ لیا گیا اس نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں ایک آوارہ بوند پلکوں کی قید سے رہائی پا کر گال پر لکیر چھوڑ گئی۔ کے سامنے ماں جی کھڑی تھیں چاہت کے دریچے میں مان کا دیا سجائے جس کی لو امید کے تیل سے ن تھی۔

"کیا میری بات بھی نہیں مانو گی؟ مجھے تو ماں کہتی ہو نا تم تو کیا تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں؟" زینب کے شانے پر سر رکھے بری طرح رو دی۔

✦

ذرا سی پلکیں اٹھا کر اس نے زرتار آنچل کی اوٹ سے سارے کمرے میں نگاہ ڈالی۔ یہ کمرہ اس نے کوئی بار نہیں دیکھا تھا اور وہ کوئی پہلی بار بھی یہاں نہیں آئی تھی مگر آج تو اس کمرے کے تمام رنگ ہی بدلے ئے تھے۔ یقیناً سارے کمرے کو نئے سرے سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ زمین اور سارا بیڈ گلاب کی یوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کی خوشگوار مہک چاروں اور اڑتی پھر رہی تھی۔ بیڈ کے اطراف میں رکھے لوں کے گلدان وائیٹ اور ریڈ للی گود میں لیے مسکرا رہے تھے جبکہ اس کے دماغ میں اذیت کے جھکڑ چل تھے اسے اپنے سجے سنورے روپ سے سخت وحشت ہو رہی تھی لیکن ابھی وہ شدید خواہش کے باوجود

کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مبادا کوئی کمرے میں آ جاتا اور اسے عام حلیے میں دیکھ کر نجانے کیا سمجھتا۔ اسے ایک ہفتہ قبل اپنی کزن شازیہ کی کہی بات یاد آ گئی جب بھابی اسے مایوں بٹھانا چاہتی تھیں۔

"رہنے دو تہمینہ! اس کی کون سی پہلی شادی ہے پھر پچھلی بار بھی تو مایوں بیٹھی تھی اس بار نہ بیٹھے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔" لوگ مزاح کے لبادے میں کتنا گہرا طنز کر جاتے ہیں یہ اس نے اسی پل میں جانا تھا۔ شکست خوردہ سی نگاہ بھابی پر ڈال کر وہ پلکیں جھکا گئی۔ ایک اسی بات نے ساری ہمت کھینچ لی تھی پھر آنے والے دنوں میں وہ بھابی کی ہر بات مانتی چلی گئی۔ آف وائیٹ وال پر سرکتی اس کی نظر ولید قاسم کی تصویر پر جا رکی۔ بلاشبہ بلیک ہائی نیک میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا اور یقیناً آج اس کی وجاہت کو چار چاند لگے تھے کیونکہ اس نے کئی کزنز کو اس کے متعلق کہتے سنا تھا۔

"ویسے زینب! تم ہو بہت خوش قسمت دوسری بار بھی کس شان سے بارات آئی ہے تمہاری۔" پتا نہیں یہ رشک تھا یا......

"بھئی ظاہر ہے زینب کے ارمان تو پہلی دفعہ ہی پورے ہو گئے تھے لیکن ولید کی تو پہلی شادی ہے نا۔" جانے کس نے کہا تھا اور محفل کشت زعفران بن گئی تھی۔ وہ بھابی سے کہنا چاہتی تھی مگر وہ ان سب کو ڈپٹ رہی تھیں۔

"یار چھوڑو ان سب باتوں کو۔ زینب! تم یہ بتاؤ ولید نے تم سے پہلی بار اظہار عشق کب کیا تھا۔" اس کی ماموں زاد کاشفہ اشتیاق سے اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کا دل چاہا تھا کہ اس پل ساری مصلحت بالائے طاق رکھ دے اور دھاڑیں مار مار کر روئے، کاشفہ کہہ رہی تھی۔

"تم دونوں اتنا عرصہ ایک ہی گھر میں رہتے رہے ہو کوئی بات تو ایسی ہو گی جو بات شادی تک پہنچی۔"

"تم یہ سب ولید سے ہی پوچھ لینا۔" بھابی نے ان سب کو وہاں سے اٹھا دیا اور اس کے اندر بوند بوند ٹپکتا غصہ سوراخ کرنے لگا تھا اور اب جبکہ وہ اس کی دلہن کی حیثیت سے اس کے کمرے میں موجود تھی تو سوراخ کھائی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اسے اپنے گل بوٹوں سے مزین ہاتھوں سے غلیظ بو آ رہی تھی۔ تن سے لپٹا میرون عروسی جوڑا اسے خون رنگ لگ رہا تھا۔ خون ہی تو تھا اس کی امیدوں کا، اس کے بھروسے اور مان کا اور قاتل کون تھا؟ ولید...... ولید قاسم۔ جس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھی تھی اور قد آدم آئینے کے سامنے رک کر زیورات اتارنے لگی تھی۔

+

جس پل وہ کمرے میں داخل ہوا زینب نہایت اطمینان سے بیٹھی تھی مگر جیسے ہی اس نے دروازہ لاک کیا۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر بیڈ سے اتری تھی۔ اس سے قبل وہ گھونگھٹ پلٹنا نہیں بھولی تھی۔ وہ چند

وہیں کھڑا اسے تکتا رہا پھر جیب سے والٹ اور دیگر ضروری اشیاء نکال کر میز پر ڈالیں اور صوفے پر نیم دراز ہو کر بہت سہولت سے ٹانگیں میز پر پھیلا لیں۔ اب وہ نہایت اطمینان سے سر کے پیچھے ہاتھ باندھے اسے نوچ نوچ کر زیورات اتارتا دیکھ رہا تھا جس کے ہر انداز سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ ولید اسے پکارنا چاہتا تھا مگر نجانے کیا چیز زبان کو تالو سے چپکائے ہوئے تھی۔ اپنا سجا سنورا روپ کس بے دردی سے اجاڑ رہی تھی وہ۔ اتنا صبر بھی نہیں کر رہی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ ہی لے۔ پتا نہیں کیوں وہ اتنی متنفر ہو گئی تھی حالانکہ کوئی غلط تمنا تو نہیں کی تھی اس نے اور تمنا بھی ایسی جسے حاصل کرنے میں اس کے اردگرد کے سبھی لوگ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ تو اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا مگر ماں جی کا خیال تھا کہ شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور اس نے بھی امید پر اپنی دنیا قائم کر لی تھی۔

"اگر تم اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سن لو تو شاید بہت سے معاملات سلجھ سکتے ہیں۔" اسے واش روم کی طرف جاتا دیکھ کر وہ ایک دم بولا۔ زینب نے مڑ کر ایک قہر زدہ نظر اس پر ڈالی۔

"شاید نہیں یقیناً سلجھ سکتے ہوں گے مگر مجھے تمہارے ساتھ کوئی معاملات نہیں سلجھانے۔" اس کے انداز میں سرد سی قطعیت تھی۔

"کیوں؟" وہ ایک پل بھی ضائع کیے بنا اس کے سامنے آیا تھا۔

"کیونکہ یہ شادی ماں جی کی مرضی سے ہوئی ہے یا پھر شعیب بھائی کی زبردستی کی وجہ سے، لہٰذا مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" دو ٹوک لہجے میں کہہ کر وہ واش روم میں گھس گئی۔ ولید نے ایک گہری سانس ہوا کے سپرد کی تھی۔

"تم نے کسی اور کی مرضی کے آگے سر جھکایا ہو گا ہمیں تو ہمارے دل نے کہا تھا۔" وہ خود بخود مسکرایا۔

"ٹھیک ہے زینب بی بی! ہم بھی دیکھیں گے کہ تم کب تک اپنی انا کا پرچم بلند رکھتی ہو۔" اس کی آوازیں واش روم کے دروازے سے ٹکرا کر پلٹ آئیں۔ زینب باہر آئی تو وہ گردن تک کمبل تانے اطمینان سے سو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر وہ اندر تک تپ گئی۔ اگرچہ پہلے بھی ارادہ صوفے پر رات گزارنے کا تھا مگر اب سخت تذلیل کا احساس ہو رہا تھا۔ تیز تیز بالوں میں برش یوں پھیرا گویا سارا غصہ ادھر ہی نکال دینا ہو۔ دھاڑ سے الماری کھولی کھینچ کھانچ کر کمبل نکالا۔ اسی دھاڑ سے بند کیا۔ راستے میں آئی ٹیبل کو ٹھوکر ماری اور تکلیف سے لب بھینچ لیے۔ ساری رات صوفے پر لیٹے کراہ کر گزری۔ رہ رہ کر ولید پر غصہ آ رہا تھا۔ اتنا نہ ہوا کہ اٹھ کر کہہ دے تم بیڈ پر سو جاؤ۔ میں صوفے پر سو جاتا ہوں۔

تھک کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ گھور گھور کر کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی رہی جس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔

"بے ادب نہ ہو تو۔ بڑی ہوں میں اس سے اور بڑوں کا احترام تو لازم ہے۔" جھنجلا کر کمبل سر تک

تان لیا۔ پھر جب صبح موٴذن نے پہلی اذان دی تب اس کی آنکھ لگی۔ خواب میں اس نے وحید کو دیکھا جو بڑی برہمی سے اس کے سامنے کھڑے تھے جبکہ وہ منمنا رہی تھی پھر وہیں کہیں ولید بھی آ گیا۔ زینب کو اس کے چہرے پر بڑی خباثت نظر آئی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس آیا تھا۔ پھر پورے استحقاق سے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا تھا۔ وہ مچل کر وحید سے التجا کرنے لگی تبھی وحید نے پیروں سے ہوائی چپل اتاری اور ان دونوں کی طرف یوں بڑھے جیسے قصائی بکرے کی طرف بڑھتا ہے۔ انہوں نے کھینچ کر زینب کو ولید کے شکنجے سے آزاد کروایا اور اس کے بعد دھپ دھپا دھپ...... ولید کی شامت آ گئی۔

"مت ماریں وحید، چھوڑیں وحید، بچہ ہے۔" وہ انہیں روکنے کو آگے بڑھی اسی چکر میں ٹھاہ کر کے ایک ضرب اس کی کمر پر لگی اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ سانس بیحد غیر متوازن، دھڑکن ڈگمگاتی ہوئی اور چہرہ عرق زدہ۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر گردن ادھر ادھر گھمائی۔ وحید کہیں نہیں تھے البتہ ولید آئینے کے سامنے کھڑا بے حد حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں ہیئر برش تھا اور کمرے میں ٹائم پیس کے الارم کی آواز گونج رہی تھی۔ کھڑکھڑاتی آواز ذہن پر کوڑے برساتی رہی۔

"کیا ہوا زینب!...... اور کون بچہ...... کس کا بچہ۔" ولید نے جھک کر تشویش سے اس کے زرد رد چہرے کو دیکھا وہ ابھی تک سانس بحال نہیں کر پائی تھی۔

"وہ...... وہ وحید......" سراسیمگی چہرے سے ہویدا تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وحید ابھی کہیں سے نکل کر سامنے آئیں گے اور اسے مارنے لگیں گے۔

"اس کے ذہن سے تو شاید کبھی وحید لالہ نہیں نکلیں گے۔" ولید ایک دم سیدھا ہوا۔

"شادی مجھ سے ہوئی ہے اور خواب ابھی تک وحید لالہ کے دیکھے جا رہے ہیں۔ بھگتو ولید میاں! محبت کرنے کی یہی سزا ہے۔" وہ بڑبڑایا ایک دم ہی ولید کو وحید لالہ سے بے تحاشا جلن محسوس ہوئی تھی۔

"شعیب بھائی اور تہمینہ بھابی ناشتا لے کر آئے ہیں۔ اٹھ کر فریش ہو جاؤ۔"

زینب کے حواس بیدار ہو چکے تھے سو ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی جس کے چہرے پر اب خفگی رقم تھی۔

"کاش وحید دونوں چپل اتار لیتے تو میں بھی اس ولید کے بچے کا حشر بگاڑتی۔" اس نے دانت کچکچائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں سو رہی تھی مر نہیں گئی تھی جو مردوں کو جگانے والا الارم لگایا تھا۔" الارم بند کرتے ہوئے اس نے ایک نگاہ بھی گلاب کی نیم جان پتیوں پر نہ ڈالی تھی جو اپنی بے قدری پر اب تک ماتم کناں تھیں۔ ولید نے اسے دیکھا اور قدم آدم آئینے کے سامنے جا رکا۔

"پچھلے آدھے گھنٹے میں، میں آپ کو تقریباً پانچ بار آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کر چکا ہوں مگر آپ تو یقیناً پورا اصطبل بیچ کر سوئی تھیں۔" اجنبی انداز میں گہرا طنز تھا۔

"کاش یہ اونٹ بھی اس وقت نظر آ جاتا۔" وہ بڑبڑا کر واش روم میں گھس گئی اور جب ٹھنڈے یخ پانی نہا کر باہر نکلی تو بری طرح کانپ رہی تھی۔ بھائی بھابی سے وہ نارمل انداز میں ملی تھی۔ شعیب بھائی نے ی پیشانی پر پیار کیا تھا۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہے نا ہماری بیٹی۔" انہوں نے بھابی سے کہا تھا اور لہجے کی شفقت محسوس کر کے نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔ ذرا سی نظر اٹھا کر قریب کھڑے ولید قاسم کو دیکھا۔ گرے کلر کے کرتا ار میں وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ زینب جھنجلا سی گئی جب وہ خود خوش نہیں تھی تو اسے بھی خوش ہونے کا حق ں پہنچتا۔

"زینب! منہ دکھائی میں کیا ملا؟" اس کی اکتائی ہوئی صورت دیکھ کر بھابی اس کی طرف جھکیں۔ اس ٹھا کر ولید کو دیکھا جو اس وقت دیگر کزنز کے ساتھ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اسے مناسب جواب ں سوجھ رہا تھا۔

"کیا دیا ہے ولید نے تمہیں؟" بھابی نے اسے پھر ٹہوکا دیا تو وہ سر جھکا کر کلائی میں پڑی چوڑیوں سے لگی۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"ہیں کچھ بھی نہیں۔" وہ چونکیں پھر کچھ سوچ کر ولید کی طرف گھومیں۔

"تم نے زینب کو کچھ بھی نہیں دیا۔" یہ سوال انہوں نے شعیب اور کزنز کے باہر جانے کے بعد کیا تھا۔

"ارے واہ کچھ بھی نہیں کیوں؟ اپنا آپ ان محترمہ کو سونپ دیا کیا یہ کافی نہیں ہے۔" اس نے سرسری ی نگاہ اس پر ڈالی جو اس وقت دنیا جہان کی سنجیدگی چہرے پر سجائے نئی نویلی دلہن کی بجائے اماں لگی بیٹھی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کافی نہیں ہے تمہیں کچھ اور بھی گفٹ دینا چاہیے تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"منہ دکھائی کا تحفہ الگ ہوتا ہے۔"

"کوئی سو بار تو یہ صورت دیکھ ہی چکا ہوں میں پھر اب کیوں الگ سے تحفہ دیتا؟"

اس نے بہت شریر انداز میں بھابی سے دریافت کیا تھا۔ زینب کو ہتک کا شدید ترین احساس ہوا زبان تک تو بہت کچھ آیا تھا مگر بھابی کے خیال سے چپ رہی۔ بھابی ہنس رہی تھیں۔

"ضرور سو بار دیکھی ہو گی مگر دلہن بنی تو پہلی بار ہی دیکھی ہے نا۔"

"کیوں ولید! وحید بھائی کی شادی میں نہیں دیکھا تھا زینب کو؟" اسی پل ولید کی چچازاد شازمین نے مل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ ولید اور بھابی نے ایک ساعت میں زینب کو دیکھا۔ وہاں کے تاثرات

توقعات سے کچھ کم نہ تھے۔

"بالکل دیکھا تھا مگر تب دل نہیں بھرا تھا تبھی تو دوبارہ دیکھنے کا بندوبست کیا ہے۔" حد درجہ اطمینان سے جواب دے کر وہ اٹھا اور وارڈ روب کے داہنی کیبنٹ سے ہرا مخملیں کیس نکال لایا جسے کھول کر بھابی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ ہے، رات پہنا نہیں سکا تھا لہٰذا اب پہنا دیتا ہوں۔" سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اس نے گولڈ نیکلس زینب کے گلے میں پہنا دیا تھا۔ ساتھ ہی کڑے بھی تھے جنہیں ایک ہی کلائی میں ڈال کر وہ اس کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ بھابی کو ایک گونا سکون ہوا جبکہ زینب کو یہ چونچلاہٹ بالکل نہ بھائی تھی اور شازمین بظاہر مسکراتے ہوئے اپنے دل کو تھپکیاں دے رہی تھی۔ ولید جیسے شاندار بندے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیکھنے کا خواب تو اس نے بھی دیکھا تھا۔

✦

"ہائے یہ کیا کر رہی ہو تم؟" ماں جی کی دلخراش ہائے پر اس کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے نہ ہٹی ہوتی تو یقیناً گرم مسالے سے اس کے پاؤں پر تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ بن گیا ہوتا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے زینب، کیا کر رہی ہو تم؟" وہ صدمے کے اثر سے نکل کر اب کسی قدر غصے سے پوچھ رہی تھیں۔

"کھانا پکا رہی ہوں ماں جی!" کفگیر اٹھاتے ہوئے اس نے کسی قدر استعجاب سے جواب دیا کیونکہ ان کی وجہ ناراضگی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"کس گدھے نے کہا ہے یہ سب کرنے کو۔" انہوں نے کفگیر اس کے ہاتھ سے لے کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

"کیا تم ہمارے خاندان کی رسموں سے ناواقف ہو؟ معلوم ہے نا تمہیں کم سے کم بھی ایک مہینہ تک نئی دلہن سے کام نہیں کروایا جاتا۔" وہ اسے یاد دلا رہی تھیں زینب کو ہنسی آ گئی۔

"بھلا اب ہنس کیوں رہی ہو؟"

"میں کہاں کی نئی دلہن ہوں ماں جی ایک عرصہ سے اس گھر میں رہ رہی ہوں۔ کام کرنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ فارغ نہیں بیٹھ سکتی۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو زینب!" وہ ڈپٹ کر بولیں۔ "ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے تمہاری شادی کو۔ میں مانتی ہوں کہ بہت عرصہ تم وحید کے حوالے سے اس گھر میں آتی رہی ہو مگر اب بات دوسری ہے پھر ولید کیا سوچے گا میری نئی نویلی دلہن کو کام پر لگا دیا۔" اب کے انہوں نے بات کو مزاح کا رنگ دینا چاہا مگر وہ

سکرا بھی نہ سکی۔

"پھر آرام کرنے کے بھی تو چند دن ہیں۔ اس کے بعد تو سب کچھ تم ہی کو سنبھالنا ہے اور کتنے دن ہوں میں یہاں؟" انہوں نے گہرا سانس بھرا تو وہ آزردہ سی ہو کر ان سے لپٹ گئی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔"

"لاحول ولا۔" انہوں نے جھرجھری لی پھر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

"خاطر جمع رکھو۔ تمہارے بچوں کی شادیاں کیے بغیر اس دنیا سے جانے والی نہیں ہوں میں۔"

"جی......"

"جی۔" وہ بولیں۔ "میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ کچھ دنوں میں سارا گھر تم ہی کو سنبھالنا پڑے گا کیوں کہ جنید میرا ویزہ بھجوا رہا ہے اور اگلے ماہ میں دبئی جا رہی ہوں۔"

"کیوں جا رہی ہیں ماں جی۔" وہ پریشان سے ہو گئی تھی۔ "یہاں کوئی تکلیف ہے آپ کو میرا مطلب ہے میری یا ولید کی وجہ سے؟"

"ارے نہیں میرے بچے! بھلا اپنے گھر میں کیا تکلیف ہو گی۔" وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ "اس کی بیوی کے لیے جڑواں بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ تبھی مجھے بلایا ہے ورنہ وہ کب ماں کو یاد کرتا ہے۔" وہ نالاں دکھائی دے رہی تھیں مگر ماں تو ماں ہوتی ہے نا۔ بچوں کی غلطیاں کب غلطیاں لگتی ہیں۔

"پھر ذاتی بزنس چلانا کوئی آسان کام ہے؟ وہ بیچارا بھی کیا کرے۔ اسی موئے بزنس کی وجہ سے بھائی کی شادی میں شرکت بھی نہیں کر سکا۔" ان کے خاموش ہونے پر وہ افسردہ سی ہو گئی حیران تو خیر تھی ہی۔

"آپ نے پہلے ذکر ہی نہیں کیا کہ دبئی جا رہی ہیں۔"

"ولید نے نہیں بتایا تمہیں؟"

"نہیں...... ہاں...... بتایا تھا۔" اس نے بات بنائی کہ اپنے تعلق کی سرد مہری کو کمال خوب صورتی سے سب کے سامنے بہترین بنا رکھا تھا۔ پھر مزید ایک ہفتہ ہی گزرا تو اس کی اکتاہٹ عرش کو چھونے لگی۔

"بس بہت ہو چکا ماں جی! اب میں مزید ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ آج میں کھانا پکاتی ہوں۔" اس نے چند لفظوں میں مدعا سمیٹا تو وہ گھور کر بولیں۔

"چپکی بیٹھی رہو۔"

"ماں جی پلیز۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں حد درجہ بوریت محسوس کر رہی ہوں۔ بھلا آپ خود بتائیں کہ میں کیا کروں؟"

"گھومو پھرو عیش کرو۔ تم دونوں کی حرکتیں مجھے کچھ مشکوک لگ رہی ہیں۔ شادی کے ابتدائی دن تو ہوتے ہی گھومنے پھرنے کے لیے ہیں۔ تم دونوں کو تو خدا ہی سمجھے۔ دعوتوں کو بھی منع کر رکھا ہے۔ میں پوچھتی

ہوں دفتر سے اتنی دیر سے آنے کی کیا تک ہے؟" کمان کا رخ چینل سرچنگ کرتے ولید کی طرف ہوا تو وہ اطمینان سے بولا۔

"آفس میں کام بہت ہے ماں جی......"

"ہاں، ہاں سارا آفس تمہارے ہی کندھوں پر سوار ہے۔"

"اچھا کیا چاہتی ہیں آپ؟" وہ ہنوز ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"میں کیا چاہوں گی مگر...... پہلے اس ٹی وی کو تو بند کرو۔" ولید نے والیم بہت کم کر دیا البتہ آف نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر دل ہی دل میں بیٹے کی عقل پر ماتم کرتی رہیں پھر اکتا کر بولیں۔

"زینب کو کہیں گھما لاؤ۔" ولید نے زینب کو دیکھا جو اکتاہٹ کا شکار تھی۔

"چڑیا گھر تو اس نے دیکھ رکھا ہے۔" وہ مذاق میں ہی بات ٹال دینا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ زینب کبھی جانے پر راضی نہ ہوگی۔ زینب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ آج کل ویسے بھی مذاق سمجھنے کی صلاحیت کم ہوگئی تھی۔

"ولید!" ماں جی نے اسے تنبیہی انداز میں گھورا تو وہ ہنسنے لگا۔

"شاہدرہ اور اچھرہ یہ جا چکی ہے۔ شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد اور مینار پاکستان بھی دیکھ رکھے ہیں۔" وہ انگلیوں پر گنوانے لگا۔ وہ ماں جی کی طرف متوجہ تھا مگر اس کے باوجود زینب کے تاثرات اسے اندر ہی اندر محظوظ کر رہے تھے۔

"یوں کر میرے لال! ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی بکنگ کروا لے۔ شادی کے فوراً بعد گھومنے پھرنے کے لیے اس سے زیادہ اچھی جگہ پورے پاکستان میں ہے ہی نہیں۔" ماں جی جل کر بولیں۔ زینب کو اس جواب نے بڑا سکون دیا تھا جبکہ ولید کا قہقہہ چھت پھاڑ تھا۔

"اچھا کل ہم بھاٹی گیٹ جائیں گے ناشتا کرنے۔" اسے زینب کی تلملاہٹ مزہ دے رہی تھی جس نے تپ کر کہا تھا۔

"بھاٹی گیٹ کی بجائے لاہوری منڈی چلیں گے لسی پینے۔" اس نے فقرہ دانتوں تلے چبا ڈالا تھا۔ ولید کی ہنسی دبانے کی کوشش ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ ماں جی نے باری باری دونوں کو دیکھا ان کی سنجیدگی ماں جی کو حیران کر رہی تھی۔

"تم دونوں کی کہیں مت تو نہیں ماری گئی۔"

"آپ خفا مت ہوں۔ زینب سے پوچھ لیں یہ جہاں جانا چاہے گی میں لے جاؤں گا۔" اس نے مزید جلانے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے سارا بار اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ ماں جی جھنجھلا گئیں۔

"کیوں تمہارا منہ دکھتا ہے پوچھتے ہوئے؟" انہیں شک سا گزرا۔ وہ دونوں ان کے سامنے ایک

دوسرے کو بس منہ توڑ جواب ہی دیتے تھے۔

"رہنے دیں ماں جی! مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"لاہوری منڈی بھی نہیں۔" اپنے پیچھے اس نے ولید کی آواز سنی تھی اور کوئی بھی جواب دیئے بنا کمرے میں گھس گئی۔

"بس اتر گیا دو دن میں عشق کا بھوت...... یہ نہیں کہتا کہ اپنے سے بڑی عمر کی بیوی کو ساتھ باہر لے جاتے شرم آتی ہے۔" بدگمانی ہر پہلو خود ہی تلاش کر لیا کرتی ہے۔ وہ بیڈ پر لیٹی تھی یک دم کنپٹی کے قریب نمی سی محسوس ہوئی اس نے چھو کر دیکھا۔

"ارے میں رو کیوں رہی ہوں؟" وہ حیران ہوئی پھر جھلا کر اٹھ بیٹھی۔

+

عجیب خاموش سی شام دھرتی پر اتری تھی آشیانوں کو لوٹتے پرندے بھی کیسے اداس اور اسی کی طرح کوفت زدہ لگ رہے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر ٹیرس کی ہری گرل کے پاس کھڑے مشرقی افق پر پھیلتے سیاہی مائل بادلوں کو دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ شام بھی اندھیرے میں تحلیل ہوگئی۔ اپنے گرد گرم شال اچھی طرح لپیٹ کر وہ نیچے آگئی۔ ولید کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس نے سارے گھر کی لائٹس آن کیں اور لاؤنج میں آ گئی۔ ابھی ٹی وی آن کیا ہی تھا کہ فون گنگنا اٹھا۔ دوسری طرف ولید تھا جس نے سلام کا جواب دیتے ہی کہا تھا۔

"میں پندرہ بیس منٹ میں آ رہا ہوں تم تیار رہنا۔ آج فاطین نے اپنے گھر ڈنر پرائیویٹ کر رکھا ہے۔" زینب نے ناگواری سے لب بھینچ لیے اس خیال سے جو ذرا خوشی ہوئی تھی کہ ولید نے اس کی تنہائی کے خیال سے فون کیا ہوگا۔ اب ساری دھری رہ گئی۔ دل تو چاہا کہہ دے مجھے کہیں نہیں جانا مگر اچھا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ ایسی کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ اس نے میرون کرتا، پاجامے کا انتخاب کیا جس کے ساتھ فل ایمبرائیڈرڈ دوپٹہ تھا۔ سوٹ کی مناسبت سے ہلکی سی جیولری پہن لی اور میک اپ اس نے نسبتاً ڈارک کیا تھا اتنے عرصے بعد بہت دل سے تیار ہوئی تھی سو اپنا آپ اچھا لگ رہا تھا۔ شگی کٹ بالوں کو اس نے یونہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ولید پندرہ منٹ کی بجائے پورے پینتالیس منٹ بعد آیا تھا اور آتے ہی جلدی مچا دی تھی راستے میں اس نے فریش ریڈ روزز کا بوکے اور چاکلیٹ کیک خرید کر اسے تھما دیا تھا۔ فاطین کے گھر فاطین اس کی دو چھوٹی بہنوں اور والد نے ان کا استقبال کیا تھا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔" گال سے گال ملا کر بوسہ دیتے ہوئے فاطین نے کہا تھا۔ اس نے بس مسکرا کر تعریف قبول کر لی۔ فاطین کے بابا نے اس کے سر پر پیار دیا تھا۔ وہ بہت ہی شاندار پرسنیلٹی

اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ زرمین اور نوشین بھی بے حد اچھی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار رہی تھی۔ ہر دومنٹ بعد کوئی ایسی بات ہوتی جو اسے ہنسنے پر مجبور کر دیتی اور وہ ہنستی ہی چلی جاتی کھانا بھی بہت اچھے ماحول میں کھایا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہاں آنا ناحق نہیں گیا۔ ماں جی کے جانے سے وہ بہت تنہائی محسوس کرنے لگی تھی پھر عبدل بھی کچھ دنوں کے لیے گاؤں گیا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد فاطین اسے اپنا اسٹوڈیو دکھانے لے گئی تھی وہ فائن آرٹس میں ماسٹرز کر رہی تھی اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز دیکھ کر بہت متاثر ہوئی تھی اور اس کا برملا اظہار بھی کر دیا تھا۔ فاطین اس کی بات سن کر ہنسنے لگی پھر بولی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے زینب!" اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اس نے تجسس پھیلانا چاہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"اچھا...... کیا؟"

"ادھر آؤ" وہ اسے ایک کونے میں لے گئی پھر اس نے ایک تصویر اٹھا کر زینب کے سامنے کر دی۔

"ارے...... یہ تو میں ہوں۔" زینب کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ فاطین اپنے کارنامے پر خود ہی بہت خوش ہو رہی تھی۔

"ہاں بھئی یہ تم ہی ہو...... میں نے بنائی ہے یہ تصویر۔" اس نے بتایا۔

"ایکچوئلی تمہارے چہرے کے ایک ایک نقش کے بارے میں مجھے ولید نے بتایا تھا بس میں نے اندازے سے تصویر بنا دی۔" فاطین تصویر پر نظریں ٹکائے شاید تنقیدی جائزہ لے رہی تھی جبکہ اس کا ذہن پہلی بات میں اٹک گیا تھا۔

"میری اور ولید کی نیٹ فرینڈ شپ ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ دوستی بڑھتی گئی پھر ملاقات ہوئی اور اب ہم بیسٹ فرینڈز بن چکے ہیں۔ یو نو ہم جب بھی ملتے تھے ولید سب سے زیادہ تمہارے بارے میں ہی باتیں کرتا تھا اور میں احمد کے بارے میں۔" وہ رکی پھر بولی۔

"زینب! تم پلیز ہماری فرینڈ شپ کو غلط مت سمجھنا۔ ہم لوگ صرف دوست ہیں اور احمد سمجھتا ہے کہ ......" وہ خاموش ہو کر ہونٹ چبانے لگی یکدم وہ بہت افسردہ نظر آنے لگی تھی زینب نے اس کا ہاتھ بہت پیار سے تھام لیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم دونوں صرف دوست ہو پلیز...... پلیز تم رو مت۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ولید کی محبت سے واقف ہو۔" وہ افسردگی سے ہنسی۔

"تو کیا احمد تمہاری محبت سے واقف نہیں ہے؟" وہ احمد کو نہیں جانتی تھی مگر فاطین کے انداز سے جان گئی تھی۔ فاطین نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔

"خیر فکر مت کرو میں ولید سے کہوں گی وہ احمد کو سمجھا......"

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فاطین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہماری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔"

"اوہ۔" زینب چپ سی رہ گئی جبکہ فاطین ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئی۔ احمد نہیں تو کوئی اور سہی۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ وہ ولید مجھے کوس رہا ہوگا کہ نجانے میں اس کی بیوی کو کہاں لے گئی۔" بعض اوقات انسان اندر کا حال چھپانے کے لیے ہنسی کا سہارا لیتا ہے اور اسے لگا کہ فاطین بھی ایسا ہی کر رہی ہے بہر حال وہ اس کے ساتھ باہر آگئی۔

"بہت خوش قسمت ہو تم زینب! کیونکہ تمہیں ولید جیسا ہزبینڈ ملا ہے۔ مگر تم سے بھی زیادہ خوش قسمت ولید ہے کیونکہ اسے تم ملی ہو۔" کاریڈور سے گزر کر لونگ روم کی طرف جاتے ہوئے فاطین نے کہا تھا اور وہ کمنٹس سن کر بہت زور سے ہنسی تھی۔ ان کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ راستہ بھر وہ منتظر ہی رہی کسی ستائشی جملے کی مگر...... اور اس کی وجہ وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ وہی ولید تو تھا جسے وہ بچہ سمجھتی تھی اور جس سے شادی نہ کرنے کے لیے اس نے بہت احتجاج کیا تھا۔

+

وہ کچن سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو ادھ کھلے دروازے سے آتی ولید کی آواز نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم اچھی خاصی ہو۔ زینب کو چھوڑ کر تم سے شادی کر لیتا ہوں مگر تم نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا۔" زینب کا سر گول گول گھومنے لگا۔ پیشانی پر کئی ایک سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ ولید کے بارے میں اس کی سوچ قدرے مثبت ہو گئی تھی مگر اب...... دوسری طرف سے نجانے کیا کہا گیا تھا جس پر ولید بہت زور سے ہنسا تھا۔

"ارے نہیں بھئی۔ تمہاری خوب صورتی کا تو میں قائل ہوں۔ یاد ہے اس دن ریسٹورنٹ میں وہ ساٹھ سال کا بابا کیسے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ تو شکر کرو وہاں میں آ گیا۔" گویا نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا دل دھڑا دھڑ چیخنے لگا۔ وہ پھر ہنس رہا تھا۔

"سوچ لو مجھ سے شاندار بندہ تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔"

"تم اشارہ تو کرو میں کل ہی تم سے شادی کر لوں گا۔" زینب نے گھومتے سر کو سنبھالتے ہوئے دروازے کا سہارا لینا چاہا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ ولید نے اسے تیزی سے جاتے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"طلینا! میں تمہیں کچھ دیر بعد رنگ کرتا ہوں۔" فاطین کیوں، کیوں ہی کرتی رہ گئی اور اس نے ریسیور رکھ بھی دیا۔ لاؤنج میں جھانکا پھر کچن میں۔ لیکن زیادہ تردد کرنا نہیں پڑا تھا۔ کھلے ہوئے لکڑی کے منقش دروازے کے باہر وہ سیڑھیوں میں بیٹھی نظر آ گئی تھی۔ وہ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے سے جھانکتا تفکر دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان بکھرتی چلی گئی۔ وہ واپس بیڈروم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

+

"آخر یہ تم کرتی کیا پھر رہی ہو زینب!"

"ہیں...... کیا کیا ہے میں نے؟" اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔

"ولید شوہر ہے تمہارا؟" تہمینہ نے اسے باور کروایا تھا۔

"معلوم ہے۔" حلق میں جاتی چائے یکدم ہی بے حد کڑوی ہو گئی تھی۔ بھابی کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں پھر متانت سے بولیں۔

"معلوم ہے تو الٹی سیدھی حرکتیں کیوں کرتی ہو۔ ایک بات بتاؤ زینب! آخر روز روز ولید سے جھگڑنے کا کیا مطلب ہے؟"

"اوہ، تو آپ اس کی وکالت کرنے آئی ہیں۔"

"میں اس کی وکالت نہیں کر رہی زینب، صرف تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اگر تم دونوں کے جھگڑوں کی یہی رفتار رہی تو یہ شادی جسے محض ایک مہینہ ہوا ہے ٹوٹنے میں ایک پل بھی نہیں لگے گا۔" وہ اسے تاریک پہلو دکھا رہی تھیں اور وہ تو پہلے ہی ہراساں تھی مزید دہل گئی۔

"خدا نہ کرے۔"

"انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔" بھابی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "لیکن زینب اس کے لیے تمہیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں بھابی! اور غلطی میری نہیں ہے۔ جھگڑے کی ابتدا ہمیشہ اس کی طرف سے ہوتی ہے۔" اس نے احتجاجاً کہا۔

"وہ ابتدا کرتا ہے تو تم تصفیہ کر لیا کرو۔ میرا جھگڑا بھی ہوتا ہے تمہارے بھائی کے ساتھ۔ مگر میں تمہاری طرح دوبدو جواب نہیں دیتی۔" وہ کچھ دیر سر جھکائے انگلیاں مروڑتی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔

"وہ بھی تو خاموش ہو سکتا ہے آخر کو چھوٹا ہے مجھ سے۔"

"بکو مت۔" وہ دھاڑیں پھر اس کی نقل اتار کر بولیں۔ "چھوٹا ہے مجھ سے۔ آخر کب تک تم عمر کا فرق لے کر بیٹھی رہو گی۔ صرف دو سال چھوٹا ہے۔ دس برس چھوٹا ہوتا تب بھی رتبہ اسی کا بڑا ہونا تھا۔ احمق نہ

ہو تو۔ میں تمہیں وارن کر رہی ہوں زینب! تم اگر اسی چھوٹائی بڑائی کے چکر میں پڑی رہیں نا تو ضرور اپنا گھر برباد کر لو گی...... احمق وقت گزر جائے تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"خدا کے لیے بھابی مجھے مت ڈرائیں۔" اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

"یہی خوف کھائے جا رہا ہے مجھے۔ پہلے وحید کو خدا نے چھین لیا اور اب ولید......" اس کے کانوں میں وہ گفتگو سائرن کی طرح گونجنے لگی۔

بھابی نے اسے روتے دیکھا تو بہت پیار سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا پھر اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھو کر بولیں۔

"محبت کرنے لگی ہو نا اس سے۔"

"میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی مگر......"

"مگر پہلے وہ تمہارا دیور تھا اب شوہر ہے۔" انہوں نے بات کاٹ دی۔ "سوچو ذرا کیا گزرتی ہو گی اس بیچارے کے دل پر جب وہ تمہیں اس حلیے میں دیکھتا ہو گا۔" آج وہ اسے آئینہ دکھانے کے موڈ میں تھیں۔

"میرے حلیے کو کچھ مت کہیں۔" وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ اندر خفگی بھری تھی۔

"وہ مجھے دیکھتا ہی نہیں ہے۔ دل پر کیا خاک گزرے گی۔" بھابی نے امڈتی مسکراہٹ کو بڑی مشکل سے روکا۔

"اسے تو بس اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیاں نظر آتی ہیں یا پھر اپنی یونیورسٹی فیلوز کی شان میں قصیدے پڑھ سکتا ہے وہ۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے میری طرح اسے بھی اس شادی کے لیے ماں جی نے مجبور کیا ہوگا۔ ورنہ اس کا ایک سے بڑھ کر ایک معاشقہ مجھے ازبر ہے۔ ہر قصہ مجھے ہی سناتا تھا۔ اس کی آنکھیں حسین ہیں تو اس کا کمپلیکشن نہایت خوب صورت ہے۔ فلانی ماہ جبین ہے تو الانی مہ سیما۔ میں جانتی ہوں اب بھی اسے وہی نظر آتی ہیں۔" اب کی بار بھابی ہنسی روک نہیں پائیں ہنسیں تو پھر ہنستی ہی چلی گئیں۔

"کیوں ہنس رہی ہیں بھابی۔" اس نے جھنجھلا کر ٹوکا۔

"سنا ہے دن میں کم سے کم ایک گھنٹہ قہقہے لگانے سے صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے بس اسی لیے۔" وہ بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔

"یہ شغل کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔"

"تم کیا کہہ رہی تھیں ولید تمہیں دیکھتا ہی نہیں ہے۔" انہوں نے آنکھیں رگڑیں جو لبالب بھر گئی تھیں۔

"جب بیوی تمہاری جیسی سر جھاڑ منہ پہاڑ ہو گی تو شوہر بیچارا الانیوں فلانیوں کو ہی دیکھے گا نا۔"

"آپ ہر بار مجھے ہی غلط قرار کیوں دیتی ہیں؟"

"اس لیے کہ غلط تم ہی ہو۔"

"جی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے کوئی اور پسند آ گئی ہے۔" بالآخر اس نے کہہ دیا۔

"ہیں کیا مطلب......" بھابی ایک دم سیدھی ہوئیں تو اس نے ساری بات بتادی جسے سنتے ہی انہوں نے سر پیٹ لیا۔

"اتنی بڑی بات اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ پچھلے ایک ہفتے سے اسی لیے یہاں آ کر بیٹھی ہوئی ہو نا۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ غصے سے بولیں۔

"تم سے بڑا احمق تو اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ اب اس سے پہلے کہ وہ سچ مچ دوسرا نکاح کرے تم فوراً اپنے گھر چلی جاؤ۔ بلکہ میں ولید کو فون کر دیتی ہوں وہ تمہیں لے جائے گا۔" انہوں نے بات کو زیب داستان کے لیے بہت بڑھا دیا تھا زینب نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔

"آپ رہنے دیجئے میں ہی فون کر دیتی ہوں۔" وہ ٹیلی فون سیٹ اپنے قریب گھسیٹ کر بولی اور جانے سے قبل اسے شعیب بھائی اور بھابی سے اپنے غلط رویے اور سخت لفظوں کے لیے معافی مانگنی تھی۔

✦

کار کی پرحدت فضا میں خاموشی گونج رہی تھی اور وہ مجسم کان بنی بیٹھی تھی شاید وہ کہے۔ میں نے تمہیں مس کیا تھا۔ ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی تم یاد آتی رہیں۔ یہ سات دن میں نے بڑی مشکلوں سے کاٹے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مگر سارا راستہ وہ یوں سنجیدگی سے ونڈ اسکرین سے باہر بچھی سڑک پر نظریں گاڑے رہا تھا گویا اس سے بڑھ کر ضروری کام اور کوئی نہ ہو۔ اب تو وہ لوگ لاہور میں داخل ہو کر اپنی کالونی کی حدود میں بھی داخل ہو چکے تھے۔

"بدتمیز کہیں کا۔ کیا میں نہیں جانتی اسے۔ اگر مجھے یاد کرتا رہا ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتا...... ہونہہ انا جو آڑے آتی ہے۔" وہ اندر ہی اندر جھنجلاتی رہی تبھی گاڑی گیٹ کے سامنے رک گئی مگر وہ ٹھس انداز میں بیٹھی رہی۔ ولید نے کچھ پل اس کے اترنے کا انتظار کیا پھر حیرت سے اسے دیکھا وہ حد درجہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔

"کیا ساری رات کار میں ہی گزارنی ہے۔" اس کے پوچھنے پر وہ ٹھٹکی پھر خجل سی ہو کر اتر گئی۔

"گیٹ اچھی طرح بند کر لینا چوکیدار نوکری چھوڑ گیا ہے۔ میں کچھ دیر میں آؤں گا۔"

چابیاں اسے تھما کر وہ کار بھگا لے گیا۔ وہ اندر آئی کچھ دیر کمر سیدھی کی جو بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھی پھر

کپڑے تبدیل کیے اور اپنے لیے چائے بنا کر لاؤنج میں آ گئی۔ ٹی وی آن کر کے وہ ولید کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ ہر معاملہ نمٹا دینا چاہتی تھی۔ وال پر سجے کلاک نے چھ بجنے کا اعلان کیا تو وہ صوفے پر لیٹ گئی پھر نجانے کب آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ حیران ہوتی اٹھ بیٹھی ایسی بے سدھ ہو کر سوئی تھی کہ وقت گزرنے کا بھی علم نہ ہوا تھا۔ وہ ولید کو سوچ کر پریشان ہو گئی جواب تک نہ آیا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے اس کی واپسی ہوئی۔

"یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔" اسے دیکھتے ہی وہ برس پڑی حالانکہ سوچ لیا تھا وہ غصہ نہیں کرے گی مگر پھر بھی کوفت نے غصے میں مبتلا کر دیا۔

"تم اب تک میرے انتظار میں جاگ رہی ہو؟" ولید کے لہجے میں استعجاب استفہام تھا زینب سلگ کر رہ گئی۔

نہیں موت کے فرشتے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ کچھ جواب صرف سوچنے کے لیے ہوتے ہیں۔

"کھانا کھاؤ گے...... لگا دوں۔"

"نہیں میں کھا کر آیا ہوں۔" وہ کمال رکھائی سے بولا۔

"اچھا چائے پیو گے۔" زینب نے غصے کے ابال کو اندر ہی دبایا ولید نے رخ موڑ کر اپنی مسکراہٹ چھپائی اور احسان کرنے والے انداز میں بولا۔

"دل تو نہیں چاہ رہا البتہ اگر تم پینا چاہ رہی ہو تو تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔" زینب سر ہلا کر کچن میں چلی گئی اور وہ بیڈ روم میں آ گیا۔ اسے زینب کے رویے میں بڑی خوش گوار سی تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ جو تیر اس نے چلایا تھا وہ نشانے پر لگا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر کچن میں، زینب برنر کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ وہ وہیں چوکھٹ سے شانہ ٹکا کر اسے دیکھنے لگا۔

"لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے۔" اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی پھر کھل کر مسکرا دیئے۔ بلیک کھدر کے سادہ سے سوٹ میں بھی اس کا سراپا بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ شاید یہ محبت کا خاص اعجاز ہوتا ہے کہ دل میں بسنے والے ہر حال، ہر انداز میں اچھے لگتے ہیں۔ استحقاق کہیں اندر ہی اندر انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ کوئی خوش کن جملہ زبان کی نوک پر مچل اٹھا تھا۔ اس نے نگاہ چرائی مگر پھر جیسے بے بس ہو گیا۔ آج اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر دیکھتے رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے جا رکا۔ ایک بے اختیاری سی اسے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی۔ اس کی نظریں سیاہ بالوں سے جھانکتی صراحی دار گردن پر ٹھہر گئیں۔ جہاں ننھا سا تل مثل ماہ مسکرا رہا تھا۔ بس ایک پل تھا جو اسے اس چاند کے اپنا صرف اپنا ہونے کا یقین دلا گیا۔ اس نے شہادت کی انگلی سے ریشمی پردہ ہٹا دیا اور......

زینب کرنٹ کھا کر بہت تیزی سے مڑی تھی۔ ولید اس کے بے حد نزدیک کھڑا تھا بس ایک ہی لمحہ تھا جو اس کا سب کچھ لے گیا۔ بے اختیاری سی بے اختیاری تھی۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور ولید کے گال پر نادیدہ نقش چھوڑ گیا۔ اپنی اس جسارت پر وہ خود بھی حیران پریشان سی سن رہ گئی۔ ولید گال پر ہاتھ رکھے ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا کر چکی ہے؟"

ولید کے اندر اشتعال کی تیز ترین لہر دوڑ کر چہرے پر سرخی رقم کر گئی وہ جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمائے، مٹھیاں بھینچے اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے شیلف سے لگی کھڑی تھی۔ شرمندگی اور سراسیمگی جیسے اثرات نے اس کے دل پر سوکھے پتے جیسا لرزہ طاری کر دیا تھا۔ چائے ابل کر مزید آگ کو بھڑکانے لگی۔ زینب کو لگ رہا تھا کہ ابھی ولید کوئی چھری اٹھا کر اس کی شہ رگ کاٹ دے گا۔ ورنہ تھپڑوں کی بارش تو لازما ہو گی مگر اس نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا تھا بلکہ وہ مڑا تھا اور تیزی سے راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا تھا۔

"ولید" وہ جیسے خوف سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن اس نے نہیں سنا اور گیٹ کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔

+

اس کی آنکھ کھلی تو لونگ روم کے کونوں کھدروں میں سے نکل کر بھائیں بھائیں سناٹا بول رہا تھا۔ ملگجے سے اجالے نے اسے احساس دلایا کہ وہ بہت دیر تک سوتی رہی ہے۔ اس کا سر اس وقت بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ شاید روتے رہنے کا اثر تھا۔ ولید ساری رات گھر نہیں آیا تھا اور اس وقت گیارہ کا وقت تھا۔ وہ بے دم ہو کر خود ہی کو کوسنے لگی۔ اسی پل فون کی گھنٹی نے اسے متوجہ کیا تھا۔ کسی خوش گمانی کے زیر اثر اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بھابی تھیں جن کی آواز سنتے ہی وہ بے اختیار رونے لگی تھی وہ ایک آن میں گھبرا گئیں۔

"مجھے آپ بہت یاد آ رہی ہیں۔" ان کے بار بار استفسار پر وہ یہی کہہ سکی۔

"اف میں سمجھی ولید نے سچ مچ دوسری شادی کر لی۔"

"ابھی تک کی تو نہیں ہے مگر اب شاید کر لے۔" اس کے دل میں گونج ابھری اور آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے دوسری طرف بھابی نجانے کون سی تسلیاں دے رہی تھیں۔

"بھابی آپ یہاں آ جائیں پلیز مجھے...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے کہا انہیں ساری حقیقت بتا کر وہ مزید شرمندہ نہیں ہو سکتی تھی۔ معلوم جو تھا کہ ادھر سے بھی لعن طعن ہی ملے گی۔

"ارے ڈرنے کی کیا بات ہے بھئی ویسے میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں اور صہیب کوئٹہ جا رہے ہیں میری امی کا آپریشن ہے نا...... اچھا ولید کہاں ہے؟" انہوں نے رک کر پوچھا تو وہ لمحہ بھر کو خود بھی چپ سی رہ گئی کیونکہ اس بات سے تو وہ خود بھی ناواقف تھی۔

"ولید گھر پر نہیں ہے۔"

"ہیں اتنی جلدی باہر چلا گیا ابھی ایک منٹ پہلے ہی تو وہ مجھ سے بات کر رہا تھا پھر لائن کٹ گئی۔" وہ حیران ہو رہی تھیں جبکہ زینب اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے کرنٹ لگا ہو پھر تیزی سے بولی۔

"اپنی امی کو میری طرف سے پوچھیے گا بھابی اور آپ لوگ اپنا خیال رکھیے گا اللہ حافظ۔" وہ پکارتی ہی رہ گئیں مگر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ صوفے پر لاوارثوں کی طرح جھولتا دوپٹہ کندھوں پر ڈالا اور ولید اور اپنے مشترکہ بیڈروم کی طرف آ گئی۔ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اگلے کئی پل اسے اس خوف کی نذر کرنے پڑے تھے جو اردگرد منڈلا رہا تھا۔ دل الگ دھڑ دھڑ ادھڑ کر رہا تھا۔ اس نے اندر ہی اندر آیت الکرسی کا ورد شروع کیا اور نہایت احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ولید اوندھے منہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا زینب نے بے اختیار جھرجھری سی لی وہ اتنی ٹھنڈ میں بغیر شرٹ کے لیٹا ہوا تھا۔ قریب ہی سفید سنگ مرمر کی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری پڑی تھی۔ اسے دھچکا سا لگا مگر جلد ہی وہ اس کیفیت سے نکل آئی کیونکہ پچھلے دو ڈھائی ماہ اس نے دانستہ اس شخص سے بیگانہ ہو کر گزار دیے تھے۔ اس نے اپنے دل کو بڑے پیار سے سہلایا اور طفل تسلی دے کر اس کے قریب چلی آئی۔

"ولید" بہت ڈرتے ڈرتے اس نے دھیرے سے پکارا مگر جواب موصول نہ ہوا تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ جسے بڑی بے دردی اور نفرت سے جھٹک دیا گیا تھا۔ ولید نے ٹانگیں بیڈ سے نیچے اتاریں اور ساتھ ہی اخروٹی رنگ کی شرٹ پہن لی۔ زینب ابھی لفظ ڈھونڈ رہی تھی جب وہ شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اٹھا۔ ایک پل میں اس کے دل میں گمان جاگا کہ وہ چلا جائے گا مگر اس نے دروازہ چوپٹ کھول دیا اور واپس آ کر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے اسے جانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں ولید کہ تم مجھ سے بہت خفا ہو مگر پلیز ایک بار میری بات......"

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی جسٹ گیٹ آؤٹ آف ہیئر۔" اس کی بات کاٹ کر وہ بولا۔ انداز و اطوار میں لہو منجمد کر دینے والی سرد مہری تھی۔ وہ کبھی بھی اس سے اس انداز میں بات نہیں کرتا تھا۔ زینب کو آج اس کے لہجے و انداز کی نرمی و محبت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی جو اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی جس سے بڑے بڑے گھونٹ غالباً غصہ کم کرنے کے لیے پیے جا رہے تھے۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے کیا تم مجھے......" اس کی بات پھر قطع کر دی گئی مگر اس بار ولید نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا بوتل سائیڈ ٹیبل پر پٹخ کر وہ دروازے کے قریب جا کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے اس کے

جانے کا منتظر ہو۔ مارے بے بسی کے وہ رونے لگی نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلا جا رہا تھا۔

"پلیز ولید صرف ایک بار میری بات سن لو۔" اس نے روتے ہوئے التجا کی۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" ولید نے ہر لفظ دانتوں تلے چبا ڈالا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ شاید میں خود پر قابو نہ رکھ پاؤں۔" اس نے زینب کی طرف دیکھا اور اس کی روح تک لرز گئی۔ دبے دبے تنفس لہجے میں کتنی درشتی اور برہمی تھی اور آنکھیں...... آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ گویا سارا غصہ اور نفرت وہیں سمٹ آئی ہو۔ زینب کے حلق میں کانٹے اٹک گئے اور پیشانی پر عرق چمکنے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ آواز میں ڈھل ہی نہ سکے۔ دروازے کا ہینڈل چھوڑ کر ولید بڑے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ وہ ہراساں ہو کر پیچھے ہٹی مگر اس سے بھی پہلے ولید نے اسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ وہ خزاں گزیدہ پتے کی طرح لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی اور جب تک سنبھلی دروازہ ایک زوردار چیخ مار کر خاموش ہو چکا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بند دروازے پر نظروں سے دستک دیتی دیوار کے ساتھ لگی نیچے بیٹھتی چلی گئی وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ اسے رونا آ بھی نہیں رہا تھا مگر دل تو لرزیدہ تھا نا جو چیخ چیخ کر زیاں کا احساس دلا رہا تھا۔

+

وہ باہر نکلی تو فضا کی خاموشی چھٹ کر بادلوں کا روپ دھار چکی تھی۔ گہرے رنگ کے بادل آسمان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نہایت خباثت سے مسکرا رہے تھے۔ یقیناً اب شہر میں بارش کا غل مچنا تھا۔ وہ برآمدے میں لان سے منسلک ٹھنڈی یخ سیڑھیوں میں بیٹھ کر سامنے والی دیوار سے لپٹی بیل کو دیکھنے لگی جس کے اکا دکا کاسنی پھول ہوا کی یخ بستگی سے تھرتھرا رہے تھے۔ لان کی وہ حد جو پورچ کو لان سے الگ کرتی تھی علیک کی لمبی لمبی ٹہنیوں کو گود میں اٹھائے ساکت کھڑی تھی۔ اوس سے بھیگی گھاس بھی دبی دبی سی تھی۔ جس وقت آسمان سے پہلا قطرہ اس زمردیں گھاس پر گرا تب ہی ایک گرم آنسو اس کے گال پر لکیر چھوڑ گیا تھا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں روتی ہی چلی گئی غلطی جب اپنی ہو تو انسان کسی اور کو الزام دے کر بھلا کیسے بری الذمہ ہو سکتا ہے۔

"میں ولید کو منا لوں گی۔ معافی مانگ لوں گی اس سے۔" وہ خود ہی کو تسلیاں دینے لگی پھر چھاجوں چھاج برستے مینہ اور ٹھنڈی یخ ہوا نے اسے وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اندر عبدل اپنی سرخ رضائی اردگرد لپیٹے ٹی وی کے عین سامنے بیٹھا نہایت انہماک سے نجانے کون سی پنجابی فلم دیکھ رہا تھا۔ وہ ولید کو دیکھ کر نا چاہتے ہوئے بھی وہیں دروازے میں رک گئی۔ جو بہت عجلت بھرے انداز میں فون پر بات کر رہا تھا

پھر اس نے ریسیور رکھا اور عبدل کے پاس جا کر نجانے کیا کہا تھا۔ پھر اسی عجلت بھرے انداز میں اس کے قریب سے نہایت اجنبیت سے گزر کر باہر چلا گیا تھا۔

"عبدل! کہاں گئے ہیں تمہارے صاحب؟" اس نے بہت جھجکتے ہوئے پوچھا تھا مگر عبدل کی ساری دلچسپی فلم میں تھی۔

"ایئر پورٹ گئے ہیں جی۔"

"ایئر پورٹ؟" اس کا دھیان ماں جی کی طرف گیا تھا۔

"وہ جی پنڈی سے مہمان آ رہے ہیں ان کو لینے گئے ہیں۔" عبدل نے والیم بڑھا دیا تھا۔

+

"قمر بھائی کو یہاں لاہور میں کچھ آفیشل کام کے سلسلے میں آنا تھا۔ میں نے سوچا کچھ میری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی تبھی چلی آئی۔" ناشتا کرتے ہوئے شازمین نے بتایا تھا۔

"بہت اچھا کیا بھئی۔" ولید نے مسکرا کر کہا۔ کپوں میں چائے انڈیلتے ہوئے زینب نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ قمر تو صبح ہی صبح اپنے کام کے سلسلے میں چلے گئے تھے جبکہ ولید نے محض شازمین کی خاطر آفس جانا کینسل کیا تھا اور اس بات کا اظہار دانستہ یا نادانستہ کر بھی دیا گیا تھا۔

آج پورے تین دن گزر گئے تھے ان دونوں کو آپس میں بات کیے اور اب شازمین کی آمد نے اسے بالکل ہی پابند کر دیا تھا۔ پچھلے کچھ دن اس نے اپنے پرانے بیڈ روم میں گزارے تھے اور اب وہ ہنوز صوفے کو بیڈ بنائے ہوئے تھی۔ ساری رات بیڈ خالی پڑا رہتا کیونکہ ولید اسٹڈی کو بیڈ روم بنائے ہوئے تھا۔ اسے دوبارہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ شازمین کو سارا لاہور دوبارہ سے دیکھنے کا شوق ہوا تھا۔ رات کو اول تو وہ بہت دیر سے آتا اور آتے ہی اسٹڈی میں گھس جاتا۔ اس دن بھی وہ کسی کام سے روم میں آئی تو ولید وارڈ روب کھولے ٹائی میچ کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا پھر واپس گردن موڑ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا تھا۔ زینب نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا مگر اب ہمت نہیں ہو رہی تھی اگلا قدم اٹھانے کی۔ سو وہیں کھڑی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے دیکھتی رہی، جو اب قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا فٹافٹ ٹائی کی ناٹ لگا رہا تھا۔ زینب ہولے ہولے چلتی اس کے پیچھے آن رکی۔ شیشے میں اس لمبے چوڑے شخص کا عکس اس کے عکس کو چھپائے ہوئے تھا۔ چہرے پر ایسی سنجیدگی جو کم سے کم زینب کے لیے نئی اب ہرگز نہ رہی تھی۔ ولید اب بالوں میں برش کر رہا تھا۔ برش رکھ کر اس نے پرفیوم کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے ہی زینب نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھا لی اور اس کے اور آئینے کے بیچ

حائل ہوگئی۔ کیمل کلر کی شرٹ پر لگے براؤن بٹنوں پر نظر جمائے بھی وہ ولید کے تاثرات جان سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پرفیوم اسپرے کرتی ولید نے اس کے ہاتھ سے بوتل جھپٹ لی۔ زینب نے خائف ہو کر سوکھا حلق تر کیا۔

''محبت میں کیا معاف کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی ولید؟'' ولید نے اسے بہت طنز بھری نظروں سے دیکھ کر پرفیوم پٹخا اور بیڈ پر بیٹھ کر جلدی جلدی جوتے پہننے لگا۔

''پلیز ولید...... صرف ایک بار میری بات سن لو'' اس کے آواز میں نمی سی گھل گئی تھی۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' نہایت روکھے انداز میں کہہ کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا اور فوراً ہی فائل لے کر واپس آیا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں ایسا کوئی حق نہیں رکھتی مگر کیا تم مجھے اس محبت کے واسطے بھی معاف نہیں کرو گے جو تمہیں مجھ سے تھی۔'' اور بالآخر اس نے اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے جوڑ دیں۔ وہ گڑگڑا رہی تھی مگر ولید کے اعصاب کے تناؤ میں چنداں فرق نہ آیا۔ چہرے پر سنجیدگی اور سرد مہری کھد کے رہ گئی تھی۔ زینب کی آنکھوں سے برستے آنسو بھی اس کے لیے جیسے بارش سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے وہ اس کے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑے کھڑا تھا جن میں تازہ الاؤ کی سی تپش تھی اور جن کی حدت زینب نے اپنے اندر تک محسوس کی تھی تبھی تو اسکی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔

''دیکھو ولید......''

''ولید ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' تڑاخ سے دروازہ کھول کر شازمین اندر آئی تھی زینب نے تیزی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے ولید کی سرد مہری کو گہری دلفریب مسکراہٹ میں بدلتے دیکھا تھا۔

''میں بس آ ہی رہا تھا۔'' ولید کی چہکتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی پھر شازمین کی کھنک دار ہنسی۔

''ارے کہیں میں مخل تو نہیں ہوئی۔''

''ارے نہیں یار! خیر چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

''اوہ ہاں چلو۔ اچھا زینب آپا۔ اللہ حافظ۔'' بھاری جوتوں کے ساتھ ہائی ہیل کی ٹک ٹک پھر دروازہ بند ہونے کی آواز۔ کہیں دور کار اسٹارٹ ہوئی اور سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر بعد زینب نے گردن موڑ کر دیکھا وہ دونوں کب کے جا چکے تھے اور اب وہ کمرے میں تنہا تھی۔

''زینب آپا'' اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی تھی۔

✦

وہ نہایت اطمینان سے چینل پر چینل بدل رہی تھی۔ ایک سکون تھا آزادی کا احساس تھا جو اسے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل اس نے عبدل سے ڈھیر سارے لطیفے سن کر قہقہے لگائے تھے پھر جب ہنستے ہنستے تھک گئی تھی تو اسے پکوڑے تیار کرنے کا آرڈر دے دیا تھا اور اب ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے وہ مسلسل ولید اور اس کے متوقع رویے کو سوچ کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ولید کی کار کا مخصوص ہارن سنا تو چوکنی ہو کر بیٹھ گئی مگر انداز ابھی بھی لاپروا سا تھا۔ ولید اندر آیا اور آتے ہی عبدل کو آواز دی تھی۔ زینب کی چونکہ اس کی جانب پشت تھی اس لیے چہرے کے تاثرات جان نہ سکی۔ البتہ آواز کی کرختگی نے اسے عجیب سا احساس دلایا تھا۔ ولید نے عبدل کو سگریٹ لانے کے لیے کہا تھا اور اس کے جانے کے بعد اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

''تم نے شازمین سے کیا کہا ہے؟'' ہاتھ میں پکڑا کوٹ صوفے پر پھینک کر اس نے سینے پر بازو باندھ لیے۔ زینب نے سر اٹھا کر اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔

''میں نے شازمین سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔'' ولید نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا پھر لفظ چبا کر بولا۔

''کیا تم نے اس سے چلے جانے کے لیے نہیں کہا؟''

''نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ لاہور میں اس کے کچھ اور رشتے دار بھی مقیم ہیں۔'' اس کا انداز سراسر خبر دینے والا تھا ولید سلگ کر رہ گیا۔

''تم......'' وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔

''وہ صرف ہم لوگوں سے ملنے لاہور آئی تھی......''

''تصحیح کر لو ولید!'' وہ ٹوک کر بولی۔ ''شازمین ہم سے نہیں بلکہ صرف تم سے ملنے لاہور آئی تھی اور میرا خیال ہے دو ہفتے ملنے ملانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اب اسے کچھ دن اپنے ماموں کے گھر قیام کرنا چاہیے۔'' اس کا انداز بے حد دل جلانے والا تھا اور وہ واقعی جل گیا۔

''تم انتہائی کم عقل اور ان مینرڈ عورت ہو زینب۔''

''ہاں میں ہوں کم عقل اور ان مینرڈ بھی۔'' اس کا غصہ بھی باہر آیا تھا۔

''ایک کام کرو مسٹر ولید! اپنی اسی زیادہ عقل والی اور ویل مینرڈ شازمین کو لے آؤ اس گھر میں۔ پھر جی بھر کر اس کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا، سینما جانا اور رات کو دو، دو ڈھائی ڈھائی بجے واپس آنا۔ کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا پھر تم جی بھر کر عیش کرتے رہنا۔''

''شٹ اپ۔'' وہ دھاڑا تھا۔ سارا اعتراض ہی اس لفظ عیش پر تھا۔ پھر خود کلامی کے سے انداز میں جھنجلایا۔

"نجانے کس جاہل سے پالا پڑا ہے۔" وہ جو اس کے یوں دھاڑنے پر خائف سی ہو گئی تھی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔

"اس جاہل سے شادی کرنے کے لیے میں نے نہیں کہا تھا وہ تم خود تھے جو......" ولید نے اس کی بات نہایت تیزی سے قطع کر دی۔

"جانتا ہوں وہ میری حماقت تھی اور اپنی اس حماقت پر میں اب تک پچھتا رہا ہوں۔" اور زینب کی ساری خوش گمانی دھری کی دھری رہ گئی۔ ولید رخ موڑ چکا تھا۔ وہ جھٹ سے اٹھی اور اس کے سامنے آ گئی۔

"بہت دیر تو ابھی بھی نہیں ہوئی پھر تم تو خود مختار ہو ولید قاسم! جو چاہو کر سکتے ہو تو پھر چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے۔ طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔" وہ بہت زور سے بولی تھی مگر اس سے بھی زیادہ زور سے ولید کا آہنی ہاتھ اس کے گال پر پڑا تھا۔ وہ جو تن کر کھڑی ہوئی تھی توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ وہ کاؤچ پر گری تھی۔ اپنے لرزتے وجود کو سنبھالا دینے کی کوشش نہ کی تھی البتہ وہ اسے، دیکھے جا رہی تھی پتا نہیں حیرانی سے یا دکھ سے۔

"بہت بکواس کر لی تم نے مگر اب ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہیں قتل ہی کر دوں گا۔"

وہ انگلی اٹھا کر بولا تھا اور پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ٹیبل کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا تھا۔

+

کتنی ہی دیر بلا مقصد سڑکوں پر کار دوڑاتے رہنے کے باوجود بھی وہ اپنے دماغ میں اٹھتے دھوئیں کو کم نہیں کر پایا تھا۔ اصل پچھتاوا تو اب ہو رہا تھا۔ ایک اذیت ہی تو تھی جو اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی جب وہ گھر سے نکلا تھا تب شام نے اپنا آنچل نہیں پھیلایا تھا اور اب سارا شہر رات کی تاریکی کو مات دینے کے لیے برقی قمقموں سے فروزاں ہو چکا تھا۔ اس نے روڈ کے دوسری جانب بازاروں میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا جن کے چہرے آسودگی سے دمک رہے تھے اور کچھ اس جیسے بھی تو تھے اکتائے ہوئے یا جھنجلائے ہوئے۔ اس نے ایک گہرا سانس کار کی خاموشی اور اکتا دینے والی فضا میں خارج کیا اور کچھ سوچ کر آڈیو پلیئر آن کر دیا۔ ابرار الحق کا "پرتیو" فل والیم میں گونجنے لگا تھا اس نے تپ کر والیم کم کیا پھر کار کے شیشے کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا اس کے منہ سے ٹکرا کر بھاگنے لگی تھی۔ اس نے دوسری کیسٹ لگائی۔ عدنان سمیع اپنی خمار آلود آواز میں نہایت بھونڈا گانا گا رہا تھا اس نے پھر کیسٹ بدل دی۔ اب کی بار قدرے سکون تھا کیونکہ نصرت فتح علی کی آواز میں "آپ سے مل کر ہم" گونجنے لگا تھا۔

وہ قدرے ریلیکس انداز میں ڈرائیو کرنے لگا کبھی کبھی دل بھی عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ خود سے خود ہی باتیں اور پہلو گھڑ کر آپ کے سامنے رکھے جاتا ہے پھر آپ لاکھ چاہیں ان باتوں کو مان لینے کے سوا اور کوئی

چارہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل اٹھا لیا۔ دوسری طرف مسلسل بیل کے باوجود فون ریسیو نہیں کیا جا رہا تھا مگر وہ مستقل مزاجی سے موبائل کان سے لگا کر بیٹھا رہا۔ تھک ہار کر انگیج ٹون آنے لگی تو اس نے دوسری بار نمبر ملایا۔ تیسری بار ٹرائی کرتے ہوئے اس کی انگلیاں ساکت ہوئیں۔ نصرت فتح علی اب "کسے دا یار نہ وچھڑے" گا رہا تھا۔ اس نے جھرجھری سی لے کر موبائل ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا اور ہاتھ گرانے والے انداز میں آڈیو پلیئر آف کر دیا تھا۔

بے سمت پریشانی، جھنجلاہٹ کا باعث بنتی ہے مگر وہ بے سمت تو نہ تھا اس کے باوجود جھنجلایا ہوا تھا نجانے خود پر یا اس پر...... اور بالآخر تھک کر اس نے کار اس سڑک پر ڈال دی جو اس کے گھر کو جاتی تھی۔ جہاں اس وقت وہ لڑکی تنہا تھی جس سے وہ بے حد و حساب محبت کرتا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اسے آنسو اچھے نہیں لگتے تھے۔ جس کی ہنسی سے اسے عشق تھا۔ جس نے ہاتھ جوڑ کر اسے اس کی محبت کا واسطہ دیا تھا اور ...... اور جسے اس نے بہت زوردار تھپڑ مارا تھا۔

"پھول لے لیں صاحب جی!" سگنل کھل چکا تھا پچھلی گاڑیاں اسے آگے بڑھنے کے لیے ہارن دے رہی تھیں جب دس، گیارہ سال کے لڑکے نے جھک کر لجاجت سے کہا تھا۔ پچھلی گاڑیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ولید قاسم نے والٹ سے روپے نکال کر اس بچے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

+

اس کی توقع کے برخلاف گھر میں داخل ہوتے ہی خاموشی نے اس کا استقبال نہیں کیا تھا۔ سب سے پہلے تو گیٹ پر کھڑے دلدار چوہدری نے سر تک ہاتھ لے جا کر اسے سلیوٹ کیا تھا۔

"کیسے ہو دلدار؟" سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اللہ میاں کا کرم ہے صاب۔" پوری بتیسی نکالے دلدار اسے کار لاک کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"اور تمہاری بیوی اب کیسی ہے؟" اسے یاد آیا کہ وہ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے چھٹی لے کر گیا تھا۔ دلدار نے مثبت انداز میں سر ہلایا پھر کچھ شرماتے ہوئے بولا۔

"آپ کو بہت بہت مبارک ہو صاب۔"

"مبارک...... وہ کس لیے؟" ولید حیران ہوا۔

"وہ جی...... آپ چاچو بن گئے ہو۔"

"چاچو۔" وہ کچھ اور حیران ہوا پھر ایک دم بولا۔

"مگر تمہیں کس نے بتایا۔"

"میری بیوی نے۔"

"تمہاری بیوی نے؟" ولید کی حیرانی کسی طور کم ہو ہی نہیں رہی تھی پھر جھنجلا کر بولا۔

"لیکن میرے چاچو بننے کی خبر تمہاری بیوی کو کیسے مل گئی دلدار؟"

"وہ ایسے کہ اللہ میاں نے دلدار چوہدری کو پیاری سی بیٹی دی ہے۔" پیچھے سے آتے عبدل نے مشکل آسان کی۔ پہلے تو ولید چپ سا رہ گیا پھر مسکرا کر بولا۔

"بہت مبارک ہو دلدار! یہ لو بچی کے لیے کچھ لے لینا۔" اس نے والٹ سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دلدار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر کار کی چابی عبدل کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"کچھ کھانے کا سامان ہے نکال لو۔" پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔

"اور تم بھی تو گاؤں جا رہے تھے نا آج!"

"جی سر جی! پر اب نہیں جانا۔" بے نیازی سے کہہ کر وہ سامان نکالنے لگا۔

"کیوں؟"

"اندر آئیں جی بتاتا ہوں۔" وہ سامان اٹھا کر اندر کی طرف بڑھا۔ ولید اس کے پیچھے تھا مگر اندر جا کر عبدل کو کچھ بھی بتانا نہیں پڑا۔ منقش دروازہ کھلتے ہی سامنے موجود تخت آج پھر آباد تھا ماں جی کے ساتھ حیدر بھائی، نوشابہ بھابی بیٹھے تھے۔ دوڈھائی سال کے دو بچے مائرہ اور معاویہ بھی تھے۔

"مجھے فون کر دیا ہوتا تو میں آپ لوگوں کو لینے ایئر پورٹ آ جاتا۔" ماں جی کے گلے میں بازو ڈالے وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم نے سوچا تمہیں سرپرائز دے دیں۔" حیدر بھائی پستے چھیل رہے تھے۔ پھر وہ وہیں بیٹھ کر ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا جبکہ نظریں مسلسل اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ کچن سے برآمد ہوئی تھی بمعہ ٹرالی جس میں چائے کے ساتھ لوازمات سجے ہوئے تھے۔

"سوری یار ولید! تم لوگوں کی شادی میں تو ہم شریک نہیں ہو سکے البتہ مبارک تم اب قبول کر لو۔" وہ مسکراتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جس نے اپنا سارا چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں اس کے دل میں ایک بار پھر شرمندگی یہاں سے وہاں بکھر گئی۔

"ولید! تم زینب کو لے کر ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے؟" نوشابہ کے اس سوال پر ولید نے گھبرا کر ایک نظر اس پر ڈالی تھی جو اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھی تھی۔

"ڈاکٹر کے پاس جانے کی کچھ خاص ضرورت تو نہیں تھی۔ بس ہلکا سا فلو ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" اس سے پہلے ہی زینب نے بات بنائی تو وہ دل ہی دل میں شکر کرنے لگا۔

"ہلکے فلو نے یہ حشر کر دیا ہے بھاری فلو کیا کرے گا۔" ماں جی نے گھرکا تو وہ مسکرانے لگی جبکہ ماں جی کہہ رہی تھیں۔

"تم نے میری بچی کا بالکل خیال نہیں رکھا ولید! دیکھو تو کتنی کمزور لگ رہی ہے۔" وہ سچ ہی کہہ رہی تھیں۔ پھر رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور وہ جو سوچ رہا تھا کہ تنہائی میسر آئے موقع ہی تلاش کرتا رہ گیا دو بجے کے قریب ماں جی نے ان سب کو ڈپٹ کر اٹھایا تو زینب بولی۔

"آج میں آپ کے پاس سوؤں گی۔" ماں جی نے نہال ہوتے ہوئے اسے بانہوں میں بھر لیا اور ولید اپنے کمرے میں جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"ماں جی بھی غلط ٹائم پر محبت جتاتی ہیں۔" کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اٹھ بیٹھا۔ خالی صوفہ منہ چڑا رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے تین کے فگر پر ٹک ٹک ناچ رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر کچن میں آ گیا۔ کچھ دعائیں کتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں برنر کی قریب زینب کو کھڑا دیکھ کر اس کا دل اچھل کر خاموش ہوا تھا۔

"ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟" وہیں دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے کہا۔ زینب نے گردن موڑ کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا وہ غالباً پہلے سے یہی کام کر رہی تھی تبھی پین میں کچھ اور دودھ ڈال دیا۔

ولید نے اسے خاموشی سے کام کرتے دیکھا پھر نپے تلے قدموں سے اس کے قریب آ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر پہلے برنر آف کیا پھر بنا کچھ کہے اس کا ہاتھ تھاما۔ کچن کی لائٹ آف کی اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ لاک لگا کر وہ ایک پل کو رکا پھر اس کی طرف پلٹا۔ وہ پلکیں جھکائے زمین میں جانے کیا کھوج رہی تھی۔ ولید نے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"کہو کیسے یقین آئے گا تمہیں میری محبت کا...... مر جاؤں، جان دے دوں اپنی، پھر مانو گی میری چاہت کو۔" اس کی جھکی پلکوں کو نظروں کے حصار میں لیے وہ پوچھ رہا تھا اور اس شکوے میں اپنائیت کا عنصر غالب تھا۔ وہ جو اتنی دیر سے آنکھوں میں دھند سجائے کھڑی تھی خود سے کیا ہوا عہد بھول کر دو قدم آگے بڑھی اور اس کے سینے سے سر ٹکا کر بری طرح رو دی۔ ولید نے چند پل توقف کیا پھر بہت اطمینان اور پیار سے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار باندھ دیا تھا۔ کوئی آپ کے سامنے اپنا غم اسی لیے بہاتا ہے کہ اس کے دل میں، آپ کے لیے اپنا غم چھپا لینے کا مان ہوتا ہے۔ اس کے مسکراتے لب زینب کے ریشمی بالوں کو چھونے لگے تھے۔

وہ روتی رہی حتیٰ کہ سسکیاں، ہچکیوں میں بدل گئیں۔ پھر جب اپنی بے اختیاری کا دھیان آیا تو شرمندہ سی ہو کر ایک طرف ہو گئی۔ ولید نے اسے گال رگڑتے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے...... مر جاؤں پھر مانو گی۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ وہاں سے ہٹنے لگی۔ مگر ولید نے بازو سے پکڑ کر واپس اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔

"تم تو کبھی بھی کچھ نہیں کہتیں۔ کیونکہ تمہاری انا تمہیں کچھ کہنے ہی نہیں دیتی۔" اس کا سارا زور انا پر

تھا زینب سلگ کر رہ گئی۔

"یہ سچ نہیں ہے۔" اس نے احتجاج کیا تو وہ تلخی سے ہنسا اور بیڈ پر جا بیٹھا۔

"یہی سچ ہے زینب بی بی! کہ تمہاری اس گردن کو انا کا کلف لگا ہوا ہے جو تمہیں بعد میں بھی روکتی رہی ہے ورنہ...... ورنہ میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا۔ وہ حق تھا میرا۔" وہ اسے پچھلا قصہ یاد دلا رہا تھا زینب پھر سے رونے لگی وہ وہیں زمین پر دو زانو بیٹھ گئی تھی۔

"تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو ولید! میں انا پسند تو کبھی بھی نہیں رہی۔" اس نے آنسوؤں پر قابو پانے کی خفیف سی کوشش کی۔

"مجھے لگا تھا کہ میری طرح تمہیں بھی اس شادی کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے......"

"میرے اظہار کے باوجود؟" وہ اس کے سامنے بالکل اسی کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں تمہارے اظہار کے باوجود کیونکہ مجھے تمہاری باتیں صرف جھوٹ لگ رہی تھیں۔ ہمارا ساتھ کوئی دو چار روز کا تو تھا نہیں، ہم لوگ بہت عرصے سے ایک ساتھ تھے اور اس سے پہلے مجھے کبھی ایسا نہیں لگا تھا کہ...... کہ تم مجھ سے دوسری قسم کی محبت کرتے ہو۔" ولید کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔

"یہ دوسری قسم کی محبت کیا ہوتی ہے بھئی، میں نے تو تم سے ہمیشہ ایک ہی قسم کی محبت کی تھی۔ سچی اور پکی...... اب تم ہی آنکھیں پڑھنے کے فن سے ناواقف ہو تو اس میں میرا کیا قصور۔" وہ بے حد شوخی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زینب نے پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تھکے تھکے سے انداز میں ہنس دی۔

"مجھے دنیا سے بہت ڈر لگتا تھا نہ جانے ہماری شادی کو لے کر لوگوں نے کیسی کیسی باتیں بنائی ہوں گی۔" ولید کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ یہ لڑکی مرغے کی ایک ٹانگ چھوڑتی ہی نہ تھی۔

"دنیا والوں کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ ہر وقت ہمیں یا ہماری شادی پر ہی باتیں بناتے رہیں اور جب ہمارے مذہب نے ہمیں نہیں روکا تو بھاڑ میں جائے ساری دنیا۔"

"صرف اپنے فائدے کے لیے مذہب کا سہارا لینا کہاں کی شرافت ہے؟ کبھی نماز تو تم نے ایک نہیں پڑھی۔" اس نے چوٹ کی تو وہ بغیر شرمندہ ہوئے ہنسنے لگا۔

"اب پڑھوں گا بلکہ شکرانے کے نفل بھی ادا کروں گا۔"

"اور تمہیں اپنے الفاظ واپس لینے ہوں گے کیونکہ انا پسند میں نہیں بلکہ تم ہو۔" ولید نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

"میرے انکار کو تم نے انا کا مسئلہ بنا لیا تبھی تو شادی کے بعد ایک بار بھی مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کی۔"

"کیا......" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "کیا ضروری ہے کہ ہر الزام میرے سر ہی آئے۔ میں تو اسی

رات ہر معاملہ نمٹا دینا چاہتا تھا مگر تم تو میری شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں کجا کہ مجھ سے بات کرنا اور بعد میں جب میں نے خود پیش قدمی کرنی چاہی تو تم سے جواباً تھپڑ کھانے کو ملا تھا۔" وہ نروٹھے پن سے بولا اور پہلی بار زینب نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکانے کی بجائے بہت پیار سے اپنے شریک سفر کو دیکھا تھا۔

"اپنی اس حرکت کے لیے میں شرمندہ تھی اور ہوں بھی اور میں نے تم سے معافی بھی مانگی تھی۔ پتا نہیں تم نے مجھے معاف کیا ہے یا نہیں...... ولید! وہ بے اختیاری میں ہوا تھا۔ یقین کرو میں نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں مارا تھا اور...... اور بدلہ تو تم لے ہی چکے ہو۔" اس نے کہتے ہوئے سر سے دوپٹہ ہٹا دیا۔ دائیں گال پر انگلیوں کے نشان موجود تھے ولید نے ہاتھ کی پشت سے ان نشانات کو چھوا۔

"میں نے تمہیں بے اختیاری میں نہیں مارا تھا بلکہ جان بوجھ کر مارا اور وجہ بدلہ لینا قطعاً نہیں تھی...... تم اگر اب بھی میری زندگی سے نکلنے کی بات کرو گی تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ زور سے ماروں گا۔" وہ بہت اپنائیت و محبت سے بول رہا تھا مگر آخری بات سن کر زینب نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ولید ہنسنے لگا پھر ٹیبل پر پڑا لائیٹر اٹھا کر سگریٹ سلگانے لگا مگر اس سے بھی پہلے زینب نے اس کے ہونٹوں کے بیچ دبا سگریٹ کھینچ لیا اور خفگی سے بولی۔

"میں اپنے گھر میں اس قسم کی فضولیات بالکل برداشت نہیں کروں گی۔"

"اچھا تو پھر کس قسم کی فضولیات برداشت کریں گی آپ؟" سینے پر بازو باندھ کر وہ شوخی سے اس کی طرف جھکا۔ زینب اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں جا رہی ہوں۔ ماں جی کی آنکھ کھل گئی تو مجھے نہ پا کر پریشان ہوں گی۔" ولید نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا دیا۔

"پہلے میری آنکھوں میں جھانک کر بتاؤ تمہیں میری محبت پر یقین ہے یا نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ زینب نے بہت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ایسے شخص کی محبت پر تو میں یقین کر ہی نہیں سکتی جو کسی اور سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو۔" ولید نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ بڑی مشکل سے روکی۔

"ارادہ تو خیر میں اب بھی رکھتا ہوں بلکہ تم اجازت دو تو میں کل ہی دوسری شادی کر لوں۔"

"کر لو اور اپنی محبت کا یقین بھی اسی کو دلانا۔" ناراضگی سے کہتی ہاتھ چھڑوا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر ولید کے سامنے آ جانے کی وجہ سے اس کے قدموں کو وقفہ کرنا پڑا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا مگر زندگی کا رنگ ولید کی خواہش کے عین مطابق تھا۔

"شادی تو خیر میں کر ہوں لوں گا۔ البتہ محبت میں صرف تم سے کرتا ہوں اور یقین بھی تم ہی کو دلانا ہے۔" بند دروازے سے کمر ٹکائے وہ بہت شرارتی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے جانے دو ولید!'' دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

''مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی اور تم سے ابھی بہت ساری باتیں بھی کرنی ہیں۔''

''نیند نہ آنا تمہارا مسئلہ ہے پھر کچن کا رستہ تمہیں معلوم ہے لہٰذا اپنی مدد آپ کے تحت کام کرو۔'' اس نے بے نیازی دکھائی۔

''اتنے دنوں سے اپنی مدد آپ ہی کر رہا تھا مگر اب......''

''کل تک انتظار کرو۔'' وہ تیزی سے کہہ کر لاک کھولنے لگی تھی ابھی تو اسے گجرے بھی پہنانے تھے۔

''اوہ تو یعنی چائے کے لیے بھی کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ دس از ناٹ فیئر۔'' اس کی پر احتجاج آواز پر وہ پلٹی پھر اس کے بکھرے بالوں کو کچھ اور منتشر کر کے بولی۔

''لمبی ہے غم کی رات مگر رات ہی تو ہے۔'' بہت معنی خیز انداز میں کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ اور اندر ولید قاسم بہت آسودگی سے مسکراتے ہوئے بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا تھا اور اس رات آسمان پر ٹمٹماتے ستارے کچھ اور ٹمٹمانے لگے تھے اور ایک نے دوسرے سے پوچھا تھا۔

''محبت نے جیتنے کا فن کہاں سے سیکھا ہے؟'' اور یہ سوال سن کر ادھوری راتوں کے چاند نے ان کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ مگر وہ اپنی نازک چاندنی کو وارفتہ نگاہوں سے تکنا نہیں بھولا تھا۔ کبھی کبھی اپنی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے اور وہ جھکنا رائیگاں نہیں ہوتا۔

